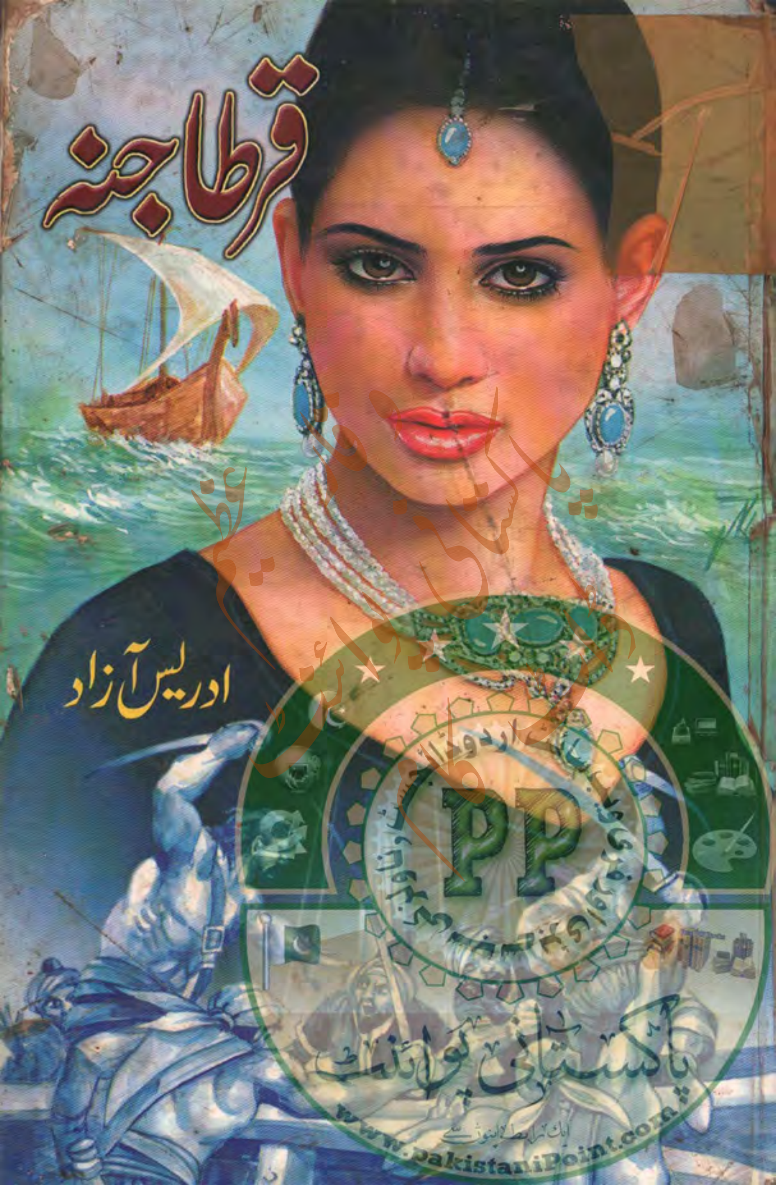

پاکستانی پوائنٹ
www.pakistanipoint.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام! قرطاجنہ حاضر خدمت ہے۔

انسانی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل ''ہینی بال'' کا شہر۔ جسے تاریخ میں ''محبت کی دھرتی'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور فنکاروں کی سرزمین کے طور پر بھی۔ جب میں نے قرطاجنہ پر لکھنے کا ارادہ کیا تو یہی فیصلہ کیا کہ ناول کا مرکزی کردار ہینی بال کو ہی بناؤں گا۔ میں نے ہیرلڈلیم کی مشہور کتاب اٹھائی اور ہینی بال کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں...... ہینی بال کی شخصیت میرے سامنے آتی گئی میں سچ مچ اس عظیم مرد آہن سے مرعوب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ...... ''ہینی بال'' پر قلم اٹھانے کی جرأت کروں بھی یا نہیں۔

اور پھر کئی دن کی مسلسل سوچ بچار کے بعد میں نے ہینی بال کو کسی اچھے وقت کے لئے چھوڑ کر صرف قرطاجنہ شہر کو اپنے قارئین سے متعارف کروانا ضروری خیال کیا۔ دراصل میں نے سوچا کہ جب تک قرطاجنہ شہر کا صحیح تصور میرے قارئین کے ذہن میں گھر نہیں کر لے گا' میں ہینی بال کے کردار کے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔

چنانچہ میں نے ایک ایسی تاریخی کہانی کے تانے بانے بننے شروع کر دیئے جو ''محبت کے شہر'' قرطاجنہ کی کسی قدر واضح تصویر قارئین کے ذہن پر مرتسم کر سکے۔ قرطاجنہ آج سے لگ بھگ اڑھائی ہزار برس قبل افریقہ کے ساحل پر ایک پرشکوہ سلطنت تھی۔

عربی میں قرطاجنہ اور انگریزی کارتھیج (Karthage) ان چند شہروں میں سے ایک تھا جو دست قدرت کے ہاتوں صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ لیکن تاریخ عالم اور تہذیب

عالم پر نہایت گہرے اثرات چھوڑ گئے' جیسے کہ بابل' نینوا' ممفس' اور سدوم۔ یہ شہر ایشیا کے فنیقیوں نے آباد کیا تھا۔ وہی فینیقی جو "قدیم دُنیا کے کاریگر" کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اس ناول کی کہانی تاریخی واقعات پر مشتمل نہیں ہے۔ کیونکہ قرطاجنہ کے تاریخی واقعات کا ریکارڈ کہیں موجود ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہنی بال کے واقعات میں قرطاجنہ کی کچھ تصویر سامنے آتی ہیں' جس سے ہم اہل قرطاجنہ کے رہن سہن' بازاروں' گلیوں' سڑکوں' طرز حکومت یا روم کے ساتھ ان کی دشمنی سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "قرطاجنہ" میں اپنے اندر کے افسانہ نگار کو پوری قوت سے آواز دی ہے۔

ہم آج بھی اس شہر کے کھنڈرات دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے انٹرنیٹ پر "کارتھیج" کے کھنڈرات اور آثار قدیمہ کی تصویریں بغور دیکھی ہیں' لیکن شدید آرزو ہے کہ...... کبھی خود افریقہ جا کر ان پتھروں' ٹوٹی ہوئی دیواروں اور اونچی نیچی گلیوں کو دیکھوں جہاں "اہل محبت" کا بسیرا تھا۔ یہ کھنڈرات موجودہ "تیونس" کے نواح میں واقع ہیں۔

پاکستان میں عموماً تاریخی ناول نگاری اور اسلامی ناول نگاری کو ایک چیز سمجھا جاتا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان میں نہیں بلکہ اردو دنیا میں یہی سمجھا جاتا ہے تو بھی زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ لیکن محترم قمر اجنالوی نے اس روایت کو توڑا اور چاہ بابل یا چند دیگر ناول لکھ کر اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کو ایک منفرد مقام عطا کیا۔

قبل ازیں میرے سارے ناول بھی کم و بیش سابقہ روایت کے ترجمان تھے۔ قرطاجنہ اس روایت سے ہٹ کر ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ...... میں عظیم ناول "داریوش اعظم" پر عرصہ دراز سے کام کر رہا ہوں' لیکن کیا کہیئے اس تلخ حقیقت کو جسے اہل جہاں "فکر معاش" کے نام سے جانتے ہیں۔ بخدا...... قوت لایموت کا بندوبست کرتے کرتے موجودہ دور کا انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں اور ضروری مقاصد کو بھی بسا اوقات پس پشت ڈال دیتا ہے۔ قرطاجنہ کی طرح "داریوش اعظم" بھی قدیم تاریخ پر مبنی ہے۔ اور میں قارئین سے التماس کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا کریں۔ دعا کریں کہ میں جلد سے جلد اپنے اس لازوال شہکار کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کر سکنے کے قابل ہو سکوں۔

قدیم تاریخ میں اک عجب سی بحث ہے۔ دور حاضر میں زیادہ سہولیات ہونے کے

باعث پہلے کی نسبت قدیم تاریخ کے اعداد و شمار حاصل کرنا کم مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی ایک ناول نگار کو اپنا شاہکار خوب سے خوب تر بنانے کیلئے کم از کم اس ماحول کو سمجھنے کی پوری پوری کوشش کرنی پڑتی ہے جس میں وہ طبع آزمائی کا ارادہ رکھتا ہے۔

''قرطاجنہ''...... ہنی بال کی وجہ سے...... کھنڈرات میں تبدیل ہو کر بھی زندہ ہے۔

اور میں چاہتا ہوں کہ قرطاجنہ کے بعد روئے زمین کی تاریخ کے سب سے بڑے فوجی جرنیل ہنی بال پر ناول لکھوں۔ جس نے ''الپس'' کی برفانی چوٹیوں پر سے ہاتھیوں کو گزار کر...... ایک ایسا عجوبہ کر دکھایا' جس پر آج تک عقل انسانی نہ صرف ششدر ہے بلکہ عاجز ہے۔ ہنی بال کے ساتھ ہی قرطاجنہ بھی تباہ و برباد ہو کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اور یہ تباہی رومیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ لیکن زیر نظر ناول اس دور سے پہلے کی تاریخ فرض کر کے لکھا گیا ہے۔

اس ناول میں آپ کو محبت کا شہر...... ہنستا بستا اور آباد دکھائی دے گا۔

اہل قرطاجنہ بہت اچھے لوگ تھے۔ حیرت ہے کہ دست قدرت نے انہیں کیوں مٹا دیا۔ ہیرلڈلیم کے بقول:

> فینیقی وہ قوم جنہوں نے سمندری راستوں کے ذریعے دوسرے ملکوں کے سفر کئے' سپین کو آباد کیا' افریقہ میں شہر بسایا' لیکن کہیں بھی وہ فاتح بن کر داخل نہیں ہوئے۔ وہ اپنی بنائی ہوئی چیزیں بیچنے کے لئے پہنچے اور یوں وہ دنیا کی واحد قوم ہیں' جنہوں نے تجارت اور فن کو تسخیر ارض کا ہتھیار بنایا۔''

قارئین کرام!

قرطاجنہ کیا ہے؟ اور فینیقی قوم کیا تھی؟ یا ان کی عادات' طرز حکومت اور رسم و رواج کیا تھے؟...... یہ تفصیلات تو ناول کی کہانی کے ساتھ ساتھ آپ کو خود بخود ملتی جائیں گی لہٰذا ان صفحات میں مزید ''وضاحت'' کی بجائے بہتر ہے کہ میں ناول آپ کے سپرد کر کے بیچ میں سے ہٹ جاؤں۔ چنانچہ میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ''قرطاجنہ'' آپ کو بے حد پسند آئے گا اور آپ مجھے اپنے خطوط اور آراء سے ضرور نوازیں گے۔

والسلام

آپ کا اپنا

ادریس آزاد۔ 29-37007

مہا پجاری کا بیٹا

Pakistanipoint

اب موسم کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔ برف باری تو رک چکی تھی۔ لیکن دھرتی ابھی تک پوری طرح سفید چادر میں لپٹی تھی۔ پچھلا پورا مہینہ آسمان سے اتنی برف گری تھی کہ پوری وادی برف کی کپاس کا صحرا دکھائی دیتی۔ شاید سردی کی شدت نے درختوں کو بھی سفید چادروں میں چھپنے پر مجبور کردیا تھا۔ چشمے اور ندیاں سفید برف میں ڈھک چکی تھیں۔ برتھاس کے لشکریوں کو پانی حاصل کرنے کیلئے برف کو پگھلانا پڑتا تھا۔ اب وہ لوگ گرم اونی خیموں میں بھی کھلے آسمان تلے نہ رہ سکتے تھے۔ رات بھر اتنی برف باری ہوتی کہ برف زمین سے کئی کئی ہاتھ اوپر اٹھ آتی۔ یہی وجہ تھی کہ پورے لشکر نے پہاڑی غاروں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کچھ غاریں تو قدرتی تھیں اور کچھ برتھاس کے جفاکش لشکریوں نے خود کھودی تھیں۔ برف باری کے موسم سے پہلے پہلے انہوں نے خود کو محفوظ کرلیا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ برف سے بچنا تو نہ تھا۔ انیس ہزار کے لشکر کی خوراک کا انتظام درحقیقت برتھاس کے لیے اصل مسئلہ تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ حالات اسے اپنی ہی لدو جانوروں کا گوشت کھانے پر مجبور کردیں۔ پڑاؤ کے آغاز میں برتھاس نے نہایت بے چینی سے اس حقیقی مسئلے پر غور کیا۔ تب اس نے لشکر کی تمام رسد کا جائزہ لیا۔ اور ہر لشکری کے لیے خوراک کی ایک مخصوص مقدار طے کرلی، پھر بھی وہ دو ماہ سے زیادہ عرصے تک یہاں مورچہ بند نہ رہ سکتے تھے۔ برتھاس نے اس مشکل کا یہی حل نکالا کہ آس پاس کی بستیوں کو مکمل طور پر لوٹ لیا۔ نوجوانوں کو برفانی ریچھ، بارہ سنگے اور بکرے کا شکار کرنے کیلئے لشکر میں رکھ لیا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کردینے کا حکم دے دیا۔ اب وادی داریون کی ساری بستیوں کے سترہ سو نوجوان سارا دن قرطاجنی لشکر کے لیے شکار کھیلتے تھے۔ برتھاس کا طریقۂ جنگ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا تھا۔ یہ وادی جس کے پہاڑی غاروں میں قرطاجنی لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، درہ داریون کے سامنے انسانی ہاتھ کی طرح پھیلی ہوئی

تھی۔ درہ داریون سے برآمد ہونے والا لشکر اس وادی کے میدان میں داخل ہوتے ہی برتھاس کے تیر اندازوں کی زد پر ہوتا۔ پچھلے چار ماہ سے اس برفانی وادی کے غاروں میں قرطاجنی لشکر کے جفاکش سپاہی چھپے رومیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ برتھاس کو یقین تھا کہ رومی سالار ارمنیدس کا سمندر کی طرف جانے کیلئے واحد راستہ یہ پہاڑی درہ ہی تھا۔

دراصل برتھاس کو اس کے جاسوسوں نے جونہی یہ اطلاع دی کہ سمندر میں ایک بڑا بحری بیڑا یاندران کی ساحلی چٹانوں کی جانب بڑھ رہا ہے...... تو برتھاس کو فوری اندازہ ہو گیا کہ یہ بیڑہ رومی سالار ارمنیدس کو قرطاجنیوں کے شکنجے سے نکالنے کی خاطر رومی حکومت نے بھیجا ہے۔ تب برتھاس نے سرما کے آغاز میں نہایت تیزی کے ساتھ شمال کی جانب کوچ کیا اور وادیٔ داریون میں آ کر پڑاؤ ڈال دیا۔

اہل قرطاجنہ اور رومیوں کی یہ جنگی آنکھ مچولی گزشتہ کئی سال سے جاری تھی۔ دراصل جوں جوں رومی حکومت وسیع ہوتی چلی گئی توں توں بحر روم میں ان کا دخل بھی بڑھتا چلا گیا۔ اہل قرطاجنہ بنیادی طور پر ''جنگ پسند'' لوگ نہیں تھے۔ لیکن رومیوں کی بحر روم میں ناروا اجارہ داری نے قرطاجنہ کی مجلس شوریٰ کو مجبور کر دیا کہ وہ سمندر اور خشکی، ہر دو جگہوں پر اپنی فوجیں بھیج کر رومیوں کو اپنے عظیم ہونے کا یقین دلائیں، اور مجلس قرطاجنہ اپنے اس منصوبے میں بہت حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ اگرچہ سمندر میں تو رومیوں کی اجارہ داری ویسے ہی تھی لیکن مشرقی یورپ کے بہت سے ساحلوں پر اب فنیقی صنعت کار نئی بستیاں بسانے کے لیے اتر رہے تھے، کیونکہ ان علاقوں سے قرطاجنی سالار برتھاس نے رومیوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا جرنیل تھا۔ گزشتہ تین سال سے وہ مشرقی یورپ کے ان ساحلی علاقوں کو تاراج کرتا پھر رہا تھا، جو بحر روم کے شمالی کناروں پر آباد تھے۔ اگر وہ مزید مشرق کی طرف یلغار کرتا تو شاید یونانی بادشاہ کو بلاوجہ ناراض کر بیٹھتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف ان علاقوں میں اپنی گوریلا جنگ کا بازار گرم کیے ہوئے تھا جو رومی سلطنت کے زیر تسلط تھے۔ اور برتھاس کی اس یلغار سے یونانی بادشاہ خوش تو ہو سکتا تھا ناراض نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سرحدات کی جانب سے چشم پوشی کیے، مزے سے حکومت کر رہا تھا۔ لیکن برتھاس کی چھاتہ بردار یلغاروں نے رومی سلطنت کو بری طرح پریشان کر دیا۔

مجلس قرطاجنہ نے برتھاس کو تین سال پہلے بحر روم عبور کر کے یورپ کے مشرقی

ساحلوں پر اترنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح کا ایک لشکر انہوں نے بوڑھے ''موآبریس'' کی زیرکمان بحرروم کے پانیوں پر رومیوں کے ساتھ کھلے معرکے لڑنے کے لیے بھی بھیجا۔ بوڑھا اور تجربہ کار موآبریس، جو چالیس سال تک بحرروم کے پانیوں پر ایک خطرناک قزاق کے طور پر حکمرانی کرتا رہا تھا، اب اپنے فنیقی خون کا حق ادا کرنے نکلا تھا۔ دوسو جہاز اور بارہ ہزار کی فوج لے کر قرطاجنہ کے ساحلوں سے بحرروم میں آگے بڑھنے والے موآبریس نے جگہ جگہ رومیوں کے دانت کھٹے کیے۔ لیکن رومیوں کی طاقت موآبریس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس لیے بوڑھے ڈاکو کو بھی بحرروم میں چھاپہ مار لڑائی لڑنی پڑی۔

مجلس قرطاجنہ کے جاسوس اپنے دنوں جری سالاروں کی ہر خبر بروقت قرطاجنہ پہنچاتے رہتے تھے، اور مجلس قرطاجنہ کے دانشمند، ارباب حکومت بہ وقت ضرورت بہترین حکمت عملی اختیار کرتے رہتے تھے۔ قرطاجنہ ایک شہر تھا، ایک ایسا شہر جسے دور سے دیکھتے ہی مسافروں کی تھکن اتر جایا کرتی تھی۔ براعظم افریقہ کے انتہائی شمال میں بحرروم کے جنوبی ساحل پر واقع دورقدیم کا یہ حسین شہر ماضی میں انسانی عظمت کی ایک ایسی مثال، جس کی بعض خوبیوں کا مقابلہ ممفس، سکندریہ، پاسا گرد اور بابل ونینوا بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس شہر کی سب سے انوکھی اور نرالی بات...... ''محبت'' تھی۔ یہ دنیا کا واحد شہر تھا جسے ایک حسین اور دانا دوشیزہ نے آباد کیا تھا۔ شاید سنگ بنیاد رکھتے وقت حوا کی اس بیٹی نے اپنی ممتا کا کچھ رس قرطاجنہ کی فضاؤں میں بھی گھول دیا تھا۔ اہل قرطاجنہ آج بھی اپنی اس مہوش آسمانی کی مورتیاں بنا کر صبح وشام اس کے آگے پرارتھنا کرتے تھے۔ اہل قرطاجنہ میں ''محبت'' کی فضا اس لیے بھی نظر آتی تھی کہ قرطاجنی قوم بنیادی طور پر اونچے درجے کے فنکاروں کی اولاد تھی۔ ماضی قدیم کی تمام دنیا کو اس وقت کی جدید تکنیکیں، آلات، اشیائے استعمال، برتن، کپڑے، مصوری، سنگتراشی، موسیقی اور آلات سازی...... فی الحقیقت فنیقیوں نے ہی فراہم کی تھیں۔ توریت وزبور میں ''شہرصور'' کے تذکرے ہیں۔ یہ اشیائے کوچک کے مغربی کنارے پر آباد ہنرمند ایشیائیوں کا ایک جنت نظیر شہر تھا۔ اہل قرطاجنہ انہیں فنیقیوں کی اولاد تھے۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والا ایشیائی خون انہیں آج بھی ایک اچھا ہنرمند یا فنکار بنانے کے لیے اسی طرح پرجوش تھا، جس طرح صدیقوں پہلے ''شہرصور'' میں ہوا کرتا تھا۔ دنیا کو جہاز سازی کا فن سکھانے والے فنیقی ماضی بعید میں بھی احساس کی دولت سے مالا مال تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونان میں فلسفہ اور

مصر میں سائنس ترقی کر رہی تھی۔ قرطاجنہ میں بدستور ''محبت'' پروان چڑھ رہی تھی۔ فن اور ہنر کی محبت نے اہل قرطاجنہ کے چہروں سے کرختگی کے نشانات مٹا دیئے۔ یہی وجہ تھی کہ اس حسین شہر کے مرد و زن پرستان کی شہزادیوں اور شہزادوں جیسے حسین تھے۔

برتھاس ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا درہ داریون سے آنے والی پر بہار ہواؤں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس کے بدن پر موٹی فر کا بھاری اونی لباس اتنا شاندار تھا کہ بے اختیار قرطاجنہ کے ہنرمندوں کا خیال آ جاتا تھا۔ برتھاس کے سر پر چمڑے کی گول ٹوپی ہندوستانی کپاس سے بھری کسی تاج کی طرح شاندار دکھائی دیتی تھی۔ چالیس سالہ برتھاس کی نگاہیں درہ داریون پر تھیں۔ اس کے جاسوس رومی سالار ارمعیدس کی نقل و حرکت اور داریون کی طرف بڑھتے ہوئے رومی لشکر کی ہر خبر اس تک پہنچا رہے تھے۔ لشکر کے باقی سپاہی معمول کے کاموں پر جتے تھے۔ چاروں طرف سفید برف اور برف سے ڈھکے درخت دیکھ کر برتھاس نے اندازہ لگایا کہ اب مزید برف باری نہیں ہوگی۔ آج سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ پڑاؤ کے زیادہ تر لوگ اس وقت غاروں سے باہر کھلی وادی میں مصروف اور مشغول تھے۔ قرطاجنہ کے سپاہی اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو تو نہ لا سکے تھے، لیکن رومی قصبوں اور رومی دیہاتوں سے اپنی یلغاروں کے دوران، انہوں نے اتنی نوجوان لڑکیاں اسیر کر لی تھیں کہ اب ان کے لیے عورت کے جسم کی بھوک مسئلہ نہ رہی تھی۔ لشکر میں پندرہ سو سے زیادہ دوشیزائیں تھیں۔ جو انیس ہزار سپاہیوں کا کھانا تیار کرتیں اور رات کو اپنی باری کے حساب سے قرطاجنی سپاہیوں کے بستر گرم کرتیں۔ برتھاس نے اپنے لیے سات لڑکیوں کو چن کر الگ کر لیا تھا۔ ان رومی عورتوں کو اپنے بستروں پر سجا کر قرطاجنیوں کو کچھ برا نہ لگتا تھا۔ دراصل انسانی اخلاقیات کا ارتقاء ابھی قبل مسیح کی صدیوں میں آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز اور درست سمجھا جاتا تھا۔

پندرہ سو رومی عورتیں ہر روز آفتاب کی ٹھنڈی اور چمکیلی دھوپ میں کوہ قاف کی پریوں کی طرح قرطاجنی لشکر میں گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔

''کلاڈینا'' بھی ان اسیر دوشیزاؤں میں سے ایک تھی۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی قرطاجنی سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ کلاڈینا چاہتی تو اپنے خاندان کی طرح لڑ کر جان دے دیتی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس نے اسیر ہونا منظور کر لیا۔ اس کا خاندان آبائی طور پر

تو ''سیرا کیوز'' شہر کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس کا بوڑھا باپ سیرا کیوز کی سیاسی اونچ نیچ سے تنگ آ کر جنوبی یورپ کے ساحلوں پر آباد ہوگیا تھا۔ برتھاس کی یلغار نے جب یورپ کے جنوب مشرقی ساحلوں کو تاراج کیا تو کلاڈینا کا پورا خاندان قرطاجنی تلواروں کا لقمہ بن گیا۔ لیکن کلاڈینا نے ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ وہ اتنی حسین تھی کہ گرفتار ہو کر آئی تو اسے فوراً برتھاس کے حضور پیش کر دیا گیا۔ قرطاجنی سالار اس خوبصورت چہرے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ خوشی سے جھومتے ہوئے آگے بڑھا اور کلاڈینا کے قریب آ کر کہنے لگا:......

''خوبصورت!...... بہت خوبصورت ہو تم۔ تمہارے ساتھ پیار کر کے بہت لطف آئے گا۔''

کلاڈینا کچھ نہ بولی۔ وہ اپنی حسین پلکیں برسے ہوئے بادل کی طرح اٹھائے اپنی موٹی موٹی آنکھیں برتھاس کے چہرے پر گاڑے نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ آج کلاڈینا کے حرم میں داخل ہوئے پانچ مہینے ہونے والے تھے۔ وہ ان سات لڑکیوں میں سب سے بڑھ کر حسین تھی۔ جو برتھاس کے آرام اور راحت کے لیے خاص طور پر چنی گئی تھیں۔
چٹان پر ٹھنڈی ہوا کے سامنے سینہ تانے کھڑے برتھاس کی نگاہیں تیرتی تیرتی کلاڈینا پر جا اٹکیں۔ وہ آج کئی روز بعد نکلنے والی دھوپ میں ایک صاف پتھر پر بال کھولے بیٹھی دھوپ تاپ رہی تھی۔ برتھاس کی پسندیدہ لونڈی کے لیے سپاہیوں نے پتھر پر پڑی برف ہٹا دی تھی۔ برتھاس کی نظریں سورج کے سامنے بیٹھی روشن روشن رومی لڑکی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت اداس تھی۔ برتھاس بڑے شوق سے اس کے ساتھ رات گزارتا اور جی بھر کر خوش ہوتا۔ لیکن کلاڈینا اکثر خاموش رہتی۔ اس کی جھیل سی اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اکثر برتھاس کو یوں لگتا جیسے وہ اس گہری اداس جھیل میں ڈوب جائے گا۔ لیکن وہ ایک فوج کا سالار تھا۔ اس لیے وہ اکثر سر کو جھٹکتا اور کلاڈینا کے سحر حسن سے نکل کر اس کے گداز جسم سے لپٹ جاتا۔ کلاڈینا کے سحر کو یوں کھلے بالوں کے ساتھ برتھاس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اسے لگا جیسے یونان کی کوئی دیوی اطالیہ کی اس برفانی وادی میں اتر آئی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے چٹان سے اترنے لگا۔

آج کئی دنوں بعد برفباری رکی تھی۔ برتھاس سوچ رہا تھا کہ اگر ایک دو دن مزید برف نہ پڑی تو وہ غاروں سے نکل کر کھلی وادی میں خیمے نصب کرنے کا حکم دے دے گا۔

14

چٹان سے اتر کر قرطاجنی سالار سیرا کیوز کی اس حسینہ کی طرف بڑھنے لگا، جسے دیوتاؤں نے ملائم زمرد سے بنایا تھا۔ اس کے آس پاس موجود قرطاجنی سپاہیوں نے اپنے سپہ سالار کو رومی لونڈی کی طرف بڑھتے دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی۔ کیونکہ یہ ان کے خیال میں قرطاجنی سپہ سالار کے شایان شان نہیں تھا کہ وہ لونڈی کو اپنی طرف بلانے کی بجائے، خود چل کر اس کی طرف آئے۔

کلاڈینا بھی برتھاس کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ لہرا کر اٹھی اور برتھاس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

"کلاڈینا!...... میں تمہارا خاندان تمہیں واپس نہیں دلا سکتا۔ لیکن اس کے بدلے جو تم چاہو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ کیا تم عظیم سالار برتھاس کے بستر کی رانی بن کر خوش نہیں ہو؟ تمہیں اداس دیکھ کر قرطاجنی سالار کو دکھ ہوتا ہے۔"

کلاڈینا کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائی نظر آئی۔ آج پہلی مرتبہ فاتح سالار نے اس سے اداس رہنے کی وجہ پوچھی تھی۔ درہ داریون سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کلاڈینا کی کاکلوں کو لہرا رہے تھے۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں اور دو موٹے موٹے قطرے برگ گل کے ساتھ اٹکی ہوئی شبنم کی طرح دھاری دار پتھر پر ٹپک پڑے۔ برتھاس کو ایسا لگا جیسے اس نے اسیر رومی دوشیزہ کے کسی گہرے دکھ کو چھیڑ دیا ہو۔ کلاڈینا نے اپنی اٹھی ہوئی پلکیں پھر جھکا لیں۔ تب برتھاس وادی کے میدان میں موجود اپنے سپاہیوں کی پرواہ کیے بغیر اس دھاری دار بڑے پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"بیٹھو! اے حسینۂ رُوم بیٹھو!...... مجھے بتاؤ میں تمہارا دکھ کیسے دور کر سکتا ہوں؟"

کلاڈینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ تو صرف اس کے بستر کی ساتھی تھی۔ برتھاس جیسے قاتل کے دل میں درد کا یہ احساس کیونکہ پیدا ہونے لگا تھا۔ کلاڈینا اسی پتھر پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مشغول تھا۔ وادی کا پورا میدان دھوپ کی وجہ سے خالص چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ چاروں طرف پڑی سفید برف سے منعکس ہونے والی سورج کی شعائیں اس خوبصورت میدان کو بقیۂ نور بنا رہی تھیں۔ دور رسد کی غاروں کے پاس اٹھتا ہوا دھواں اس بات کا ثبوت تھا کہ لشکر کے لیے لنگر تیار کیا جا رہا ہے۔ زیادہ تر سپاہی بعض مقامات سے برف ہٹانے کے کام میں مشغول تھے۔ برتھاس نے ایک نظر آس پاس کے

ماحول پر دوڑائی اور پھر رومی حسینہ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں کچھ ہے...... جیسے تم اندر ہی اندر سوچتی رہتی ہو۔ تمہارے ساتھ کی دیگر لڑکیاں بھی تو ہیں۔ کیا ان کے خاندان جنگ کی نذر نہیں ہوئے؟ لیکن ان میں سے کوئی بھی تمہاری طرح اداس نہیں رہتی۔ کیا تم بولو گی نہیں کلاڈینا؟''

کلاڈینا زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکتی تھی۔ اس کے سامنے قرطاجنی لشکر کا سپہ سالار بیٹھا تھا۔ جواب اس کا آقا تھا۔ اور وہ اس کی لونڈی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آج برتھاس ایک حاکم بن کر نہیں، بلکہ ایک دوست بن کر بات کر رہا تھا۔ چنانچہ اسے کہنا پڑا۔ ''محترم سالار کارتھیج! میں اپنی بزدلی پر خود سے نادم رہتی ہوں۔ میرے خاندان کی باقی لڑکیاں جان پر کھیل گئیں اور انہوں نے غلامی پر موت کو ترجیح دی لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ یہی میرا دکھ ہے اور یہی میری پریشانی۔''

برتھاس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رومی دوشیزہ اتنے واشگاف الفاظ میں اپنی نفرت بھری زندگی کا اظہار کر دے گی۔ اس کی تمام تر انسیت اور رحم دلی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ میدان جنگ میں آن کی آن میں بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے والا جرنیل ایک معمولی لونڈی کے سامنے بوکھلا گیا تھا۔ اب وہ کیا کہتا۔ کیا وہ اپنی پیشکش پر قائم تھا۔ کیا اس بات کے بدلے وہ رومی دوشیزہ کو آزاد کر دیتا۔ وہ غصہ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ اس نے خود کلاڈینا سے اس کے دل کا حال پوچھا تھا، اور یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ اس کا درد دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اور تو کچھ نہ سجھائی دیا، تبھی اس نے ایک عجیب بات کہی۔ ''تم اپنی بزدلی پر نادم ہو تو اس ندامت کو اب دور کر دو۔ تم میرے حرم میں رہ کر خود کو غلام سمجھتی ہو۔ اور اس بات کے لیے خود کو گنہگار بھی سمجھتی ہو۔ اس لیے میں تمہیں تجویز دوں گا کہ تم خود کو اپنی بہادری کے ذریعے آزاد کروانے کی کوشش کرو۔ میں اپنی پیشکش پر قائم ہوں۔ تم یہاں سے بھاگ نکلو۔ یہی میری پیشکش ہے۔ دیکھو کلاڈینا! میری ایک بات یاد رکھو۔ اگر تم اپنی کسی غلطی پر نادم ہو تو تمہیں اس کا ازالہ کرنا چاہیے۔ نہ کہ اس ندامت کی وجہ سے مایوس اور غمگین رہنا چاہیے۔''

اب حیران ہونے کی باری کلاڈینا کی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کارتھی سالار نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ وہ اپنی جگہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ وہ چاہتی تو اپنی صفائی پیش کر سکتی تھی۔

لیکن نہ جانے کیوں آج اس کے لہجے کا سچ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''سالار کارتھیج! آپ جانتے ہیں کہ یہ آسان نہیں۔ لیکن میں دل سے چاہتی ہوں میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میں اپنی ندامت کا داغ دھونا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آج کی سچائی، میرے اس کام کو اور بھی دشوار کر دے گی۔''

''نہیں تمہارے اندر ابھی یقین کی دولت کم ہے اور میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ جب تک تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ کامیابی تمہارا مقدر ہے، تب تک تم اپنے منصوبے پر عمل پیرا نہ ہونا۔ جنگ میں کامیابی کا پہلا اصول یہ ہے کہ پوری فوج کے ہر سپاہی کا دل کامیابی کے یقین سے معمور ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں کبھی نہیں ہارتا۔ صرف اس لیے کہ مجھے ہمیشہ اپنی جیت کا یقین ہوتا ہے۔'' ایک آقا اور لونڈی میں بڑی عجیب باتیں ہو رہی تھیں، دونوں ہی بے جھجک سچ بول رہے تھے۔ کلاڈینا کو پانچ ماہ میں پہلی مرتبہ برتھاس سے اپنی نفرت کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک عجب شان سے پلکیں اٹھائیں اور سر کو تھوڑا سا ترچھا کر کے قرطاجنی سالار کی جانب دیکھا۔ حسین کلاڈینا کا یہ انداز بڑا ہی قاتل تھا۔ برتھاس کے دل کو آج اس لڑکی کی سچائی نے چھو لیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ معاً اس کی نگاہیں وادی میں کام کرتے لوگوں کی طرف اٹھیں۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کلاڈینا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب برتھاس واپس جا رہا تھا۔ وہ دیوہیکل دھاری دار پتھر پر سے اترا اور وادی کے میدان کی جانب چل دیا۔ کلاڈینا عقب سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی زلفوں کو لہرائے دے رہے تھے۔ وہ دیر تک برتھاس کے چوڑے چکلے کندھوں کو عقب سے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ برتھاس اپنے سپاہیوں کے قریب پہنچ گیا۔

اس رات نہ جانے کیوں کلاڈینا کے دماغ میں یہ خیال موجود تھا کہ آج رات برتھاس اسے بستر پر بلائے گا۔ لیکن جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو حیران تھی کہ ابھی تک آقا کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ وہ سو گئی۔ اگلی رات، پھر اس سے اگلی رات، حتیٰ کہ کئی روز گزر گئے۔ وہ بے حد حیران تھی۔ اس عرصہ میں باقی لڑکیاں باری باری قرطاجنی سالار کا بستر گرم کرتی رہیں۔ لیکن کلاڈینا کو شاید برتھاس بھول گیا تھا۔ برتھاس کے اس طرز عمل سے کلاڈینا کے دل میں دو خیال گزرتے تھے۔ پہلا یہ کہ برتھاس ایک اچھا انسان ہے اور وہ کلاڈینا کا غم جان کا اسے عزت دے رہا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ برتھاس ایک بزدل انسان ہے۔ جو اس سچی حریت پسند

لونڈی سے ڈرتا ہے کہ...... یہ لونڈی اسے قتل ہی نہ کر دے۔ کلاڈینا کا دوسرا خیال غلط تھا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ لیکن پھر برتھاس نے کلاڈینا کو اپنے بستر پر نہ بلایا۔

برتھاس کے جاسوسوں نے اسے بتایا کہ رومی ''سالار ارمنیدس'' درہ داریوان کی طرف بڑھا آ رہا ہے۔ گویا اب اسے اپنی مشقت کا پھل ملنے والا تھا۔ رومی لشکر کا سالار برتھاس کی موجودگی سے مطلق بے خبر تھا۔ برتھاس نے یہاں پڑاؤ ڈالتے وقت آس پاس کی بستیوں میں قتل عام کیا تھا۔ ایسا کوئی شخص یہاں نہ بچا تھا جو ارمنیدس کو برتھاس کی موجودگی کی خبر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ رومی سالار نہایت تیزی کے ساتھ درہ داریون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس درے سے گزر کر وہ صرف دو روز کی مسافت طے کر کے ساحل سمندر تک جا سکتا تھا۔ بیچارہ ارمنیدس راستے میں موجود پیش آمدہ خطرات سے بے خبر موت کے دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے علم میں تو یہ تھا کہ اس کا دشمن برتھاس اس سے چار سو کلومیٹر دور مغرب میں موجود ہے اور یہ ارمنیدس کے جاسوسی نظام کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت بھی تھا۔ بہت جلد رومی لشکر درہ داریون کے دو پہاڑوں میں پسنے والا تھا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری
ڈاٹ کام

دور قرطاجنہ میں مجلس عامہ کے نمائندے برتھاس اور بوڑھے بحری سالار موآبرلیس کی صورت حالات پر بحث کررہے تھے۔ قرطاجنہ جسے لاطینی لوگ ''کارتھیج'' کہتے تھے، 500 قبل مسیح میں عروس البلاد تھا۔ جہاں صبح وشام شہنائیاں بجتیں۔ بازاروں میں ہر ملک کے گاہک قرطاجنی مصنوعات خریدتے نظر آتے۔ جنگ کی خبریں دینے والے ہرکارے، ہر چوک میں کھڑے ہوکر اپنے فاتحین کے معرکوں کی بابت اپنے عوام کو بتاتے، اونچی نشستوں والی بڑی بڑی دکانیں شہر قرطاجنہ کی عظمت کا نشان تھیں۔ اہل قرطاجنہ نے اپنے شہر کے گردا گرد کبھی فصیل بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ کیونکہ شہر کے تین اطراف میں نیلگوں سمندر کی قدرتی فصیل تھی۔ اور چوتھی سمت دنیا بھر کے سوداگروں کے لیے کھلی رکھی تھی۔ دستور کے مطابق شہر کی احاطہ بندی کرنے کیلئے سرخ اینٹوں سے بنی ایک لمبی دیوار شہر کو جنگل سے الگ کرتی تھی۔ شہر کا دروازہ دن بھر کھلا رہتا۔ اور محض محصولات کی آمدنی ہی ہر شام وزیر خزانہ کو حیران کردیتی۔ یہ ہنرمندوں کا شہر تھا۔ دنیا بھر کے ممالک کو یہاں سے ہر قسم کی مصنوعات ملتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ قرطاجنی باشندے سب کے دوست تھے اور تقریباً تمام اقوام میں ان کی عزت تھی۔ لیکن مجلس قرطاجنہ کو پھر بھی اپنے دو مایہ ناز سالار رومیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجنے پڑے۔ مجلس کے تمام ارکان اس بات پر بحث کررہے تھے کہ ان کی فوجوں کو واپس آجانا چاہیے۔ ''مینو'' خاندان کے افراد موجودہ وزیراعظم کے مخالفین میں سے تھے اور اسی خاندان کے زیادہ تر لوگ شہر کی اشرافیہ اور مجلس عامہ کے نمائندے تھے۔ آج کی بحث میں ایک مینو سردار ''کاسی بال'' بار بار وزیراعظم کو سستی، کاہلی اور لاپروائی کے طعنے دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:......

''حکومت قوم کا خزانہ برباد کررہی ہے۔ برتھاس اور موآبرلیس کی طرف بھیجی جانے

والی کمک اور رسد کا تخمینہ شہر کے پہرے خرچ کے برابر ہے۔ دونوں لشکر بھیجتے وقت ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم رومی سلطنت پر اپنی طاقت کا رعب ڈالیں اور انہیں یہ بتا دیں کہ ہم کوئی تر نوالہ نہیں ہیں۔ جسے وہ آسانی کے ساتھ نگل جائیں گے۔ لیکن حکومت اس مقصد میں ناکام رہی۔ دونوں سالار چھوٹی چھوٹی رومی بستیوں کو یوں لوٹتے پھر رہے ہیں گویا آوارہ لٹیرے ہوں۔ میں کہتا ہوں، برتھاس اور بوڑھے موآبرلیس کو واپس بلایا جائے۔ ہمیں کسی کی زمینیں چھیننے کا کوئی حق نہیں۔ رومی ہم پر کبھی حملہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہماری سرزمین ان کے لیے ہمیشہ اجنبی رہے گی۔"

مینو خاندان کے سردار کاسی بال کی کڑک دار آواز سے اہل مجلس سہم گئے۔ وزیراعظم اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک اور مینو سردار نے اٹھ کر کہا۔

"ہمارا بری سپہ سالار برتھاس 19 ہزار کی فوج کو لے کر برف سے ڈھکے ایک درے میں چار ماہ سے بے کار پڑا ہے۔ اس کے حرم میں سات سات لڑکیاں ہیں۔ اس شدید سردی میں قوم کے بہترین سپاہیوں کو یوں ضائع کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میں کہتا ہوں برتھاس کو پابہ زنجیر واپس بلایا جائے اور اسے سزا دی جائے۔"

اب اہل مجلس کی نگاہیں وزیراعظم کی جانب اٹھ گئیں۔ ساٹھ سالہ "ارفلکر" مخالفین کی سخت باتوں کا سامنا ئے بغیر نہایت بردبارانہ لہجے میں اہل مجلس سے مخاطب ہوا۔

"معزز ین اراکین مجلس! ہمارے دونوں سپہ سالاروں نے قوم کے تمام مقاصد کو ہر لحاظ سے پورا کیا ہے۔ ہم نے انہیں تین سالوں میں کل چھ بار غذائی رسد بھیجی ہے۔ لیکن ان تین سالوں میں برتھاس نے چودہ سو ٹیلنٹ چاندی، اٹھائیس کلوسونا اور تیس ہزار ٹیلنٹ چاندی کے برابر دیگر مال غنیمت اہل قرطاجنہ کے لیے بھیجا ہے۔ جہاں تک ہماری بحری مہم کا تعلق ہے تو اس میں بھی ہمیں کامیابیاں ہوئی ہیں۔ جب موآبرلیس، یہاں سے روانہ ہوا تھا تو اس کے پاس دوسو جہاز تھے۔ لیکن اب اس کا بحری بیڑا دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہے۔ اور ہر حصے میں دوسو جہاز ہیں۔ اب تک ہمارے بحری سالار نے انگنت مال سے لدے جہاز قرطاجنہ بھیجے ہیں۔ جبکہ ہماری طرف سے ماسوائے غذائی امداد کے موآبرلیس کی جانب کچھ نہیں بھیجا گیا۔"

وزیراعظم ارفل کر کی دانشمند بیٹی اہل مجلس کے سامنے اپنے باپ کا مدلل جواب سن

کر مسکرانے لگی۔ ''جافیکس'' بھی عاملہ کی رکن تھی۔ وزیر اعظم کی 34 سالہ کنواری بیٹی نے قرطاجنہ کی اس روایت کو زندہ رکھا تھا کہ روز اول سے اس شہر کی دانائی ایک نہ ایک دوشیزہ کے ساتھ جڑی رہی تھی۔ آج کی مجلس میں جافیکس مینو خاندان کے اعتراضات کو بے بنیاد قرار دے رہی تھی۔ اپنے باپ کی بات مکمل ہونے کے بعد وہ خود اہل مجلس سے مخلص ہوئی۔

''معزز اراکین مجلس! جیسا کہ وزیر اعظم نے بتایا کہ ہم نے اپنے تین سالہ معرکوں میں نقصان کی بجائے فائدہ حاصل کیا ہے۔ لیکن مجلس کے معزز مینو خاندان کے عمائدین ہمارے دونوں لشکروں کو واپس بلانے کی بات کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ مسئلہ کسی ایک فرد کا نہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ ہم اہل مجلس کی رائے شماری کے ذریعے اس سوال کا جواب حاصل کریں۔''

مینو خاندان کی ایک خاتون نے وزیر اعظم کی بیٹی کو بولتے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اپنی جگہ مٹک کر بولی۔

''رائے شماری کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے تانیت، ایشمون، ہیلر اور مل کرتے کے مندروں سے شگون لیے ہیں اور ہمارے دیوتاؤں نے ہمارے کاہنوں کی زبانی ہمیں یہ اشارے دیئے ہیں کہ مزید جنگ قرطاجنہ کے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔''

مجلس عامہ کی گرما گرم بحث جلد ختم ہونے والی نہیں تھی۔ گزشتہ کئی روز سے ہر اجلاس میں یہی بحث چل رہی تھی۔ مینو خاندان کے لوگ ہر روز مندروں کے شگونوں کو اپنے حق میں استعمال کرتے۔ وزیر اعظم کی دانشمند بیٹی کے لیے یہی بات زیادہ پریشان کن تھی۔ آج کی بحث کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی دھرتی ماتا، تانیت دیوی کے مندر سے جنگ کے حق میں شگون لے کر آئندہ اجلاس میں پیش کرے گی۔ آج کا اجلاس بھی بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہو گیا۔

''نیا شہر یعنی قرطاجنہ دو سو سال پرانا تھا۔ شروع میں وہ فنیقی قوم کے لیے سپین کے رستے میں ایک پڑاؤ کا کام دیتا تھا اور اس میں اب تک اپنی اصل اور ابتدائی حالت کے نشان موجود تھے۔ ایک تنگ جزیرہ نما، جو خلیج تیونس کے اندر گھسا ہوا تھا، اس کی آخری نوک پر، ''جبل مقدس'' کی سلیگ نما چوٹیوں کے پار چار سو فٹ اونچی پہاڑی کے نیچے ایک عارضی بندرگاہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے پشتے جہازوں کو شمال مغرب کی خطرناک

ہواؤں سے محفوظ رکھتے تھے۔ جزیرہ نما کی گردن کی پہاڑیاں قرطاجنہ کی بندرگاہ تک خشکی کے راستے کی حفاظت کرتی تھیں۔

ایک دوسری داخلی بندرگاہ جنگی جہازوں کے لیے پہاڑوں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ شکل میں چکر کی طرح گول، یہ ایک بڑی محراب کے اندر واقع تھی۔ اور دو سو جنگی جہاز اس میں لنگر ڈال سکتے تھے۔ ہر گودی کے ساتھ رسوم ادا کرنے کے لیے سنگ مرمر کے ستون تھے۔ جہاں پر جہاز آ کر ٹھہرتے تھے۔ یہ ایک جزیرہ نما تھا، جس پر محکمۂ بحریہ کے دفاتر واقع تھے۔ یہاں فرعون کے چھوٹے سے بت کی مانند ایک اونچا مینار تھا۔ جہاں سے باہر کے سمندر پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ یہ مینار جہازوں کو اشارے اور پیغام دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ گول محراب کے پیچھے گوداموں میں لکڑی، ہتھیار، رسے اور جنگی سامان بھرے رہتے تھے...... ایک حفاظتی دیوار ایسے لوگوں کو جو یہاں آنے کے مجاز نہ تھے۔ تا گہانی کے وقت اس خفیہ بندرگاہ پر جاسوسی کرنے سے باز رکھی تھی۔

ایک بہت فراخ سڑک قلعہ بیرسا کو جاتی تھی۔ قریب دو سو فٹ کی بلندی پر، جس کا رقبہ ایتھنز کے بالا حصار...... ''قلعہ اکروپسہ'' کا بمشکل نصف ہوگا۔ یہ جگہ کلی طور پر مندروں کے لیے مخصوص تھی۔ جن میں دھرتی ماتا، تانیت، صحت دینے والے اشمون اور ملکرت کے مندر سب سے نمایاں تھے۔ چونکہ وسط شہر میں جگہ کی قلت تھی۔ چنانچہ معماروں نے سات سات منزل بلند مکانات بنائے۔ جو بیرسا قلعے کے اس پاس تھے اور جن کے عقب میں روشنی حاصل کرنے کیلئے کھلی چھتیں تھیں۔ ان مکانوں میں بارش کا ذخیرہ کرنے کے لیے بے شمار حوض بنے ہوئے تھے۔ یہاں وہ معمار اور عظیم بڑھئی رہائش رکھتے تھے، جو پورے بحر روم کی منڈیوں کو سامان مہیا کرتے تھے۔ ان کی اپنی اپنی جماعتیں تھیں جو مشترکہ دسترخوانوں پر جمع ہوتیں اور شہر کے معاملات پر اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔

بیرسا قلعے کی بلندی سے جزیزہ نما کے ساتھ ایک چوڑی سڑک سات میل تک باغات میں سے ہوتی چلی گئی تھی۔ یہاں عظیم فنیقی معماروں کی قبریں تھیں۔ جن پر فنیقی سنگتراشی کا لاثانی کام کیا ہوا تھا۔ سمندر کی طرف دوسرے احاطہ بند باغات تھے۔ جو ایسے بڑے خاندانوں کی ملکیت تھے جنھوں نے تجارت سے دولت کمائی تھی۔ ان میں ''ہنو خاندان'' نمایاں تھا۔

شاہراہ کے کناروں پر جو ہجوم گزرتا تھا۔ اس میں قرطاجنہ کے باشندے کم ہی ہوتے۔ ان میں چغے پہنے سوداگر سبک روگھوڑوں پر سوار ہوتے اور ان کے جلو میں نفیری والے نفیری بجاتے ہوئے چلتے تھے۔ کئی سوڈانی لوگ گرد آلود سڑک پر چلتے نظر آتے۔ جن کے کاندھے اپنے بوجھ کے نیچے بھی سیدھے رہتے تھے۔ مسالیہ کے جنگجو اپنے اہل و عیال سمیت اس بے حد وحساب دولت کی طرف قدم فرسائی کرتے دکھائی دیتے۔ لیبیا کے کسان بھی جو اس زرخیز ساحل کے اصل باشندے تھے، اپنی گاڑیاں اس مارا ماری میں...... شہر کے ہجوم میں سے ہانک کر گھر لے جاتے۔ سانولے یونانی اپنی مخصوص چابک کو چٹخا کر اپنے پرانی طرز کے بارعب رتھوں کے لیے راستہ بناتے۔ عموماً دیہاتی گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدک جاتے۔ بھاری بھرکم ہاتھی جو سامان کے بڑے بڑے بوجھ لیے چپ چاپ راستہ طے کرتے۔ قافلوں پر قافلے، غلاموں کی سرزمین، یعنی اندرونی افریقہ سے آتے اور یہاں کی سڑکوں پر نمودار ہوتے تھے۔ حقیقتاً قرطاجنہ کی شاہراہیں، افریقی براعظم کی رگیں بن گئی تھیں۔ ان کے توسط سے افریقہ کی پیداواریں یہاں سے جہازوں کے ذریعے بحرہ روم کی دوسری بندرگاہوں کی طرف روانہ کی جاتی تھیں۔

قرطاجنہ قوموں کا اعصابی منظر بن گیا تھا اور سمندر کے کنارے اس کی صورت ایک عالمی صدر مقام کی ہوگئی تھی۔ اس کی دکانوں میں فنیقی زبان کے ساتھ ساتھ وہاں کی اصل زبان بھی سنائی دیتی تھی۔ حقیقت میں قرطاجنہ مشرقی شہر ہی تھا۔ قرطاجنہ کی ایک اور خصوصیت تھی کہ یہ شہر ہمیشہ آزاد رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتا۔تم بہت آوارہ ہوگئے ہو۔ میں تو اپنے بابا سے بہت ڈرتا ہوں۔سنتوش کے بابا اسے مارتے بھی بہت ہیں۔لیکن یہ پھر بھی نہیں ڈرتا۔وہ کہتے ہیں لڑکا ہاتھ سے نکل گیا ہے۔آوارہ ہوگیا ہے۔"

یہ عفرانس کی آواز تھی۔عفرانس۔اشمون کے پجاری، میکاڈلس کا بیٹا تھا۔وہ سچ مچ بزدل لڑکا تھا۔حالانکہ سنتوش اس کا ہم عمر تھا۔لیکن وہ ہر روز اپنے دوستوں کے ساتھ دیوتاؤں کی دیوار کے پاس بغلوں کے انڈے چوری کرنے جایا کرتا تھا۔عفرانس اپنے پجاری باپ سے بہت ڈرتا تھا۔آج بھی جب سب لڑکے مل کر دیوتاؤں کی دیوار کے پاس جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے تو حسب معمول عفرانس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔اس نے سنتوش کو بھی جانے سے منع کرنا چاہا لیکن سنتوش نے اس کی بات نہ مانی اور جب پانچ لڑکوں کا قافلہ اس خطرناک مہم پر روانہ ہونے لگا تو بزدل عفرانس نے ایک بار پھر کہا۔

"سنتوش! تم ان آوارہ لڑکوں کے ساتھ مت جاؤ۔ہم پجاریوں کے بیٹے ہیں۔ ہمیں اس طرح کے کام زیب نہیں دیتے۔تمہارے بابا سب سے بڑے مندر میں بڑے بڑے لوگوں کو پوجا کرواتے ہیں۔تمہاری اس حرکت پر قرطاجنہ کے معمار تمہارے بابا کو برا بھلا کہیں گے۔تمہیں اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔"

اب سنتوش کو عفرانس کا بھاشن اچھا نہ لگا۔اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بس بس بس!!! زمین پر قدم رکھو۔تم اپنے آپ کو بڑا مہاتما سمجھتے ہو۔ میں تم کو بھی جانتا ہوں اور تمہارے پجاری باپ کو بھی۔اب میرا منہ نہ کھلاؤ۔تم نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ۔لیکن ہم جارہے ہیں۔اور ہاں اگر تم نے میرے بابا سے شکایت کی تو یاد رکھنا وہ دھلائی کروں گا، کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

سنتوش کا لہجہ بھی آوارہ لڑکوں جیسا تھا۔ عفرانس تو دم دبا کر گھر بھاگ گیا، لیکن سنتوش اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ دیوتاؤں کی دیوار کی جانب چل دیا۔ وہ قرطاجنہ کے سب سے بڑے مندر کے مہا پجاری "کاہوبال" کا اکلوتا تھا۔ ملکرت کا مندر کارتھیوں کا سب سے بڑا مندر تھا۔ جنگ اور امن پر دو قسم کے حالات میں سب سے زیادہ چڑھاوے اسی مندر پر آتے تھے۔ مندر کی تینتیس نرتکیاں تھیں۔ یہ وہ نوجوان اور حسین لڑکیاں تھیں جنہوں نے "مل کرت" کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ مل کرت کے اس بڑے مندر کا لاڈلا چشم و چراغ مہا پجاری کاہوبال کا بیٹا سنتوش ہی تھا۔ سنتوش کی عمر مشکل سے سولہ برس تھی۔ جبکہ اس کے ساتھی آوارہ لڑکے اٹھارہ اور انیس کے لگ بھگ تھے۔ سنتوش چار آوارہ لڑکوں کے ساتھ انڈے چرانے کی مہم پر روانہ ہوا۔

دیوتاؤں کی دیوار فی الحقیقت کوئی دیوار نہ تھی۔ بلکہ کارتھیج شہر کا وہ اختتامی کنارا تھا جو سطح سمندر سے تین سو فٹ بلند ایک ستواں پہاڑی تھی۔ کارتھیج یعنی قرطاجنہ اتنا ہی اونچا شہر تھا۔ خلیج تیونس میں کسی چھجے کی طرح آگے کی طرف بڑھا ہوا شہر قرطاجنہ اسی بلند جزیرہ نما پر واقع تھا۔ پورا جزیرہ نما سمندر کے ساتھ ساتھ سات میل تک گھومتا چلا جاتا تھا۔ شہر کی گھنی آبادی تو قلعہ بیرسا کے گرداگرد تھی۔ جبکہ سمندر تک وسیع رقبے پر خوش رنگ باغات کا سلسلہ تھا۔ انہی باغات کو عبور کرکے جزیرہ نما کا اختتام آجاتا تھا۔ سنتوش اپنے دوستوں کے ہمراہ اسی مقام پر آنے والا تھا۔ حالانکہ یہ جگہ نوعمر لڑکوں کے کھیلنے کے لیے مناسب نہ تھی۔ کیونکہ تین سو فٹ کی بلندی سے اگر کسی کا پیر پھسل جاتا تو وہ سیدھا سمندر میں جا گرتا۔ دراصل پہاڑی اتنی ستواں تھی جیسے کوئی دیوار۔ سمندری بگلے اور کئی قسم کے پرندے اسی پہاڑی کے مختلف رخنوں اور دراڑوں میں اپنے گھونسلے بناتے تھے۔ سنتوش اور اس کے دوستوں کو انہی گھونسلوں تک پہنچنا تھا۔

دوپہر کے قریب سنتوش اور اس کے دوست اس ویرانے میں آپہنچے۔ دراصل باغات کا سلسلہ ختم ہوتے ہی نہایت خاموش اور ویران چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ جو دیوتاؤں کی دیوار پر جاکر ختم ہوجاتا۔ سنتوش تھا تو لڑکا۔ لیکن وہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حسین تھا۔ اگرچہ اہل قرطاجنہ مجموعی طور پر سب کے سب پر جمال چہرے تھے لیکن مل کرت کے مہا پجاری کا بیٹا اتنا حسین تھا گویا ہاتھ لگانے سے میلا ہوتا تھا۔ اس کے آوارہ دوست اسے بگلوں کے بہانے

یہاں لے آئے۔لیکن ان کا مقصد کچھ اور تھا۔سنتوش اوراس کے دوست جب ویران چٹانوں میں آ پہنچے تو سنتوش کو اپنے آوارہ دوستوں کے چہروں پر کچھ عجیب سے تاثرات دکھائی دیئے۔ وہ کچھ نہ سمجھا۔لیکن اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دراصل اس کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔آوارہ لڑکے مہاپجاری کے معصوم بیٹے کے ساتھ زیادتی کرنے کے درپے تھے۔جب سنتوش اوراس کے دوست سب کی نظروں سے اوجھل ہوگئے اور ساحل کے بلندترین کنارے پرآ پہنچے۔تو سب سے بڑے لڑکے نے سنتوش کو رکنے کے لیے کہا۔

''سنتوش!یار! بگلوں کے انڈے تو کیا ہم تمہیں بہت سے بگلے پکڑ کر دیں گے۔تم بس ہمارا تھوڑا سا کام کردو۔''

سنتوش کچھ نہ سمجھا۔

ایک لڑکے نے اچانک اپنے لباس سے خنجر نکال لیا۔اوراس نے اپنا دودھاری خنجر سنتوش کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''دیکھوسنتوش!!تم سیدھی طرح ہمارے ساتھ تعاون کرو۔اگرتم نے تعاون نہ کیا تو پھر ہوسکتا ہے ہمیں ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا پڑے۔''

اب سنتوش کو یقین ہوگیا کہ وہ ان لڑکوں کی ہوس کا نشانہ بننے سے نہیں بچ سکتا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔لیکن پھر چمکتے ہوئے خنجر کو دیکھ کراس نے یہ خیال ترک کردیا۔اگلے لمحے وہ ان آوارہ لڑکوں کی دست برد میں تھا۔

ظلم کا نشانہ بننے کے بعد سنتوش میں اٹھ کر گھر واپس جانے کی بھی سکت نہ تھی۔ کافی دیر تک نڈھال رہنے کے بعد آخر اس نے ہمت کی اور گرتے پڑتے بالاآخر مل کرت کے مندر تک آ پہنچا۔مندر کے دروازے پر ہی مل کرت کی ایک نرتکی شیتل نے مہاپجاری کے لاڈلے بیٹے سنتوش کو نہایت خستہ حالت میں دیکھ لیا۔پہلے تو وہ ٹھٹکی اور پھر پاگلوں کی طرح سنتوش کی طرف دوڑی۔سنتوش کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔اس نے سرخ آنکھوں سے ایک نظر شیتل کو دیکھا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر شرم سے سر جھکا لیا۔شیتل کچھ نہ سمجھی۔ چنانچہ وہ بڑی بے ساختگی کے ساتھ پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا سنتوش؟ تمہیں کیا ہوا؟ کسی سے جھگڑا ہوگیا؟'' لیکن سنتوش کچھ نہ بول رہا تھا۔شیتل نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اوراسے سہارا دے کر چلنے لگی۔ چلتے چلتے اچانک

سنتوش کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ رک گیا۔ اس نے مندر کی حسین ناری کی جانب ایک نظر دیکھا اور پھر نہایت عاجزی کے ساتھ شیتل سے کہنے لگا۔

"شیتل!...... کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟"

"ہاں ہاں!! کیوں نہیں۔ تم بولو۔"

"تم مجھے میرے گھر مت لے جاؤ۔ بلکہ اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ میں بابا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ ایکبار تھوڑا سا سنبھل جاؤں تو پھر گھر چلا جاؤں گا۔"

مندر کا احاطہ بہت بڑا تھا۔ مندر کی عمارت میں نرتکیوں کے لیے الگ الگ کمرے بنائے گئے تھے۔ شیتل نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنتوش کے ورم آلود چہرے کو دیکھا اور پھر کچھ سمجھے بغیر ہی سنتوش کی بات ماننے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ سنتوش کو سہارا دے کر چل رہی تھی۔ شیتل مہا پجاری کے گھر کی طرف بڑھنے کی بجائے اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں اس کا اپنا کمرہ تھا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور یہ وقت نرتکیوں کے آرام کرنے کا وقت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام نرتکیاں اپنے اپنے کمروں میں تھیں۔ شیتل، سنتوش کو سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے سنتوش کو اپنے آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ ابھی تک بھی کچھ نہ سمجھ پائی تھی۔ سنتوش کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ شیتل نے اس سے پھر پوچھنا شروع کیا:۔

"اب بتاؤ سنتوش!! تمہاری کس کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ تمہارا چہرہ پیلا کیوں پڑ گیا ہے؟ کیا تمہیں کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے۔"

اب بھلا سنتوش ایک لڑکی کو کیا جواب دیتا۔ وہ مارے شرم کے کچھ نہ بولا۔ لیکن شیتل کے اصرار کرنے پر بالآخر اس نے صرف اتنا کہا۔

"میری کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ میری طبیعت خراب ہے۔"

"تو پھر کیا میں طبیب کو بلاؤں؟ مجھے تو لگتا ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم مجھے بتا دو کہ اصل کیا ماجرا ہے، تب ہی میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ مجھے اپنا دوست سمجھو! سنتوش!"

جوانی سے بھرپور اور بدمست حسن کی مالک شیتل نے بڑے پیار کے ساتھ اپنی ملائم

ہتھیلی سنتوش کے رخسار پر پھیری۔ سنتوش کو شیتل کے لہجے میں اتنی ہمدردی اور اپنائیت محسوس ہوئی کہ اس نے چاہا کہ شیتل کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن ابھی وہ جھجک رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیتل سے پوچھا۔

''شیتل! کیا تم میرا راز رکھو گی؟ بہت شرم کی بات ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ ایسا لگتا ہے تمہیں بتاؤں تو...... تمہاری نظروں میں گر جاؤں گا۔ کیونکہ اپنی نظروں میں تو پہلے ہی گر چکا ہوں۔''

اب تو شیتل کی حیرت آسمان کو چھونے لگی۔ آخر ماجرا کیا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لیکن اس نے سولہ سالہ سنتوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار بھرے انداز میں دباتے ہوئے سنتوش کو تسلی دی۔

''تم خاطر جمع رکھو! تمہارا راز گویا میرا راز ہوگا۔ تم بے فکر ہو کر مجھے بتاؤ کہ تم پر کیا بیتی۔

تب اس نے ہمت کر کے مختصر الفاظ میں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں اسے بتایا۔

اب شیتل سمجھ چکی تھی۔ اس کے دیدے حیرت اور افسوس سے پھیل گئے۔ اس کے جسم کا دوران خون یکلخت مشتعل ہو گیا۔ حتیٰ کہ دکھ اور افسوس کی شدت نے اس کے آنکھوں میں پانی بھی بھر دیا تھا۔ وہ سنتوش کی بات سن کر فی الحقیقت بوکھلا گئی تھی۔ یہ کیسا اندھیرا تھا؟ شیتل کے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

''ملکرت اور اشمون ان کو غارت کرے! جنہوں نے تمہارا یہ حال کیا۔ میں تو کہتی ہوں تم اپنے بابا کو سب بتا دو۔ وہ فنیقیوں کے سب سے بڑے مندر کے مہا پجاری ہیں۔ وہ چاہیں تو ان لڑکوں کو موت کی سزا بھی دلوا سکتے ہیں۔''

''نہیں نہیں!! دیوتاؤں کے لیے ایسا مت کہو۔ تانیت کی قسم! اس طرح بڑی بدنامی ہوگی۔ تم جانتی ہو یہ بات مجلس عامہ تک پہنچ گئی تو میں قرطاجنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں نے دل میں ٹھان لی ہے میں خود انہیں سزا دوں گا۔ تم میرے ساتھ وعدہ کرو۔ تم کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ تم وعدہ کرو، جب تک سمندر کا پانی خشک نہیں ہو جاتا، تم میرے راز کو راز رکھو گی۔''

شینتل ایک ذہین لڑکی تھی، وہ جلد ہی سنتوش کا مدعا سمجھ گئی۔ اس نے سنتوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ کیا وہ کسی سے کچھ تذکرہ نہیں کرے گی۔ سنتوش اب مطمئن تھا۔ شینتل مندر کے طبیب سے اپنا بتا کر اس کے لئے دوا لے آئی۔

تکلیف میں کچھ افاقہ ہوا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور مندر کی ناری نوجوان شینتل اس کے پہلو میں لیٹی اس پر ہونے والے ظلم کو سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔ مہا پجاری کا ہوبال کا بیٹا، گھر نہ آنے کی خبر ملکرت کے مندر سے اشمون، اشمون کے مندر سے تائیت تک پھیل گئی۔ مہا پجاری کے ہرکارے جگہ جگہ سنتوش کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اشمون کے پجاری میکاؤس کے بیٹے عفرانس کے بتانے پر گھڑ سواروں کا ایک دستہ رات کی تاریکی میں دیوتاؤں کی دیوار تک بھی گیا، لیکن سنتوش وہاں بھی نہیں تھا۔ مہا پجاری عفرانس سے لاکھ پوچھتا رہا کہ وہ آوارہ لڑکے کون تھے۔ لیکن عفرانس انہیں شاید جانتا ہی نہیں تھا۔ صورتحال بڑی گھمبیر تھی۔ مہا پجاری صبح سے پہلے ان لڑکوں کو تلاش کرنے کی کوئی بھی کامیاب کوشش نہیں کرسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی گمشدگی پر تقریباً پاگلوں جیسا برتاؤ کر رہا تھا۔

صبح تک سنتوش کو کافی آرام آ گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ پوری طرح چل نہیں سکتا تھا۔ علی الصبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے پہلو میں شینتل کو سوئے ہوئے پایا۔ شینتل کا نرم و گداز بدن سنتوش کے بدن سے مس ہو رہا تھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ سولہ سالہ سنتوش کو نوجوان شینتل کے گرم پہلو کی لبھاس نے مسرور کر دیا۔ وہ اپنے تمام درد بھول گئے۔ اسے یاد رہا تو صرف یہ کہ اس کے پہلو میں اس کی محسنہ۔ معصوم شینتل بے فکر سو رہی تھی۔ سنتوش کے دل میں بے اختیار شینتل کے لیے پیار کا جذبہ پیدا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شینتل کے ماتھے پر پڑی لٹ ایک طرف ہٹائی اور اس کا چاند جیسا چہرہ محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا، مندر کی اس نرتکی کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت تھی۔ اس کی بھاری بھاری پلکیں بند تھیں۔ اپنائیت بھرے چہرے کی مالک شینتل سولہ سالہ سنتوش کو اتنی پیاری لگی کہ اس نے شینتل کی فراخ پیشانی پر اپنے گرم ہونٹوں کی مہر ثبت کر دی۔ شینتل کو سنتوش کا لمس محسوس ہوا تو وہ پہلے کسمسائی اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سنتوش اس پر جھکا ہوا تھا۔ شینتل نے اپنے مریض کو دیکھا تو نہ جانے کیوں مسکرا دی۔

”تم ٹھیک ہو گئے۔ ہے نا!“

سنتوش بھی مسکرا دیا۔

"ہاں! تمہاری محبت نے مجھے ٹھیک کر دیا۔ لیکن اب جی نہیں چاہتا کہ یہاں سے چلا جاؤں۔ دل کرتا ہے کہ ابھی میں تمہارے پاس ہی رہوں۔"

"نہیں! ایسا مت کہو۔ تمہارے بابا جانے اب تک تمہاری تلاش میں کیا کیا کر چکے ہوں گے۔ تمہیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ تمہارے بابا کی تفتیش بالآخر ان آوارہ لڑکوں تک جا پہنچے گی۔ اور وہ پکڑے جائیں گے۔ تب پھر تمہیں اپنے آپ سے شرم آئے گی۔ اور میں تمہارے اس پیارے چہرے پر شرم اور بے بسی نہیں دیکھ سکتی۔ اگر میں تمہیں سچ بتاؤں تو تم بھی مجھے بہت اچھے لگے۔ لیکن سنتوش تم ابھی بچے ہو۔ اور میں تم سے بڑی ہوں۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں مندر کی نرتکی ہوں۔ اگر تمہارے بابا کو پتا چلا کہ تم......"

"ٹھک ٹھک!!!"

اچانک دستک کی آواز نے سنتوش اور شیتل کو چونکا دیا۔ ان دونوں کے چہرے یک لخت فق ہو گئے۔ یہ کون آ گیا تھا۔ وہ دونوں گویا حیرت اور خوف کی شدت سے پتھر کی طرح ساکت ہو گئے۔

"شیتل!...... شیتل!...... دروازہ کھولو شیتل! میں "راکشی" ہوں۔ دروازہ کھولو۔ بہت پریشانی کی بات ہے۔ مہا پجاری نے سب نرتکیوں کو بلایا ہے، اٹھو شیتل!"

اب وہ کیا کرتی؟ شیتل اگر دروازہ کھولتی تو چرب زبان راکشی ضرور اندر گھس آتی اور شیتل کو ذرا سی بات بڑھا چڑھا کر بتانے لگتی۔ ایسی صورت میں سنتوش کا بھانڈا ابھی پھوٹ سکتا تھا۔ دونوں بری طرح سٹپٹا گئے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق شیتل کو دروازہ تو کھولنا ہی تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ایک بار سنتوش کی جانب دیکھا اور پھر کسی قدر بلند آواز میں کہا۔

"راکشی! تم جاؤ! ٹھیک ہے، میں ابھی تیار ہو کر مہا پجاری کی خدمت میں حاضر ہوتی ہوں۔"

لیکن راکشی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"شیتل! تم دروازہ تو کھولو! آج تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو۔ تم جانتی نہیں، مہا پجاری کا بیٹا سنتوش رات سے لاپتہ ہے۔ سب نرتکیوں کو مہا پجاری نے بلایا ہے۔ ہم سب

جارہی ہیں۔جلدی چلو!"

راکشی بہت باتونی تھی۔ وہ آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ شیتل یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی۔ چنانچہ وہ بستر سے اٹھی اور دیوتاؤں کو یاد کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ بستر پر لیٹے سنتوش کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ شیتل دروازہ کھولے۔اس نے شیتل کو پیچھے سے آواز دی۔

"شش!...... شیتل!......رکو!"

شیتل یکلخت رکی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سنتوش کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ سنتوش تو خاموش ہوگیا لیکن اس وقت تک دیر ہوچکی تھی۔ راکشی نے شیتل کے کمرے میں کسی مرد کی آواز سن لی تھی۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"ارے شیتل! تم کس کے ساتھ باتیں کر رہی ہو۔تمہارے کمرے میں ضرور کوئی ہے۔ میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔تمہارے ساتھ کون ہے؟"

اب سنتوش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسی اثنا میں باہر راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اور بھی دروازہ پیٹتی راکشی کے پاس آ پہنچا تھا۔ باتونی راکشی سے نہ رہا گیا۔شیتل اور سنتوش نے اس کی آواز سنی۔ وہ کسی کو بتا رہی تھی "شیتل دروازہ نہیں کھول رہی ہے۔اس کے کمرے میں کوئی ہے۔ میں کہتی ہوں کوئی مرد ہے۔تم دیکھو تو! یہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ پھر دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔ اب شیتل کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔اس نے سوچا اب اس راز کو مزید نہیں چھپایا جاسکتا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے اپنے دروازے کی کنڈی ہٹا دی۔ اگلا لمحہ شیتل اور سنتوش دونوں کے لیے دھماکہ خیز تھا۔ جونہی شیتل کے کمرے کا دروازہ کھلا، باہر کھڑی راکشی نے دروازے کے پٹ کو زور سے دھکا دیا اور پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوگی۔ اب شیتل کے بستر پر سنتوش اضطراری حالت میں اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی راکشی کی نظر سنتوش پر پڑی تو اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی۔ اور پھر راکشی کسی کے سنبھالے نہ سنبھل سکی۔ وہ جس تیزی سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی تیزی سے توبہ توبہ کرتی کمرے سے نکل گئی۔ سنتوش اور شیتل نے دیکھا کہ دروازے کے باہر ایک اور نرتکی کھڑی شیتل اور سنتوش کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

راکشی جب دیوتاؤں کی پناہ مانگتی ہوئی کمرے سے باہر جارہی تھی تو اس کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا:۔

''غضب ہوگیا۔شیتل نے مہاپجاری کے بیٹے کو اپنے کمرے میں چھپایا ہوا تھا۔ سنتوش مل گیا! سنتوش مل گیا!''

یہی جملے دہراتی، قینچی کی طرح زبان چلانے والی راکشی پورے مندر میں ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے باہر چلی گئی۔

شیتل کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔اسے اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔نوعمر سنتوش ابھی ناتجربہ کار تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ اب شیتل کے ساتھ کیا ہوگا۔لیکن پھر بھی اپنی محسنہ کا ہلدی ہوتا چہرہ دیکھ کر بستر سے نیچے اتر آیا۔

''شیتل!...... یہ کیا ہوگیا؟تم نے اسے بتایا کیوں نہیں کہ میں نے خود تمہیں مجبور کیا تھا۔ بہت برا ہوا۔میرے خیال میں مجھے بابا کے پاس چلنا چاہیے، ورنہ راکشی کی بات سن کر نہ جانے وہ کیا کیا سوچنے لگیں گے۔''

لیکن شیتل کا پورا جسم ٹھنڈا ہوچکا تھا۔اس کی زبان گنگ اور ہونٹ خاموش تھے۔وہ ندر کے قواعد اور قوانین جانتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ اب اس کا کیا حشر ہوگا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔راکشی کے بتانے پر رات بھر کا جاگا ہوا مہاپجاری ے سے پاگل ہوگیا۔جب تک اس کا بیٹا اس کے پاس نہیں پہنچتا،اس کے سپاہی شیتل کو گرفتار رنے آپہنچے۔سنتوش نے اپنی بدنامی کی پروا کیے بغیر باپ کو سب کچھ سچ سچ بتانا چاہا۔لیکن ے میں بپھرا ہوا مہاپجاری کاہوبال...... اپنے نوعمر بیٹے کی کسی بات پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ ں نے سنتوش کو دیکھا تو بجائے اسے گلے لگانے کے سنتوش کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید ر دیا۔

''کم بخت!...... تو رات پھر ایک نرتکی کے کمرے میں باپ دادا کی عزت کو نیلام تا رہا اور ہم نے تیری تلاش میں پورے قرطاجنہ کی خاک چھان ماری۔تمہیں تو میں بعد میں ھ لوں گا۔پہلے میں اس نانہجار نرتکی کو اس کے انجام تک پہنچادوں۔''

سنتوش نے لاکھ سر پٹخے، بار بار واویلا مچایا کہ اس میں شیتل کا کوئی قصور نہیں بلکہ وہ ں کی محسنہ ہے۔لیکن کاہوبال نے اس کی ایک نہ سنی۔مندر کے سپاہی مندر کی بے گناہ نرتکی

کو گرفتار کر کے زندان کے تہہ خانے میں لے گئے۔ انہوں نے بڑی بیدردی سے شیتل کو پیٹا اور لاکھ لاکھ گالیاں دیں۔

"رنڈی!...... نجس!...... چڑیل!......تو نے مہا پجاری کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ تو نے ملکرت دیوتا کے مندر کا اپمان کیا۔ کلموہی، بدذات! تجھے تو بیلوں کے ساتھ باندھ کر چیر دینا چاہیے۔"

طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد مہا پجاری کا رتھ قلعہ بیرسا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد وزیراعظم کی مجلس خصوصی کے سامنے بدکار نرتکی کا مسئلہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ وزیراعظم کی مجلس خصوصی کل سات افراد پر مشتمل تھی، جس میں سے تین تو بڑے بڑے مندروں کے پجاری تھے۔ ملکرت کے پجاری، کاہو بال اور اشمون کے پجاری، میکاؤس کے علاوہ، تیسرے بڑے مندر تائیت کا مہا پجاری "گازینڈر" بھی...... وزیراعظم کی مجلس خصوصی کا رکن تھا۔ کاہو بال جانتا تھا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ یہ کوئی جنگی قضیہ نہ تھا۔ اور نہ ہی ملک کا کوئی اقتصادی مسئلہ تھا جسے مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیا جاتا۔ یہ تو ایک مذہبی مسئلہ تھا۔ جس کا فیصلہ کرنے کی مجاز صرف قرطاجنہ کے وزیراعظم کی مجلس خصوصی تھی۔

اور پھر توقع کے مطابق ملکرت کا مہا پجاری شیتل کی سزائے موت کا پروانہ لے کر ہی لوٹا۔ سنتوش کو پتا چلا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کا باپ اس کی محسنہ کو قتل کروا دے گا۔ ابھی تو اسے شیتل سے اظہار محبت کیے چند گھنٹے ہی نہ گزرے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کی شیتل کو مار دیا جاتا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر شیتل کی جان بچانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں پہلے کی طرح ناکام رہا۔ اس کے باپ نے سارا قصہ سن کر صرف اتنا کہا تھا۔

"اس ناہنجار نرتکی کا فرض تھا کہ وہ ہمیں تمہاری بابت آگاہ کرتی۔ تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ وہ اصل میں اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں اپنے کمرے میں لے گئی اور اب تو وہ ویسے بھی مندر کی نرتکی بننے کے قابل نہیں رہی۔ اسے مرنا ہوگا۔"

سنتوش اچھی طرح جان گیا کہ اس کا باپ شیتل کو نہیں چھوڑے گا۔ شیتل کو اگلی صبح سولی پر ٹھونکا جانا تھا۔ سنتوش کے پاس وقت بہت کم تھا اور وہ ہر قیمت پر شیتل کو بچانا چاہتا تھا۔

اچانک اسے عفرانس کا خیال آیا۔ کیا وہ عفرانس سے مدد مانگے؟ لیکن اس کے دل نے کہا کہ عفرانس اس کی کچھ مدد نہیں کرسکتا۔ وہ تو سنتوش کی بات سن کر گھر سے بھی باہر نہیں نکلے گا۔ سنتوش کو جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

غروب آفتاب تک سنتوش پاگلوں کی طرح اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اسے اپنا دوست ''کیدارا'' یاد آیا۔ وہ دیو قامت لیبیائی، سپاہی، جس نے سنتوش سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے کام آئے گا۔ کیونکہ سنتوش نے اسے سالانہ عید کے موقع پر ملکرت دیوتا کے جام میں شراب پلائی تھی۔ ملکرت کے مندر میں رکھا چاندی کا وہ جام قسمت والوں کے حصے میں آتا تھا۔ سالانہ عید کے موقع پر صرف دس قرطاجنیوں کو دیوتاؤں کا جام پینے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ کسی لیبیائی کے لیے تو اس جام میں شراب پینے کا تصور بھی محال تھا۔ قرطاجنہ کے فنیقی اپنے آپ کو افریقیوں سے برتر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لیبیا، ایتھوپیا، سائرینے (موجودہ طرابلس) اور سوڈان کے باشندوں کو گھٹیا سمجھتے تھے۔ لیکن سنتوش کی پرزور سفارش پر اس کے باپ نے پہلی مرتبہ ایک لیبیائی سپاہی کو بھی دیوتا کا جام پینے والوں میں شامل کیا۔ کیدارا ایک لمبا تڑنگا افریقی تھا۔ جس کے کانوں کے چھلے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹن ٹن کی آواز نکالتے تھے۔ اور وہ بچھڑے کے پچھلے پاؤں باندھ کر اسے اپنے مضبوط کندھوں پر باآسانی اٹھا سکتا تھا۔ قرطاجنہ کے معماروں نے سالانہ عید کے موقع پر بڑے بڑے امراء کی بجائے ایک لیبیائی کو جام پینے والوں کی قطار میں دیکھا تو اپنے مہاپجاری کیخلاف طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ لیکن ''کاہوبال'' اپنے لاڈلے بیٹے کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔ نوعمر سنتوش تو لیبیائی سپاہی کو جانتا تک نہیں تھا یہ تو اتفاق تھا کہ کیدارا مندر میں پوجا کے لیے آیا اور اس کی غیر معمولی جسامت کو دیکھ کر مہاپجاری کا بیٹا اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ سنتوش نے اس میں دلچسپی لی اور اس نے جنگوں کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کیے اور اس طرح عمروں کے فرق کے باوجود دونوں میں اچھی دوستی ہو گئی۔

آج سنتوش کو اسی لحیم شحیم لیبیائی کی یاد آئی۔ وہ بجلی کی طرح اپنے کمرے سے نکلا اور سب کی نظروں سے بچتا بچاتا مندر سے باہر آ گیا۔ کیدارا تک جانے کے لیے اسے نچلے قرطاجنہ تک جانا پڑتا۔ فنیقی معماروں نے اپنے لیے بلند میدان چنا تھا۔ جبکہ باقی اقوام قرطاجنہ شہر سے کئی فٹ نیچے ایک اور میدان میں آباد تھیں۔ پہاڑی علاقے میں واقع ہونے

کی وجہ سے قرطاجنہ شہر کی بناوٹ خاصی پست و بلند اور عجیب و غریب تھی۔ اونچی نیچی سطح کا یہ شہر تین اطراف سے کافی گہرے سمندر میں گھرا ہوا تھا۔ یہ گہرائی پانی کی نہیں بلکہ سطح سمندر کی تھی۔ دیوتاؤں کی دیوار سطح سمندر میں سات میل تک گھومتی تھی۔

سنتوش کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ نچلے قرطاجنہ میں اوپر سے بھی زیادہ رش ہوتا تھا۔ دراصل معماروں کی مصنوعات کے بازار تو قلعہ بیرسا کے گرداگرد ہی تھے۔ لیکن نچلے قرطاجنہ میں غلاموں کی منڈیاں لگتیں اور ہر درجے کے پیشہ ور اپنے دھندے کرتے دکھائی دیتے تھے۔ نچلا قرطاجنہ شہر کے مشرقی پہلو میں تھا اور اس لحاظ سے یہ اصل شہر کے بعد آتا تھا۔ قرطاجنہ کے جنوبی رخ پر فصیل تھی۔ جو خشکی کی طرف اس شہر کا اکلوتا راستہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ دیکھنے والا کسی بلند سطح پر کھڑا ہے۔ کیونکہ یہاں سے نہ تو سمندر نظر آتا تھا اور نہ ہی اس جزیرہ نما کے مشرقی یا مغربی کنارے۔ فصیل سے نکلتے ہی تاحد نگاہ ناہموار زمین تھی جس میں زیتون کے باغات اور جو کے انگنت کھیت تھے۔ سنتوش غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر بعد نچلے قرطاجنہ میں پہنچ گیا۔ یہ گھنی آبادی کا علاقہ تھا۔ یہاں غریب فنیقیوں کے علاوہ لیبیائی، یونانی اور مصری تاجروں کی بستیاں تھیں۔ ہر محلہ کئی سو مکانوں پر مشتمل تھا۔ سنتوش نہایت سمجھداری کے ساتھ کیدارا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ آج اس کا ذہن صحیح کام کر رہا تھا۔ دراصل شیتل کی سزائے موت کی خبر نے اس کے حواس اچھی طرح درست کر دیئے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جب وہ کیدارا کے گھر کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے لکڑی کے دروازے پر دستک دی۔ اور کچھ ہی دیر بعد اس کا سیاہی دوست نمودار ہو گیا۔ کیدارا نے جونہی مہاپجاری کے بیٹے کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھا، اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ حیرت، خوشی اور بے چینی سے عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا۔ کبھی جھک کر، ننھے پجاری کے پیر چھوتا تو کبھی اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہو جاتا۔ کیدارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح سنتوش کے ساتھ پیش آئے۔ بالآخر سنتوش نے اسے کہا۔

"میرے طاقتور دوست! آج مجھے اپنے سب سے عزیز انسان کی جان بچانے کیلئے تمہاری طاقت کی ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"

سنتوش کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ کیدارا اس کے سامنے سراپا عجز و انکساری بن گیا۔

"تم کہو!...... میرے چھوٹے پجاری!...... میں تمہارے لیے فارس کے بادشاہ کا سر کاٹ لاؤں۔ تم مجھے بتاؤ! تمہیں کون عزیز ہے اور کس کی جان کو خطرہ ہے۔ میں تمہارے دشمن کو چھتیس ٹکڑوں میں کاٹ کر آگونہ کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

آگونہ کے کتے اور گدھ قرطاجنی زبان کے محاورے میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ شاید کسی قدیم جنگ یا قحط و وباء کے ذریعے مرنے والوں کی کوئی یادگار تھی۔ سنتوش کو آگونہ سے کچھ واقفیت نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ لیبیائی سپاہی اس کا کام کر سکتا ہے۔ تب سنتوش نے اپنے لیبیائی دوست سے کہا۔

"چلو تو پھر تمہارے گھر کے اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں تمہیں تفصیل سے ساری بات بتاؤں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

کیدارا بہت خوش ہوا۔ وہ تیزی سے سنتوش کو اپنے ساتھ لیے اندر چلا گیا۔

سنتوش کی ساری بات سن کر کیدارا گہری سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ پجاری کا بیٹا اسے کس قسم کا کام کہنے آیا ہے۔ کیا وہ قلعہ بیرسا کے زندان میں گھس کر سنتوش کی عزیز دوست شیتل کو نکال سکتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن سی بات تھی۔ سنتوش نے اپنے لیبیائی دوست کو خاموش دیکھا تو کہنے لگا۔

"میرے خیال میں تم ڈر رہے ہو۔ کیا تم میرے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے لیے کسی کی جان لے بھی سکتے ہو۔ اور اپنی جان دے بھی سکتے ہو۔"

سنتوش کی بات سن کر کیدارا چونکا۔ اسے اپنے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے تو جیسے اس کے بدن میں بجلی بھر گئی۔

"ہاں ہاں!! میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ میں تمہارے لیے یہ سب کروں گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ لڑکی کو وہاں سے نکالنے کے بعد اس کا کرنا کیا ہے۔ کیا میں اسے زندان سے نکال کر آزاد چھوڑ دوں؟"

"نہیں! سنو! میں بندرگاہ پر تمہارا انتظار کروں گا۔ اب شیتل قرطاجنہ میں نہیں رہ سکتی۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ اس لیے میں بھی اس کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ پھر جب ہم شادی کر لیں گے اور میں بڑا ہو جاؤں گا تو شیتل کو لے کر واپس قرطاجنہ آؤں گا۔ تب

میری محسنہ کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

کیدارا...... سنتوش کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

"چھوٹے پجاری! آپ گھر چھوڑ کر جا رہے؟؟ یہ تو بہت بری بات ہے۔ آپ ابھی چھوٹے اور ناتجربہ کار ہیں۔ آپ ایک لڑکی کو لے کر کہاں جائیں گے۔ آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ قرطاجنہ کے نزدیک ترین شہر کون سا ہے؟"

کیدارا کی بات ٹھیک تھی۔ لیکن آج سنتوش ٹھان چکا تھا۔ اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"میں گھر سے جا نہیں رہا ہوں، بلکہ جس ناتجربہ کاری نے کل مجھے تار تار کر دیا اسی ناتجربہ کاری کو، تجربہ کاری میں بدلنے جا رہا ہوں۔ اور اگر یہ بات ہے کہ میں نے کوئی شہر نہیں دیکھا تو پھر تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ میرے گلے کی تیرہ مالائیں ہیں جو میں سالانہ عید کے دن پہنتا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت قیمتی پتھروں سے، عمدہ طریقے سے بنائی گئی ہے۔ تم چاہو تو میں اپنی ساری مالائیں تمہیں دے سکتا ہوں۔ پھر تمہیں زندگی بھر کسی کی غلامی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

مہاپجاری کے اکلوتے بیٹے سنتوش کے ذاتی استعمال کی چیزیں بھی فی الواقع قیمتی تھیں۔ کاہوبال کو سنتوش سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو قرطاجنہ کا سب سے بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ سب مندروں کا مہاپرش، جس کا حکم مجلس قرطاجنہ کے لیے بھی آسمانی تعزیر کا درجہ رکھتا تھا۔ مہاپجاری کاہوبال خود بھی مہاپرش کے عہدے پر فائز نہیں تھا۔ مہاپرش کا کوئی مندر نہ ہوتا تھا بلکہ دیوتاؤں کی دیوار کے پاس مہاپرش کا اپنا مینار تھا۔ جسے قرطاجنہ کے لوگ برج اعظم کہہ کر پکارتے تھے۔ دیوتاؤں کی دیوار سات میل تک کارتھیج کے جزیرہ نما کے گرد گھومتی تھی۔ جس مقام پر سنتوش کو بے آبرو کیا گیا تھا وہ مقام برج اعظم سے بہت دور تھا۔ برج اعظم قرطاجنہ کی دوسری بندرگاہ کے عقب میں دور سے نظر آنے والی ایک اونچی عمارت تھی۔ جو چاروں طرف سے باغات میں گھری ہوئی تھی۔ انگور، زیتون اور اناس کے علاوہ شہتوت اور کھجور کے بے شمار درختوں کے درمیان گھری برج اعظم کی عمارت زمین سے آٹھ منزل بلند تھی۔ دور سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز برج اعظم کو دیکھتے تو انہیں اپنے سروں پر خدا کے سائے کا احساس ہوتا۔ وہ جانتے تھے کہ اس برج میں فنیقی قوم کا سب سے مہان اور

برگزیدہ انسان قیام پذیر تھا۔ مہاپرش کا نام "طالوسا" تھا۔ 80 سال سے زیادہ عمر کا یہ بزرگ صرف تیس سال کی عمر میں مہاپرش بن چکا تھا اور اس قدر جلد اس کے مہاپرش بننے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے قدیم فنیقی شہر صور کے کھنڈرات میں تیرہ سال تک قیام کیا تھا اور فنیقیوں کے آباؤاجداد کی روحوں سے ان کے آبائی ورثے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ قدیم شہر صور کے کھنڈرات میں رہنا آسان کام نہیں تھا۔ اول تو قرطاجنہ سے صور تک کا سفر اہل قرطاجنہ کے لیے خاصا مشکل تھا۔ صور ایشیا میں واقع تھا۔ جبکہ قرطاجنہ براعظم افریقہ کا شہر تھا۔ صور تک جانے کے لیے ایک قرطاجنی باشندے کو پورا بحیرۂ روم عبور کرنا پڑتا تھا۔ پھر ایشیائی خاص طور پر فارسی، پگڑی والوں کی دستبرد سے بچ کر رہنا قرطاجنیوں کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ اتنی مشکلات میں طالوسا نے تیرہ سال اپنے آباؤاجداد کے کھنڈرات میں گزارے۔ ان تیرہ سال کے علاوہ بھی وہ پوری دنیا کی سیر کر کے لوٹا تھا اور آج سے چالیس سال پہلے جب وہ لوٹا تھا تو اس نے مجلس قرطاجنہ کے سامنے اپنے علم و حکمت اور کمالات کی مثالیں پیش کی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ اہل قرطاجنہ نے کسی پجاری کو مہاپرش کے درجے پر تسلیم کیا۔ اس سے پہلے افریقی قرطاجنیوں نے اپنے آبائی شہر صور کی طرز پر تین بڑے مندر تو قائم کر لیے تھے، لیکن ان کے شہر میں کوئی مہاپرش نہیں تھا۔ وہ آج بھی اپنی ہر قربانی اور چڑھاوا مشرق کی طرف منہ کر کے اتارتے تھے۔ لیکن مہاپرش طالوسا اور برج اعظم کے بعد اب قرطاجنہ کے فنیقی لوگ بھی مذہبی معاملات میں خودکفیل ہو چکے تھے۔ ملکرت کا مہاپجاری کاہوبال اپنے اکلوتے بیٹے سنتوش کو مہاپرش طالوسا کے بعد قرطاجنہ کا مہاپرش بنانا چاہتا تھا۔

آموسا

وہ تینوں بروقت خطرے کی زد سے نکل آئے تھے۔ یہ سنتوش کی زندگی کا پہلا سمندری سفر تھا۔ شیتل تو ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں ان لوگوں نے پاپ کیا تھا۔ شیتل اور نوعمر سنتوش کو کامیابی کے ساتھ نکال لانے والا تن آور لیبیائی کیدارا تھا۔ وہ لوگ کسی قرطاجنی جہاز پر تو سفر کر نہ سکتے تھے۔ کیونکہ اس طرح ان کے پہچان لیے جانے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک یونانی تجارتی جہاز کے کپتان کو بھاری معاوضے کے لالچ میں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ انہیں قرطاجنہ سے دور لے جائے۔ قرطاجنہ کی بندرگاہوں پر یونانی تجارتی جہاز اکثر دکھائی دیتے تھے۔ حقیقت میں تو قرطاجنہ اپنے وقت کی دنیا کا ایک مشہور تجارتی شہر تھا۔

سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے جہاز کے عرشے پر بیٹھے شیتل اور سنتوش حسب معمول اپنے حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ سنتوش جو ایک مہاپجاری کا بیٹا تھا، شیتل کو مذہبی توہم کی گرہ سے نکالنا چاہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کوشش کر رہا تھا۔

"شیتل! دیوتاؤں کو کیا پتا کہ ہم کہاں ہیں؟ وہ تو قرطاجنہ کے مندروں میں رکھے ہیں اور پھر اگر تم وہاں رہ جاتیں تو میرا باپ تمہیں مروا دیتا۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو۔ تم میری محسنہ ہو۔ میں تمہیں کیسے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا؟ ایشور کے لیے تم ایسی باتیں مت کرو۔ میں مہاپجاری کا بیٹا ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔"

شیتل حسب معمول پیار بھری نظروں سے حسین سنتوش کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سنتوش اس پر دل ہار بیٹھا ہے۔ وہ خود بھی اس نوعمر لڑکے کو سچے دل سے چاہنے لگی تھی۔ لیکن عمر کے تفاوت کی وجہ سے وہ اکثر جھجکتی رہتی۔ سنتوش کا بھی

یہی حال تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی دیوانہ وار محبت شیتل کی نگاہوں سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ وہ تو پہلے دن ہی سنتوش کے پیار کو جان گئی تھی۔ ان کا رکھوالا کیدارا بھی ان کی محبت سے باخبر تھا۔ لیکن ابھی تک سنتوش یا شیتل نے ایک دوسرے کے سامنے اظہار محبت نہ کیا تھا۔
شیتل نے پیار سے سنتوش کی بات سنی اور ہلکی سی مسکان اپنے ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔
''سنتوش! میں بڑے مندر کی نرتکی ہوں میری زندگی دیوتاؤں کے لیے وقف ہے۔ اور تم مہا پجاری کے بیٹے ہو کر غلط بات کہتے ہو۔ دیویاں دیوتا صرف مندروں میں نہیں ہوتے۔ مندروں میں تو ان کے بت ہوتے ہیں۔ دیوی دیوتا تو زمین کے نیچے اور آسمانوں کے اوپر ہوتے ہیں۔ پاپ تو ہم نے کیا ہے، لیکن خیر اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب ہمیں اس کا پرائشچت کرنا چاہیے۔''
''پرائشچت! کیا پرائشچت؟ کیا تم واپس قرطاجنہ جانے کی بات کرو گی۔ قرطاجنہ کی مجلس تمہارے قتل کا حکم جاری کر دے گی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ہر قیمت پر تمہاری جان بچاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے دیوتاؤں کے ساتھ کیوں نہ لڑنا پڑے۔''
شیتل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ لڑکا اس سے اتنا پیار کرتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ خود بھی جذبات سے معمور ہو گئی۔ اسے سب کچھ بھول گیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا خمار اتر آیا۔ اچانک اس کے ہونٹوں سے عجب الفاظ برآمد ہوئے، وہ کہہ رہی تھی۔
''سنتوش! اگر تم میرے لیے دیوتاؤں سے لڑ سکتے ہو۔ تو میں تمہارے لیے ایشور سے بھی لڑ سکتی ہوں۔ دنیا کا کوئی بھی دھرم محبت سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مجھے جہاں چاہو لے جاؤ۔''
آج شیتل نے پہل کر دی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا تھا۔ وہ جذبات سے لبریز ہو گئی تھی۔ اس نے اظہار محبت کر دیا تھا۔ شیتل کو یوں نچھاور ہوتا دیکھ کر سنتوش کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہوا۔ اور اس نے حیاء سے آنکھیں جھکا لیں۔ شیتل کو اس پر اتنا پیار آیا کہ وہ لپک کر آگے بڑھی اور سنتوش کو سینے سے لگا لیا۔
آج سمندر میں انہیں پانچواں روز تھا۔ یونانیوں کا تجارتی جہاز رومی سمندر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ ایک یونانی جہاز تھا۔ اس لیے کارتھیوں اور رومیوں دونوں کی بندرگاہوں پر لنگرانداز ہو سکتا تھا۔ اہل یونان، رومیوں اور کارتھیج کے فینیقیوں کی جنگ سے باہر

تھے۔ معاً سنتوش کو اپنا دوست کیدارا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس لمبے تڑنگے افریقی کو دیکھتے ہی سنتوش اور شیتل احساس تحفظ محسوس کرتے تھے۔ کیدارا نے آکر سنتوش کو عجیب بات بتائی۔ اس نے کہا۔

''جہاز کا کپتان کہہ رہا ہے کہ ہم رومی سلطنت میں ہیں اور چونکہ ہم قرطاجنہ کی جانب سے آرہے ہیں اس لیے رومی گشتی جہاز ہماری تلاشی لیں گے۔ تم لوگ تیار رہو۔''

سنتوش کو تو جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور چیختے ہوئے بولا۔

''نہیں!...... رومی ہمیں پکڑ لیں گے۔ ہم قرطاجنی ہیں۔ وہ ہمیں پہچان لیں گے۔ تم کپتان سے کہو کہ وہ ہمیں کسی طرح اس تلاشی سے بچائے۔ اسے کہو کہ وہ رومی سمندر کی حدود سے نکل جائے۔ کیدارا ہم تو یونان جانے کے لیے اس جہاز پر سوار ہوئے تھے۔''

''یونان جانے کے لیے بھی ہمیں اسی سمندر سے گزرنا پڑے گا۔ جس پر رومیوں کا قبضہ ہے۔ جب تک ہم ان کی حدود میں رہیں گے، تلاشی کا خطرہ تو رہے گا۔ اور میرا خیال ہے کہ......'' سنتوش نے کیدارا کی بات کاٹ دی۔

''یونانی کپتان ایک تاجر ہے۔ وہ اگر ہمیں رومیوں کے ہاتھ بیچ دے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس جہاز کے کپتان کو مزید پیسوں کا لالچ دینا چاہیے۔''

نہیں سنتوش! ہم سے پہلے بھی غلطی ہوئی۔ ہم نے اسے زیادہ رقم دی ہے۔ تو وہ شک میں مبتلا ہوگیا۔ اب اگر ہم اسے مزید پیسوں کا لالچ دیتے ہیں تو اس کا شک اور بڑھ جائے گا۔ اسے یقین ہوجائے گا کہ ہمارے پاس بہت خزانہ ہے اور یوں رومی کیا ہمیں خود یونانی سوداگر اور اس کے ملاحوں سے خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ہم خاموشی سے حالات کو دیکھتے رہیں اور اگر ایشور نہ کرے یونانی سپاہی ہماری تلاشی لیں گے تو کیدارا تم ایک لیبیائی کی حیثیت سے ان سے بات کرنا۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

شیتل پہلی بار بولی تھی۔ لیکن اس نے بہت سمجھداری کی بات کی تھی۔ سنتوش، شیتل کی تائید میں سر ہلانے لگا۔ کیدارا نے بھی اطمینان کا اظہار کیا اور جانے سے پہلے کہنے لگا۔

''بہرحال تم لوگ فکرمند نہ ہونا۔ جب تک میں ہوں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔''

اتنا کہہ کر کیدارا واپس مڑا۔ اور عرشے سے اتر گیا۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ سنتوش کے

دل میں یہ خوف بیٹھ چکا تھا کہ کہیں وہ دشمن رومیوں کے ہاتھ ہی نہ لگ جائیں۔ رومیوں کے علاوہ ان پانیوں میں رومی قزاقوں کا بھی خطرہ تھا۔ سوداگر کے جہاز پر شیتل کے علاوہ کوئی اور عورت سوار نہ تھی۔ اس کے ملازم اور جہاز کے چپو چلانے والے غلاموں کو چھوڑ کر باقی یہی تین لوگ ہی تھے۔ شیتل، سنتوش اور کیدارا خود بھی ہمہ وقت چوکنے رہتے۔ سب سے زیادہ ذمہ داری کیدارا کے توانا کندھوں پر تھی۔ وہ شب و روز میں بہت ہی کم سوتا تھا۔ زیادہ تر وقت وہ اپنا مخصوص نیزہ پشت میں اڑسے شیتل اور سنتوش کا پہرہ ہی دیتا رہتا تھا۔

سفر کی ساتویں رات آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ چاند کا دور دور تک کہیں پتا نہ تھا۔ سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھاتا ہوا سوداگر کا جہاز اپنی مخصوص معتدل رفتار سے مشرقی بحرروم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شمال کی ٹھنڈی ہوائیں جہاز کے بادبانوں کو یوں پھڑپھڑا رہی تھیں گویا سوداگر کا جہاز کوئی پرندہ ہو۔ شیتل اور سنتوش اپنے چوبی کمرے میں سو رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے غلام کشتی ران بھی جہاز کے تہہ خانے میں آڑے ترچھے محوخواب تھے۔ صرف رات کے چند غلام کشتی ران معتدل رفتار سے چپو چلاتے ہوئے مشرق کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ کیدارا حسب معمول جہاز کے عرشے پر کھڑا ایک طرح سے پورے جہاز کا پہرہ دے رہا تھا۔ دفعتاً اسے دور شمال میں ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ یک لخت اس کی ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ شمال کی طرف سے آنے والا جہاز رومی بحریہ کا ہی ہو سکتا تھا۔ یکا یک کیدارا کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ تیزی سے عرشے پر موجود اس چھوٹے سے برج کی جانب لپکا جس کے سرے پر ایک بڑی سی شیشے کی چمنی میں مشعل روشن تھی۔ کیدارا نے آن واحد میں عرشے کی مشعل بجھائی اور پھر تیزی سے نیچے کی طرف لپکا۔ اب جہاز میں نصب تمام مشعلیں بجھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تہہ خانے کی طرف بڑھا تو پہرے پر موجود غلام نے اسے روک لیا اور حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا:۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ جہاز کے اس حصے میں تمہارا آنا منع ہے۔“

”ہاں! مجھے معلوم ہے لیکن میں نے غالباً رومیوں کا ایک جہاز دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ رومی نہ ہوں۔ قزاق ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جہاز کی تمام مشعلیں گل کر دی جائیں۔“

کیدارا کی بات سن کر غلام پہریدار بری طرح چونکا۔"

"کیا؟؟؟...... کیا! تم نے جہاز دیکھا؟ رومی کبھی رات کی تاریکی میں اکیلا جہاز نہ بھیجتے۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تم نے بحری لٹیروں کا ہی جہاز دیکھا ہے۔ ٹھہرو! میں مالک کو جگاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر غلام پہریدار نے کیدارا کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود سوداگر کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ یونانی سوداگر کے لیے بھی یہ خبر پریشان کن تھی۔ وہ عجلت میں اپنے کمرے سے باہر آیا اور بجلی کی رفتار سے عرشے کی طرف لپکا۔ عرشے پر پہنچ کر اس نے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی کی رہ گئیں۔ سچ مچ شمال کی جانب سے کوئی جہاز بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی معمول سے بہت تیز تھی۔ ستاروں کی ٹھنڈی چاندنی میں آنے والے جہاز کے خدوخال کچھ کچھ دکھائی دیتے تھے۔...... کپتان سوداگر نے چیخ کر حکم دیا۔

سب غلاموں کو جگاؤ۔ جہاز کو پوری رفتار سے دوڑائیں۔ ہم ان کے ساتھ نہیں لڑ سکتے۔ یہ یقیناً بحری قزاق ہیں۔"

بادبان پھڑ پھڑا رہے تھے۔ سمندر کی لہریں میٹھی ہواؤں کے نشے میں مست ہو کر خوب اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ سوداگر کے حکم پر تہہ خانے کی مشعلیں بھی بجھا دی گئیں۔ تاکہ چپوؤں کے لیے بنائے گئے رخنوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی بھی دشمن کو دکھائی نہ دے۔ لیکن اب مشعلیں بجھانے سے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ ستاروں کی روشنی...... سمندر کی سطح پر کم از کم اتنی تو تھی کہ ایک جہاز دوسرے کو دیکھ لیتا۔ جہاز پر موجود تمام لوگوں کو جگا دیا گیا۔ کیدارا نے شیتل اور سنتوش کو جگا کر کہا۔

"تم دونوں اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لو، آنے والے اگر قزاق ہوئے تو شاید ہم سب کو لڑنا پڑے۔ سنتوش مجھے امید ہے کہ تم شیتل کو بھی جرأت دلاؤ گے۔"

سنتوش کے لیے یہ بڑا عجیب وقت تھا۔ جس شیتل کے لیے وہ اپنا گھر اور ماں باپ چھوڑ آیا تھا۔ اس شیتل کو قزاقوں کے ساتھ کیسے جانے دیتا۔ اس کے دل میں خوف کی بجائے غصہ بھر گیا۔ اس نے اپنا بھالا سیدھے ہاتھ میں پکڑا۔ اور غصے سے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

"ہم مرنے کے لیے لڑیں گے اور دشمن ہماری بے خوفی دیکھ کر خود موت سے ڈر

جائے گا۔ تم فکر مت کرو کیدارا! تم عرشے کو سنبھالو۔"

کیدارا نے سنتوش کے عزم پر اطمینان کا اظہار کیا اور تیزی سے جہاز کے عرشے کی جانب ہولیا۔ سنتوش پوری طرح مستعد تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک تیز بھالا تھا اور بائیں ہاتھ میں ڈھال۔ شیتل بھی کافی دلیری کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس نے ایک تیز دھار شمشیر تھام رکھی تھی اور وہ بار بار سنتوش کے ولولے کو دیکھتی تو مسکرانے لگتی۔

تمام ملاح غلام مل کر زور لگا رہے تھے، لیکن تاجر کا سامان سے لدا جہاز کالی رات کے قزاقوں سے زیادہ تیز نہیں تھا۔ جلد ہی دونوں جہازوں کا فاصلہ کم ہونے لگا۔ سوداگر کے تنخواہ دار سپاہی اپنے ہتھیار لیے، قریب آتے ہوئے جہاز کو پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کپتان سوداگر خود ایک سالار جنگ کی طرح اپنے سپاہیوں کی کمان کر رہا تھا۔ کیدارا سب سے الگ تھا۔ اس کا لمبا نیزہ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے قمیض اتار کر خالص افریقیوں کی طرح اپنا اوپری دھڑ ننگا کر رکھا تھا۔

قزاق جہاز مزید قریب ہوا تو اس کے بھونپو سے ایک زوردار آواز بلند ہوئی۔

"رک جاؤ!...... تم جو کوئی بھی ہو رک جاؤ، ہم رومی بحریہ کے لوگ ہیں۔ تم لوگ کار تھیج سے آ رہے ہو، ہم تمہارے جہاز کی تلاشی لیں گے۔"

یونانی سالار کو بھونپو سے برآمد ہونے والی آواز پر یقین نہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ رومی جہاز سمندر میں اکیلے نہیں گھومتے، وہ جتھوں کی صورت گشت پر نکلتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ قزاق انہیں دھوکے سے گھیرنا چاہتا ہیں۔ سوداگر کے جہاز کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن قزاقوں کا جہاز تو جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ کیدارا عرشے پر ہی موجود تھا لیکن سنتوش جہاز کے نچلے حصے میں کھڑا، پریشان کن نظروں سے قزاقوں کے دیوقامت جہاز کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب تھی۔ شیتل اس کے پہلو میں تلوار اٹھائے بظاہر تن کر کھڑی تھی، لیکن فی الحقیقت اس کا دل بھی زور سے دھڑک رہا تھا۔ بھونپو سے مسلسل انہیں للکارا جا رہا تھا۔ لیکن یونانی سوداگر نے اپنے ملاحوں کو نہ رکنے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح قزاقوں کے ساتھ جنگ سے بچ جائے۔ معاً یونانی سوداگر نے دیکھا۔ قزاقوں کے جہاز سے آتشیں تیر سنسناتے ہوئے ان کے جہاز کی طرف لپکے۔ اب گویا جنگ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ جلتے ہوئے تیر دیکھتے ہی سنتوش کے چھکے چھوٹ

گئے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اتنی جلدی اتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہو جائے گا۔ یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔ اس نے ہراساں نظروں سے شیتل کی طرف دیکھا۔ شیتل بھی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو سنتوش کی آنکھوں میں جیسے عزم لوٹ آیا۔ شیتل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سنتوش نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں صاف کیں اور کہا:۔

"شیتل...... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اس لیے میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

شیتل نے آنسو بھری مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور کہا۔

"مجھے یقین ہے، لیکن سنتوش مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ کیونکہ میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

پاکستان ورچوئل لائبریری
عظیم ڈائجسٹ ڈاٹ کام

قرطاجنہ کی مجلس عامہ میں بحث زوروں پر تھی۔ آج ایوان میں مہاپرش بھی موجود تھا۔ مینو خاندان کے امراء وزراء، وزیراعظم ارفلکر پر برس رہے تھے۔ حالانکہ مندر کی نرتکی کا فرار اور پجاری کے بیٹے کا اغوا...... وزیراعظم کی غفلت کی وجہ سے نہ ہوا تھا۔ لیکن حسب معمول مینو خاندان کے سرداروں کی تنقید کا نشانہ وزیراعظم ارفلکر ہی تھا۔ بوڑھا مہاپرش طالوسا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی دوربین اہل مجلس کے چہروں پر نصب کیے ہوئے تھا۔ طالوسا کبھی کبھار ہی مجلس عامہ کی صدارت کیا کرتا تھا۔ مرتبے کے اعتبار سے تو وہ مہاپجاری اور وزیراعظم سے بھی بڑھ کر تھا۔ لیکن اپنے فرائض کے حوالے سے وہ ملک کے سیاسی اور دفاعی امور سے بالکل لاتعلق تھا۔ لیکن مہاپجاری کے اصرار پر طالوسا کو مجلس عامہ کی صدارت کرنی پڑی۔ مہاپجاری کا ہوبال چاہتا تھا کہ مجلس قرطاجنہ اس کے بیٹے اور غدار نرتکی کو گرفتار کرنے کے لیے بحری دستے روانہ کرے۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور مجلس کی اجازت کے بغیر انجام پانا ممکن نہیں تھا۔ وزیراعظم نے ہچکچاہٹ سے کام لیا تو مینو خاندان کے سردار اس پر برس پڑے۔ مینو خادان کے لوگ تو پہلے ہی مذہبی تھے۔ وہ فالوں اور پیش گوئیوں پر یقین رکھتے تھے۔ اور موجودہ معاملہ سب سے بڑے مذہبی پیشوا مہاپجاری کا ہوبال کا ذاتی معاملہ تھا۔ ساٹھ سالہ وزیراعظم تنقید کرنے والوں کے سامنے بے بس ہوگیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا ارفلکر کی پینتیس سالہ بیٹی جافیکس اپنی نشست پر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ جافیکس قرطاجنہ کی کنواری کے نام سے مشہور تھی۔ وہ عوام میں بہت مقبول اور ہردلعزیز ہونے کے باوجود اپنے لیے حکومت کا کوئی عہدہ پسند نہ کرتی تھی۔ وہ ابھی تک کنواری تو محض اس لیے تھی کہ اسے پوری دنیا میں ایسا کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا تھا جو علم و فضل اور صلاحیتوں میں اس سے بڑھ کر ہو۔ جبکہ وہ اپنے سے کم کسی مرد کو اپنا شوہر بنانے کیلئے تیار نہیں تھی۔ قرطاجنہ کی کنواری بات کرنے کے لیے کھڑی

ہوئی تو حسب معمول، ایوان پر سناٹا چھا گیا۔ جافلیکس کی آواز بلند ہوئی۔

"محترم حاضرین مجلس! اس مسئلے کا ایک آسان حل بھی ہے۔ مینو خاندان کے سردار اپنے ذاتی جہاز اور ذاتی سپاہی اس مہم پر روانہ کریں اور حکومت ان کے اخراجات برداشت کرے۔ وزیراعظم قرطاجنہ کے خزانے سے رقم ادا کریں۔ لیکن مفروروں کے تعاقب میں جانے والے سپاہی اور سردار مینو خاندان کے ہوں۔"

قرطاجنہ کی کنواری کا لہجہ دبنگ تھا۔ وزیراعظم کے حمایتی سرداروں نے داد و تحسین کی آوازوں سے ایوان کی چھت کو لرزا دیا۔ مہاپرش کی آنکھوں میں بھی چمک نظر آئی۔ لیکن مینو خاندان کے سرداروں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ تو مخالفت برائے مخالفت کر رہے تھے۔ اور اب وہ اپنی ہی بحث کی زد میں آ گئے تھے۔ ارفلکر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جافلیکس کی بات کو مزید پکا کرنے کیلئے باقاعدہ احکامات جاری کرنے شروع کر دیئے۔ کاہوبال کو تو اپنے بیٹے اور اپنی مجرمہ نرتکی کی گرفتاری سے غرض تھی۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ خاموش رہا۔ قانون کی رو سے وزیراعظم کے احکامات کی تعمیل ہر قرطاجنی کی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ مینو خاندان کے ان سرداروں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا جنہیں تلاش کی مہم پر بھیجا جانا تھا۔

مجلس عاملہ کی کارروائی آن کی آن میں پورے قرطاجنہ میں پھیل گئی۔ ہر شہری کو پتا چل گیا کہ مینو خاندان کے گشتی جہاز مہاپجاری کے بیٹے کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ آج کل قرطاجنہ کے مرد و زن کی زبان پر شیتل اور سنتوش کے فرار کا چرچہ تھا۔ مذہب پسند لوگ شیتل کی گرفتاری اور اس کی سزائے موت کے قائل تھے۔ لیکن محبت پسند لوگ اس انوکھی جوڑی کے فرار پر خوش تھے۔ کیدارا تو ایک معمولی آدمی تھا۔ لہٰذا اس کا ذکر کسی کی زبان پر نہ آیا۔ قرطاجنہ دنیا کے بہترین ہنرمندوں اور فنکاروں کا شہر تھا۔ مٹی سے بت بنانے والے ایک سرپھرے بت گر نے سنتوش اور شیتل کے مجسمے بنا کر بازار میں رکھ دیئے۔ قرطاجنہ کا بڑا بازار بیرونی ممالک سے آئے ہوئے تاجروں کی وجہ سے ہمیشہ بھرا بھرا رہتا۔ دونوں طرف بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ جن کے پچھلی طرف دستکاروں کے کارخانے تھے۔ دستکاروں، ہنرمندوں اور تاجروں نے آپس میں ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے قرطاجنہ کے بازار کی قیمت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اور وہ نظام یہ تھا کہ کپڑے کے تاجر کی دکان کا عقبی دروازہ دکان کے پیچھے

جولاہوں کے کارخانے میں کھلتا تھا۔ زیورات بنانے والے، آہنگر، بڑھئی، درزی، چمڑے کی اشیاء بنانے والے برتن بنانے والے سب کے سب اپنے تاجروں کی دکانوں کے عقب میں کام کرتے تھے۔ گویا ہر دکان کے عقب میں ایک کارخانہ تھا۔ شام، ایتھوپیا، ممفس، ایتھنز، بابل، نینوا، مقدونیا حتیٰ کہ پارسا گرد کے سوداگر بھی قرطاجنہ کے بازاوں میں عام دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھار تو ہندوستان کے اکادکا تاجر بھی اس بازار میں آنکلتے۔ ہر تاجر کی دکان نئے سامان کی آرائش اور سجاوٹ میں دوسروں سے بڑھ کر تھی۔ بازار میں سب سے زیادہ دکانیں چمڑے کے سامان بنانے والوں کی تھیں۔ قرطاجنہ کے لمبے بازار میں آخری اور پہلے سرے پر دو بڑی سرائیں تھیں۔ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے سوداگران سراؤں میں قیام کرتے اور دن بھر قرطاجنہ کے بازاروں میں گھوم پھر کر اپنے اپنے مطلب کا سامان خریدتے۔ سوداگروں کی مستقل آمدورفت کی وجہ سے قرطاجنہ کی نیم دائروی تجارتی بندرگاہ بھی دنیا بھر میں مشہور ہوگئی تھی۔ شام اور فلسطین کے زیادہ تر سوداگر یہودی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ شہر قرطاجنہ اور اس کے باشندوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ دراصل یہودیوں کو معلوم تھا کہ ان کے نبی سلیمان علیہ السلام نے فنیقی ہنرمندوں سے بہت کام لیے تھے اور یہ سچ بھی تھا۔ قرطاجنہ والوں کے آباؤاجداد مشرق کے شہر صور سے آئے تھے اور صور کے فنیقیوں نے اسرائیل کے بادشاہ سلیمان علیہ السلام کو بحری بیڑا بنا کر دیا تھا۔ آج صدیوں بعد اسرائیل کے باشندے اہل قرطاجنہ کے لیے اپنے دلوں میں احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ لیکن یہودی سوداگروں کی بعض عادتوں سے قرطاجنہ کے تاجر اور دوسرے ملکوں کے سوداگر بہت تنگ تھے۔ وہ چیزوں کے دام گرانے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اپنی چیز بیچتے وقت اس کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے۔ لیکن دوسرے کی چیز خریدتے وقت وہ اپنی باتوں سے چیز میں ہزار خامیاں نکال لیتے۔ ایک اور بات جس کی وجہ سے یہودی قرطاجنہ میں سب سے مختلف نظر آتے۔ یہ تھی کہ وہ بتوں کو نہیں پوجتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو توحید پرست کہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ حالانکہ قرطاجنہ میں ہر مذہب کے باشندے جمع ہوتے لیکن کوئی کسی کو تبلیغ نہ کرتا۔ یہ صرف یہودی تھے جو عام لوگوں کو بھی تبلیغ کرتے اور انہیں اپنے نبیوں کے قصے سنا کر ایک خدا کی عبادت کرنے اور مذہبی طور اطوار اختیار کرنے کی دعوت دیتے۔

''دانیال'' پہلی مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ قرطاجنہ آیا تھا۔ تب وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ لیکن اب تو اسے یہاں آتے کئی سال بیت گئے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد تمام کاروبار دانیال نے سنبھال لیا تھا۔ اس نے شادی نہ کی تھی۔ خاندانی ذمہ داریاں نبھانے کے بعد اس نے اپنے آپ کو یہودیت کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا تھا، اور اب تو اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔

دانیال کی زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ ایک سچا یہودی ہونے کے ناطے وہ کاروبار میں بھی اوچھے ہتھکنڈوں کا استعمال گناہ سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قرطاجنہ کے تاجر اس کے آنے سے خوشی سے پھولے نہ ساتے۔ وہ سال میں ایک بار قرطاجنہ ضرور آتا تھا۔ فلسطین سے بھیڑوں کی اون لاتا اور قرطاجنہ سے متفرق مصنوعات لے جاتا۔ اپنے اس کاروباری دورے کے دوران وہ تبلیغی کام سے کبھی غافل نہ ہوتا تھا۔ اسے اپنے نبیوں کے قصے سنانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ دانائی کی سطح پر رہ کر بات کرتا جو سیدھے سننے والے کے دل میں جا اترتی۔

دانیال قسمت کا بھی دھنی تھا۔ اسے کاروبار میں کبھی خسارہ نہ اٹھانا پڑا تھا۔ تجارت تو ایک بہانہ تھا۔ حقیقت میں تو دانیال کسی اور دنیا کا باشندہ تھا۔ اس کی زندگی کی حقیقت کو جاننے والا اس دنیا میں کوئی نہ رہا تھا۔ ماں کی وفات کے ساتھ ہی دانیال کے دل کا راز ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں چھپ چکا تھا۔ اس کی تینوں شادی شدہ بہنیں اصل حقیقت سے بے خبر تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انکے اکلوتے بھائی نے آج تک شادی کیوں نہیں کی۔ دراصل بچپن میں ہی کسی کی محبت نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا اور پھر اس کا محبوب کہیں کھو گیا۔ تب سے اب تک دانیال اپنے محبوب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ ہر سال قرطاجنہ آتا اور یہاں کئی مہینے کام کرتا۔ اس کی نگاہیں ہمہ وقت اس پری وش کو ڈھونڈتی رہتیں جو بچپن میں اسے سرخ سیبوں کے باغ میں ملی تھی۔ اسے سیبوں کے وہ درخت ابھی تک یاد تھے جن کی شاخوں پر لٹکتے ہوئے لال سیب گویا اشجار کے کانوں میں یاقوت کے آویزے جھلمل کر رہے ہوں۔ بارش سے دھلنے کے بعد دھوپ میں چمک رہے ہوتے۔ باغ کے بیچوں بیچ سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی شفاف پانی کی مست ندی، جس میں کنول کے پھول کناروں کے ساتھ رقص کرتے دور تک تیرتے چلے جاتے تھے۔ اسے وہ منظر آج تک نہیں بھولا تھا جب وہ پہلی بار

"آموسا" کے گھر آیا تھا۔ سرخ سیبوں کے باغ میں۔ کڑکڑاتے ہوئے خشک پتوں کی قدرتی چٹائی پر لیٹی ہوئی لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہی تھی۔ دانیال کے ناپختہ ذہن میں وہ لمحات ثبت ہو کر رہ گئے۔ اور زندگی بھر وہ پہلی ملاقات کے اس انوکھے منظر کو بھلا نہیں پایا تھا۔ یہ دل کی بات تھی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسے یاد تھا، جب وہ اس سوئی ہوئی گڑیا کی طرف بڑھ رہا تھا تو پتوں کی کڑکڑاہٹ نے اس کے آرام میں خلل ڈال دیا۔ وہ بیدار ہو گئی تھی اور دانیال کو اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا تھا۔ وہ اس معصوم اپسرا سے معافی مانگنا چاہتا تھا کہ وہ مسکرا دی۔ سرخ سیبوں کے باغ میں جیسے قوس قزح اتر آئی۔ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ گیارہ سال رہی ہوگی۔ دانیال نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ کتاب مقدس کے اوراق سے بھی زیادہ پاک اور صاف تھا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے دانیال سے پوچھا:۔

"تم یہودی سردار شمعون کے بیٹے ہو نا؟ میرے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ آج تم آنے والے ہو۔ میں یہاں تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ تم مجھے معاف کر دینا۔" دانیال چکرا گیا۔ وہ تو خود اس پری وش کی نیند خراب کرنے پر اپنے آپ کو کوس رہا تھا جبکہ یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ نکلی۔ چاند کے چہرے والی پری الٹا اس سے معافی مانگ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ کوئی حسین خواب۔

دانیال کا باپ باغ کے مالک سے ملنے آیا تھا۔ وہ دونوں دیرینہ دوست تھے۔ باغ کے مالک نے جب اپنی بیٹی کو بتایا کہ آج ان کے یہاں کچھ یہودی مہمان آنے والے ہیں، اور ان کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بھی ہے، تو "آموسا" خوشی سے مچل اٹھی۔ وہ وقت سے پہلے ہی ندی کے کنارے چلی آئی۔ جہاں سے ان کے مہمان گزرنے والے تھے۔ آموسا کے ہم عمر دوست نہیں تھے، وہ تنہا تھی۔ اس پر مستزاد یہودیوں کے بارے میں اس نے اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ یہودی لڑکے کے ذکر پر ہی اس کا تجسس آسمان کو چھونے لگا۔ وہ وقت سے پہلے آ تو گئی تھی لیکن اس کی آنکھ لگ گئی۔ مہمان آئے اور باغ میں موجود خوبصورت مکان کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن دانیال کی نظر سوئی ہوئی گڑیا پر پڑ چکی تھی۔ پہلی نظر میں اسے یقین ہی نہ آیا تھا۔ اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھا۔ لیکن جب وہ اپنے میزبان کے گھر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ سوئی ہوئی لڑکی اس کا واہمہ نہیں تھی۔ اس کے باپ کے دوست اور ان کے میزبان "ہمسدرو" نے اسے

بتایا:۔

''ارے دانیال بیٹا! آموسا تمہیں لینے گئی ہے۔ کیا وہ تمہیں نہیں ملی؟ وہ میری بیٹی ہے۔'' دانیال چونک گیا اور اس نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

''ہاں! وہاں ندی کے کنارے ایک گڑیا سو رہی ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''سو رہی ہے؟...... ہا ہا ہا! تو جاؤنا اسے اٹھا کر لاؤ۔ وہ تمہاری میزبان ہے۔''

دانیال تیزی سے باہر کی طرف لپکا اور اسے دیکھ کر ہسدرو اور شمعون دونوں ہنس دیئے۔ وہ دونوں بہت پرانے دوست تھے۔ شمعون جب بھی قرطاجنہ آتا تو ہسدرو کے ہاں ہی قیام کرتا تھا۔ اس بار پہلی مرتبہ...... وہ اپنے ساتھ دانیال کو لایا تھا۔ دانیال کو یوں لگا جیسے وہ جنت میں آ گیا ہو۔

اور پھر آموسا کے ساتھ نے قرطاجنہ میں اس کے قیام کو فردوس گم گشتہ کی بھولی بسری یادیں بنا دیا۔ سرخ سیبوں کے باغ میں صبح و شام آموسا کے ساتھ کھیلتے، ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے اور پیار کرتے وقت کے گزرنے کا اسے پتا ہی نہ چلا اور پورے دو ماہ گزر گئے اور جب واپسی کا وقت آیا تو دانیال کو ایسا لگا جیسے اس کے باپ نے لوٹ جانے کی نہیں بلکہ مر جانے کی خبر سنائی ہو۔ وہ ساری رات روتا رہا تھا۔

ہسدرو اور اس کی بیٹی انہیں بندرگاہ تک الوداع کہنے آئے تھے۔ الوداعی منظر دانیال کی آنکھوں کے سامنے آج بھی موجود تھا۔ وہ جب چوبی تختوں پر چل کر اپنے جہاز میں سوار ہو رہے تھے تو دانیال کے قدم منوں بھاری ہو گئے تھے۔ آموسا تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دانیال جہاز کے آہنی جنگلے کے ساتھ لگ کر اس وقت تک کھڑا رہا جب تک آموسا اور اس کا باپ پلٹ نہ گئے۔ وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

وہ سلگتی آنکھ میں کچھ ان کہے جذبے لیے ہوئے
بھیڑ میں گم ہونے تک میری طرف تکتا رہا

نہ جانے کیوں آج بائیس سال بعد بھی وہ انہی سلگتی آنکھوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ جب بھی قرطاجنہ آتا سیبوں کے اس باغ میں ضرور جاتا۔ اپنا تمام فارغ وقت ندی کنارے گزارتا۔ لیکن اب وہاں اس کی آموسا کا گھر نہیں تھا۔ اب وہاں باغ کا نیا مالک رہتا تھا۔

صرف جدائی کا درد ہوتا تو شاید دانیال اپنے بچپن کی محبت کو بھول بھی جاتا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور بھی تھا۔

اگلے سال وہ پھر اپنے باپ کے ساتھ قرطاجنہ آیا تھا اور یہاں آ کر اسے بتایا گیا کہ ہسدرو اور اس کی بیٹی آخری بار فلسطین کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ دانیال اور اس کا باپ شمعون یہ خبر سن کر حیران رہ گئے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ آموسا اس سے ملنے کے لیے فلسطین آ رہی تھی۔ پھر وہ لوگ کہاں گئے؟ وہ دونوں باپ بیٹی فلسطین کیوں نہ پہنچے تھے؟ ان کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا تھا؟ دانیال کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ اس کا باپ بھی کم پریشان نہیں تھا۔ انہیں قرطاجنہ میں اپنا کاروبار بھول گیا اور وہ دونوں باپ بیٹا فوری طور پر واپس بھاگے۔ انہوں نے ہر بندرگاہ پر پوچھ گچھ کی اور فلسطین پہنچتے تک ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن افسوس انہیں آموسا اور ہسدرو کا کوئی پتہ نہ چلا۔

تب سے دانیال کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا کھوئے ہوئے محبوب کی تلاش، جدائی اور...... بے بسی کے دکھ نے اسے ''یہواہ'' کی طرف مائل کیا اور یوں وہ لڑکپن سے ہی ایک مذہب پسند انسان بن گیا۔ لیکن اس کا مذہب باقی یہودیوں سے الگ تھا۔ وہ اپنے خدا کے ساتھ بہت باتیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ خاص خاص اوقات میں یہواہ کے ذکر کی تسبیح بھی کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ مذہبی پیشواؤں اور مذہبی رسومات سے دور بھاگتا تھا۔ اس کا ذہن سب سے الگ تھا۔ فی الحقیقت وہ یہودی نہیں بلکہ ایک عاشق تھا۔ دانیال نے آموسا کو کہاں کہاں نہ ڈھونڈا؟ جوانی کے بائیس سال بیت گئے۔ اب وہ چالیس کے قریب تھا۔ لیکن آموسا کے لیے اس کی تلاش ختم نہ ہوئی تھی۔

یہ تھا دانیال کے دل کا وہ راز جس سے اب کوئی واقف نہیں تھا۔

دانیال جس سرائے میں قیام کیا کرتا تھا اس کے مالک کے ساتھ اس کی پرانی دوستی تھی۔ دانیال کو باقی یہودیوں کی طرح لوگوں کے ساتھ مذہبی باتوں پر سر کھپانے کی عادت نہیں تھی۔ اس سے جب کوئی مذہبی سوال کیا جاتا تو وہ اپنی فراست سے اس کا نہایت تسلی بخش جواب دیتا۔ سننے والا فوراً اس کی بات کا قائل ہو جاتا۔ اور بحث شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ سرائے کا مالک ''سموجن'' دانیال کی فراست کا قائل تھا۔ دانیال اپنے دن بھر کے

کاموں سے فارغ ہوتا تو وہ دونوں اکٹھا بیٹھ کر شطرنج کھیلتے۔ قرطاجنی شطرنج کے مہروں میں بشپ کی جگہ پجاری اور بادشاہ کی جگہ وزیراعظم ہوتا تھا۔ ملکہ وزیراعظم کے پہلو میں تن کر کھڑی ہوتی اور پوری بساط کے چونسٹھ خانوں پر حکمرانی کرتی۔ سموجن شطرنج کے کھیل میں دانیال سے کبھی نہ جیت سکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ شطرنج کا رسیا تھا۔ گھوڑے کی چال اسے اتنی پسند تھی کہ آخر تک اپنے گھوڑے نہ مرنے دیتا۔ اس کی جوان بیٹی "سندینا" دل ہی دل میں دانیال کو پسند کرتی تھی۔ لیکن دانیال نے کبھی اسے آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دانیال کے لیے مونگ پھلی کا حلوہ اور زیتون کے تیل میں تلے کباب بنا کر بھیجتی تو ہر بار طشتری میں گلاب کا ایک پھول بھی رکھ دیتی۔ لیکن جب بھی طشتری واپس جاتی سندینا کو گلاب کا پھول ویسے کا ویسا پڑا ملتا۔ نہ جانے کتنے سالوں سے وہ یہ پرارتھنا کر رہی تھی کہ طشتری لوٹے لیکن پھول نہ لوٹے۔

لیکن دانیال تو عشق میں مست تھا۔ سندینا کے باپ، سرائے کے مالک سموکو اپنی بیٹی کے دل کا حال معلوم تھا۔ وہ دانیال سے بات بھی کر چکا تھا۔ لیکن دانیال نے ایک ہی جملہ کہا تھا۔

"میری منزل کوئی اور ہے۔"

ایک صبح دانیال نے ایک انوکھی خبر سنی۔ قرطاجنہ کے بڑے مندر ملکرت کی ایک نرتکی مہا پجاری کے نوعمر بیٹے کو بھگا کر لے گئی تھی اس روز پورے قرطاجنہ میں سنسنی کا ماحول تھا۔ پولیس کے ہرکارے جگہ جگہ تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ بازاروں میں بھی ہر شخص کی زبان پر یہی قصہ تھا۔ دانیال بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو دل ہی دل میں مہا پجاری کے بیٹے اور مندر کی نرتکی کے حق میں دعائیں کر رہے تھے۔ اسی رات شطرنج کی بساط پر بھی یہی ذکر چھڑ گیا۔ سموجن کا خوبصورت مکان بھی سرائے کے اندر ہی تھا۔ دانیال اور سموجن دالان میں بیٹھ کر شطرنج کھیلتے تو سندینا بھی اکثر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ آج کے واقعہ نے سندینا کو جذباتی کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی:۔

"ملکرت اور اشمون کریں کہ خیر ہو۔ وہ دونوں دیوانے سلامت رہیں۔ ان پر کبھی کوئی مصیبت نہ آئے۔"

سچ تو یہ تھا کہ سندینا کی آنکھوں میں پانی کی ننھی ننھی بوندیں بھی چمک رہی تھیں۔

سموجن نے پجاری کی زد سے اپنا گھوڑا بچاتے ہوئے بات کی:۔

''ہاں! اشمون کرے خیر ہو۔لیکن میرا خیال الگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مندر کی نرتکی پجاری کے بیٹے کو بھگا کر نہیں لے گئی بلکہ پجاری کا بیٹا مندر کی نرتکی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ وہ کم عمر ہے تو کیا ہوا۔ وہ یقیناً عام بچوں سے مختلف ہوگا۔ وہ مہا پجاری کا بیٹا ہے۔ شاید وہ لوگ پکڑے جائیں۔''

باپ کی بات سن کر سندینا تڑپ اٹھی۔

''ایسا تو مت کہہ بابا! ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ وہ نہ پکڑے جائیں۔ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ پیار جو دنیا کا سب سے حسین تحفہ ہے۔''

دانیال دونوں باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ ساتھ کے ساتھ وہ شطرنج کے مہروں کو بھی گھور رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

''قرطاجنہ محبت کی دھرتی ہے۔ اس شہر کی مٹی میں محبت کا رس ملا ہوا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس شہر کو ایک عورت نے آباد کیا تھا۔ اور اسی عورت کی ممتا بھی پہلے روز سے اس شہر کی فضاؤں میں شامل ہوگئی۔''

سندینا نے نہایت توجہ سے دانیال کی بات سنی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ چلو دانیال کی زبان پر محبت کا لفظ تو آیا۔ وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

''آپ عورت کی محبت سے واقف ہیں دانیال؟ مجھے تو لگتا ہے تائیت کی مالا ہل گئی ہوگی۔''

سندینا نے خوبصورت طنز کیا تھا۔ قرطاجنہ کے لوگ جب کسی کے منہ سے ایسی بات سنتے جس کی انہیں امید نہ ہوتی تو یہی محاورہ بولتے تھے۔ سندینا نے جب کہا کہ دانیال کی بات سن کر تائیت کے مندر میں رکھے تائیت کے بت کے گلے میں موجود مالا ہل گئی ہوگی، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ دانیال کے منہ سے محبت کا ذکر اسے انوکھا لگا۔ سندینا کے طنز پر اس کا باپ کھلکھلا کر ہنس دیا اور دانیال بھی مسکرا دیا۔

''ہاں میں عورت کی محبت سے وقف ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے سندینا کہ میں پتھر دل

ہوں؟ نہیں۔ داؤد و سلیمان کے خدا کی قسم! میری نظر میں عورت یہواہ کی سب سے حسین صفت ہے۔اگر دیوی دیوتا کوئی حقیقت رکھتے ہیں تو عورت دھرتی کی سب سے معتبر دیوی ہے۔تم میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ مجھے قرطاجنہ اسی لیے پسند ہے کہ یہاں مجھے محبت کی دولت میسر آئی ہے۔ یہاں کے لوگ دیوانے ہیں۔محبت میں دیوانے۔"

سندینا کو ایسا لگا جیسے اس کی بات سے دانیال کا دل دکھا ہو۔ وہ فکرمند ہو کر اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔سموجن خاموش بیٹھا چال سوچ رہا تھا۔سندینا نے فوراً معذرت کی۔

"دانیال! میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔آپ عورت کو اتنا پوتر معتبر سمجھتے ہیں تو آپ نے آج تک شادی کیوں نہیں کی۔ کیا زمین کی سب سے حسین دیوی آپ کو نہیں چاہیے۔"

سموجن اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے حاجت ہے۔میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔"

دانیال خوب سمجھ رہا تھا کہ سموجن اچانک اٹھ کر کیوں چلا گیا۔وہ اپنی بیٹی اور دانیال کو باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔سموجن کے اٹھ جانے سے شطرنج کا کھیل رک گیا تھا۔ دانیال کے کہے بغیر ہی سندینا اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے باپ کی نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔اور کھیل جہاں سے رکا تھا، خود بخود وہیں سے شروع ہو گیا۔دانیال نے ابھی تک سندینا کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔چنانچہ سندینا نے کہا۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا؟"

دانیال کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ وہ متفکر تھا کہ اب سندینا کو کیا جواب دے، تاہم اس نے کہا۔

"دیکھو سندینا! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ میں نے آج تک شادی اس لیے کی کہ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ میرا دل کہتا ہے وہ مجھے ضرور ملے گی۔ وہ چاند کے چہرے والی گڑیا۔ جسے میں گزشتہ بائیس سال میں بھی بھول نہیں پایا۔ نہ جانے کیوں میں نے تمہیں ایک ہی سوال کے جواب میں اپنا غم بتا دیا۔شاید اس لیے کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ ہاں شاید اس لیے۔"

سندینا دم بخود رہ گئی۔ وہ کئی سال سے دانیال کو جانتی تھی۔لیکن آج تک اسے

دانیال کے اس راز کا پتا نہیں تھا اور پھر بائیس سال کا ذکر سن کر تو وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

"بائیس سال!...... دانیال تم دیوانے ہو۔ بائیس سال پہلے تو یقیناً تم بچے رہے ہو گے۔ بچپن میں نہ جانے کیا کیا ہو جاتا ہے۔ کیا تم مجھے چاند کے چہرے والی اس گڑیا کی کہانی سنانا پسند کرو گے جس کا گھر تمہارے دل میں ہے؟"

سندینا کو کچھ امید بندھی تھی۔ اس کا محبوب پرانی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ جو لڑکی معاشرے کی بھیڑ میں گم ہو گئی تھی وہ اسے کہاں ملنے والی تھی؟ یہ دانیال کا بھولپن تھا۔ وہ دل ہی دل میں دانیال کے بھولپن پر مسکرا دی۔ دانیال نے کہا۔

"ہاں! میں اس وقت بچہ تھا۔ اس سال میں پہلی مرتبہ قرطاجنہ آیا تھا۔ وہ سرخ سیبوں کے باغ میں خشک پتوں پر سوئی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ کتاب مقدس کے اوراق سے بھی زیادہ پاک صاف تھا۔ اس کا سر اس کی کہنی پر تھا اور وہ دائیں پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی لمبی سیاہ پلکیں کسی چلمن کی طرح اس کی چمکتی ہوئی ذہین آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھیں۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے سوچا میں جنت میں ہوں اور میرے سامنے کوئی حور آرام کر رہی ہے۔"

وہ بولتا رہا۔ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہا۔ اپنی کہانی سناتا رہا۔ سندینا اب سچ مچ اس کی باتوں میں کھوسی گئی تھی۔ اسے بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں بیٹھی ہے۔ وہ تو بس ایک ٹک دانیال کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دانیال کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ بول رہا تھا۔

"دو مہینے کیسے گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ دن کھیل کود میں گزر جاتا تھا اور رات ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے سپنے دیکھتے ہوئے کٹ جاتی تھی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے پودے لگائے۔ اب وہ سب تناور درخت بن چکے ہیں۔ اب تو مجھ سے بھی بڑے لگتے ہیں۔ مجھے ایک بات بھی نہیں بھولی۔ ایک دن درخت پہ بیٹھے کسی کوے نے بیٹ کر دی۔ بیٹھ "چھپ" کی آواز سے میرے سر پر گری۔ آموسا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کے چھن چھن کھنکتے...... قہقہے اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ سارا سارا دن ہم جنگلی خرگوش کے بچے پکڑنے کے لیے خرگوشوں کی غار کے سامنے بیٹھے رہتے۔ میں اسے ننھے خرگوش پکڑ کر

دیتا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ اسے اپنی گود میں بٹھا کر سہلاتی تو خرگوش کا بچہ یوں شانت ہوجاتا جیسے اس نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہو۔ وہ کئی کئی گھنٹے آنکھوں بند کیے آموسا کی آغوش میں سر چھپائے لذت وصال کا لطف لیتا رہتا اور آموسا کو بھی ننھے خرگوش کی ملائم بال دار جلد سہلاتے ہوئے بہت مزا آتا تھا۔ وہ جنگلی پھولوں سے میرے لیے ہار پروتی اور اپنے ہاتھوں سے میرے گلے میں پہنا کر زور زور سے ہنستی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہوجاتا۔ ندی کے کنارے...... ہم نے چھتیس دوپہریں بتائیں۔ مجھے ایک ایک دوپہر کا احوال پوری طرح یاد ہے۔ تب تک تو خرگوشوں کے بچے ہم سے مانوس ہوچکے تھے۔ ہم ندی کے پانی میں آہستہ آہستہ تیرتے کنول کے پھول اکٹھے کرتے اور اتنی احتیاط برتتے کہ ان کی کوئی پتی تک نہ زخمی ہوتی۔ ہم وہ پھول لاکر آموسا کے گھر کے تالاب میں ڈال دیتے تھے۔ آخر تالاب میں اتنے پھول جمع ہوگئے کہ پانی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک روز ہسدرو چاچا کی نظر تالاب پر پڑی تو وہ ہکابکا رہ گئے۔ اتنے پھول؟ تالاب گویا اشمون دیوتا کا تخت دکھائی دیتا تھا، اور ہاں سیب توڑنے کا شوق تو پہلے ہفتے میں پورا ہوگیا تھا۔ ہمارے آس پاس اتنے سرخ سیب تھے کہ ہمارا جی بھر گیا تھا۔ البتہ درختوں پر چڑھنے کا شوق کبھی نہ ختم ہوا۔ ایک بار میں آموسا سے پہلے ہی درخت پر سے اتر آیا۔ وہ ابھی درخت کی شاخوں پر ہی کسی سرخ سیب کی طرح کھکھلا رہی تھی کہ بندروں کا ایک جھنڈ قلقاریاں مارتا ہوا اس طرف آنکلا۔ بندر ایک شاخ سے دوسری شاخ تک جھول رہے تھے۔ آموسا بری طرح ڈر گئی۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔ آموسا جتنی زور سے چیختی، سارے بندر اس کی نقل اتارتے ہوئے اتنی ہی زور سے چیختے۔ میں حواس باختہ ہوگیا اور درخت پر چڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر بیٹھا۔ لیکن میں کم سے کم وقت میں آموسا کی مدد کے لیے پہنچا تھا۔ بندروں نے مجھے اوپر آتا دیکھا تو بھاگ گئے۔ میں اس ٹہنی پر پہنچا جہاں آموسا بیٹھی تھی۔ وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور میرے سینے میں سر چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا اور اسے حوصلہ دے رہا تھا۔

تب میں پندرہ سال کا تھا۔ میری مسیں ابھی نہیں بھیگی تھیں۔ بس بھیگنے ہی والی تھیں۔ نہ جانے کیوں آموسا کے دل میں میرے لیے اور میرے دل میں آموسا کے لیے

ایک انوکھا جذبہ پیدا ہوگیا۔ وہ انس کی کون سی قسم تھی؟ میں نہیں جانتا تھا۔ ہسدرو چاچا ہمیشہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اب سوچتا ہوں وہ کیا تھا؟ ان کا رویہ۔ کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ وہ آموسا کو خود لے کر کہیں چلے گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کرنے لگی تھی۔ پھر سوچتا ہوں نہیں وہ تو میرے بابا کے دوست تھے اور ان کی افریقی خادمہ نے بھی تو بعد میں یہی بتایا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے فلسطین گئے ہیں۔ اس موٹی افریقی عورت کو میں بعد میں ملتا رہا۔ لیکن وہ زیادہ سال جی نہ سکی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے چلے آنے کے بعد پیچھے آموسا کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ نہ کچھ کھاتی نہ پیتی، بس زیادہ تر لیٹی رہتی۔ اس کے باپ ہسدرو نے اسے لاکھ سمجھایا لیکن وہ ٹھیک نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ہسدرو مجبور ہوگیا کہ اسے تم لوگوں سے ملانے کے لیے لے چلے۔ افریقی خادمہ نے مجھے بتایا تھا کہ فلسطین جانے کے ذکر پر وہ یکا یک بہتر ہونے لگی تھی۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور کئی روز تک ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ لیکن اس کی زبان پر ہر لمحہ فلسطین جانے کا تذکرہ ہی رہتا۔ بالآخر دونوں باپ بیٹی فلسطین کے لیے روانہ ہوگئے۔

تم مجھے دیوانہ سمجھتی ہو۔ ہاں! میں دیوانہ ہوں۔ عاشق دیوانے ہی ہوتے ہیں۔ اب میں نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کی بھی شادی کردی ہے اور میری ماں بھی فوت ہوچکی ہے۔ لہٰذا اس مرتبہ میں واپس فلسطین نہیں جاؤں گا۔ میں اپنا الگ جہاز خریدوں گا، عملہ بھرتی کروں گا اور ایک لمبی تلاش پر نکلوں گا۔ جب تک آموسا مجھے مل نہیں جاتی، نہ میرا کوئی گھر ہے، نہ وطن، نہ نام نہ قبیلہ، نہ مذہب اور نہ زندگی۔ سندینا! تم ایک سائے کو پکڑنے کی کوشش کررہی ہو۔"

سندینا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دانیال کے جذبے نے اسے بیدار کردیا تھا۔ اسے عشق کی قدر و قیمت کا پتا چلا اور وہ دانیال کو رشک اور تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے زیادہ پیار کرنے والے انسان ہو۔ مجھے معاف کرنا۔ دانیال! تم میرے لیے ایک دیوتا ہو، میں تمہاری داسی۔ یہ سچ ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ لیکن تمہارا ساتھ پانے کے لیے مجھے عشق کرنا ہوگا۔ جتنی شدت سے تم

آموسا کو چاہتے ہو اگر اس سے زیادہ شدت کے ساتھ میں تمہیں چاہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ پا نہ سکوں۔ آج میں سمجھ گئی۔ یوں سمجھو کہ مجھے راستہ مل گیا۔''

دانیال ورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ گنگا تو الٹی بہنے لگی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آموسا کے ساتھ اس کے پیار کا قصہ سن کر سندینا اس کا خیال ترک کر دے گی۔ لیکن وہ تو خود دیوانگی اختیار کرنا چاہتی تھی۔ دانیال بری طرح سٹپٹا گیا۔ اسی اثنا میں سموجن لوٹ آیا۔

''تم لوگوں کی بحث کہاں تک پہنچی؟...... ارے یہ کیا! بساط تو ویسے کی ویسے دھری ہے۔ ایک مہرہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔''

سندینا نے ہنس کر باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''یہ مہرے آسانی سے ہلنے والے نہیں۔''

سموجن نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا اور شطرنج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

کوناڈس داشتائیں

ارمنیدس کا لشکر بری طرح گھر چکا تھا۔ درہ داریون کی تنگ گھاٹیوں میں ان پر یکا یک آسمان سے پتھروں کی بارش برس پڑی۔ رومی سپہ سالار کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس قدر شدید سردی اور بے پناہ برفباری میں کارتھی ان کا راستہ روکے بیٹھے ہوں گے۔ وہ برتھاس کے طریقہ جنگ کو ازبر کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ اور پچھلے کئی ماہ سے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ شاید کارتھی سالار برتھاس بھی تھک چکا ہے۔ لیکن یہاں آ کر اسے پتا چلا کہ قرطاجنی سالار بے خبر نہیں تھا اور نہ ہی وہ چوہے بلی کے اس کھیل سے تھک چکا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ رومی سپہ سالار کو تمام راستے میں کہیں سے بھی برتھاس کے گزرنے کی خبر نہ ملی۔ اپنے تئیں وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ برتھاس کو جنوب میں کہیں دور چھوڑ آیا ہے۔ رومی لشکر قرطاجنیوں سے لگ بھگ تین گنا بڑا تھا۔ لیکن پھر بھی برتھاس نے جگہ جگہ رومیوں کے دانت کھٹے کیے اور اس بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔ نصف لاکھ سے اوپر رومی سپاہی غضب کی سردی اور برفباری میں تیزی کے ساتھ لقمۂ اجل بننے لگے۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی لاش گر رہی تھی۔ فر کے اونی گرم لباسوں میں ملبوس تربیت یافتہ رومی سپاہی سب کچھ بھلا کر صرف جان بچانے کی کوششوں میں لگ گئے۔ جس کا جس طرف منہ آتا وہ اسی طرف بھاگ کھڑا ہوتا۔ کسی سالار کی کوئی پکار سنائی نہ دے رہی تھی۔ خود ارمنیدس زخمی تھا۔ ایک بھاری پتھر نے اس کے ٹخنے کی ہڈی کو چور کر دیا تھا وہ گھسٹتا ہوا ایک قدرتی سائبان کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ لیکن درد سے زیادہ اس کے چہرے پر مایوسی، دکھ، غم اور بے بسی کے بادل تھے۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ وہ اپنی فوج کو سنگین برفباری میں بھی درہ داریون تک صحیح سلامت لے آیا تھا۔ اور اب تو صرف پندرہ دن کی مسافت پر

سمندر تھا۔ جہاں رومی بیڑا تھکی ہوئی رومی سپاہ کو واپس لے جانے کے لیے منتظر کھڑا تھا۔ دراصل روم کی مجلس شوریٰ نے اپنے ملک میں رزم گاہیں ختم کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ مسلسل منعقد ہونے والے اجلاسوں میں بالآخر یہ طے پایا تھا کہ پورے روم میں کہیں بھی جنگ باقی نہ رہنے دی جائے۔ قرطاجنیوں کی دراندازی کا جواب دراندازی سے دیا جائے۔ یہ فیصلہ نوجوان ''اورلیس'' کے اصرار پر کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ارمنیدس کو واپس بلا لیا گیا۔ لیکن محاذوں کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ وہ سیدھے راستے سے واپس نہ لوٹ سکتا تھا۔ دراصل برتھاس کی چالبازی نے اسے گمراہ کیا تھا اور وہ برتھاس کے داؤ میں آ گیا۔ برتھاس نے اپنے جاسوسی نظام کے ذریعے ارمنیدس کو یہ چکمہ دیا کہ وہ روم واپسی کے تمام راستوں پر موجود ہے۔ لیکن حقیقت میں وہاں اس کی چند چوکیاں تھیں اور سینکڑوں خیموں پر مشتمل خالی پڑاؤ۔ لے دے کہ ارمنیدس کے پاس سمندر کا راستہ تھا۔ لیکن سمندر میں موآبریس سے مڈبھیڑ کا خطرہ بھی موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ارمنیدس نے اپنی فوج کو جہازوں پر سوار کرنے کے لیے خفیہ راستہ اختیار کیا۔ برتھاس کو اس کے منصوبہ کی خبر مل گئی اور اس نے وقت سے بہت پہلے وادیٔ داریون میں آ کر ڈیرے جما دیئے۔ اس نے چھاتہ برداروں کی طرح سفر کیا اور بستیوں سے نظر بچاتے ہوئے وادی داریون تک پہنچا۔ یہاں پہنچتے ہی برتھاس نے آس پاس کی ساری بستیوں کو لوٹ لیا تھا۔ مرد قیدی اس کے لیے برفانی ریچھ اور بارہ سنگوں کا شکار کر کے لاتے اور قیدی عورتیں لشکر کی باقی خدمات انجام دیتیں۔ کوئی ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو رومیوں کو جا کر ان مظالم کی داستان سناتا۔

ایک ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ کسی موسلا دھار بارش کی طرح بھاری پتھر برسانے کے بعد قرطاجنی نیچے اتر آئے اور اب وہ اندھا دھند رومیوں کو کاٹ رہے تھے۔ اکا دکا رومی سپاہی مزاحمت کر رہے تھے جبکہ باقی لشکر بے مہار اونٹوں کی طرح تتر بتر ہو گیا تھا۔ دور سفید چٹان پر کھڑا برتھاس اپنے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ سجائے میدان جنگ کا نظارا کر رہا تھا۔

پیچھے وادی کے چمکیلے پڑاؤ میں حسب معمول غلام اور لونڈیاں دن بھر کے کام کاج میں جتی ہوئی تھیں۔ آج سب کو معلوم تھا کہ رومی لشکر کو شکست ہوگی۔ اس لیے قرطاجنی خدام لگے ہاتھوں فتح کے جشن کی بھی تیاریاں کر رہے تھے۔

سہ پہر تک پڑاؤ میں خبر آ گئی کہ رومی لشکر کو کاٹ دیا گیا۔ چالیس ہزار رومی سپاہی برف کے سمندر میں در گور ہو گئے۔ باقی چند ہزار جو بچے تھے ان میں سے کچھ زخمی تھے اور کچھ ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ برتھاس نے حکم دیا کہ زخمی رومیوں کو بھی ہلاک کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زخمی رومی قیدی اس برفانی موسم میں اس کے لشکر پر بوجھ بنیں گے۔ البتہ اس نے زخمی سالاروں کو زندہ رکھنے کا حکم دیا۔ مال غنیمت میں قرطاجنی فوج کے ہاتھ بہت کچھ آیا۔ قرطاجنی سپاہی برف میں دبنے سے پہلے لاشوں کے جسموں سے ان کے لباس اور چھوٹی چھوٹی چیزیں نوچتے پھر رہے تھے۔ تنگ گھاٹی میں جلد ہی ملگجا اندھیرا چھانے لگا۔ حالانکہ ابھی شام ہونے میں خاصی دیر باقی تھی۔ برتھاس چاہتا تھا کہ اب واپس پڑاؤ میں لوٹ جائے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے کسی زخمی کو لایا گیا۔

"جناب یہ رومی سپہ سالار ارمنیدس ہے۔"

برتھاس کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ چونک گیا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں ارمنیدس پر جم گئیں۔ ارمنیدس بھی درد کی شدت کے باوجود برتھاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

"تم دھوکے سے جیتتے رہے برتھاس! کبھی مردِ میدان کی طرح سامنے نہیں آئے۔ قرطاجنہ ایک عورت کا آباد کردہ شہر ہے۔ اسی لیے وہاں کے سالار بھی عورتوں جیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تمہیں اپنی فتح پر خوش نہیں ہونا چاہیے۔ بہت جلد قرطاجنہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔ تم نے میری واپس لوٹتی ہوئی فوج کو دھوکے سے مارا۔ یہ جنگ نہیں بے ہودگی ہے، اور میں تمہارے منہ پر کہتا ہوں کہ تم ایک بے ہودہ انسان ہو۔"

رومی سپہ سالار نے نہ صرف اتنا کہا بلکہ باقاعدہ برتھاس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ دراصل برتھاس کو غصہ دلانا چاہتا تھا تاکہ وہ آگے بڑھ کر اس کا سر قلم کر دے۔ لیکن برتھاس نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ ہمیشہ جیتنے والا ایک دانشمند سالار تھا۔ ارمنیدس کی باتوں سے وہ اشتعال میں نہ آیا بلکہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"آج تمہیں جنگ کے قوانین یاد آ گئے۔ کیا تمہارے جنگ کے قوانین سمندر پر لاگو نہیں ہوتے جہاں تم رومی کسی ملک کی بحریہ کا سا برتاؤ کرنے کی بجائے قزاقوں کی طرح ہمارے سوداگروں کے جہازوں کو لوٹ لیتے ہو۔ ہمیں تمہاری زمینوں پر چڑھائی کا...... کوئی

شوق نہیں تھا۔ ارمنیدس۔ ہم تو تمہاری شیطانی طاقت کو کم کرنے آئے تھے۔ یہ جو تم قرطاجنہ کی بات کرر ہے ہو تو میری ایک بات کان کھول کر سن لو کہ قرطاجنہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہے۔ وہ دیویوں کا شہر ہے۔ اگر تمہاری فوج نے قرطاجنہ پر چڑھائی کی غلطی کی تو یاد رکھو وہاں سے تمہارا ایک سپاہی بھی زندہ نہیں لوٹے گا۔“

اتنا کہہ کر برتھاس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

”اس کا علاج کرو اور اسے رومی بحریہ کے بیڑے تک پہنچاؤ۔ یہ ویسے بھی اب آئندہ ہمارے سامنے آنے کے قابل نہیں رہا۔“

ارمنیدس کے دل کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ برتھاس نے طیش میں آ کر اس کا قتل نہ کیا۔ یہاں تک کہ ارمنیدس چلا چلا کر کہنے لگا۔

”مجھے قتل کر دو قرطاجنی کتے! اگر تو نے مجھے نہ مارا تو تیری بیوی ریچھ کے ساتھ سوئے گی۔ حرام زادے! تو ناپاک زمین کا ناپاک خون ہے۔“

لیکن برتھاس اپنے غصے پر قابو پانا جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ارمنیدس کا قتل اس کے لیے انعام ہوگا۔ جبکہ وہ اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ ارمنیدس نے اسے مخصوص گالی دی تھی۔ تیری بیوی ریچھ کے ساتھ سوئے گی۔ قرطاجنیوں کی فحش گالی گلوچ میں یہی گالی سب سے بڑی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن برتھاس ٹس سے مس نہ ہوا۔ ارمنیدس اور بھی ہذیان بکتا رہتا اگر ایک قرطاجنی سالار تلوار کا دستہ مار کر اس کا جبڑا نہ توڑ دیتا۔

برتھاس نے واپس پڑاؤ میں لوٹنے کا حکم جاری کیا۔ اس نے فرار ہونے والے رومیوں کا تعاقب کرنے کی کچھ ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی ٹھنڈی رات میں زیادہ تر مفرور خود بخود مر جائیں گے۔ ان کے لیے دور دور تک کہیں کوئی پناہ نہیں تھی اور اگر مفرور رومیوں میں سے چند ایک بچے کھچے دستے بحری بیڑے تک پہنچ بھی جاتے تو اس پر برتھاس کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا لانے کا حکم دیا اور سفید چٹان سے نیچے اتر آیا۔

برتھاس کے چہرے پر فاتحانہ غرور کی بجائے اطمینان اور ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔ اس نے مخصوص قرطاجنی چغہ پہن رکھا تھا۔ موٹی فر کا گرم چغہ اور سر پر مضبوط آہنی خود۔ جس کے دونوں اطراف میں کسی بالدار جانور کی کھال سے سردی روکنے والے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

برتھاس نے گھوڑے کی رکاب میں پیر رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اگلے لمحے وہ یوں پڑاؤ کی طرف واپس لوٹ رہا تھا جیسے کوئی مچھیرا اپنا آج کا کام مکمل کر کے اطمینان سے گھر لوٹ رہا ہو۔

شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ قرطاجنی پڑاؤ کی مشعلیں اور الاؤ جل اٹھے۔ خدام اپنے ہاتھوں میں شراب کی چھاگلیں لیے فاتح سپاہیوں کے منتظر تھے۔ رقاصائیں، لونڈیاں اور داسیاں بن ٹھن کر الاؤں کے نزدیک کھڑی واپس لوٹتے سپاہیوں کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ برتھاس کا گھوڑا پڑاؤ میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جشن کی تیاریاں مکمل ہیں۔''

وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر اپنی رہائش کی طرف بڑھنے لگا۔ آج وہ اپنے آپ کو زیادہ تھکا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کی رہائش ابھی تک ایک شاندار غار میں تھی۔ جس میں کئی کمرے بنائے گئے تھے اور جہاں دنیا کی ہر سہولت فراہم کی گئی تھی۔ وہ جگمگ کرتے غار کے دہانے پر پہنچا تو اس کی خاص داشتائیں عمدہ لباس پہنے آنکھوں کے کناروں سے کجلے کی دھاریں نکالے، ہاتھوں میں مبارکباد کے پھول لیے اس کی منتظر تھیں۔ لیکن انہیں دیکھ کر برتھاس کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ وہ چونک گیا۔ کلاڈینا ان میں نہیں تھی۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے غار میں داخل ہو گیا۔

''کلاڈینا کہاں ہے؟''

اس نے حسیناؤں کی سرغنہ حسینہ سے پوچھا۔ وہ ساری حسیناؤں میں زیادہ سمجھدار تھی۔ وہ بھی ایک رومی قیدی تھی۔ جس کا نام ''گومالا'' تھا۔ برتھاس کے سوال پر گومالا شش و پنج میں پڑ گئی اور پھر اس نے کس قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔

''کلاڈینا کو بخار ہے، وہ کل رات سے بستر میں ہے۔ میں نے تو آج سارا دن اسے دیکھا بھی نہیں۔ مجھے تو اس کی خادمہ نے بتایا۔''

''کیا بتایا خادمہ نے؟ کہاں ہے کلاڈینا کی خادمہ؟''

''ابھی تو یہیں تھی۔''

برتھاس کی داشتاؤں کو ایک ایک خادمہ بھی ملی ہوئی تھی۔ داشتاؤں کی خادمائیں معمولی شکل و صورت کی قیدی لڑکیاں تھیں۔ کلاڈینا کی خادمہ کو آوازیں دی جانے لگیں۔ لیکن

وہ وہاں ہوتی تو سنتی۔ اچانک برتھاس کو یوں لگا جیسے کلاڈینا فرار ہوگئی۔ اسے کلاڈینا کے اعتماد سے یہی امید تھی۔ اس رومی حسینہ نے کئی دن پہلے...... برتھاس کو بتا دیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔ برتھاس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ کلاڈینا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، اور جونہی وہ بھاری پردہ ہٹا کر کلاڈینا کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کلاڈینا اپنے بستر پر نہیں تھی اور اس کی جگہ اس کی خادمہ سو رہی تھی۔ پہلی نظر میں وہ اسے کلاڈینا ہی سمجھا تھا اور اس کے دل کو یک گونہ اطمینان بھی ملا تھا۔ لیکن اگلے لمحے خادمہ کو پہچان کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ خادمہ سو رہی تھی۔ برتھاس نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔ تو خادمہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھ کر برتھاس کو کچھ عجیب سا لگا۔ کچھ ایسا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خادمہ کی گال پر برتھاس کی انگلیوں کے نشان پڑ چکے تھے۔ برتھاس کو لگا جیسے خادمہ کی رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے نہایت سخت لہجے میں خادمہ سے سوال کیا۔

"کلاڈینا کہاں ہے؟"

"وہ...... بچ...... چلی گئی۔ مم...... میں...... بھی جا رہی ہوں۔"

خادمہ نے اٹک اٹک کر برتھاس کو جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی باچھوں سے سفید جھاگ نکل کر گالوں پر بہنے لگی۔ برتھاس سمجھ گیا کہ وہ زہر کھا چکی ہے۔ وہ اپنی جگہ ناچ کر رہ گیا۔ اب وہ کیا کرتا؟ جو لڑکی اسے سب سے زیادہ پسند آئی تھی وہی بھاگ گئی تھی۔ برتھاس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے مرتی ہوئی خادمہ کو جھنجھوڑا۔

"کہاں گئی وہ؟ کس طرف کو گئی؟ اس برفانی موسم میں وہ کیسے سفر کر سکتی ہے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں گئی؟"

لیکن خادمہ کیا بتاتی وہ تو خود آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ برتھاس کے اردگرد کھڑی حسنائیں مرتی ہوئی خادمہ کو دیکھ کر سہم گئیں۔ برتھاس نے کچھ سوچا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ چند ثانیے بعد وہ اپنے سپاہیوں کو احکامات جاری کر رہا تھا۔

رات تک برتھاس کو کلاڈینا کے فرار کی تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ ایک تیز رفتار گھوڑا لے کر اکیلی ہی فرار ہوئی تھی۔ قرطاجنی پہریدار غلاموں نے اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کا کھوج لگا کر برتھاس کو بتایا تھا کہ وہ مشرق کی طرف فرار ہوئی۔ تمام رات برتھاس کے سپاہی

شکاری کتوں کی طرح کلاڈینا کو ڈھونڈتے رہے۔ لیکن وہ اسے کہاں ڈھونڈ سکتے تھے۔ اسے فرار ہوئے چوبیس گھنٹے ہونے والے تھے اور اتنی دیر میں تو وہ کہاں سے کہاں نکل سکتی تھی۔ بشرطیکہ سخت سردی میں وہ زندہ رہ پاتی۔

یقیناً وہ مر جاتی اگر اس نے سرخ شراب کی چھاگلیں اپنے ساتھ نہ رکھ لی ہوتیں۔ وہ آدھی رات کے وقت پڑاؤ سے فرار ہوئی تھی اور اب تو وہ برتھاس کی پہنچ سے بہت دور آ چکی تھی۔ ایک پوری رات اور پورا دن سفر کرنے کے بعد جب غروب آفتاب سے پہلے وہ تھک کر چور ہوگئی تو اس نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ قرطاجنیوں کی پہنچ سے بہت دور آ چکی ہے۔ سچ تو یہ تھا کہا اس کی دیوانی خادمہ "بطرہ" نے اس پر اپنی جان نچھاور کردی تھی۔ حالانکہ کلاڈینا اس طرح فرار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی خادمہ کو سولی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ لیکن بطرہ نے منت سماجت کی انتہا کردی۔ اس نے کلاڈینا کو مجبور کردیا تھا کہ وہ پڑاؤ سے نکل بھاگے۔ بطرہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے بعد خودکشی نہیں کرے گی۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہ تھا کہ پکڑی بھی نہیں جائے گی۔

لیکن کلاڈینا کا دل کہتا تھا کہ بطرہ نہیں بچ سکے گی۔ ارمنیدس کے ساتھ معرکے کا موقع بار بار آنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ کلاڈینا نے نکل بھاگنے کا فیصلہ کرلیا۔ حالات نے اس کا ساتھ دیا اور وہ قرطاجنیوں کی دست برد سے کامیابی کے ساتھ نکل آئی۔ اس نے رومیوں کے ساتھ قرطاجنیوں کی جنگ کے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اسے معلوم تھا کہ ارمینڈس کے ساتھ لڑائی کے دوران برتھاس سمیت ساری فوج مصروف ہوگی۔ اگرچہ برتھاس نے اپنی رہائش گاہ اور داسیوں کے لیے ایک حفاظتی دستہ مقرر کیا ہوا تھا لیکن جنگ کی وجہ سے اس دستے کی تعداد مختصر ہو کر چار رہ گئی اور ان چار سپاہیوں کو نشیلا کھانا کھلانا بطرہ کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اور اس وقت تکان سے چور رومی حسینہ ایک مختصر پہاڑی غار میں گھوڑا باندھ کر سو رہی تھی۔ لمبے برفیلے سفر کی تھکاوٹ اور کسلمندی نے کلاڈینا کو نڈھال کردیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ راستے بھر سردی سے بچنے اور توانائی حاصل کرنے کے لیے گھونٹ گھونٹ شراب پیتی آئی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے گردونواح سے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے سو رہی تھی۔ کیونکہ گزشتہ روز غروب آفتاب سے پہلے ہی اس نے اپنے لیے مناسب جگہ کی تلاش شروع کردی تھی۔ اور جب اسے ایک محفوظ جگہ مل گئی تو اس نے اس کی صفائی کرنے کے بعد گھوڑے

کی زین کے ساتھ بندھا کھانا نکالا اور دیوانوں کی طرح کھانے لگی۔ راستے بھر اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے برفیلے سفر کے دوران کچھ کھایا تو اسے نیند ستائے گی۔ کھانا کھاتے ہی اسے نیند نے آلیا۔ اس نے گرم اونی کمبل میں خود کو لپیٹا اور سو گئی۔ آدھی رات کے بعد اچانک کلاڈینا کا گھوڑا خرخرانے لگا۔ اس نے فضا میں کوئی مانوس سی بو سونگھ لی تھی۔ وہ خرخراتا اور ساتھ کے ساتھ اپنے کھر زمین پر مارتا۔ جیسے وہ کلاڈینا کو جگانا چاہتا ہو۔ شاید اس نے کوئی خطرہ سونگھ لیا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ گھوڑا مسلسل خرخراتا رہا اور زمین پر اپنے پیر اور کھر مارتا رہا۔ لیکن جب تھکی ہوئی کلاڈینا نے کروٹ بدلی تو اس کا گھوڑا خاموش ہو گیا۔ اور کلاڈینا کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد گھوڑا پھر خرخرایا اور اب کی بار وہ ہنہنانے لگا۔ کلاڈینا بیدار ہو گئی۔ گھوڑا چپ ہو گیا۔ کچھ دیر تک تو کلاڈینا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ لیکن جب اس کا شعور بیدار ہوا تو وہ فوراً خطرے کو بھانپ گئی۔ خطرہ واقعی موجود تھا۔ دور کہیں کچھ گھوڑوں کے خرخرانے اور ہنہنانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کلاڈینا نے اپنی تلوار کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ جمایا اور کسی چاق و چوبند سپاہی کی طرح اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ برتھاس کے ہرکارے اس کے پیچھے پہنچ چکے ہیں۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس مرتبہ وہ ٹکرا جائے گی۔ لڑ کر اپنی جان دے دے گی۔ لیکن قرطاجنیوں کے ساتھ واپس نہیں جائے گی۔ وہ اپنے چھوٹے سے غار سے نکل آئی۔ اس نے گھوڑے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے خود تو کھا پی لیا۔ لیکن بے زبان جانور کو کچھ نہ کھلایا پلایا۔ تو اس کو بے حد ندامت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ گھوڑا خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس پر مستزاد کلاڈینا نے اس کی گردن چوم لی۔

"دیکھو پیارے! مجھے معاف کرنا۔ میں نے تمہیں چارا نہیں ڈالا۔ لیکن تم نے مجھے جگایا تم بہت اچھے ہو۔"

اب کلاڈینا تلوار لیے نزدیکی پتھر پر چڑھ رہی تھی۔ اس نے پتھر پر چڑھ کر شمال کی طرف دیکھا جہاں سے قرطاجنیوں کے آنے کی امید تھی اور اگلے لمحے وہ ہکا بکا رہ گئی۔

سپاہیوں کا ایک پورا دستہ اسی طرف آ رہا تھا۔ شدت کی سردی میں بھی کلاڈینا کو پسینے چھوٹ گئے۔ آنے والے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے۔ کلاڈینا کے دل کی دھڑکن اس کے

بس سے باہر ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ برتھاس کے سپاہی اتنی جلدی اس کا کھوج لگا لیں گے۔ وہ دل میں اپنے عزائم دہرانے لگی۔

''میں جان دے دوں گی، لیکن قرطاجنیوں کیساتھ واپس نہیں جاؤں گی۔''

صورتحال نہایت تشویشناک تھی۔ کلاڈینا کی ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔ دیوتاؤں پر سے تو پہلے ہی اس کا بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ اب اس مشکل وقت میں وہ کس کو پکارتی۔ معاً اس کے دل میں خیال آیا کہ اب بھی وقت ہے، بھاگ کھڑی ہو۔ وہ تیزی کے ساتھ پتھر سے نیچے اتر آئی۔ اگلے لمحے وہ گھوڑے پر سوار ہو رہی تھی۔ اس کا گھوڑا تو پہلے سے ہی یہی چاہتا تھا۔ لگامیں ڈھیلی چھوڑنے کی دیر تھی کہ کلاڈینا کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن آج بدنصیبی اس کا راستہ روکنے پر تل گئی تھی۔ سپاہیوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اچانک ایک آواز بلند ہوئی۔

''ارے وہ دیکھو! وہ کون نکلا۔ کوئی فرار ہو رہا ہے۔''

دوسری آواز آئی۔

''ارے ارے!! پیچھا کرو۔ برتھاس کا جاسوس ہوا تو ہم سارے مارے جائیں گے۔''

کلاڈینا نے یکا یک گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ ذہین کلاڈینا کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ آنے والا دستہ قرطاجنیوں کا نہیں تھا بلکہ رومیوں کا تھا۔ اتنی تیزی کے ساتھ اس کے جاننے کی وجہ وہ ''بولی'' تھی جس میں وہ لوگ بات کر رہے تھے۔ وہ لوگ کلاڈینا کی اپنی زبان بول رہے تھے اور پھر اگلے لمحے کلاڈینا کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ پھر آواز سنائی دی۔

''ارے دیکھو!! وہ رک گیا ہے۔ ہاں وہ رک گیا ہے۔''

ایک اور آواز آئی۔

''ہم میں سے ہی کوئی ہوگا۔ آج نہ جانے کتنے رومی ان ٹھنڈی چٹانوں میں بھٹکتے پھر رہے ہوں گے۔ دیوتا غارت کریں ارمیدس کو جو ہمیں اس راستے سے لایا۔''

کلاڈینا بڑے غور سے ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ نزدیک آ رہے تھے۔

ایک اور آواز آئی۔

''ارمیدس تو غارت ہو چکا، اب تو وہ مر بھی چکا ہوگا۔ میں نے اسے دیکھا وہ زخمی

حالت میں گھسٹتا ہوا پناہ کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔"

کسی نے کلاڈینا کو پکارا۔

"خبردار! کون ہو تم؟"

کلاڈینا خاموش ہو گئی۔ ایک بار پھر آواز ابھری۔

"جواب دو نوجوان! کون ہو تم؟ رومی سپاہی یا کوئی اور؟"

اب وہ بالکل نزدیک آ چکے تھے۔ کلاڈینا نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور گھوم کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں رومی ہوں، کیا تمہیں شکست ہوئی یا تمہارا لشکر کامیابی سے نکل آیا۔"

کلاڈینا نے مزید کوئی جواب دینے کی بجائے نہایت بردبارانہ لہجے میں سوالات کر دیئے تھے۔ دستے کے سپاہی ہکا بکا رہ گئے۔ وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ گزرتی ہوئی رات، برفیلا موسم، غضب کی سردی اور خوفناک پہاڑی جنگل میں ایک اکیلی رومی دوشیزہ کیا کر رہی تھی۔ بھگوڑے سپاہی حیران رہ گئے۔ بالآخر ایک گھڑسوار نے دو قدم آگے بڑھ کر کلاڈینا سے بات کی۔

"جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ ارمنیدس کی نادانی کی وجہ سے پورا رومی لشکر تنگ گھاٹی میں پھنس گیا۔ اوپر سے قرطاجنیوں کے پتھر بارش کی طرح برسے، جس کا جس طرف منہ آیا وہ اسی طرف کو بھاگ نکلا۔ لیکن تم کون ہو؟...... اور اس سے ان ویرانوں میں کیا کر رہی ہو؟"

کلاڈینا کو اندازہ تھا کہ ارمنیدس کا لشکر بری طرح شکست کھا چکا ہوگا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"میں ایک مرحوم رومی سردار کی بیٹی ہوں۔ کئی ماہ پہلے ایک جنگ میں برتھاس نے میرے خاندان کا خاتمہ کر دیا اور مجھے اپنا بندی بنا لیا۔ تب سے میں موقع کی تلاش میں تھی۔ کل کی جنگ میں مجھے بھاگنے کا موقع ملا اور میں نکل آئی۔ کیا تم کوئی سالار ہو؟"

"ہاں! میں ایک ہزار سپاہیوں کا افسر تھا۔ ارمنیدس بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور میرے خیال میں اب تک وہ گرفتار یا قتل ہو گیا ہوگا۔ اس دستے میں میرے ساتھ اور بھی سالار ہیں۔ ہم پانچ سالار اور انیس سپاہی ہیں۔ ہم اپنے بحری بیڑے کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو ساحل پر ہمارا منتظر ہے۔ اگر آپ ہمارے ساتھ آنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔"

اندھا کیا مانگتا ہے، دو آنکھیں؟ کلاڈینا کے تو جیسے بھاگ کھل گئے۔ اسے اپنے ہی ہم وطن اپنے ہی بھائی مل گئے تھے۔ ایک نہیں، دو نہیں، پورے چوبیں۔ اس نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں نہیں۔ میں بھی تو روم جانا چاہتی ہوں۔ میرے لیے تو آپ لوگ دیوتاؤں کے بھیجے ہوئے پمددو ہو۔ ہمارا بحری بیڑا یہاں سے کتنا دور ہے؟"

"ہمیں کچھ خاص اندازہ نہیں، ہم تو سالاران جنگ ہیں۔ راستہ بتانے کے ماہرین تو شاید مارے گئے۔ ہم اندازے پہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ البتہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ لشکر کی رفتار سے چلتے ہوئے جہازوں تک پہنچنے میں ہمارے پندرہ دن لگنے کا اندازہ بتایا گیا تھا۔ لیکن اب تو ہم تیزی سے سفر کریں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں تین دن بعد ساحل پر ہونا چاہیے۔"

کلاڈینا کے چہرے پر ہلکی سی خوشی کی لہر نمودار ہوئی۔

"اس کا مطلب ہے ہم اپنی منزل کے نزدیک ہیں۔ لیکن افسوس کہ بحری بیڑے کے لیے ہم بہت کم سوار ہوں گے۔ نہ جانے بحری بیڑے کا سالار ہم سے کس طرح پیش آئے۔"

کلاڈینا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ رومی سالار نے اس کی تائید کی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں خاتون! لیکن اس شکست میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگے، بلکہ ہم نے رومی سپاہ کے بہترین سپاہیوں کی جان بچائی ہے۔ امیرالبحر ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرے گا۔ ہوسکتا ہے مزید کچھ بھولے بھٹکے لوگ بھی ہم سے آملیں۔ ہم نہ جانے کتنے سالوں سے قرطاجنی سالار کے پیچھے پیچھے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ اپنے گھربار، اپنے بال بچوں اور ماں باپ کو دیکھے ہوئے ہمیں مدت بیت گئی ہے۔ کیا ہمیں ہماری قربانیوں کا یہی صلہ ملے گا کہ ہمیں ان پتھروں میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا؟ نہیں ہم ضرور اپنے گھروں کو جائیں گے۔"

کچھ دیر تک بھگوڑے سپاہیوں اور کلاڈینا کے درمیان اسی طرح کی بات چیت ہوتی رہی۔ اور پھر ایک دوسرے کا اچھا خاصا تعارف حاصل کرنے کے بعد مفروروں کا قافلہ روانہ ہوگیا۔

کلاڈینا کے دل میں خدشہ تھا کہ اتنے زیادہ مردوں میں وہ اکیلی عورت کسی ستم کا

شکار ہی نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہتھیار سوتے ہوئے بھی اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ دن کی روشنی میں جب رومی سپاہیوں نے کلاڈینا کا حسن دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ عرصہ دراز سے گھروں سے نکلے ہوئے سپاہی کلاڈینا کے سڈول اور جوان بدن کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تو کلاڈینا کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔ لیکن دیوتاؤں کی کرپا سے کلاڈینا محفوظ رہی۔ تین چار روز بعد جب ان کا قافلہ ساحل پر پہنچا تو ارمنیدس کے استقبال میں آنے والے رومی انہیں دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید ارمنیدس کا ہراول دستہ آ پہنچا ہے اور پیچھے پیچھے اس کا لشکر بھی آ تا ہی ہوگا۔ رومی بحریہ کا ''سالار کوناڈس'' ساحلی چٹانوں پر کھڑا مسکراتی ہوئی نظروں سے آنے والوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ارمنیدس کا لشکر تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ وہ تو اپنی بہادر سپاہ کو میدان جنگ سے نکالنے کے لیے آیا تھا۔ کلاڈینا اور اس کے ساتھی پہلا دستہ تھے جو کوناڈس کے سامنے نمودار ہوئے اور پھر جب کوناڈس کو حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ چکرا گیا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کبھی وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا اور کبھی افسوس سے سر ہلانے لگتا۔ کبھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کلاڈینا کو دیکھتا اور کبھی غصیلی نظروں سے رومی بھگوڑوں کو گھورنے لگتا۔ اور پھر اس نے نہایت زہریلے لہجے میں رومیوں سے کہا۔

''تم لوگوں کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ یہ بحری بیڑا خالی واپس جائے گا۔ روم میں بزدلوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ قرطاجنیوں سے جنگ تو درکنار تم لوگ تو اپنے ہی ملک میں سے امن کے ساتھ اپنا لشکر نہیں گزار سکتے۔ ہاں البتہ میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ کیونکہ اس کی کہانی تم سے الگ ہے۔''

بحریہ کے سالار کی بات سن کر رومی بھگوڑے گرتے گرتے بچے، اس قدر طویل دکھ درد اور مصائب کے بعد ان کے لیے سالار بحر کا یہ لہجہ بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ اور مارے خوف کے ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، تب کلاڈینا نے التجا کی۔

''ان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ آج بھی روم کے وفادار ہیں۔ ارمنیدس یقیناً مارا جا چکا ہے۔ جو دراصل قصوروار ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ ان لوگوں کو ان کے گھروں میں واپس جانے دیا جائے۔''

کوناڈس تو پہلے ہی کلاڈینا پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ کلاڈینا کے لہجے میں التجا دیکھ کر اس کا

رویہ فوراً بدل گیا۔ اس نے کہا۔

”تم کہتی ہو تو میں انہیں انکار نہیں کرتا۔“

کوناڈس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

”ان لوگوں کو سوار کرا دیا جائے۔ ہم ابھی یہاں کچھ دن رکیں گے۔ جیسے ہی ان کے بیان کی تصدیق میں کوئی دوسرا بھگوڑا دستہ وارد ہوا، ہم چل دیں گے۔ میں اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھانا چاہتا ہوں۔“

کلاڈینا نے کوناڈس کے لہجے میں نرمی پیدا ہوتے دیکھی تو ایک بار پھر کہا۔

”محترم سالار! آپ اپنی ذمہ داری ضرور نبھائیں اور ہمارے بیان کی تصدیق کے لیے یہاں ضرور رکیں۔ لیکن آپ بعد میں بھی یہاں اپنے چند جہاز چھوڑ دیں۔ ہمارے بھٹکے ہوئے سپاہی وقفے وقفے سے یہاں پہنچتے رہیں گے۔ وہ سب مظلوم اور بے قصور ہیں۔ اگر آپ نے یہ ساحل خالی چھوڑ دیئے تو ان کے پاس سمندر میں ڈوب کر مرنے کے سوا کوئی چارا نہیں بچے گا۔“

کوناڈس نے پھر پوری توجہ سے کلاڈینا کی بات سنی اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے اچھا مشورہ دیا۔ میرا خیال ہے یہاں کچھ جہاز چھوڑ کر ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ جیسے ہی تصدیق ہوتی ہے ہم چل پڑیں گے۔“

بھگوڑے رومیوں کو دوسرے جہازوں میں بھیج دیا گیا۔ جبکہ کلاڈینا کو کوناڈس نے اپنے جہاز پر رکھ لیا تھا۔

کوناڈس بنیادی طور پر حسن پرست تھا۔ اس کے جہاز پر پہلے سے بھی اس کی داشتائیں موجود تھیں۔ اس میں یہی ایک خرابی تھی کہ وہ عورت کا رسیا تھا۔ ورنہ سمندر میں وہ شکرے کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی جوشیلی اور جذباتی طبیعت نے اسے ایک منفرد انسان بنا دیا تھا۔ بحری قزاق ہر کسی کے ساتھ ٹکرا جاتے۔ لیکن کوناڈس کا نام سنتے ہی کانپنے لگتے۔ وہ خود کسی بحری قزاق سے کم نہیں تھا۔ اسے سمندر میں آوارہ جہازوں کو لوٹنا اچھا لگتا تھا۔ وہ کسی بحری قزاق کی طرح نکلتا اور یونانی سوداگروں کے جہاز لوٹ لیتا۔ کئی مرتبہ اس کی شکایتیں رومی دربار تک پہنچیں۔ لیکن رومی مجلس شوریٰ میں اس کے طرفدار بہت تھے۔ اس کی بہادری

اور کارناموں کا اتنا اثر تھا کہ رومی مجلس شوریٰ اسے امیر البحر کے عہدے سے ہٹا نہ سکتی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ قرطاجنہ والے کبھی رومی سرزمینوں پر اپنی فوجیں روانہ نہ کرتے۔ اگر کوناڈس بحر روم میں اپنی دست درازیوں سے سوداگروں کو پریشان نہ کر دیتا۔ قرطاجنہ تجارتی شہر تھا۔ اور اہل قرطاجنہ جنگیں پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ جنگوں سے ان کے کاروبار زندگی پر منفی اثرات پڑتے تھے۔ لیکن جب قرطاجنہ کی مجلس عامہ کے سامنے بار بار ایک ہی قضیہ پیش کیا گیا کہ رومی بحریہ قزاقوں کے روپ میں قرطاجنہ آنے والے سوداگروں کے جہاز لوٹ لیتی ہے...... تو مجلس قرطاجنہ مجبور ہوگئی کہ رومی قزاقوں کی سرکوبی کے لیے اپنے فوجی روانہ کرے۔ گویا روم کا اصل نقصان کوناڈس نے ہی کیا تھا۔ لیکن یہ ایک ایسا عمل تھا جس پر باریکی سے نظر ڈالنا فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ کوناڈس نے سالہا سال میں قرطاجنہ والوں کے کاروبار کو خراب کیا اور لاکھوں کا سامان روم کی طرف بھیجا۔ لاکھوں ٹیلنٹ چاندی اور سونے کی ڈلیاں دیکھ کر مجلس روم کا سارا غصہ اتر جاتا۔ اگر کوئی دانا شخص کوناڈس کی اس حرکت پر اعتراض بھی کرتا تو اسے خاموش کروا دیا جاتا۔ کوناڈس کے سالہا سال کے اس ظلم و ستم اور زیادتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل قرطاجنہ اس کی روک تھام کے لیے مجبور ہوگئے۔ پہلے پہل تو انہوں نے سمندر میں چند گشتی جہاز بھیجے لیکن کوناڈس بہت پھرتیلا تھا۔ وہ پل میں قزاقوں کا روپ دھار لیتا اور پل میں رومی بحریہ کا سالار دکھائی دینے لگتا۔ اس کے بیڑے میں ایسے جہاز بھی شامل تھے جنہیں بوقت ضرورت وہ قزاقیت کے لیے استعمال کرتا۔ ان پر کالا تیل اور چربی مل کر انہیں اور بھی بھیانک بنا دیا گیا تھا۔ جونہی کوناڈس کی جاسوسی کشتیاں اسے بتاتیں کہ کوئی تجارتی جہاز یا کشتی بحر روم میں سے گزر رہا ہے تو کوناڈس قزاقوں کا روپ دھار لیتا۔ وہ ایک جہاز کے مقابلے میں ایک اور زیادہ کے مقابلے میں زیادہ لے کر نکلتا۔ شکرے کی طرح نمودار ہوتا اور اچانک جھپٹ پڑتا۔ سوداگروں کا سب مال و متاع لوٹ کر انہیں قتل کر دیتا اور ان کی لاشوں کو سمندر میں پھینک دیتا۔ لوٹا گیا سامان شہر روم کی طرف روانہ کر دیتا اور جہازوں کو اپنے جنگی بیڑے کا حصہ بنا لیتا۔ کئی سال پہلے جب اس نے امیر البحر کا عہدہ سنبھالا تھا تو مجلس روما نے اسے صرف تیس جہازوں کا بیڑا دیا تھا۔ لیکن آج اس کے بیڑے میں دو سو تیس جہازوں کا لشکر تھا۔ ان سالوں میں کوناڈس نے بحر روم پر اپنا قبضہ خوب مکمل کیا اور سمندر کے شکرا کا لقب پایا۔ وہ کئی سالوں سے گھر نہ گیا تھا۔ اس کی عیاشی کا ہر سامان اس کے ذاتی جہاز پر موجود تھا۔ ایک

سے ایک حسین لڑکی ہمہ وقت اس کے جہاز پر موجود ہوتی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب اور ہر کھانے میں بھنا ہوا گوشت اس کی مرغوب تفریح تھی۔ سچ مچ وہ رومی بحریہ کا سالار نہیں بلکہ ایک خطرناک قزاق تھا۔ کوناڈس کی کاروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل قرطاجنہ نے دو فوجیں روانہ کیں۔ ایک بری اور دوسری بحری۔ بری فوج کا سپہ سالار برتھاس تھا۔ جواب تک رومیوں کو ناکوں چنے چبا چکا تھا۔ اس نے رومیوں کے ساتھ ہر وہ کام کیا جو کوناڈس نے قرطاجنیوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے رومیوں کی سینکڑوں بستیاں لوٹیں، لڑکیاں اغوا کیں، فصلیں جلائیں اور پورے مشرقی روم میں اودھم مچا دیا۔ برتھاس کی کارروائیوں سے مجلس روما بوکھلا گئی۔ اور انہوں نے آخری فیصلہ یہی کیا کہ برتھاس اپنی مختصر فوج کے ساتھ جو کرتا ہے کرے۔ وہ بڑے شہروں کی طرف کبھی رخ نہیں کرے گا۔ مضافاتی بستیوں میں جتنی لوٹ مار مچاتا ہے، مچائے۔ اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے اور اپنی ساری فوج واپس بلالی جائے۔ اس کے بدلے ایک بڑا لشکر قرطاجنہ بھیجا جائے جو قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ یہ تھا رومی مجلس کا آخری فیصلہ۔ برتھاس کو اس فیصلے کی خبر مل چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ارمیدس کی ناکہ بندی کی۔ رومی مجلس نے ستر ہزار سپاہیوں کی واپسی کے لیے اپنے امیر البحر کو حکم دیا کہ وہ اپنا بیڑا لے کر جائے اور بری سپاہ کو بھر کر لائے۔ رومی امیر البحر کوناڈس برق رفتاری سے اونچے ساحلوں کی طرف لپکا لیکن یہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ ارمیدس کی فوج تباہ ہو چکی ہے۔ یہ تھا کوناڈس کا مکمل تعارف۔

سمندر میں قرطاجنی امیر البحر موآبریس بھی موجود تھا۔ وہ گزشتہ تین چار سال سے کوناڈس کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موآبریس بھی اپنے وقت کا مانا ہوا قزاق رہا تھا۔ اور اس پر مستزاد اس کا تجربہ تھا۔ کیونکہ وہ بوڑھا تھا۔ کوناڈس کی طرح جوان نہیں تھا۔ اس نے ہر طریقے سے رومی امیر البحر کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن آج تک رومی بحریہ کے بچے رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا بیڑا کبھی سمندر میں ایک جگہ اکٹھا نظر نہیں آیا تھا۔ کوناڈس کی عادت تھی کہ وہ اپنے بیڑے کو بیسیوں ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر رکھتا۔ جب بھی موآبریس کو کامیابی ہوئی تو اسی حد تک کہ اس نے رومی بیڑے کی ایک آدھ ٹکڑی کو تباہ کیا۔ خود کوناڈس کبھی موآبریس کے ہاتھ نہ لگا۔ یہ آنکھ مچولی پچھلے تین چار سال سے جاری تھی۔ قرطاجنی امیر البحر ہمیشہ اس تلاش میں رہتا کہ کبھی اسے رومی بیڑے کے اکٹھا ہونے کی خبر

ملے۔

جب سے کوناڈس اونچے ساحلوں کی طرف آیا تھا۔ اس کے دل میں یہی ایک خدشہ تھا کہ کہیں موآبریس کو اس کے بیڑے کے یکجا ہونے کی خبر نہ مل جائے۔ کیونکہ اتنے عرصے میں پہلی مرتبہ اس کا بیڑا یکجا ہوا تھا۔ اور یہ امر بھی مجبوری تھا۔ ارمنیدس کی ستر ہزار بحری سپاہ کو واپس نکالنے کے لیے رومی مجلس شوریٰ کے حکم کو ماننا کوناڈس کی مجبوری تھی۔ چنانچہ کوناڈس اپنا بیڑا لیے یہاں آیا۔ اور جب یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ واپس لے جانے کے لیے کوئی فوج بچی ہی نہیں تو اس نے چاہا کہ پھر اپنے بیڑے کی ترتیب کو توڑ دے۔ کیونکہ اگر قرطاجنی امیرالبحر کو رومیوں کے ساتھ بڑی سمندری جنگ کا موقع مل گیا۔ تو وہ ہر قیمت پر جنگ جیتنے کی کوشش کرے گا۔ موآبریس اور کوناڈس کے درمیان جنگ نہیں تھی۔ یہ سچ مچ "پکڑو پکڑو" کا کھیل تھا۔ الغرض کوناڈس نے نئے احکامات جاری کر دیئے۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اس کے جہاز پر ایک نئی حسینہ آئی تھی۔ کلاڈینا تو خود بخود اس تک آ پہنچی تھی۔ یہ لوٹ کا مال نہ تھی۔ اس لیے وہ کسی قدر جھجک رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس رومی لڑکی کو پوری طرح اعتماد میں لے کر اس کی آبرو کے ساتھ کھیلے۔ ورنہ وہ اس طرح کے تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ اس سے قبل جتنی لڑکیاں اس کے جہاز پر رہائش پذیر تھیں وہ سب لوٹ کا مال تھیں۔ کلاڈینا جہاز پر سوار ہوئی تو اداس چہرے والی حسین لڑکیوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ تعداد میں گیارہ تھیں۔ کلاڈینا بارہویں تھی۔ سب کی سب لڑکیاں نہایت حسین اور پرکشش۔ کوئی یونانی، کوئی قرطاجنی، کوئی مشرقی، کوئی مغربی، غرض کوناڈس نے اپنے لیے اپنے جہاز پر ہی جنت بنا رکھی تھی۔ وہ کسی حسینہ کو زیادہ عرصہ تک اپنے جہاز پر نہ رکھتا تھا۔ اس کا دل جب بھی کسی لڑکی سے بھر جاتا تو وہ اسے فروخت کر دیتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے ہر شہر میں غلاموں اور لونڈیوں کا کاروبار ذرا بھر معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

قبل مسیح کے اس دور میں جب قرطاجنہ کو آباد ہوئے ابھی ایک دو صدیاں ہی گزری تھیں دنیا کے ہر بڑے شہر میں غلاموں اور لونڈیوں کو سر بازار بیچا جاتا تھا۔ کوناڈس کا جی بھر جاتا تو وہ فارغ ہونیوالی حسینہ کو رومہ کے بازار میں بیچ دیتا۔ وہ خود رومہ نہ جاتا تھا۔ یہ کام بھی اس کے ہرکارے کرتے تھے۔

کلاڈینا کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ وہ کسی غلط جگہ آ گئی ہے۔ رومی امیرالبحر کے

جہاز پر اتنی زیادہ لڑکیوں کا کیا کام۔ یقیناً کوئی اور ماجرا تھا۔ سب حسیناؤں کے چہرے بجھے بجھے سے تھے اور ان کی آنکھوں میں بے بسی اور اداسی کی کیفیت صاف دکھائی دیتی تھی۔ رومی امیر البحر کا جہاز بہت بڑا تھا۔ یہ حقیقت میں ایک قزاق کا جہاز تھا۔ اس قسم کے جہازوں کو سہ منزلہ جہاز کہا جاتا۔ قرطاجنیوں کے جہاز بنانے کی صنعت دنیا کی سب سے بڑی صنعت تھی۔ قرطاجنہ میں دور دراز سے بے پناہ لکڑی صرف جہاز بنانے کے لیے لائی جاتی تھی۔ چھوٹی کشتیوں سے لے کر پانچ منزلہ جہاز تک قرطاجنہ کی تعمیراتی بندرگاہ سے نمودار ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ رومی امیر البحر نے ایک نیا نویلا قرطاجنی جہاز لوٹنے کے بعد اسے اپنے لیے عیاشی کا محل بنا لیا تھا۔ سہ منزلہ جہاز میں تہہ خانہ بھی تھا۔ جس میں دورویہ نشستیں لگی ہوئی تھیں)۔ یہ نشستیں جہاز کھینچنے والے ملاحوں کے لیے تھیں۔ رومی بیڑے کے زیادہ تر جہاز افریقی غلام رکھتے تھے۔ سپہ سالار کے بڑے جہاز کے تہہ خانے میں موجود ملاحوں میں کوئی کمزور یا ناتواں یا بوڑھا غلام شامل نہیں تھا۔ چنانچہ جہاز کے تہہ خانے میں اترتے ہی ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ اوپر کی منزلوں کی طرح تہہ خانہ مختلف کمروں میں تقسیم نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک بڑے لمبوترے ہال کی طرح کھلا کمرہ تھا۔ جس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چوبی بنچوں کی قطاریں تھیں۔ ہر بنچ پر تین غلام بیٹھ سکتے تھے۔ جو ایک ہی چپو کو ہلاتے۔ بنچوں کی دورویہ قطاروں کے بیچوں بیچ گزرنے کا راستہ تھا۔ جہاں کوڑا بردار سپاہی غفلت کرنے والے کی چمڑی ادھیڑنے کے لیے موجود تھے۔ نشست پر بیٹھتے ہی غلام کے پیروں کو لوہے کی کڑیوں میں جکڑ لیا جاتا۔ سرد علاقے کے اس سفر سے پہلے پہلے تک ان غلاموں نے ایک لنگوٹی سے بڑھ کر کسی لباس کا سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن پہلی مرتبہ اس سفر کے دوران کوناڈس نے انہیں تین کے حساب سے ایک اونی کمبل فراہم کیا تھا۔ یعنی ایک کمبل میں تین غلام خود کو لپیٹ کر چپو چلاتے تھے۔

تہہ خانے میں تقریباً پچاس تنومند حبشی غلام ہمہ وقت چپو چلانے کے لیے موجود ہوتے اور اس لحاظ سے جہاز پر ہمہ وقت سو غلاموں کا موجود ہونا ضروری ہوتا۔ آدھے آرام کرتے تو باقی آدھے چپو چلاتے۔ ان مزدوروں کو کبھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ ماسوائے ان دنوں کے جب جہاز کہیں لنگر انداز ہوتا۔ قریب قریب پورے رومی بیڑے کی یہی کیفیت تھی۔

ان غلاموں میں ایک شخص دوسروں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی عقابی آنکھوں

میں ہمہ وقت بغاوت کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ کوڑا بردار رومیوں سے اس حبشی غلام نے بہت کوڑے کھائے۔ اس کا پورا بدن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ لیکن اب بھی اس کے مزاج میں تندی باقی تھی۔ رومی کوڑا برداروں کا کہنا تھا کہ وہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ ابھی نیا تھا۔ اسے حال ہی میں جہاز کھینچنے والے ملاح غلاموں میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ کون تھا؟ جہاز کا تہہ خانہ تو مظلوم غلاموں کی آماجگاہ تھا۔ جبکہ پہلی منزل پر عملے کی رہائش گاہیں تھیں۔ اپنی باری پر آرام کرنے والے پچاس غلام بھی اس منزل کے ایک بڑے کمرے میں ننگے فرش پر سویا کرتے تھے اور باقی کارکن عملہ بھی اس منزل پر مقیم تھا۔ دوسری اور تیسری منزل پر غلاموں کا داخلہ تو ایک خطرناک جرم تھا۔ نچلے طبقے کے ملازمین بھی وہاں نہ جاسکتے تھے۔ دوسری منزل پر امیرالبحر کا خاص الخاص ذاتی دستہ قیام پذیر رہتا۔ جبکہ جہاز کی تیسری منزل جو بناوٹ اور آرائش کے لحاظ سے بھی کسی محل سے کم نہ تھی۔ کوناڈس اور اس کی باندیوں کے لیے مخصوص تھی۔ کلاڈینا کو اس منزل پر لایا گیا۔ باقی داشتاؤں کی طرح کلاڈینا کو بھی ایک الگ پرآسائش کمرہ دیا گیا۔ وہ ایک قوی ہیکل رومی خادم کی معیت میں اپنے کمرے تک آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کلاڈینا حیران رہ گئی۔ یہ کسی جنگی بحری جہاز کا کمرہ نہیں تھا۔ یہ تو رومہ کی کسی شہزادی کا کمرہ لگتا تھا۔ کلاڈینا کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی اور معاملہ تھا۔ ساحل پر کوناڈس کی باتیں سن کر بھی اسے کچھ شک ہوا تھا۔ لیکن اب اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ کوناڈس ضرور کوئی اوباش شخص تھا۔ قوی ہیکل خادم اسے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اس خوبصورت کمرے کی زینت و آرائش کو دیکھنے لگی۔ لکڑی کی دیواروں میں خوبصورت الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں قرطاجنیوں کی جدید ترین ایجاد یعنی شفاف شیشے بھی لگائے گئے تھے۔ قرطاجنہ کے عہد تک شیشہ اتنا مہنگا سمجھا جاتا تھا گویا ہیرا موتی۔ اس جہاز کے کمرے میں اتنا بڑا شیشہ دیکھ کر کلاڈینا ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے قرطاجنیوں کی اس ایجاد کے بارے سنا تو تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ صرف آئینے سے ہی واقف تھی۔ شفاف شیشہ اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر الماریوں کے قریب آئی اور اپنے ہاتھ کی نازک انگلیوں سے شفاف شیشے کو چھو کر دیکھنے لگی۔ معاً اس کی نظر الماری میں لٹکے ہوئے لباسوں پر پڑی۔ تو مارے حیرت کے اسے چکر آ گیا۔ ایک سے ایک عمدہ ریشمی لباس، جو دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے پارس کی کسی شہزادی کے لیے بنایا گیا ہو، الماری میں لٹکا ہوا تھا۔ کلاڈینا نے الماری کے پٹ کھولے اور عمدہ ریشمی لباس

کو بھی چھو کر دیکھنے لگی۔ کمرے میں ایک خوبصورت تخت بچھا تھا۔ جس کے پہلو میں تپائی تھی اور فرش پر عمدہ قالین بچھا ہوا تھا۔ کلاڈینا سمجھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اداس چہرے والی لڑکیاں کون تھیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سب کی سب کوناڈس کی باندیاں تھیں۔ معاً کلاڈینا کے منہ سے نکلا "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔" کلاڈینا تم قرطاجنی سپہ سالار کی قید سے نکل کر رومی سپہ سالار کی قید میں آ چکی ہو۔"

دو تین گھنٹے تک وہ مختلف خیالات میں کھوئی کمرے میں موجود گداز گدی والے تخت پر بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ مشعلیں جلانے والا خادم جہاز میں مشعلیں جلاتا پھر رہا تھا۔ کلاڈینا کو بھی اپنے کمرے کی مشعلیں جلانے کا خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چمنی کے نیچے رکھے تیل کے چراغ کو اٹھا کر کمرے کی مشعلیں جلانے لگی۔ اسی اثنا میں اسے باہر دو لڑکیوں کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر نکل آئی۔ باہر راہداری میں دو باندیاں موجود تھیں۔ دونوں ہی غالباً یونانی نسل سے تھیں۔ وہ آپس میں ہولے ہولے باتیں کر رہی تھیں۔ کلاڈینا اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ان کی نگاہ کلاڈینا پر پڑی۔ کلاڈینا نے محسوس کیا کہ وہ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ آخر کیوں؟ وہ حیران ہونے لگی۔ اس سے رہا نہ گیا اور باندیوں کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں باندیاں کلاڈینا کو آتا دیکھ کر گھبرا گئیں۔ انہوں نے وہاں سے جانا چاہا لیکن کلاڈینا نے انہیں آواز دے کر روک لیا۔

"ٹھہرو!...... میری بات سنو! تمہیں دیوتاؤں کی قسم! جاؤ مت۔"

دونوں باندیاں رک گئیں۔ کلاڈینا ان کے قریب آئی۔ انہیں سلام کیا اور کہنے لگی۔

"تم مجھے دیکھ کر جا کیوں رہی تھیں؟"

دونوں باندیاں کچھ نہ بولیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ پھر انہوں نے سر جھکا لیا۔ کلاڈینا نے پھر کہا۔

"تم یونانی ہو؟ کیا تمہیں میری زبان سمجھ نہیں آ رہی؟ میں یونانی زبان میں بھی بات کر سکتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟"

اب ان میں سے ایک لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ تم تو رومی فوجیوں کے ساتھ آئی ہو۔ تم خوش نصیب ہو اپنے گھر جا رہی ہو۔ اپنے ماں باپ سے ملو گی۔ چھوٹے بہن بھائیوں سے ملو گی، لیکن ہم، ہم تو

بس اپنی حسرتوں پر مضبوطی سے ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔ کیونکہ روتی ہوئی لڑکیاں بھی کوناڈس کو اچھی نہیں لگتیں۔"

کلاڈینا کا شک صحیح نکلا۔ اسے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے کوناڈس پر بے پناہ غصہ آنے لگا۔ یہ کیسا امیرالبحر تھا؟ یہ تو ایک ظالم قزاق تھا۔ اس کے کانوں کی لوئیں تمتما اٹھیں۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ گویا کوناڈس نے تمہیں اغوا کر رکھا ہے۔ باقی لڑکیاں کہاں ہیں۔ میں جب آئی تو اس وقت تمہاری تعداد گیارہ تھی۔"

"باقی اپنے اپنے کمرے میں ہیں۔ یہ دونوں کمرے ہمارے ہیں۔ وہ ساتھ والا "مونا" کا۔ اس سے اگلا "جانی" اور اس قطار میں آخری کرہ "شیتل" کا ہے۔ دوسری قطار میں بھی سب کمرے باندیوں کے ہیں۔ حیرت ہے کہ تمہیں کوناڈس نے ہمارے ساتھ اسی راہداری میں رکھا۔ حالانکہ تم تو اس کے لیے ایک معزز مہمان ہو۔"

کلاڈینا سارا معاملہ بخوبی سمجھ چکی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اور دماغ غصے سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کوناڈس کو رومی دربار میں پابہ زنجیر پیش کر دیتی۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ معاً اسے ایک خیال آیا اور اس نے پوچھا۔

"تو لوگوں نے یہ کیوں کہا کہ میں اس کی مہمان ہوں؟ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے میرے گھر جانے دے گا؟"

دونوں یونانی لڑکیوں کی آنکھوں میں پہلے تو حیرت دکھائی دی اور پھر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت کرنے لگیں۔

"وہ، دراصل یہاں کسی کو خنجر یا تلوار رکھنے کی اجازت نہیں۔ ہم تو اسلحہ کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ لیکن تم اپنے اسلحہ سمیت یہاں لائی گئی ہو۔ تم سے اسلحہ نہیں چھینا گیا۔ ظاہر ہے تم قیدی نہیں بلکہ مہمان ہو۔ اگر قیدی ہوتی تو تمہیں سب سے پہلے غیر مسلح کر دیا جاتا۔"

یونانی لڑکیوں کی بات ٹھیک تھی۔ اس طرف تو کلاڈینا کا خیال ہی نہیں گیا تھا۔ وہ سچ مچ اس نہج پر سوچنے لگی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اسے برے وقت کے لیے کوئی انتظام کر لینا چاہیے۔ اس نے کسی چوکنی ہرنی کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے یونانی لڑکیوں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی لہر تھی اور پھر اگلے لمحے وہ واپس مڑ رہی تھی۔

لیکن جانے سے پہلے اس نے ان کا شکریہ ادا کیا۔
"تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔ تم نے مجھے ایک ایک راستہ سمجھایا، ہوسکتا ہے میں تمہاری بھی مدد کروں۔"

کلاڈینا انہیں حیران و پریشان چھوڑ کر تیزی سے واپس اپنے کمرے میں آئی۔ اس نے اپنا دو دھاری بڑا خنجر باقی سامان سے الگ کیا اور اسے اپنے لباس میں چھپانے لگی۔ دراصل اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ جلد یا بدیر کوناڈس اس سے اسلحہ چھین لے گا۔ متجسس تو وہ پہلے سے ہی تھی۔ لیکن یونانی باندیوں سے بات کر کے اسے یقین ہوگیا کہ کوناڈس طرف ایک بحری لٹیرا ہے۔

دوسری طرف دونوں باندیاں ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات طے کر کے، تیزی سے راہداری کے آخری کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہ ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ باندیوں کا ایک دوسرے سے ملنا ممنوع تھا۔ حکم عدولی کرنے والی باندی کو کوناڈس اپنے ہاتھ سے پیٹتا تھا۔ وہ بے رحموں کی طرح تھپڑ مار مار کر معصوم دوشیزاؤں کا چہرہ لال کر دیتا۔ تیسری منزل پر کوئی پہریدار یا دربان نہ رکھے گئے تھے۔ سب باندیاں غیر مسلح اور بے ضرر تھیں۔ ان کے ایک دوسرے سے ملنے پر اس لیے پابندی تھی کہ وہ کہیں مل بھگت سے کوئی سازش نہ کرلیں۔ عموماً دن کے وقت جب کوناڈس جہاز کے عرشے پر ہوتا یا اگر جہاز لنگرانداز ہوتا اور وہ ساحل پر ہوتا...... تو کبھی کبھار قیدی لڑکیاں ایک دوسرے سے مل لیا کرتیں۔ وہ جلدی جلدی ایک دوسرے کا حال احوال سنتیں اور پھر اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتیں۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ سب ایک جگہ اکٹھی ہوئی ہوں۔ البتہ دو یا زیادہ سے زیادہ تین باندیاں کبھی کبھی چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے سے بات کرلیتیں۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کوناڈس ابھی تک باہر تھا اور دیوہیکل پہریدار کلاڈینا کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ پہریدار تیسری منزل کے صدر دروازے پر متعین رہتا۔ وہ کبھی کبھار ہی راہداری میں آتا۔ عام طور پر راہداری میں موجود سب کمرے حسیناؤں کے لیے مخصوص تھے۔ دائیں طرف کا آخری کمرہ شیتل کو ملا تھا اور بائیں طرف کے پہلے دو کمرے خود کوناڈس کی خوابگاہ تھے۔ یہ کمرے کسی بادشاہ کی رہائش گاہ سے کم نہ تھے۔ بھاری پردے، نیلی بلوری صراحیاں، تخت پوش، بہادر دیوتاؤں کے مجسمے، چاندی کے برتن اور سونے کے دستوں والی فارسی تلواریں، فرش

پر دبیز ایرانی قالین اور منقش چھت پر فانوس میں جگمگاتے قمقمے۔ ایک کمرے میں وہ خود سوتا تھا اور دوسرے کمرے میں اس کی خاص الخاص افریقی خادمہ۔ جتنا ظالم کوناڈس تھا، اس سے دگنی ''قسطونا'' تھی۔ وہ حبشہ کی رہنے والی تھی۔ کوناڈس کے ساتھ اسے ایک عرصہ ہو چلا تھا۔ پست قد اور بھدے جسم کی مالک قسطونا نہ جانے اپنی ہی نسل کی دشمن کیوں تھی؟ وہ باندی لڑکیوں سے اتنی سختی کے ساتھ پیش آتی گویا ان سے انتقام لے رہی ہو۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں تھی، لیکن اپنے بھدے جسم اور مکروہ چہرے کی وجہ سے وہ پچاس سے اوپر کی دکھائی دیتی تھی۔ وہ کسی لڑکی کو کبھی خود سزا نہ دیتی۔ بس کوناڈس سے شکایت کر دیتی۔ کرناڈس خود ملزمہ کے کمرے میں جا کر اسے بری طرح زدوکوب کرتا۔ آج خوش قسمتی سے قسطونا موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یونانی باندیاں عجلت میں شیتل کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

ہاں یہ شیتل کا کمرہ تھا۔ وہ کوناڈس کی باندیوں میں نئی نئی شامل کی گئی تھی۔ یہ وہی شیتل تھی جو کچھ دن پہلے قرطاجنہ کے بڑے مندر ملکرت کی ایک نرتکی تھی۔ اسے ملکرت کے مہا پجاری کا ہوبال کے بیٹے سنتوش کی مدد کرنے کے نتیجے میں قرطاجنہ سے فرار ہونا پڑا تھا۔ شیتل بہت دکھی تھی۔ اسے سنتوش کے ساتھ پیار ہو گیا تھا۔ لیکن سنتوش اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔ آخری بار وہ دونوں کوناڈس کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ ایک یونانی سوداگر کے جہاز میں قرطاجنہ سے فرار ہوئے تھے۔ لیکن راستے میں جہاز کو بحری قزاقوں نے لوٹ لیا تھا۔ یہ بحری قزاق کوئی اور نہ تھے بلکہ رومی امیر البحر کوناڈس خود ان کا سرغنہ تھا۔ کوناڈس نے یونانی سوداگر کے جہاز پر حملہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد سوداگر کے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ یہ خونریز جنگ بھی کیدارا کی وجہ سے ہوئی تھی۔ سنتوش اور شیتل کا لیبیائی محافظ، جس نے اپنے کانوں میں بڑے بڑے چھلے پہنے ہوئے تھے۔ کیدارا نے یونانی سوداگر کے تنخواہ دار پہریداروں سے بھی بڑھ کر ہمت دکھائی۔ وہ جان توڑ کر لڑا۔ اس نے آن کی آن میں کوناڈس کے سات سپاہیوں کا خاتمہ کر دیا۔ کوناڈس اس کی تیزی اور بہادری دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو کیدارا کو قتل کرنے کی بجائے کوناڈس نے اپنا غلام بنانا پسند کیا۔ جنگ ختم کس طرح ہوئی تھی؟ رومی قزاقوں نے رسی کا پھندا پھینک کر کیدارا کو گرا لیا تھا اور اب کیدارا نیچے تہہ خانے میں جہاز کھینے والے کڑیل ملاح غلاموں میں سے ایک تھا۔

شیتل جب سے آئی تھی کوناڈس کے ظلم و ستم کا شکار تھی۔ سنتوش کو کوناڈس نے

گرفتار ہونے والے باقی لوگوں کے ساتھ ایک غلام کے طور پر بیچ دیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح غلاموں سے بھرا ایک جہاز روم کی جانب چل پڑا تھا۔ جس میں قرطاجنہ کے مہا پجاری کا بیٹا سنتوش بھی قید تھا۔ اسے نرتکی کا عشق بہت مہنگا پڑا تھا۔ لیکن اب بھی وہ شیتل کے بارے میں ہی سوچتا تھا۔ وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ قزاقوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اسے اپنے بک جانے کی فکر نہیں تھی، لیکن اپنی شیتل کے لٹ جانے کا ڈر تھا۔ اس کا یہ ڈر سچ ثابت ہوا۔ اس کی شیتل لٹ چکی تھی۔ شیتل دن بھر اپنے کمرے میں اوندھے منہ پڑی نہ جانے کون سی سوچوں میں گم رہتی۔ دروازے پر کھٹکا ہوا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ دونوں یونانی باندیاں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ شیتل اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے شیتل کے پاس آ کر سرگوشی میں بات کرنے لگی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا:۔

''شیتل!...... ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ لیکن وہ رومی ہے۔ اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ وہ ہماری مدد کرسکتی ہے۔''

شیتل کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس کا دوران خون تیز ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچوں کی رو گزرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد شیتل نے کہا۔

''اگر اس کے پاس اسلحہ ہے تو ہوسکتا ہے وہ رومی قزاق کی وفادار ہو...... ارے ہاں تم دونوں کتنی بیوقوف ہو۔ تم دونوں ہی اندر آ گئیں۔ ''سائیکی''! تم باہر راہداری میں رکو۔ اگر دیکھو کہ قسطونا آ رہی ہے تو ہمیں خبر کردو۔''

شیتل نے یونانی باندیوں کو ان کی غلطی کا احساس دلایا۔ ان میں سے ایک جس کا نام سائیکی تھا دوبارہ باہر چلی گئی۔ جبکہ دوسری باندی جس کا نام ''تھیسیا'' تھا، شیتل کو بتانے لگی۔

''نہیں!...... وہ کوناڈس کی ساتھی نہیں ہوسکی۔ وہ کوناڈس کو رومی امیر البحر سمجھ کر یہاں آئی ہے۔ کوناڈس نے بھی اسی لیے اس سے اسلحہ نہیں چھینا کہ وہ اس کی ہم وطن ہے۔ شاید وہ اس کے ساتھ زبردستی بھی نہ کرے۔ مجھے اس جہاز میں سب باندیوں سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ میں کوناڈس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ اس رومی دوشیزہ کو چاپلوسی کے ذریعے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرے گا۔ ہم نے اس کے ساتھ بات کی ہے۔ وہ خود ہماری

مدد کرنا چاہتی ہے۔"

شیتل بڑے دھیان سے تھیسیا کی باتیں سن رہی تھی۔ تھیسیا لگ بھگ ایک سال سے یہاں تھی۔ کوناڈس کی موجودہ داشتاؤں میں تھیسیا سب سے پرانی تھی۔ چنانچہ شیتل نے اس پر بھروسہ کیا۔ اور یہ یقین کرلیا کہ نئی آنے والی رومی لڑکی ان کی مدد کرے گی۔ یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا اور کہا۔

"یہ بات ہے تو پھر میں اسے ملوں گی۔ مجھے اپنے فرار ہونے سے زیادہ کوناڈس سے بدلہ لینے کی طلب ہے۔ اگر اس لڑکی نے مجھے کوئی اسلحہ دے دیا تو میں کوناڈس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

تھیسیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم کوناڈس کو قتل کردو گی؟...... نہیں نہیں! ایسا نہ کرنا۔ ہم اس کے جہاز پر ہیں۔ سارا عملہ اس کا ہے۔ اس کے سالار غیظ و غضب سے ہم سب کو مار دیں گے۔"

شیتل چونک گئی اور سوچتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ تھیسیا کا منہ تکنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

"نہیں! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ کوناڈس کے جیتے جی ہم فرار نہیں ہوسکتے۔ اس کو قتل کرکے ہی ہم اپنا مقصد پاسکتے ہیں۔"

"نہیں شیتل! تم جذباتی ہورہی ہو۔ میں تمہیں طریقہ بتاتی ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے تو تم کوناڈس کو اسلحہ کی زد پر یرغمال بناسکتی ہو اور یہ مطالبہ کرسکتی ہو کہ جب تک سب لڑکیوں کو رہائی نہیں مل جاتی تم اسے چھوڑو گی نہیں۔ اس طرح وہ مجبور ہوجائے گا کہ ہمیں اپنے لشکر سے دور جانے دے۔"

شیتل کی سمجھ میں تھیسیا کی ترکیب آرہی تھی۔ اسلحہ کی زد پر کوناڈس بے بس کیا جاسکتا تھا۔ اسی اثنا میں سائیکی نے دروازہ کھولا اور سر اندر کرکے کہا۔

"تھیسیا! جلدی نکلو! قسطونا آرہی ہے۔"

تھیسیا بجلی کی سرعت سے شیتل کے کمرے سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ قسطونا بغلی راہداری سے راہداری میں داخل ہوتی، سائیکی اور تھیسیا اپنے اپنے کمروں میں گھس چکی تھیں۔ قسطونا اپنے بھدے جسم کو سمیٹتی مخصوص انداز میں چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ

گئی۔تھیسیا کے چلے جانے کے بعد شیتل گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی اسے امید کی کرن دکھائی دی تھی۔آزادی کا خیال آتے ہی شیتل کو سنتوش کا خیال آیا۔روز کی طرح اس کی آنکھیں ٹپ ٹپ آنسو برسانے لگیں۔وہ کہاں ہوگا؟ کس حال میں ہوگا؟ اسے جہاز پر رہتے ہوئے دوسری باندیوں کے ذریعے اتنا پتہ چلا تھا کہ سنتوش کو باقی غلاموں کے ساتھ رومہ بھیج دیا گیا ہوگا جہاں اسے غلاموں کی منڈی میں فروخت کر دیا جائے گا۔قبل مسیح کے اس زمانے میں غلاموں کی خرید وفروخت عام اشیاء مثلاً کپڑے، برتن یا نمک مرچ کی خرید وفروخت جیسی تھی۔ مویشیوں کی منڈیوں کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کی منڈیاں بھی ہفتہ وار منعقد ہوتی تھیں۔ ایک بڑے سے چبوترے پر غلاموں اور لونڈیوں کو قطاروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح باندھ کر کھڑا کر دیا جاتا اور ان کی نیلامی باقاعدہ بولی کے ذریعے عمل میں آتی۔

شیتل چشم تصور میں خوبرو سنتوش کے نام کی بولی سن رہی تھی۔اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور دل غم کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔گزشتہ دو راتوں سے کوناڈس اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔

کوناڈس سردست بہت مصروف تھا۔یہی وجہ تھی کہ گزشتہ دو راتیں...... اس نے بغیر کسی لڑکی کے گزاری تھیں اور آج تو اسے مصروفیت کے ساتھ ساتھ ایک سنگین پریشانی بھی لاحق ہوگئی تھی۔ارمنیدس کا لشکر تباہ ہو چکا تھا۔یہ خبر کوناڈس کے لیے حد سے زیادہ پریشان کن تھی۔روم کی بری فوج کا ایک بڑا حصہ ارمنیدس کے ساتھ ہی تباہ و برباد ہوگیا تھا۔چنانچہ سچ مچ کوناڈس کی طبیعت آج عیاشی کی طرف مائل نہ ہوئی۔وہ غروب آفتاب تک جہاز کے عرشے پر کھڑا رہا۔پھر رات کا اندھیرا چھاتے ہی وہ اپنے کمرے میں آیا اور بے تحاشا شراب پینے لگا۔

کوناڈس کی رگوں میں شراب اتری تو اس کی طبیعت بدلنے لگی۔لیکن آج وہ کسی اور کے کمرے میں نہ جانا چاہتا تھا۔بلکہ نئی حسینہ یعنی کلاڈینا کے شباب اور حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔اس نے چاہا کہ اٹھ کر کلاڈینا کے کمرے تک چلا جائے۔لیکن بہت زیادہ شراب پینے کی وجہ سے وہ لڑکھڑانے لگا۔چنانچہ وہ رک گیا اور واپس اپنے بستر پر گر گیا۔

دوسرے روز ارمنیدس کے لشکر کے کچھ اور بھگوڑے بھی آ پہنچے۔کوناڈس کو ثبوت مل گیا کہ فی الواقع رومی لشکر برباد ہوگیا تھا۔

کوناڈس نے نئے احکامات جاری کیے۔ لشکر کے کچھ جہاز ساحل پر چھوڑ دینے کا حکم دیا تا کہ بھولے بھٹکے رومی سپاہیوں کو نکالا جاسکے۔ باقی تمام جہازوں کو "سفید کھاڑی" تک بیڑے کی صورت چلنے اور سفید کھاڑی کے مقام سے ٹولی در ٹولی تتر بتر ہونے کا حکم جاری کردیا۔ جہازوں پر ہلچل مچ گئی۔ کوناڈس کا اپنا جہاز سب سے پہلے برآمد ہوا۔ تہہ خانے کے ہال میں موجود حبشی ملاحوں کے چپو کئی دن بعد پھر حرکت میں آئے۔ سفید کھاڑی ساحل کے ساتھ ساتھ سو کلومیٹر تک چلنے کے بعد آتی تھی۔ یہاں سے بیڑے کو کھلے سمندر میں داخل ہونا تھا۔ کوناڈس کو تسلی تھی کہ رومی ساحلوں کے ساتھ اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کوناڈس کا بیڑا واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ اس نے اپنے نائب امیرالبحر کو پیچھے رہ جانے والے جہازوں کے ساتھ چھوڑا اور خود برق رفتاری سے سمندر میں اپنے جانے پہچانے راستوں پر چل پڑا۔ کوناڈس کے سہ منزلہ جہاز کا طمطراق بیڑے کے باقی جہازوں سے جدا تھا۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ قرطاجنیوں کے خلاف انتقام اور غم و غصے نے اسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بوڑھے موآبریلیس کو پچھاڑ کر اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرے۔ لیکن براہ راست مڈبھڑ سے وہ اب بھی ڈرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے بیڑے کو ہمیشہ ٹولیوں میں تقسیم کر کے رکھا تھا۔ کوناڈس جہاز کے عرشے پر کھڑا قرطاجنی امیرالبحر کے ساتھ جنگ کرنے کی ترکیبوں پر غور کر رہا تھا۔ گزشتہ شب اس نے کسی باندی کو اپنی ہوس کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ کھلے سمندر میں آتے ہی جیسے اس کے ہواس بحال ہونے لگے۔ سمندر کا شکرا اپنی آزاد اور پسندیدہ فضاؤں میں واپس لوٹ رہا تھا۔ اسے رومی لشکر کی شکست کا غم کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ کوناڈس کا جہاز سمندر کی لہروں پر ڈولتا تیزی سے بحر روم کے شمالی ساحلوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ کوناڈس کے بیڑے کو مشہور سفید کھاڑی تک یکجا ہو کر چلنا تھا۔

شام ہوئی لیکن کوناڈس نے اپنے جہازوں کو رکنے کے لیے نہ کہا۔ یہ تیز رفتار سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ رات چھانے لگی۔ حبشی غلام بار بار باریاں بدل رہے تھے۔ کسی کو سونے کی اجازت نہ تھی۔ بیڑے کے تمام جہازوں کی مشعلیں روشن تھیں۔ سفید کھاڑی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ سفید کھاڑی ایک عجب مقام تھا۔ یہاں سخت چونے کی اونچی چٹانیں تھیں۔ جن میں ایک وسیع و عریض کھاڑی قدرتی طور پر بنی ہوئی تھی۔ کھاڑی کیا تھی ایک

لبوتری جھیل جو سفید پہاڑیوں کو کاٹتی ہوئی زمین میں دو کلو میٹر آگے تک چلی گئی تھی۔ اس لمبی جھیل کے چاروں طرف اونچی سفید چٹانیں تھیں جو سب کی سب سخت چونے کے پتھر سے قدرتی طور پر بنی ہوئی تھیں۔ کھاڑی کا صرف ایک سرا کسی دہانے کی طرح کھلا تھا جہاں سے سمندر کا پانی کھاڑی میں داخل ہوتا اور نکلتا تھا۔ تجارتی یا عسکری حوالے سے سفید کھاڑی کسی کام کی نہیں تھی۔ چونے کے گرم پتھروں پر نہ تو بندرگاہ بنائی جاسکتی تھی اور نہ ہی ان اونچی چٹانوں سے نیچے سمندر کی سطح تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ تھا۔ یہ کھاڑی گویا محض ایک ویرانہ تھی۔ البتہ کوناڈس سفید کھاڑی کو کبھی کبھار اپنی ایک کمین گاہ کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ رومی ساحلوں کا علاقہ تھا۔ اور اس طرح قرطاجنیوں کے آنے کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس مرتبہ بھی جب کوناڈس، ارمعیدس کے لشکر کو نکالنے کے لیے آیا تو اس نے کھاڑی میں اپنے دس لڑاکا جہاز پہریداری کے لیے چھوڑ دیئے۔ یہی وجہ تھی کہ واپسی کے سفر میں کھاڑی تک کے تمام راستے میں اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ عرشے پر کھڑا دور مغرب میں اپنی آنکھیں گاڑے تاریکیوں کو ٹٹولتا رہا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کے باوجود اس کا اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ کیا یہ کسی انجانے خطرے کی اطلاع تھی۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر اپنے آپ کو خود ہی جواب دیا۔

"نہیں نہیں!! ہم بحروم کے شمالی پانیوں میں ہیں۔ یہ ہمارا علاقہ ہے، یہاں مشرق میں یونان کی آخری بندرگاہ سے لے کر مغرب میں سپین کی پہلی بندرگاہ تک سینکڑوں کلومیٹر کا ساحل ہمارا ہے۔ کارتھیوں کی اتنی مجال نہیں کہ وہ شمال کے پانیوں میں آئیں۔ اصل میں مجھے بری فوج کی شکست کے غم نے پریشان کر رکھا ہے۔"

کوناڈس نے اپنے کندھے اچکائے۔ اس نے خود کو تسلی بخش جواب دے لیا تھا۔

چنانچہ اس نے مزید اپنے ذہن پر دباؤ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور عرشے سے نیچے اتر آیا۔ رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ سب جہازوں کی مشعلیں روشن تھیں۔ سفید کھاڑی نزدیک تھی۔ وہ تیسری منزل کی چوبی عمارت میں داخل ہوا۔ راہداری میں پہنچتے ہی اس کا دل مچلنے لگا۔ رومی حسینہ کا تصور کر کے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج ضرور رومی حسینہ سے لطف اندوز ہوگا۔ یہی خیال دل میں لیے وہ اپنے کمرے میں آیا۔ اس کی خادمہ قسطونا اس کی

منتظر تھی۔ وہ کمرے کے فرش پر سر جھکائے کھڑی نہ جانے کب سے کوناڈس کا انتظار کر رہی تھی۔ کوناڈس نے جونہی کمرے میں قدم رکھا وہ چونکا۔

”کیا بات ہے قسطونا! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

حبشہ کی رہنے والی بھدی اور کالی قسطونا نے سر اوپر اٹھائے بغیر کوناڈس سے کہا۔

”آج وہ قرطاجنی لڑکی نئی رومی مہمان کے کمرے میں گئی تھی۔ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں یہ معلوم نہیں ہو سکا۔“

کوناڈس کا ماتھا ٹھنکا۔“

”نئی مہمان کے کمرے میں؟؟ کیا مطلب؟ وہ وہاں کیا کرنے گئی تھی؟“

”یہ تو معلوم نہیں میرے آقا!“

کوناڈس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد قسطونا کو حکم دیا۔

”جاؤ! قرطاجنی لڑکی کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔“

قسطونا نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

کوناڈس نے ایک ہاتھ میں صراحی اور دوسرے میں جام اٹھا لیا۔ آج وہ رومی حسینہ کا مزا چکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے شیتل کو تفتیش کی نیت سے یہیں بلوا لیا۔ اس نے بلوری صراحی سے بلوری جام میں لال شراب انڈیلی اور ایک ہی سانس میں جام خالی کر دیا۔ اب وہ اپنی شاہی مسہری پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد قسطونا اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں شیتل تھی۔

”رومی مہمان کے کمرے میں تم کیا کرنے گئی تھی۔“

کوناڈس نے کڑکدار آواز میں شیتل سے سوال کیا۔ کوناڈس کے لہجے کی گونج راہداری کے سارے کمروں میں سنی گئی۔ کلاڈینا نے بھی اپنے کمرے میں کوناڈس کی آواز سن لی۔ وہ یک لخت اپنی جگہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اگلے لمحے وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ لڑکیاں بھی سہمے ہوئے چہرے لیے اپنے اپنے دروازوں کے پٹ کھولے سر باہر نکالے کھڑی تھیں۔ سب نے شیتل کی آواز سنی۔

”میں اسے خبردار کرنے گئی تھی، اسے یہ بتانے گئی تھی کہ رومی امیرالبحر کسی مہذب

ملک کا سالار نہیں بلکہ ایک قزاق اور لٹیرا ہے۔"

شیتل نے پہلی مرتبہ اتنی جرأت کے ساتھ بات کی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آج اس نے اپنے لباس میں ایک تیز دھار خنجر چھپا رکھا تھا۔ شیتل کا لہجہ دیکھ کر کوناڈس تو جیسے پاگل ہوگیا۔ اس کی کنپٹیاں تمتما اٹھیں۔ وہ غصے اور اشتعال کی حالت میں اٹھا اور اپنی عادت کے مطابق آگے بڑھ کر معصوم شیتل کے منہ پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ طمانچے کی چٹاخ راہداری میں گونجی تو سب لڑکیوں کے دل دہل گئے۔ لیکن کلاڈینا کا خون کھول اٹھا۔ وہ دوبارہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی شمشیر اٹھا کر ایک عجب عزم کے ساتھ کوناڈس کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ راہداری میں موجود باقی لڑکیوں نے کلاڈینا کو دیکھا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ بے ساختہ اپنے اپنے کمروں سے ایک ایک کر کے باہر نکل آئیں۔ اس دوران سب نے کوناڈس کی آواز پھر سنی۔

"میں تمہیں عبرت کا نشان بنادوں گا۔ نادان لڑکی! تمہاری گستاخ زبان کو کھینچ کر تمہیں خوفناک مگرمچھوں کے آگے پھینک دوں گا۔ قسطونا! کوڑا لاؤ!"

کوناڈس نے اپنی وفادار خادمہ کو کوڑا لانے کا حکم دیا۔ آج وہ اس گستاخ لڑکی کو تھپڑوں سے بھی زیادہ سزا دینا چاہتا تھا۔ لیکن شیتل تھی کہ ابھی تک تن کر کھڑی تھی۔ وہ پھر کہنے لگی۔

"اے گھٹیا قزاق!...... تیرے خاتمے کا وقت آ پہنچا ہے۔ تو نے بہت معصوموں کی آبروئیں لوٹیں، آج تو نہیں بلکہ میں تجھے عبرت کا نشانہ بنادوں گی۔"

اتنا کہتے ہی شیتل نے اپنے لباس سے لمبے پھل والا خنجر نکالا اور کوناڈس پر حملہ کردیا۔ کوناڈس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ قرطاجنی باندی کے پاس خنجر ہوگا۔ چنانچہ وہ خود کو نہ بچا سکا۔ شیتل کا پہلا وار ہی اس کے پیٹ میں لگا۔ لمبے خنجر کی نوک دوسری طرف پیٹھ کے پیچھے سے باہر نکل گئی۔ کوناڈس "اوخ" کی آواز نکالتا ہوا نیچے کی طرف جھکا اور اس نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ شیتل نے کوناڈس کے پیٹ میں کھبا ہوا خنجر زور سے واپس کھینچا اور اس کے پیٹ سے باہر نکال لیا۔ خنجر نکلنے کی دیر تھی کہ کوناڈس پیچھے کی طرف لپکا۔ شیتل کے دوسرے وار سے پہلے ہی وہ شیتل کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ اس نے دیوار پر لٹکی

اپنی سونے کے دستے والی شمشیر اتاری اور آن واحد میں اسے بے نیام کر کے شیتل پر حملہ کر دیا۔ پیٹ میں اتنا لمبا خنجر کھانے کے بعد بھی وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے اسے زخم آیا ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس کے کپڑے اور نچلا دھڑ خون میں لت پت ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی قوت اور پھرتی میں اس گھاؤ کے باوجود کوئی فرق نہ آیا تھا۔ حبشی خادم قسطونا ہاتھ میں کوڑا تھامے ایک طرف کھڑی تھر تھر کانپ اور ہونقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ کوناڈس کا خطرناک وار، ضرور شیتل کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دیا اگر کلاڈینا بروقت نہ پہنچ جاتی۔ کوناڈس کا وار کلاڈینا نے اپنی تلوار پر روکا۔ ٹن اور اب کوناڈس اپنے دیدے پھاڑے رومی حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تت!...... تم کک...... کیوں؟ تم تو رومی ہو۔ میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔"

وہ بات کرتا رہا لیکن دونوں کی تلواریں بھی چلتی رہیں۔ اسی اثنا میں شیتل کی نظریں کوڑا بردار قسطونا پر پڑیں تو اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔ مکار قسطونا فوراً شیتل کا ارادہ بھانپ گئی اور کوڑا پھینک کر الٹے پاؤں بھاگی۔ شیتل نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن کلاڈینا کا خیال کر کے رک گئی۔ اس نے سوچا ایک کمزور لڑکی اکیلی شاید اس خونخوار درندے کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اب تو سچ مچ کوناڈس نے کلاڈینا پر بھیانک وار کر دیا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکل رہا تھا۔

"میں تمہاری ایک ایک بوٹی چبا جاؤں گا۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم رومی امیر البحر پر ہاتھ اٹھاؤ۔"

موٹی قسطونا دوڑتی ہوئی باہر راہداری میں آئی تو اس کے سامنے مظلوم لڑکیوں کا پورا دستہ کھڑا تھا۔ سب سے پہلے سائیکی اور تھیسیا آگے بڑھیں۔ قسطونا اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئی اور ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگنے لگی۔ لیکن تھیسیا نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنے دائیں ہاتھ کا مکا اس کی موٹی آنکھ پر جڑ دیا۔ قسطونا کے حلق سے اتنی زور دار چیخ نکلی کہ سب لڑکیوں کے دل دہل گئے۔

اندر کوناڈس کے کمرے میں ابھی تک جنگ جاری تھی۔ کلاڈینا ایک ماہر تلوار باز کی طرح پینترے بدل رہی تھی۔ اس نے قرطاجنیوں کے لشکر میں کئی ماہ گزارے تھے اور اب تو وہ

خود کو ایک سپاہیہ تصور کرتی تھی۔ گھاگ کوناڈس میں بھی...... اب آہستہ آہستہ قوت کم ہو رہی تھی۔ قریب تھا کہ کوناڈس غش کھا کر گر پڑتا کہ اچانک باہر راہداری میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوناڈس فوراً جان گیا کہ اس کا قوی ہیکل دربان اس کی مدد کے لیے آ پہنچا ہے۔ شیتل کو جونہی دربان کے آنے کا اندازہ ہوا وہ دوڑ کر دروازے کے نزدیک آئی اور پہلو میں لگ کر کھڑی ہوگئی۔ ٹھیک اسی...... وقت قوی ہیکل دربان نے کمرے میں قدم رکھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کی سنگینی کو سمجھتا شیتل کسی بھوکے شیر کی طرح لپکی اور اپنے لمبے خنجر سے قوی ہیکل دربان پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے خنجر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سر سے بھی اونچا کر رکھا تھا۔ اس نے خنجر کو کسی پرچم کی طرح لہرایا اور اندھادھند قوی ہیکل دربان کے سینے میں پیوست کر دیا۔ نہ جانے اس کے نازک بازوؤں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ خنجر پورے کا پورا دربان کے چوڑے سینے میں کھب گیا، پسلیوں کے بیچوں بیچ سے باہر ہونے والا خنجر اتنی سختی سے کھبا کہ شیتل اسے واپس نہ کھینچ سکی۔ خنجر شیتل کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

کوناڈس نے اپنے دربان کا یہ حال ہوتے دیکھا تو اسے موت اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے چاہا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلے۔ وہ بے حد زخمی تھا اور اس کا بہت زیادہ خون بھی بہہ چکا تھا۔ معاً پیچھے ہٹتے ہٹتے کوناڈس ساتھ والے کمرے کے درمیانی دروازے سے ٹکرایا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو اس کی خاص خادمہ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ تیسری منزل کے باقی تمام کمروں میں درمیانی دروازے نہیں تھے۔ یہ کمرہ غالباً جہاز کے دفتر کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جسے عیاش کوناڈس نے اپنی خوابگاہ بنا رکھا تھا۔ کوناڈس جونہی دروازے سے ٹکرایا دروازہ کھل گیا۔ یہ بھاگ نکلنے کا اچھا راستہ تھا۔ کوناڈس ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کلاڈینا اسے للکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ لیکن کوناڈس تو بس اب اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بایاں ہاتھ اپنے پیٹ کے گھاؤ پر دھرا ہوا تھا۔ اور دائیں ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ڈگمگاتا لیکن تیزی سے دوڑتا ہوا راہداری میں نکل آیا۔ راہداری میں اس کے سامنے اس کی پسندیدہ حسینائیں کھڑی تھیں۔ اگر کوناڈس کے ہاتھ میں تلوار نہ ہوتی تو اس کی باندیاں آج اپنے ہاتھوں سے ہی اس کی تکا بوٹی کر دیتیں۔ تلوار کو دیکھ کر سب لڑکیاں دائیں بائیں ہٹ گئیں۔ ایک طرف دیوار کے پاس حبشی قسطونا اوندھی پڑی

لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ دس لڑکیوں کی لاتوں اور گھونسوں نے اسے نیم جان اور ادھ موا کر دیا تھا۔ کلاڈینا بھی کوناڈس کے عقب میں دوڑی لیکن وہ اب خطرے سے دور جا چکا تھا۔ وہ بغلی راہداری مڑ چکا تھا۔ جو تیسری منزل کے صدر دروازے پر ختم ہوتی تھی۔

سب لڑکیوں کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ کیونکہ کوناڈس زندہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آخر وہ رومی بحریہ کا سپہ سالار تھا۔ تیسری منزل سے نکلتے ہی وہ اپنے جنگجو سپاہیوں کو آواز دیتا جو آن واحد میں باغی لڑکیوں کو کاٹ کر پھینک دیتے۔ یہی سوچ کر سب باندیاں تھر تھر کانپنے لگیں۔ لیکن کلاڈینا نے گرج کر کہا۔

"خبردار! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کوناڈس بچ نہیں سکتا۔ وہ ضرور مر جائے گا۔ اس کو بہت گہرا زخم آیا ہے۔"

ابھی یہ بات کلاڈینا کے منہ میں ہی تھی کہ یکا یک ایک عجیب سا شور بلند ہوا۔ بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید دوسرے جہازوں پر بھی شور مچا ہوا تھا۔ کوناڈس کے سہ منزلہ جہاز پر یک لخت بھگدڑ مچ گئی۔ حالانکہ سمندر میں نہ تو کوئی طوفان آیا تھا اور نہ ہی دور دور تک دشمن کی کوئی توقع تھی۔ پھر یہ شور کیسا تھا؟ کلاڈینا سمیت سب لڑکیاں چونکی ہو گئیں۔ کسی طرف سے آواز سنائی دی:۔

"حملہ حملہ حملہ!...... وہ سفید کھاڑی سے نکل رہے تھے۔"

سب لڑکیوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ قدرت کا عجیب اتفاق تھا۔ ٹھیک اس وقت جب کوناڈس زخمی ہو کر تیسری منزل سے فرار ہوا کوناڈس کے جہازوں پر حملہ ہو گیا۔

سفید کھاڑی میں کوناڈس کے دس جہازوں کی بجائے بوڑھے امیر البحر...... مایہ ناز سمندری سالار، تجربہ کار "موآبریس" کے جہاز گھات لگائے بیٹھے تھے۔ عرصہ دراز سے موآبریس کے دل میں یہی آرزو تھی کہ وہ رومی بیڑے کو کسی ایک جگہ گھیر کر مارے۔ طویل محنت اور پیچیدہ سمندری جاسوسی نظام کے بعد بوڑھے موآبریس کے علم میں آیا کہ شمال مشرقی پانیوں میں کوناڈس کا بیڑا جمع ہو رہا ہے۔ وہ کسی خاموش رات کے چیتے کی طرح سمندر میں راتوں کو سفر کرتا ہوا سفید کھاڑی تک آیا تو اس کو مڈبھڑ کوناڈس کے دس جہازوں سے ہو گئی۔ کوناڈس کے سپاہیوں نے بھاگنے کی لاکھ کوشش کی لیکن بوڑھے موآبریس نے سارے رومیوں

کو ہلاک کر دیا۔ اس نے ان کے جہاز ہتھیا لیے اور خود یہیں ٹھہر کر انتظار کرنے لگا کیونکہ اب اسے پتہ چل چکا تھا کہ کوناڈس یہیں پٹنے والا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے غضب کی جنگ چھڑ گئی۔ کوناڈس بے ہوش ہو چکا تھا اور ماہر رومی طبیبوں کی ایک ٹولی اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اب اس کی قیادت نوجوان ''شیراٹن'' کے ہاتھ میں تھی۔ رومہ کی مجلس شوریٰ نے شیراٹن کو کوناڈس کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ جب سے قرطاجنی امیر البحر نے سمندر میں قدم رکھا تھا رومہ کی مجلس بحر روم کی طرف سے متفکر ہوگئی تھی۔ انہوں لاطینی نسل کے بے بدل سپاہی ''شیراٹن'' کو چالیس نئے جہازوں کے ہمراہ کوناڈس کی طرف روانہ کیا۔ رومی مجلس کی یہ مداخلت کوناڈس کو پسند نہ آئی۔ لیکن وہ طوعاً و کرھاً خاموش رہا۔ شیراٹن رومی بحریہ کا سپاہی نہیں تھا۔ اس کا تمام تر تجربہ اور تربیت مشرقی بحر روم میں مکمل ہوئی تھی۔ اس نے کریٹ کے ملاحوں کے ساتھ کئی سال کشتی رانی کی تھی۔ لڑکپن میں ہی اس کے باپ نے اسے جزیرہ کریٹ کے بحری جنگجوؤں کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ نسلاً رومی تھا۔ اس لیے جب پچیس سال کی عمر میں روم آیا تو نہایت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ شیراٹن بنیادی طور پر ایک سپاہی تھا۔ اسے کوناڈس کی قزاقیت سخت ناپسند تھی۔ لیکن عہدے میں کم مرتبے کا ہونے کی وجہ سے شیراٹن نے کبھی کوناڈس کے کام میں مداخلت نہ کی تھی۔ آج اسے اچانک اپنے بیڑے کی قیادت سنبھالنی پڑی۔ کیونکہ امیر البحر کوناڈس کو اس کی داشتاؤں نے بری طرح گھائل کر دیا تھا اور اب وہ طبیبوں کے نرغے میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ حملہ بہت زوردار تھا۔ موآبریس کے جہاز آندھی اور طوفان کی طرح سفید کھاڑی میں سے نکلے اور رومی بحری بیڑے کو نرغے میں لینے لگے۔ وہ بے پروائی کے ساتھ سوئے ہوئے رومی سپاہیوں پر آتش و آہن برسا رہے تھے۔ جہازوں کے ساتھ جہاز ٹکرا رہے تھے اور شعلوں کے ساتھ شعلے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بادبان جلنے لگے، مستول ٹوٹنے لگے، تختے اکھڑنے لگے اور سمندر میں ایک مصنوعی بھونچال آ گیا۔ بوڑھے موآبریس کے چاق و چوبند سپاہیوں نے رومی جہازوں کے ساتھ جہاز ٹکرائے اور تلواریں لہراتے ہوئے رومی جہازوں پر سوار ہونے لگے۔ آتش و آہن کی تیز ہوتی ہوئی آوازیں بحر روم کے کان پھاڑ رہی تھیں۔ جلتے ہوئے بادبانوں

اور مستولوں کی روشنی میں کہیں کٹتے ہوئے بازو دکھائی دیتے اور کہیں اچھلتے ہوئے سر۔ آج ایک بڑا سمندری معرکہ لڑا جا رہا تھا۔

دانشمند شیراٹن نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ سردست اس کے لیے اپنے زیادہ سے زیادہ جہازوں کو بچا کر لے جانا ہی کامیابی ہوگی۔ چنانچہ رومی جہازوں کے بھونپو چلا چلا کر کپتانوں کو کھلے سمندر میں نکل جانے کے احکامات جاری کر رہے تھے۔ کوناڈس کے بعد سہ منزلہ جہاز پر کوئی بڑا رومی افسر نہیں تھا۔ شیراٹن تو اپنے الگ جہاز پر تھا۔ چنانچہ جب سہ منزلہ جہاز کے عملے نے کھلے سمندر میں بھاگ نکلنے کے احکامات سنے تو جہاز کا رخ جنوب کی طرف کر دیا۔ جہاز کے عملے میں سب سے زیادہ معتبر ”سارکیس“ تھا۔ یہ ادھیڑ عمر ملاح دوڑ کر نیچے تہہ خانے میں آیا اور حبشی غلاموں کو مزید تیز چپو چلانے کے احکامات دینے لگا۔ لیکن سارکین کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تہہ خانے میں آ کر کتنی بڑی غلطی کر چکا ہے۔ اگرچہ ہر غلام کے پیر لوہے کی کڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن ہاتھ سب کے آزاد تھے۔ سارکیس جونہی لیبیائی نوجوان کیدارا کے نزدیک سے گزرنے لگا کیدارا نے کوڑا برداروں کی پروا کیے بغیر اٹھ کر سارکیس کو گردن سے دبوچ لیا۔ کوڑا بردار تیزی سے آگے بڑھا اور اپنا کوڑا لہرا کر غلام کو مارنے لگا تو کیدارا نے سارکیس کا جسم اس کے سامنے کر دیا۔ کوڑا بردار یکدم رک گیا۔ کیدارا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”میری کڑی کھولو! ورنہ میں اس رومی کی گردن مروڑ دوں گا۔“

سارکیس کی آنکھیں ابل کر باہر کو نکل رہی تھیں۔ کیدارا کے تنومند بازوؤں میں اتنی طاقت تھی کہ رومی افسر کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ کوڑا بردار ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھا۔ تب خود سارکیس نے اسے غلام کی بات ماننے کے لیے کہا۔

”اس کے پیر کی کڑی کھول دو۔“

سارکیس کے گلے سے خرخراہٹ زدہ آواز نکلی۔ پہریدار نے فوراً اپنے لباس میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور کیدارا کے پیروں کی کڑی کھولنے لگا۔ ایک زنجیر میں تین غلاموں کے پیر جکڑے ہوئے تھے۔ کیدارا آزاد ہوا تو مزید دو حبشی غلام اور بھی آزاد ہوگئے۔ پاؤں کی زنجیر سے چھٹکارا پاتے ہی کیدارا اچھل کر چوبی بنچوں سے نکل آیا۔ لیکن سارکیس کی گردن ابھی

تک کیدارا کی کہنی تلے تھی۔ کیدارا نے سارکیس کی گردن چھوڑنے سے پہلے اس کے لباس میں سے اس کا لمبا خنجر بے نیام کرلیا۔ سارکیس کی تلوار تو پہلے ہی گر چکی تھی۔ کیدارا نے خنجر کھینچا اور ایک جھٹکے سے اس کو پرے پھینک دیا۔ اگلے لمحے کیدارا زمین پر پڑا سارکیس کی تلوار اٹھا رہا تھا۔ کوڑا بردار پہریدار کو موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ کچھ کرے۔ لیکن کیدارا کو پورا پورا موقع مل گیا کہ وہ اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس نے تلوار اٹھائی اور بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر کوڑا بردار کی گردن پر وار کیا۔ اگلے لمحے اس کا دھڑ سر کے بغیر ہی ہاتھ میں کوڑا پکڑے رقص کر رہا تھا۔ سارکیس نے یہ منظر دیکھا۔ تو اس کے دیدے بری طرح پھیل گئے۔ کیدارا وحشی ہو چکا تھا۔ باہر کی آوازوں سے یہ اندازہ تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ رومی بیڑے کی کسی بڑی فوج کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تمام ترغیض وغضب کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اس نے مناسب جانا کہ سب سے پہلے بندھے ہوئے غلاموں کو آزاد کرائے۔ اس نے اپنے ساتھ آزاد ہونے والے دونوں حبشی غلاموں کو حکم دیا۔ اور وہ دونوں پہریدار کی لاش سے چابیوں کا گچھا حاصل کر کے باقی غلاموں کو آزاد کرنے لگے۔ سارے حبشی غلاموں نے بطور ہتھیار کے چپو اٹھا لیے اور آزاد ہوتے ہی کیدارا کی قیادت میں ایک جتھے کی صورت اکٹھا ہونے لگے۔

چپو چلنے بند ہوئے تو جہاز رک گیا۔ جہاز رکا تو اوپر موجود عملے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ سہ منزلہ جہاز کے بعض دیگر رومی افسر تہہ خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن تہہ خانے میں تو پچاس خوفناک غلاموں کا چپو بردار دستہ موجود تھا۔ آن کی آن میں تہہ خانہ رومی افسروں کا مقتل بن گیا۔ کیدارا کا دستہ کالے چیونٹوں کی طرح تہہ خانے کے دروازے سے ابل پڑا۔ ان کے سامنے کوئی شمشیر بردار بھی آتا تو لمبے چپو کا تھپڑ کھا کر وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ بہت جلد جہاز پر موجود رومیوں کا صفایا ہونے لگا۔ باغی غلاموں کا دستہ تھوڑی دیر بعد چپوؤں کی بجائے لمبی تلواریں لیے دوسری منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

انہوں نے پہلی منزل پر موجود تمام رومیوں کو مار دیا تھا۔ عملے کی سب سے زیادہ تعداد پہلی منزل پر ہی تھی۔ دوسری منزل پر موجود رومیوں نے باغیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ کیدارا دوڑ دوڑ کر دوسری منزل کے ہر ایک کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اسے شیتل کی

تلاش تھی۔ اپنی قید کے دوران اس نے جہاز پر موجود کوناڈس کی داشتاؤں کا ذکر سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ شیتل کو بھی اسی جہاز پر رکھا گیا ہوگا۔ اسے دوسری منزل کے کسی کمرے میں شیتل نہ ملی۔ لیکن ایک کمرے میں اس نے ایک عجب منظر دیکھا۔ تین چار ادھیڑ عمر طبیب کسی مریض پر جھکے ہوئے تھے۔ یہ کوناڈس تھا۔ جو زندگی اور موت کی کشمکش میں شاید اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ کیدارا نے کوناڈس کے چہرے کی رنگت دیکھی تو حیران رہا گیا۔ اسے تسلی ہو گئی کہ ظالم کوناڈس بچ نہیں پائے گا۔ کیدارا انہی قدموں واپس پلٹ گیا۔ اس کا رخ تیسری منزل کی طرف تھا۔ اور پھر جونہی کیدارا تیسری منزل کے دروازے سے راہداری میں داخل ہوا تو سامنے موجود شیتل کی مارے خوشی کے چیخ نکل گئی۔ وہ بھول گئی کہ کیدارا کون ہے۔ بیبا کانہ دوڑی اور لحیم شحیم حبشی کیدارا کے سینے سے آ لگی۔ ساتھ ہی شیتل کی آواز بلند ہوئی۔

"لڑکیو! اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ جہاز پر انقلاب آ چکا ہے۔"

سب لڑکیاں خوشی سے چیخیں مار مار کر اچھلنے لگیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ رہی تھیں۔ مارے خوشی کے ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ آج ان کی ناکردہ گناہ کے عذاب سے جان چھوٹ گئی تھی۔

لیکن کیدارا اور شیتل کی خوشی بہت ہی مختصر تھی۔ جو تھوڑی دیر بعد غم میں بدل گئی۔

ان کے جہاز پر قرطاجنی بحریہ کے سپاہی چڑھ آئے تھے۔ کیدارا کے کہنے پر غلاموں نے ان کے ساتھ جنگ کرنے کی نادانی نہیں کی تھی۔ سب نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ کیدارا نے قرطاجنی سپاہیوں کو خالص ان کی بولی میں بتایا کہ وہ سب قیدی ہیں اور ان کا رومی سپاہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ قرطاجنیوں نے غلاموں کو قتل نہ کیا۔ کوناڈس کی لونڈیاں ان کے ہاتھ لگیں تو انہوں نے نئی نویلی آزاد ہوئی باندیوں کو پھر سے زنجیروں میں جکڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی آزادی کی مدت بہت مختصر تھی۔ شیتل جان بوجھ کر منہ سے کچھ نہ بولی۔ اسے ڈر تھا کہ آنے والے قرطاجنی اسی کی تلاش میں آئے ہیں۔ لیکن کیدار بول پڑا۔

"محترم سالار! یہ سب لڑکیاں کوناڈس کی قیدی تھیں۔ یہ سب بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔ ان میں کوئی بھی رومی نہیں۔ جنگ کے قانون کی رو سے ایک فریق کے قیدی دوسرے فریق کے دوست ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ قیدی لڑکیاں بھی قرطاجنی

فوج کی وفادار ہیں۔اور میں درخواست کرتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو بھی آزاد کیا جائے۔"

قرطاجنی دستے کے افسر نے کیدارا کی بات غور سے سنی اور کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔

"ان کا فیصلہ موآ بریس کرے گا۔تم یہ غنیمت سمجھو کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا۔"

کیدارا جان گیا کہ قرطاجنی افسر اس کی بات نہیں مانے گا۔تب کیدارا نے صرف شیتل کو بچانے کی سعی کی۔اس نے کہا۔

"محترم سالار! کم از کم اس خاتون کی زنجیریں تو کھول دی جائیں۔ یہ تو خالص قرطاجنی نسل سے ہے۔یہی میری مالکن ہے۔"

قرطاجنی افسر نے غور سے شیتل کی جانب دیکھا اور پھر اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے شیتل سے سوال کیا۔

"تم قرطاجنی ہو؟"

"ہاں!"

"تم یہاں اس جہاز پر کیسے؟"

"ہمارے جہاز کو کوناڈس نے لوٹ لیا تھا۔ ہم اپنے تجارتی جہاز کے ساتھ مشرقی ممالک کی طرف جارہے تھے۔راستے میں بحری قزاقوں نے ہم پر حملہ کردیا۔ ہمارا جہاز لوٹ لیا اور ہمیں غلام بنا لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ بحری قزاق نہ تھے بلکہ رومی بحریہ کا سربراہ کوناڈس تھا۔"

اسی اثنا میں قرطاجنی افسر کی نگاہ قدرے فاصلے پر کھڑی کلاڈینا پر پڑ گئی۔حیرت کی بات تو یہ ہوئی کہ کلاڈینا نے نہ تو رومی لباس پہن رکھا تھا اور نہ ہی اب تک زبان سے وہ کچھ بولی تھی، لیکن پھر بھی قرطاجنی بحری افسر کو کلاڈینا کے رومی ہونے کا شک ہوگیا۔اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے کلاڈینا کی جانب دیکھا اور پھر شیتل کی طرف منہ موڑے بغیر ہی بات کی۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ قدم بقدم کلاڈینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔سب لڑکیوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ لڑکی تو ضرور رومی ہے۔اس کی آنکھیں، ناک نقشہ اور دیکھنے کا انداز سب

رومیوں جیسا ہے، کیا تم اس کو بچانے کی بات بھی کرو گے؟''

لیکن کلاڈینا تو اس مرتبہ دل میں ٹھان کر آئی تھی کہ آزادی کی زندگی یا شہادت کی موت۔ تلوار تو اس کے ہاتھ میں پہلے سے ہی تھی اور غالباً اسی تلوار کو دیکھ کر افسر کے دل میں شک گزرا تھا۔ کلاڈینا نے آسمان سے گرتے اور کھجور میں بار بار اٹکتے یہ سیکھ لیا تھا کہ بچاؤ کی ہمیشہ صرف ایک صورت ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے لڑ جانا۔ ڈرنے سے کبھی بھی موت ٹلتی نہیں۔ اس سے پہلے کہ قرطاجنی سالار تلوار سونت کر اسے حراست میں لینے کا حکم دیتا، کلاڈینا نے اپنی شمشیر ہوا میں لہرائی اور قرطاجنی زبان میں افسر سے کہا۔

''میں چاہوں تو تم سے یہ کہہ دوں کہ میں بھی قرطاجنہ کی رہنے والی ہوں۔ ہم سب لڑکیوں میں صرف میں اور شیتل تمہاری زبان بول سکتی ہیں۔ اس لیے میں تمہیں دھوکہ دے سکتی ہوں لیکن پھر بھی میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کیونکہ مجھے قرطاجنہ نہیں جانا اپنے گھر جانا ہے۔''

وہ شاید روم کو اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ حقیقت میں تو اس کا گھر دنیا میں کہیں رہا ہی نہ تھا۔ بحری افسر ہکا بکا کھڑا کلاڈینا کا منہ تکے جا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اس لڑکی کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ سٹپٹا گیا۔ معاً اس کے دل میں جنگی قوانین کا خیال آیا۔ جنگ کا قانون تھا کہ مال غنیمت میں جو سپاہی جو چیز اپنی شمشیر کے زور پر لوٹتا وہ اسی کی ہوتی۔ خاص طور پر کوئی غلام یا لونڈی تو ہمیشہ فاتح لشکر کے اسی شمشیرزن کو دیئے جاتے جو انہیں دوران جنگ قید کر لیتا۔ یہ رومی لڑکی حسین بھی تھی اور آتش جوالا بھی۔ قرطاجنی افسر کے دل میں جیسے ہی یہ خیال آیا وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم لڑ کر جان دینا چاہتی ہو تو مجھے منظور ہے۔ لیکن اگر مرتے مرتے میں نے تمہیں بخش دیا تو کیا تمہاری جان میری نہ ہو جائے گی؟''

کلاڈینا کو توقع نہ تھی کہ ایک خالص فوجی نوجوان اس طرح عقلمندی کی بات کر دے گا۔ وہ خود سٹپٹا گئی۔ لیکن معاً اسے ایک اور خیال آیا۔

''تم مجھے اپنی لونڈی بنانے کے لیے ایک اوچھا ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہو۔ تم طاقت میں مجھ سے زیادہ ہو اور پیشہ ور سپاہی ہو۔ ہو سکتا ہے تم میری تلوار گرا دو اور مجھے شمشیر کی

نوک پر اپنی باندی بنالو، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی جان خود اپنے ہاتھوں سے لے لوں گی۔"

کلاڈینا نے اتنا کہا اور اپنی شمشیر کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سامنے کر کے دھیرے دھیرے اوپر اٹھائے اور اب وہ کسی بھی لمحے تلوار کی نوک اپنے ہی پیٹ میں گھسیڑ نے والی تھی۔ اس کی نگاہیں قرطاجنی افسر پر ٹکی ہوئی تھیں اور اس کا عزم بدستور بلند ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے پیٹ میں تلوار گھسیڑ دیتی کہ اس کے کانوں میں شیتل کی آواز پڑی۔

"کلاڈینا رک جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہیں کچھ نہ ہوگا۔ تمہاری جگہ میں خود کو پیش کرتی ہوں۔"

کلاڈینا کی توجہ ذرا دیر کے لیے شیتل کی طرف مبذول ہوئی اور یہی لمحہ اس پر بھاری ثابت ہوا۔ نزدیک کھڑے بحری افسر نے بجلی کی تیزی سے اپنی شمشیر گھمائی جو کلاڈینا کی تلوار پر پہلو کے بل پڑی اور کلاڈینا کی تلوار کسی شیشے کے کھنکنے جیسی آوازیں پیدا کرتی دور جا گری۔ اب کلاڈینا نہتی تھی۔

"ان سب لڑکیوں کو زنجیریں پہنا دو۔ انہیں چھوڑنے یا لے جانے کا فیصلہ خود موآبرلیس کرے گا۔"

اتنا کہہ کر قرطاجنی افسر لحیم شحیم کیدارا کی طرف مڑا۔

"تم سب بھی اپنے آپ کو قیدی سمجھو۔ میں ایک معمولی سالار ہوں اور میں کسی کی جان بخشی کا مجاز نہیں۔"

کچھ دیر بعد سب غلام اور لونڈیاں قیدی بنا لیے گئے۔

کوناڈس کا بیڑا بری طرح شکست کھا گیا۔ موآبرلیس کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ لیکن ابھی بھی وہ خوش نہیں تھا۔ کوناڈس اس کے ہاتھ نہ لگا تھا اور کوناڈس کا آدھا بیڑا ابھی باقی تھا۔ لیکن اب موآبرلیس، کوناڈس کے بقیہ بیڑے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ رومہ کا وفادار سالار شیراٹن اپنے چالیس جہازوں کو لے کر عین جنگ کے دوران نکل بھاگا تھا۔ شیراٹن کی قابلیت اور بہادری کی خبریں قرطاجنی سپہ سالار موآبرلیس نے سن رکھی تھیں۔ چنانچہ اس نے

رومی ساحلوں پر مزید وقت گزارنا مناسب نہ سمجھا۔ موآبرلیس نے بھی اپنے فاتح لشکر کو بھاری مال غنیمت کے ساتھ واپسی کا حکم دیا۔

شیتل ابھی تک ملکرت کے مندر کی مفرور نرتکی کے طور پر نہ پہچانی گئی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک قیدی تھی۔ باقی لونڈیاں بھی ابھی تک ایک جہاز کے تہہ خانے میں قید تھیں۔ جلد ہی موآبرلیس قیدیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والا تھا۔ آج شیتل بے حد اداس تھی۔ میلے تہہ خانے کے چوبی فرش پر بیٹھی اپنے گھٹنوں میں سر دیئے وہ آج بھی سنتوش کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ مہا پجاری کا نوعمر بیٹا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کوناڈس کی قید میں بھی اس نے لاکھ کوشش کی کہ سنتوش کے بارے میں کوئی سن گن لے سکے، لیکن اسے اس سے زیادہ پتا نہ چل سکا کہ قزاقی کے ذریعے لوٹے گئے قیدی شہر رومہ کے بازاروں میں نیلام کر دیئے جاتے ہیں۔

اس کا محبوب، اس کا دیوانہ سنتوش کہاں تھا؟ کوناڈس نے سچ مچ اسے غلاموں کے ساتھ رومہ بھیج دیا تھا۔ جہاں اس کی بولی لگنے والی تھی۔ سنتوش اس وقت بھی رومہ کے بازار میں تھا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

نیلام

Pakistanipoint
Waqar Azeem

روم شہر کا بازار بڑا بارونق تھا۔ یورپ کے ہر شہر کا باشندہ یہاں پایا جاتا تھا۔ قرطاجنہ کے مقابلے میں شہر روما بہت قدیم تھا۔ یہ اطالیہ کا تب بھی دارالحکومت تھا۔ یورپ کے جنوبی ساحلوں کے نزدیک اطالیہ کے بیسیوں بڑے قصبے تھے۔ نیچے سسلی تک اطالیہ کا ہی سکہ چلتا تھا۔ یورپ کے خشکی کے ٹکڑے کا تو یہ جنوبی ملک تھا۔ لیکن بحرروم کے لحاظ سے اطالیہ شمالی سرزمین تھی۔ بحرروم کی پوری شمالی سرحد دور سپین سے شروع ہو کر مشرق کے ملک شام تک بے اندازہ لمبی تھی۔ اس ساحل پر اطالیہ سمیت کئی دیگر ممالک آباد تھے۔ لیکن یونان اور اطالیہ خاص طور پر قابل ذکر تھے۔

شہر روما میں دن کے وقت اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بازار میں دونوں طرف انواع و اقسام کے سامان کی بڑی بڑی دکانیں سجی تھیں اور بیچ بازار میں رومی اور لاطینی نسل کے لوگ خچروں اور گدھوں پر اپنے اپنے سامان لادے ادھر سے ادھر جاتے ہوئے دکھائی دیتے۔ بازار میں جگہ جگہ مختلف قسم کی نیلامیوں کے چبوترے تھے۔ چبوترے پر کوئی ایرانی تاجر اپنے قالینوں کے گن گا تا سنائی دیتا تو کسی پر کوئی یونانی سائنس دان اپنے مختلف کرتب بیچتا نظر آتا۔ سیراکیوز اور یونان کے لوگ طرح طرح کے کرتب، معمے اور دماغی کھلونے بنانے میں مشہور تھے۔ بازار کے بڑے چوک کے بیچوں بیچ رومیوں یا اطالویوں کی کسی فتح کی یادگار میں کسی قدیم سپہ سالار کا مجسمہ نصب تھا۔ رومی جب بھی کوئی شہر فتح کرتے اسی مقام پر اپنی فتح کا جشن مناتے تھے۔ رومی لوگ اپنے آپ کو مگرمچھ کہتے اور ان میں یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ شیر بھی مگرمچھ سے نہیں لڑتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بحرروم میں رومیوں کے تسلط کی ابتدا تھی اور ابھی قرطاجنہ والے پورے عروج پر تھے۔ رومہ کے کھلے بازار میں آئے

روز نئی نئی خبریں گشت کرتی رہتی تھیں اور اب تو ارمیدس کے لشکر کی شکست کے افسانے زبان زدعام تھے۔ اکا دکا بچ نکلنے والے سپاہی جو اب روما پہنچ رہے تھے، قرطاجنی سالار برتھاس اور اس کے سپاہیوں کے مظالم کی داستانیں بڑھا چڑھا کر سناتے، جگہ جگہ ان کے گرد لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے، عورتیں تو رونے لگتیں۔ لیکن بعض رومی کہانیاں سنانے والے سپاہیوں کو ڈانٹتے اور ان کو بزدلی کے طعنے دینے لگتے۔ جب سے برتھاس نے رومی ساحلوں پر قدم رکھا تھا، پورے روما الکبریٰ کے ماحول میں غم و غصے کے ساتھ ساتھ خوف اور دہشت کی لہر بھی دیکھی جاسکتی تھی۔

آج غلاموں کے چبوترے پر بھی رش تھا۔ نئے غلاموں کی کھیپ بکنے کے لیے آئی تھی۔ یہ ایک بڑا سا چبوترا تھا۔ گویا کسی جلسے کا سٹیج۔ چبوترے پر ایک قطار میں تیس سے زیادہ غلام زنجیروں میں جکڑے اپنے فروخت ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ لاطینی سوداگر باری باری ایک ایک غلام کو پکڑ کر باقیوں سے الگ کرتا اور اس کا ابتدائی مول بول دیتا۔ اگلے لمحے بولی شروع ہو جاتی۔

"پانچ سو ٹیلنٹ چاندی، پانچ سو دس ٹیلنٹ چاندی، پانچ سو بیس...... ساڑھے پانچ سو۔"

خریدنے والے دھیرے دھیرے رقم بڑھاتے رہتے اور جب رقم ایک خاص مقام پر جا کر رک جاتی تو سوداگر کے نقیب کی آواز گونجتی۔

"کوئی ہے جو اس غلام کے لیے اس سے زیادہ چاندی دے سکے؟ یہ مضبوط پٹھا ہے۔ چھ فٹ قد، تیز نظر رومی اور لاطینی زبانوں پر عبور، کھیتی باڑی سے لے کر گھوڑوں کے نعل لگانے تک ہر کام کر لیتا ہے۔"

نقیب کی دل لبھانے والی باتیں سن کر خریدار پھر بولی دینے لگتے۔

"چھ سو ٹیلنٹ چاندی، چھ سو دس، چھ سو تیس وغیرہ وغیرہ۔"

اور دوسری بار جب بلند ہوتی ہوئی رقم بلند ہوتے ہوتے تھک جاتی تو نقیب ایک دو تین کر دیتا۔ نیا مالک آگے بڑھتا اور غلام کے گلے میں نیا طوق ڈال کر اسے لے جاتا۔

بکتے بکتے آج سنتوش کی باری آ گئی۔ شہزادگی کے رتبے میں پلا یہ لڑکا جب خریداروں کے جم غفیر کی نگاہوں کے سامنے آیا تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یونان کی افرودیتی دیوی سے زیادہ حسین یہ نوعمر لڑکا اپنے گول گول گال تھرتھراتا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پٹپٹاتا مجمعے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوداگر نے اپنا مول بتایا۔

"دس ہزار ٹیلنٹ چاندی!"

تماشائیوں میں جوش و جذبہ بھر گیا۔ دس ہزار بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی کہ سیرا کیوز کا حاکم ہر سال اتنی رقم رومہ کو خراج میں دیتا تھا۔ سب تماشائی نزدیک نزدیک ہو گئے۔ لڑکا بہت حسین تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی جنسی ذہنیت پر لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں کا غلبہ تھا۔ بڑی بڑی توندوں والے لاطینی تاجر میدان میں آ گئے۔

"گیارہ ہزار ٹیلنٹ چاندی!، ساڑھے گیارہ ہزار، بارہ ہزار، ساڑھے بارہ ہزار......"

سنتوش کی قیمت بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے بائیس ہزار ٹیلنٹ چاندی تک پہنچ گئی۔ تماشائیوں کے چہرے شدت جذبات سے لال تھے۔ آج وہ ایک بہت قیمتی غلام بکتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سنتوش کے خریدار صرف شوقین تھے۔ کام کاج کے لیے غلاموں کو خریدنے والے تاجر اب پچھلی قطاروں میں کھڑے شوقین امراء کی بولی سن رہے تھے اور جب مزید بولی بڑھنی رک گئی تو نقیب نے حسب دستور کہا۔

"ہے کوئی اور جو اس ہیرے کی قیمت اس سے بڑھ کر لگائے۔ یہ قرطاجنہ کا شہزادہ ہے۔ جو خریدے گا، شان اور مرتبہ پائے گا۔ اس کا مقام طبقہ امراء میں اور بلند ہو جائے گا۔"

اور پھر حسب معمول قیمت پھر سے بڑھنے لگی۔

جس وقت نقیب نے ایک دو تین کیا تو سنتوش چھتیس ہزار ٹیلنٹ کے عوض کوہ مغرب کے ایک...... متمول ساہوکار کا غلام بن چکا تھا۔ مجمع میں تالیاں بجنے لگیں۔ لاطینی سوداگر نے آگے بڑھ کر سنتوش کے گلے سے اپنا چمڑے کا پٹا اتار لیا۔ متمول سوداگر کے ہرکارے آگے بڑھے اور انہوں نے سنتوش کو دائیں، بائیں بازوؤں سے پکڑ کر گویا حراست میں لے لیا۔

سنتوش بک چکا تھا۔ ملکرت دیوتا کے مہاپجاری کا بیٹا بک چکا تھا۔ دیوانی شیتل کا دیوانہ عاشق بک چکا تھا۔ سنتوش کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، ایک آگ تھی۔ ایک تپش تھی۔ آج جس طرح سر بازار اس کی نمائش کی گئی تھی اسے بہت برا لگا۔ وہ تو پہلے سے ہی زخم

خوردہ تھا۔ اس نے کینہ توز نظروں سے اپنے نئے آقا کو دیکھا اور دل میں کہا۔

"تم نے بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے سوداگر! یہ غلام تمہارے کسی کام کا نہیں۔"

کوہ اریکس کا متمول سوداگر اپنے نئے غلام پر اتراتا واپس اپنی وادیوں میں لوٹ گیا۔ جہاں برف ہی برف تھی۔ اونچے اونچے پہاڑ اور کپاس کی طرح چارسو پھیلی برف کی چادر۔ کوہ مغرب کے اس متمول سوداگر کا نام "پولابیس" تھا۔ یہ لگ بھگ اکاون باون سال کا ایک مضبوط پہاڑی سردار تھا۔ پوری غال اقوام میں خوشحالی ہی خوشحالی تھی۔ اور اس کی وجہ ان کے پہاڑوں میں سے نکلنے والا زمرد تھا۔ یہ قیمتی پتھر شام و فلسطین کے محلات سے لے کر پارسا گرد کے قصر تاچارا تک میں استعمال ہوا تھا۔ ابھی دنیا کے باقی خطوں میں زمرد کہیں دریافت نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان برفیلے خوفناک پہاڑوں میں بسنے والی آزاد قلطی اور غال قومیں اپنے بے شمار غلاموں کے بل پر خاصی متمول ہو گئی تھیں۔ اتنی متمول کہ قلطی یا غال سردار قیمتی سے قیمتی غلام خریدنے پر فخر محسوس کرتے۔ پولابیس کی جاگیر کوہ مغرب کی برفانی چوٹی عبور کر کے وادئ برف میں واقع تھی۔ سنتوش کو بھی وہیں جانا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اپنے دونوں سپہ سالاروں کی جانب سے اہل قرطاجنہ کو خوشخبریاں ملیں۔ ایک نے ارمیدس کے لشکر کا خاتمہ کیا تھا اور دوسرے نے کوناڈس کے بیڑے کو برباد کر دیا تھا۔ مال غنیمت سے بھرے بحری جہاز قرطاجنہ پہنچے تو بندرگاہ پر سارا شہر اکٹھا ہو گیا۔ لوگ اپنی فتوحات کو بچشم خود دیکھنے آئے تھے۔ بندرگاہ پر بہت بھیڑ تھی۔ افواہ تھی کہ مال غنیمت کا سامان لانے والے جہاز بے پناہ خزانے لے کر لوٹے ہیں۔ خزانے کیا تھے؟ کوناڈس سے لوٹے گئے جہازوں میں گویا قارون کی دولت چھپی تھی۔ ہیرے جواہرات، سونا چاندی، شیشے، ہتھیار، شرابیں، ہزاروں من اناج، گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ، رنگین چمڑے، سوتی اور ریشمی کپڑے، یونانیوں کے فن پارے اور نہ جانے کیا کیا۔ اس پر مستزاد قیدی بنائے گئے غلام اور لونڈیاں تھیں۔ آج قرطاجنہ کے ساحل پر انتشار تھا جیسے کوئی میلہ لگا ہو۔ خود وزیر اعظم ارفلکر بہ نفس نفیس مال غنیمت کا مال وصول کرنے آیا تھا۔ بڑے بڑے مندروں کے پجاری اور کاہن اپنے اپنے طور پر بندرگاہ کی سیر کے لیے آئے تھے۔ شہر قرطاجنہ میں جس کسی نے بھی موآبرلیس کی فتح کے بارے میں سنا وہ ساحل کی طرف کھینچا چلا آیا۔ مال غنیمت کے جہاز ایک ایک کر کے گودیوں سے لگتے گئے اور ان کے عرشوں پر موجود عملے کے لوگ موٹی موٹی رسیاں نیچے پھینکتے، لنگر گراتے اور بادبان لپیٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر ایک چہرے پر جوش و جذبہ تھا۔ عمائدین سلطنت، امراء اور اشرافیہ کے لوگ ساحل پر قطار میں کھڑے لکڑی کی گودیوں سے لگے جہازوں کے مصروف عملے کو دیکھ رہے تھے۔ ہر جہاز کا کپتان وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اپنے اپنے جہاز سے اتر آیا۔ وزیر اعظم ارفلکر آج بہت خوش تھا۔ کیونکہ مجلس قرطاجنہ کے سامنے آج اس کی شان و شوکت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

مہا پجاری کاہوبال اپنے خاص خاص کاہنوں کے ہمراہ بندرگاہ کی ایک گودی کے

سامنے کھڑا جہازوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب سے اس کے مندر کی ایک ناری اس کے بیٹے کو لے کر فرار ہوئی تھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ کاہوبال کے دائیں بائیں مندر کے بوڑھے پروہت کھڑے تھے۔ جن کے کانوں میں جڑاؤ فیروزے کی بالیاں تھیں اور گردنوں میں رنگین منکوں کی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ ٹھیک اس گودی پر جس کے سامنے مہا پجاری کھڑا تھا۔ رومی بحریہ کا ایک لوٹا ہوا جہاز رکا ہوا تھا۔ جہاز کے عرشے پر کام کرتے ہوئے لوگ کاہوبال کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہاز میں سے مال غنیمت کا مال اتارا جانے لگا۔ سب سے پہلے جہاز کا کپتان جہاز سے اتر کر دور قطار کے درمیان کھڑے وزیر اعظم ارفلکر کی طرف بڑھا۔ اس نے وزیر اعظم کو جھک کر سلام کیا اور پھر واپس جہاز کی طرف پلٹ آیا۔ اب وہ جہاز کے پاس پہنچا تو اس نے جنگی قیدیوں کو اتارنے کا حکم دیا۔ یہ جہاز بھی ان جہازوں میں سے ایک تھا جن میں جنگی قیدی بھرے ہوئے تھے۔ کپتان کے حکم پر زنجیروں میں جکڑے قیدیوں کو اتارا جانے لگا۔ پہلے پہل رومی بحریہ کے عام سپاہی پابہ زنجیر باہر لائے گئے۔ ساحل پر موجود تمام نگاہیں زنجیروں میں جکڑے رومیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک عجب سنسنی کا عالم تھا۔ اہل قرطاجنہ کے لیے یہ ایک دلکش منظر تھا۔ کچھ دیر بعد باقی جہازوں سے بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی اتارے جانے لگے۔ معاً کاہوبال کی نگاہ کسی ایسی چیز پر پڑی کہ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس کے سامنے کھڑے جہاز میں سے اچانک نوجوان لڑکیوں کا ایک دستہ برآمد ہوا۔ وہ سب کی سب زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ کاہوبال کے لیے حیرت کا سبب وہ لڑکی تھی جس نے سب سے پہلے قرطاجنہ کے ساحل پر قدم رکھا۔ وہ شیتل تھی۔

کاہوبال نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ آخر وہ اس کے مندر کی ایک نرتکی تھی۔ وہ اسے کیوں نہ پہچانتا۔ وہ تو ایک طرف شیتل کو ملکرت مندر کے باقی لوگوں نے بھی پہچان لیا۔ بوڑھے پروہتوں نے تو چیخ کر کہا۔

"اوے وہ دیکھو!...... ہمارے مندر کی مفرور نرتکی۔"

کاہوبال پلکیں نہ جھپک رہا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں اور آنکھوں میں دھیرے دھیرے سرخی اتر رہی تھی۔ اس نے شیش ناگ کے سے لہجے میں حکم جاری کیا:۔

"ایک لمحے کی دیر کیے بغیر شیتل کو گرفتار کرلیا جائے۔ اس کام کے لیے وزیراعظم کے حکم کی بھی ضرورت نہیں۔"

آن کی آن میں ملکرت کے گنجے کاہن ہاتھوں میں برہنہ ہتھیار لیے جکڑی ہوئی شیتل کے سر پر آ پہنچے۔ جہاز کا کپتان ہونقوں کی طرح کبھی ان کاہنوں کو، کبھی شیتل اور کبھی دور کھڑے مہاپجاری کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گنجے کاہن شیتل کو یوں جھپٹ کر لے گئے جیسے چیل چوزے کو جھپٹ کر لے جاتی ہے۔ ساحل پر موجود ہجوم یکا یک گردنیں موڑ کر کاہنوں کی اس کارروائی کو دیکھنے لگا۔ پورے ماحول میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شیتل کے ساتھ وہی ہوا جس کا پہلے دن سے اسے ڈر تھا۔ وہ گرفتار کرلی گئی تھی اور اب وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے ساتھ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ضرور سولی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ شیتل کا بدن ٹھنڈا ہونے لگا۔ باقی ماندہ قیدی لڑکیاں کاہنوں کے ساتھ جاتی ہوئی شیتل کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ سوائے کلاڈینا کے کسی قیدی لڑکی کو معلوم نہیں تھا کہ شیتل کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ اور کلاڈینا کو اس لیے معلوم تھا کہ شیتل نے اسے موآبریس کی قید کے دوران اپنی پوری داستان سنائی تھی۔ کلاڈینا نے بھی اپنی کہانی شیتل کو سنائی تھی۔ دونوں قیدی لڑکیاں پکی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ایک قرطاجنہ کی تھی اور دوسری روم کی۔ روم اور قرطاجنہ آپس میں دشمن تھے۔ لیکن شیتل اور کلاڈینا کا دکھ ایک تھا۔ اس لیے وہ دونوں گہری دوست بن گئیں۔ دونوں کی کہانی ایک دوسرے سے بڑھ کر دردناک تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر دلگیر تھیں۔ کلاڈینا کو شیتل نے بتا دیا تھا کہ اسے قرطاجنہ کے ساحل پر اترتے ہی گرفتار کرلیا جائے گا اور پھر وہی ہوا۔ کلاڈینا کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ وہ شیتل کو کیسے بچاتی؟ وہ شیتل کو بچانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تو خود قیدی تھی۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے شیتل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کتنا اندھیر تھا۔ مندر کی اس بے گناہ نرتکی نے مہاپجاری کے بیٹے کی مدد کی اور آج وہی مہاپجاری اس معصوم کو سولی پر ٹھونکنا چاہتا تھا۔ کلاڈینا نے دور سے مہاپجاری کو بھی دیکھا۔ وہ ایک دراز قد بڈھا تھا۔ اس کی بھنویں بہت بھاری تھیں۔ گھنی بھنوؤں کے سائے میں اس کی گہری آنکھیں کسی سانپ کی طرح چمک رہی تھیں۔ کلاڈینا جب تک وہاں کھڑی رہی، مہاپجاری کو دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد قیدی لڑکیوں کو مرد قیدیوں سے الگ کرلیا گیا۔ موآبریس کے فیصلے کے

مطابق یہ قیدی لڑکیاں ریاست کی ملکیت تھیں۔ چنانچہ زنجیروں میں جکڑی ان معصوم اور بے گناہ نوجوان لڑکیوں کو وزیراعظم ارفلکر کے سامنے لایا جانے لگا۔ وزیراعظم کے دائیں بائیں مجلس عامہ کے باقی ارکان بھی کھڑے تھے۔

آج پورا قرطاجنہ یہاں امڈ آیا تھا۔ نہیں آئی تھی تو قرطاجنہ کی کنواری جافیکس نہیں آئی تھی۔ بوڑھے وزیراعظم کی بیٹی جافیکس' قرطاجنہ میں سب سے زیادہ عقلمند انسان کے طور پر مشہور تھی۔ وہ اہلیان شہر میں ہر دلعزیز تھی۔ لیکن اس طرح کے موقعوں پر وہ کم ہی دکھائی دیتی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے باغات میں صرف کرتی۔ جہاں وہ سرخ سیبوں کے پیڑوں تلے خشک کڑکڑاتے پتوں پر لیٹ کر نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ جافیکس بے پناہ ذہین تھی۔ ارفلکر کو ملکی مسائل میں جب کبھی مشکل پیش آتی تو جافیکس ہی اس کا حل نکالتی۔ وہ مجلس قرطاجنہ کی ممبر بھی تھی۔ عمر کے لحاظ سے اگرچہ وہ اب ایک لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی بے داغ دوشیزگی نے اس کے شباب پر آنچ بھی نہ آنے دی۔ جب وہ مجلس قرطاجنہ میں اٹھ کر تقریر کرتی تو بڑے بڑے سالاروں کے ہوش اڑ جاتے۔

آج ساحل پر سب تھے۔ ایک جافیکس نہیں تھی۔ اور شاید یہ شیتل کی بدنصیبی تھی کہ جافیکس مال غنیمت کا تماشا دیکھنے نہیں آئی تھی۔ کیونکہ اگر آج وہ یہاں ہوتی تو ضرور مہاپجاری کاہوبال کے اقدام پر اعتراض کرتی۔ غصہ تو وزیراعظم ارفلکر کو بھی آیا تھا۔ اسے کاہوبال کی یہ دست درازی اور بے جا مداخلت ناگوار گزری تھی۔ لیکن وہ سرعام مہاپجاری کیخلاف کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کاہوبال نے عوام کے سامنے اپنے ہی مندر کی ایک نرتکی کو گرفتار کیا تھا۔ اور ایسا کرنے کا اسے حق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم خاموش رہا۔ مندر کی نرتکی ایک طرح سے ملکرت کے مہاپجاری کی ذاتی ملکیت ہی تھی۔

قیدی لڑکیاں وزیراعظم کے سامنے لائی گئیں۔ سب حسیناؤں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وزیراعظم کے اردگرد موجود امراء اور سرداروں کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اتنی حسنائیں ایک ساتھ دیکھ کر وہ اپنے دل کو سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ کوناڈس نے اپنے بستر کے لیے ایک سے ایک حسینہ جمع کر رکھی تھی۔ مصری، یونانی، فارسی، لاطینی اور رومی حسن ایک ساتھ قرطاجنہ کے منچلوں کی نگاہوں میں آ گیا۔ جہاز کے کپتان نے وزیراعظم سے عرض کی۔

"محترم وزیراعظم! موآبریس نے حکم دیا ہے کہ ان قیدی لڑکیوں کا فیصلہ مجلس

قرطاجنہ کرے گی۔"

وزیراعظم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔"

"کیا مطلب؟ کیا یہ جنگ کا مال غنیمت نہیں ہیں؟"

وزیراعظم کے سوال پر جہاز کے کپتان نے مؤدبانہ لہجے میں پھر کہا۔

"یہ تمام لڑکیاں کوناڈس کی لونڈیاں تھیں۔ جو اس نے ہمارے سوداگروں کے جہازوں کو لوٹ کر حاصل کی تھیں۔ یہ بڑے بڑے امراء کی بیٹیاں ہیں۔ موآبرلیس چاہتا تھا کہ ان کا فیصلہ آپ کریں۔ کیونکہ ایک لحاظ سے یہ لڑکیاں ہمارا مال غنیمت نہیں ہیں۔"

وزیراعظم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور فوراً کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہنے لگا۔

"پھر تو یقیناً یہ مال غنیمت نہیں۔ ان کو آزاد کر دیا جائے اور...... ان معزز تاجروں کے گھروں تک پہنچایا جائے جو کبھی قرطاجنہ کے راستے پر لوٹ لیے گئے۔"

وزیراعظم کی بات سے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات مرتب ہوئے۔ اہل قرطاجنہ اور امراء پر مایوسی جبکہ قیدی لڑکیوں پر خوشی اور آزادی کی کیفیت غلبہ پا رہی تھی۔ اسی اثنا میں جہاز کے کپتان نے ایک عجیب بات کی۔

"محترم وزیراعظم! ان میں سے ایک لڑکی ایسی ہے جو قزاق کوناڈس نے ہمارے معزز تاجروں سے نہیں لوٹی بلکہ وہ رومی بحریہ کے ساتھ تھی۔"

اتنا کہہ کر کپتان نے کلاڈینا کی طرف انگلی کا اشارہ کیا اور پھر کہا۔

"یہ لڑکی ہے حضور! یہ نسلاً رومی ہے اور یہ کوناڈس کے خاص جہاز سے گرفتار کی گئی۔"

کلاڈینا کا دل جو ابھی چند لمحے پہلے خوشی سے اچھل رہا تھا یکا یک ڈوبنے لگا۔ وزیراعظم نے کلاڈینا کی طرف دیکھا اور اس کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا کہ آیا وہ واقعی رومی النسل ہے؟ کچھ دیر بعد وزیراعظم کی تسلی ہوگئی اور اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ لڑکی مال غنیمت کا حصہ ہے اور قاعدے کی رو سے اس سالار کو ملنی چاہیے جس نے اسے گرفتار کیا۔"

جہاز کے کپتان کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ خود وہی سالار تھا۔ اس کے کہنے پر موآبرلیس نے حسیناؤں کو اس کے جہاز پر رکھا۔ وزیراعظم کے خاص

سپاہی آگے بڑھے۔ انہوں نے کلاڈینا کی زنجیریں کھول دیں اور پھر اس کی کلائی میں ایک ہتھکڑی ڈال کر نئی زنجیر کپتان کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ جہاز کا کپتان خوشی خوشی کلاڈینا کو لے کر ایک طرف چل دیا۔ اس کی مراد بر آئی تھی۔ اس کے سپنے پورے ہونے والے تھے۔ اب وہ اپنی آئندہ زندگی ایک بحری سپاہی کی بجائے ایک امیر شخص کی حیثیت سے گزار سکتا تھا۔ نئے آقا کے ہمراہ چلتے چلتے کلاڈینا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باقی حسیناؤں کو آزاد کیا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ اپنے بارے میں وہ زیادہ فکرمند نہیں تھی۔ اس نے چلتے چلتے دل میں سوچا کہ اگر وہ برتھاس کی قید سے فرار ہو سکتی ہے تو اس معمولی سالار کی قید سے نکلنا کیونکر مشکل ہو گا۔ اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ جلد ہی بھاگ نکلے گی۔ وہ شیتل کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ ابھی سے فرار کے منصوبے بنانے لگی۔

لیکن بہت جلد کلاڈینا کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کپتان نے اسے اپنے دس عدد ماتحت سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا۔

''اسے جہاز کے تہہ خانے میں دوبارہ قید کر دو۔ میں ضروری کاموں سے فارغ ہوتے ہی اس کے بارے میں سوچوں گا۔''

شام تک مال غنیمت کا تماشا جاری رہا۔ خوش قسمتی سے کیدارا کو کسی نے نہ پہچانا۔ اور جب اس نے قرطاجنی افسروں کو یہ بتایا کہ وہ قرطاجنہ کا ہی رہنے والا ہے تو اسے بری کر دیا گیا۔ اس نے ثبوت کے طور پر بعض مخصوص نشانیاں بھی دکھائی تھیں۔ اس نے قرطاجنہ میں اپنے واقف کار لوگوں کے نام بھی گنوائے تھے۔ فی الحقیقت کیدارا کے بارے میں ابھی تک خود مہا پجاری کا ہوبال کو بھی پتا نہیں تھا۔ کیدارا نے ساحل پر شیتل کے ساتھ ہونے والا تماشا دیکھ لیا تھا اور کلاڈینا کی طرح وہ بھی جان گیا تھا کہ مہا پجاری شیتل کو ضرور موت کی سزا دے گا۔ لیکن اب کیدارا سنتوش کے ساتھ اپنی وفاداری پوری نبھانا چاہتا تھا۔ اس نے بھی دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ شیتل کو مہا پجاری کی قید سے ضرور نجات دلوائے گا۔

غروب آفتاب کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کیدارا اپنے گھر نہ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مشرقی شہر کی طرح رخ کیا اور یہ طے کیے بغیر کہ کہاں جائے گا، چل دیا۔ سر دست وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا اور نہ رقم۔

مال غنیمت کی آمد کے تیسرے روز قرطاجنہ کے بڑے بازار میں بے پناہ ہنگامہ تھا۔

آج غلاموں کی فروخت کا دن تھا اور اس بارے بیسیوں غلام بکنے کے لیے مختلف چبوتروں پر موجود تھے۔ گویا آج غلاموں کی منڈی میں خاصا تگڑا مال آیا ہوا تھا۔ دو روز پہلے ہی تو مال غنیمت سے لدے ہوئے جہاز قرطاجنہ پہنچے تھے۔ بازار میں بے پناہ بھیڑ تھی۔ دنیا بھر کے تاجر اور سوداگر چبوتروں کے سامنے جتھوں کی صورت موجود تھے۔ لیکن سب سے زیادہ بھیڑ چوک کے بڑے چبوترے کے آگے تھی۔ یہاں رومی حسینہ کلاڈینا کو نیلام کیا جارہا تھا۔ خریدنے والوں کا رش تو تھا ہی، لیکن حسین آنکھوں کی مالک اور لانبی لانبی پلکوں والی اس رومی شہزادی کو دیکھنے والوں کی بھیڑ بھی بے پناہ تھی۔

حوا کی بیٹی بک رہی تھی۔ منظر دیدنی تھا۔ اپنی رسوائی کا یہ عالم کلاڈینا سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گر کر چبوترے کے تختوں کو گیلا کرنے لگے۔

بولی بڑھتی گئی اور بھیڑ بھی۔ جوں جوں کوئی سوداگر اونچا بھاؤ لگاتا پورا مجمع داد و تحسین کی آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ ہزاروں ٹیلنٹ چاندی تک بات جا پہنچی تھی۔ لیکن بولی تھی کہ ابھی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ دنیا بھر کے سب سوداگر اس رومی حسینہ کے خریدار تھے۔ نقیب کے ساتھی چلا چلا کر لوگوں کو خاموش کروا رہے تھے۔ چبوترے پر کلاڈینا کے علاوہ کوئی اور لونڈی یا غلام بکنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ صرف کلاڈینا کا مالک قرطاجنی سالار اور نقیب کھڑے تھے جبکہ سامنے مجمع عام کسی جلسے کی طرح ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولی لگانے والے نقیب بولی دینے والوں کا ساتھ نہ دے پا رہے تھے اور جب بولی کی رقم ستر ہزار ٹیلنٹ چاندی تک پہنچی تو اہل قرطاجنہ نے اپنی سانسیں روک لیں اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ لیکن اس وقت تک نقیبوں کے گلے بیٹھ گئے تھے۔ بڑے بڑے سوداگروں کے چہروں پر عجیب طرح کی سنسنی تھی۔ مجمع میں موجود خواتین سناٹے کے عالم میں کھڑی معصوم کلاڈینا کے چہرے کو تکے جارہی تھیں۔ کلاڈینا کی آنکھیں بند تھیں اور بھاری پلکوں کے تلے سے موٹے موٹے آنسو نکل رہے تھے۔

''اسی ہزار ٹیلنٹ چاندی!...... اکیاسی ہزار...... بیاسی ہزار......''

اب سوداگر صرف ایک ایک ہزار بڑھا رہے تھے گویا رومی حسینہ کی قیمت خطرناک حد تک جا پہنچی تھی۔ بہت سے کمزور پسلی کے سوداگر تو کافی دیر سے بولی دینا بند کرچکے تھے۔

صرف چند بڑے رؤسا اپنی دولت کے ڈھیروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مقابلہ، کس کے پاس زیادہ پیسے ہیں۔

''پچاسی ہزار ٹیلنٹ،..... پچاسی ہزار پانچ سو ٹیلنٹ!...... پچاسی ہزار چھ سو۔''

مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ بولی میں قیمت بڑھنے کی رفتار بہت زیادہ سست ہو گئی۔ کرتے کرتے بالآخر میدان میں صرف تین سوداگر باقی رہ گئے۔ دو یونانی اور ایک ہندوستانی اور اب بولی سو سو ٹیلنٹ چاندی کے حساب سے اوپر کو اٹھنے لگی۔ یہاں تک کہ اٹھاسی ہزار ٹیلنٹ چاندی تک پہنچ کر بولی رک گئی۔

نقیب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوداگروں کو گھورنے لگے۔ انہوں نے اس قدر مہنگی لونڈی آج تک نہ بیچی تھی۔ ان کے چہرے جوش و جذبے سے لال تھے۔ ان کو کمیشن کے طور پر ایک موٹی رقم ملنے والی تھی۔ بولی رک گئی۔ نقیبوں کے سردار نے روایت کے مطابق ایک بار پورے مجمع کو متوجہ کر کے کہا۔

''لوٹ لو یہ لوٹ لو! روما کی شہزادی جس کی لونڈی بنے گی، اس کے سر پر گویا روما کا تاج ہوگا۔ بولی رکنی نہیں چاہیے۔ ہاں تو! اٹھاسی ہزار ایک......''

اٹھاسی ہزار ایک...... کہہ کر نقیبوں کا سربراہ خاموش ہو گیا۔ قرطاجنی سالار کی حالت دیکھنے والی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مارے خوشی کے اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اٹھاسی ہزار ٹیلنٹ چاندی کا سوچ کر وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم سے تو وہ پورا ایک قصبہ خرید سکتا تھا۔ تماشائی اس قدر خاموش تھے کہ مجمع میں سوئی گرنے کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ نقیبوں کے سربراہ نے اپنے پھٹے ہوئے گلے کے ساتھ دائیں ہاتھ میں انگلی بلند کی اور ایک بار پھر کہا۔

''اٹھاسی ہزار ایک!......''

وہ پھر رک گیا۔ لیکن اب شاید بولی مزید بڑھنے کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی شہادت کی انگلی زور زور سے ہلاتے ہوئے آخری بار کہنا چاہا۔

''اٹھاسی ہزار ایک!...... اٹھاسی ہزار دو!...... اٹھاسی ہزار دو!......''

اور اس سے پہلے کہ وہ ''تین'' کہتا مجمع میں سے ایک بارعب آواز ابھری۔

''ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی!''

یکا یک گویا آسمان پھٹ پڑا۔ لوگ اتنی شدت سے حیران ہوئے کہ ان کی آنکھوں کے دیدے باہر کو ابلنے لگے۔

چبوتروں پر موجود نقیبوں کی حالت قابل دید تھی۔ انہیں سانپ سونگھ گیا تھا۔ اٹھاسی ہزار سے یکدم ایک لاکھ تک کا اقدام ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر بولی بڑھانے والا شخص کھڑا بھی مجمعے کے بیچوں بیچ تھا۔ وہ کون تھا؟ سب کی سب نگاہیں اس طرف کو اٹھیں۔ کلاڈینا کا آقا قرطاجنی سالار غش کھا کر گرتے گرتے بچا۔ ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی بہت بڑی رقم تھی۔ قرطاجنی سالار نے بھی مجمع میں کھڑے شخص کو بے تابی سے دیکھنے کی کوشش کی۔ جو تاجر پہلے بولیاں دے رہے تھے ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کلاڈینا نے بھی اپنی قیمت اچانک...... ایک ہی جست میں بڑھتے دیکھی تو بے اختیار اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بھی اپنے خریدار کو دیکھنا چاہتی تھی۔ نقیب نے پکارا۔

"آگے آجایئے! آگے آجایئے!...... محترم سوداگر! آگے آجایئے۔"

ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کا بھاؤ لگانے والا شخص بھیڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ یہ دانیال تھا۔ فلسطین کا یہودی سوداگر دانیال۔ جو ایک یہودی ہونے کے باوجود پہلے عاشق تھا اور بعد میں سوداگر۔ آج اس مجمعے میں کلاڈینا کو بکتا دیکھ کر اس کے دل پر گھونسا پڑا۔ اسے لگا جیسے اس کی آموسا کو سرِعام بیچا جا رہا ہو۔ جیسے اس کی آموسا کے جسم کی نمائش کی جا رہی ہو۔ تب سے وہ اس انتظار میں کھڑا تھا کہ بولی اپنی آخری حد کو چھوئے تو وہ بولے۔ وہ ہر قیمت پر آج کی اس نیلامی میں بکنے والی اس معصوم رومی حسینہ کو خریدنا چاہتا تھا۔ محض اس لیے کہ وہ اسے آزاد کر دیتا۔ ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کی رقم بہت بڑی تھی۔ لیکن دانیال نے یہ رقم اپنی آموسا کے سر کا صدقہ...... سمجھ کر دینے کا فیصلہ کیا۔ نقیبوں کے سربراہ نے مزید کسی کا انتظار نہ کیا اور تیزی سے ایک دو تین کہہ کر بولی کا خاتمہ کر دیا۔

دانیال کے پاس اتنی بڑی رقم نقد موجود نہ تھی۔ چنانچہ وہ سالار کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بیچنے والے سالار کا گھڑسوار دستہ سرائے تک دانیال کے ساتھ آیا۔ دانیال نے سرائے کے مالک کے گھر میں رکھی ہوئی اپنی رقم میں سے کلاڈینا کی قیمت ادا کی اور کلاڈینا کو سموجن کی بیٹی "سندینا" کے پاس لے آیا۔

"سندینہ!...... یہ ایک معزز رومی گھرانے کی بیٹی ہے۔ شکل وصورت سے بہت دکھی

لگتی ہے۔ شاید یہ ہماری زبان نہیں جانتی۔ اسی لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ میں نے اسے خریدا ہے۔"

سندینہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!...... بابا نے بتایا ہے تم نے اپنے ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کے عوض خریدا۔ بہت حسین ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ شاید یہی تمہاری آموسا ہے۔ لیکن تم کہہ رہے ہو کہ یہ رومی ہے۔ تو پھر اتنی بڑی رقم دے کر تم نے ایک لونڈی کیوں خریدی؟ اگر تمہیں لونڈی کی ضرورت تھی تو مجھے اپنی لونڈی بنا لیا ہوتا۔ میرے لیے یہ بھی کچھ کم سعادت نہ ہوتی۔"

دانیال سدینہ کی بات سن کر دہل گیا۔ عشق کے موضوع پر اس کی باتیں اس لڑکی کو متاثر کر گئیں۔ وہ دونوں سمجھ رہے تھے کہ کلاڈینا قرطاجنی زبان سے نابلد ہے۔ لیکن کلاڈینا تو برتھاس کی قید میں رہی تھی۔ وہ رومی ہونے کے باوجود نہایت صاف قرطاجنی بولتی تھی۔ وہ سندینہ اور دانیال کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ششدر رہ گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے حیرت ظاہر نہ ہونے دی۔ دانیال نے سندینہ کی بات کے جواب میں کہا۔

"یہ میری لونڈی نہیں ہے۔ میری معزز مہمان ہے۔ میں اسے صحیح سلامت اس کے گھر والوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ شاید اس نیکی کے بدلے مجھے میری آموسا مل جائے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے خریدا۔" کلاڈینا یکدم ششدر رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی اسے جھٹکا لگا۔ دانیال کی بات سن کر کلاڈینا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ لیکن آج اس کے آنسو دکھ یا مایوسی کے نہ تھے۔ آج تو وہ ممنونیت کے آنسو بہا رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھوں میں کوئی ہتھکڑی نہیں تھی۔ دانیال نے اسے قبول کرتے ہی اس کی ہتھکڑیاں کھول دی تھیں۔ کلاڈینا نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ قید سے آزاد ہو چکی ہے۔ یکایک وہ مڑی اور دانیال کے قدموں میں گر گئی۔ وہ زبان سے کچھ نہ بول رہی تھی، صرف رو رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ دانیال کے پیروں کو چھو رہے تھے اور وہ سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی۔ دانیال نے اسے جھک کر بازوؤں سے تھاما اور کھڑا ہونے میں مدد دی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو دانیال نے اس سے کہا۔

"تم ڈرو مت! تم اب کسی کی قیدی نہیں ہو۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچاؤں گا۔"

دانیال اسے یوں اشاروں سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کسی گو۔

کو سمجھائی جاتی ہے کیونکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ لڑکی روی النسل ہونے کی وجہ سے قرطاجنی زبان نہیں جانتی۔ لیکن اگلہ لمحہ اس کے لیے بے پناہ حیرت کا تھا۔ کلاڈینا کی زبان کو حرکت ہوئی۔

''میں آپ کی باتیں سن چکی ہوں۔ میرے آقا! آپ نے مجھے ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کے عوض نہیں خریدا، ان باتوں کے عوض خریدا ہے جو ابھی آپ نے اس خاتون کے ساتھ کی ہیں۔ میں کئی ماہ سے قرطاجنیوں کی قیدی ہوں۔ اور اب میں آپ کی زبان بول سکتی ہوں۔''

سندینہ مارے حیرت کے آگے بڑھ آئی۔

''کک...... کیا تم روی نہیں ہو؟ پھر تم نے قرطاجنی افسروں کو کیوں نہیں بتایا؟''

''میں روی ہوں، میں نے کہا نا کہ کارتھیوں کی قید میں تھی۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لی ہیں۔ مجھے لگتا ہے میری پرارتھنائیں قبول ہوگئی ہیں۔ دکھ سہتے سہتے بالآخر میں آپ لوگوں کے پاس آ پہنچی ہوں۔ آپ لوگ اچھے ہیں۔ مجھے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا۔''

دانیال کے لیے یہ ایک خوشگوار حیرت تھی۔ اس نے کسی قدر قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب!...... بہت خوب! حیرت کی بات تو یہ ہے کہ چبوترے پر اعلان کرنے والے نقیب کو بھی تمہاری اس خوبی کا علم نہیں تھا، ورنہ وہ چیخ چیخ کر اس کا ذکر کرتا۔''

یہ سن کر کلاڈینا نے پہلی بار کسی آزاد انسان کے سے لہجے میں بات کی۔

''مجھے خود حیرت ہے۔ حالانکہ جہاز کا کپتان جانتا تھا کہ میں قرطاجنی بولی سکتی ہوں۔ اسی نے مجھے گرفتار کیا تھا اور میں نے اس کے ساتھ اس کی زبان میں بات کی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیوں خاموش رہا۔''

دانیال کو یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ روی حسینہ قرطاجنی زبان بول سکتی تھی۔ سندینہ بھی مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور کلاڈینا کو گلے سے لگا لیا۔

''اگر تمہیں برا نہ لگے تو ہم تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔''

کلاڈینا نے آنسو بھری نگاہوں سے دونوں کو دیکھا اور پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''ضرور!...... مجھے کیوں برا لگے گا؟''

کچھ دیر بعد کلاڈینا' دانیال اور سندینہ کو اپنی زندگی کی کہانی سنا رہی تھی۔

اور جب کلاڈینا کی داستان حیات نیلامی کے چبوترے تک پہنچی تو کلاڈینا نے ممنونیت بھری نظروں سے دانیال کی جانب دیکھا اور کہا۔

''اس سے آگے تو جو وقت گزرا آپ کے سامنے گزرا۔ اب لگتا ہے کہ میرے دکھوں کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے۔''

سندینہ نہایت توجہ سے کلاڈینا کی آپ بیتی سن رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کلاڈینا کو مخاطب کیا۔

''تو کیا تم سچ مچ پجاری کی قید سے شیتل کو چھڑوانا چاہتی ہو؟''

''ہاں سچ مچ!''

کلاڈینا نے ہمیشہ کی طرح آج بھی کوئی جھوٹ نہ بولا تھا۔ اس نے اپنی آپ بیتی کے دوران جب شیتل سے ملاقات کا تذکرہ کیا تو شیتل کی داستان بھی انہیں سنا دی اور آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ شیتل کو مہاپجاری کی قید سے رہائی دلانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ بات اسے ابھی نہ کہنی چاہیے تھی۔ ابھی تو سندینہ اور دانیال کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ لیکن اس نے سوچا کہ جس شخص نے ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی دے کر اسے خریدا اور پھر آزاد کر دیا۔ اس کے سامنے جھوٹ بولنا پرلے درجے کی بے ایمانی ہوگی اور سندینہ کے بارے میں بھی اس کا ایسا ہی خیال تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد دانیال نے کلاڈینا سے پوچھا۔

''لیکن تم یہ کام کیسے انجام دو گی۔ ملکرت کی نرتکی کا جرم مہاپجاری کے بقول نہایت سنگین ہے۔ وہ اسے سخت سے سخت سزا دے گا اور یقیناً ایسی مجرمہ کو کڑے پہرے میں رکھا گیا ہوگا۔ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم اسے آزاد کروائیں۔''

دانیال کا آخری جملہ کلاڈینا کے لیے چونکا دینے والا تھا۔ اس نے کہا تھا...... کہ ''ہم'' اسے آزاد کروائیں''...... اس کا مطلب تو یہ تھا کہ دانیال بھی اس سلسلے میں کلاڈینا کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ دانیال کے سوال پر کلاڈینا نے بغیر کچھ سوچے ہی کہنا شروع کیا۔

''میں نے آپ کو ایک لیبیائی نوجوان کیدارا کے بارے میں بھی بتایا، جو شیتل اور سنتوش کا رکھوالا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، کیدارا بھی واپس قرطاجنہ آچکا ہے اور خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ اسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ وہ ایک بہت مضبوط اور ماہر سپاہی ہے۔

اگر ہم اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں تو یقیناً کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔"
کافی دیر سے خاموش بیٹھی۔ سندینہ کہنے لگی۔
"مگر ایک معمولی لیبیائی نوجوان پر اتنا بڑا بھروسہ؟ اس طرح کے جنگجو حبشی غلام عام مل جاتے ہیں اور بہت معمولی بھاؤ پر۔"
"بے شک مل جاتے ہوں گے لیکن شیتل نے بتایا کہ کیدارا سنتوش کا وفادار ہے۔ اس پر مستزاد وہ ملکرت کے مندر میں آتا جاتا رہتا ہے۔"
سندینہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، گویا یہ کہا کہ ٹھیک ہے۔
اب کلاڈینا محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ وہ بار بار اپنے محسن کے چہرے کو تکتی اور دل ہی دل میں اسے دعائیں دینے لگتی۔ ایک لمبے کشٹ کے بعد بالآخر اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اب وہ جب چاہتی روم واپس جا سکتی تھی۔ لیکن واپس روم وہ کس کے پاس جاتی۔ اس کا خاندان تو مارا جا چکا تھا۔ بے شک وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتی تھی لیکن شیتل کی رہائی کے بعد۔ ابھی وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ سوجن آ گیا۔ سندینہ، کلاڈینا کو اپنے باپ کا تعارف کروانے لگی۔
کیدارا نے اپنے لیے جلد ہی اچھا بندوبست کر لیا۔ اب وہ شہر کے مشرقی علاقے میں ایک نئی بستی میں رہ رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک آہن گر کے پاس نوکری کر لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شیتل اور سنتوش کے فرار میں کون کون سے لوگ اس کے متعلق جانتے تھے۔ چند دنوں میں ہی اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں جانتا۔ تب کیدارا نئی بستی کو چھوڑ کر اپنے پرانے مکان میں واپس آ گیا۔ اب اس پر ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ تھی شیتل کی رہائی۔
شیتل کو ملکرت دیوتا کے مندر کے ہی ایک تہہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ فوری طور پر مہا پجاری اسے سزائے موت نہ دینا چاہتا تھا۔ وہ سب سے پہلے تو شیتل سے اپنے بیٹے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر سنتوش کہاں گیا؟ مہا پجاری کا ہوبال کو شیتل پر بے پناہ غصہ تھا۔ یہ نرتکی اس کے نوعمر بیٹے کو ورغلا کر لے گئی تھی۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ سنتوش کے بارے میں معلومات اگلوانے کے بعد شیتل کو سولی کی سزا دے گا۔
ملکرت کے تہہ خانے، خاص اسی مقصد کے لیے بنائے گئے تھے۔ جہاں دھرم کے قیدیوں کو سزا سے پہلے رکھا جاتا تھا۔ مندر کی عمارت خاصی وسیع تھی۔ شاہ بلوط کے درختوں سے ڈھکی مندر کی یہ عمارت ایک وسیع و عریض احاطے میں واقع تھی جو کئی ایکڑ پر محیط تھا۔ تہہ

خانے مرکزی عبادت گاہ کے نیچے نہیں تھے۔ بلکہ فاصلے پر موجود خدمت گاروں کی رہائش گاہوں کے نیچے تھے۔ ملکرت کے خدمت گار ہٹے، کٹے کاہن تھے۔ جو سب کے سب سروں سے گنجے اور موٹی موٹی توندوں والے خونخوار مذہبی پیشوا تھے۔ ملکرت مندر کے رکھوالوں کی رہائش گاہیں بھی اسی عمارت میں تھیں۔ اس لحاظ سے شیتل کو یہاں سے نکالنا قریب ناممکن تھا۔ کیونکہ تہہ خانے کے اوپر موجود عمارت میں ہمہ وقت پچاس سے زیادہ گنجے کاہن اور بیس سے زیادہ رکھوالے موجود رہتے تھے۔

اپنی گرفتاری کے دسویں روز تک شیتل سنتوش کے نام پر کاہوبال کی اذیتیں جھیلتی رہی۔ وہ اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ سنتوش کا کچھ پتا چلے۔ لیکن شیتل جتنا جانتی تھی وہ اس سے زیادہ کیسے بتا سکتی تھی۔ اس نے مہا پجاری کو بتا دیا کہ اس نے سنتوش کی کس طرح مدد کی تھی اور وہ دونوں کیونکر وہاں سے بھاگے تھے۔ اس نے کوناڈس کے حملے اور اپنی گرفتاری تک سب کچھ کاہوبال کو بتا دیا۔ جہاں تک شیتل کی اس کہانی کا تعلق تھا تو حقیقت میں کاہوبال اس کہانی پر تو یقین کر چکا تھا۔ اصل مسئلہ تھا اس تیسرے شخص کی پوچھ کچھ جو ایک حبشی تھا اور ان دونوں کی مدد کرنے کے جرم میں کاہوبال کو مطلوب تھا۔ شیتل نے کمال صبر کا مظاہرہ کیا اور شروع سے آخر تک اپنی کہانی میں اس نے کیدارا کو صاف بچا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی موت کے بعد کیدارا ہی سنتوش کو چھڑا لائے گا اور وہ اپنی امید کے اس آخری سہارے کو کھونا نہ چاہتی تھی۔ کاہوبال نے ہر حربہ استعمال کیا۔ اس کے حسین جسم کو لہولہان کر دیا۔ اسے تھپڑ رسید کیے، باتیں، گھونسے، اس کے بالوں کو چھت کے ساتھ باندھ دیا اور اتنا کھینچا کہ شیتل کی ایڑھیاں اوپر اٹھ گئیں۔ وہ اپنے پیروں کے پنجوں کے بل رات بھر کھڑی رہی۔ اس کے بالوں کی چوٹی چھت سے بندھی تھی۔ لیکن کمال کی لڑکی تھی وہ کیدارا کے بارے میں کچھ نہ بولی۔ اور اب تو شیتل جسمانی سکت ہار چکی تھی۔ لیکن ہمت؟ اس نے ابھی تک ہمت نہ ہاری تھی۔ دس روز کی مسلسل تکلیف کے باوجود جب بھی کھانا آتا وہ کھا لیتی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت زندہ رہ سکے اور پھر دسویں روز کاہوبال آخری بار شیتل کے پاس آیا۔

"آج میں تمہارے پاس آخری مرتبہ آیا ہوں۔ اگر آج تم نے مجھے نہ بتایا کہ وہ حبشی کون تھا جو تم دونوں کے ساتھ گیا تھا تو کل تمہیں سولی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ سنتوش کو تو میں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ لیکن تم اپنی زندگی کو کبھی نہ ڈھونڈ پاؤ گی۔ اب بھی وقت ہے اگر تم اس

حبشی کا نام اگل دو تو میں تمہاری سزا معاف کردوں گا۔“

شیتل تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زخموں سے چور چور بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گھنی پلکیں اٹھائیں اور سرخ سرخ آنکھیں کاہوبال پر گاڑ دیں۔ وہ کچھ دیر تک کاہوبال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورتی رہی۔ اور پھر اس نے پہلی بار کاہوبال کو ایک نئے لہجے میں مخاطب کیا۔

”مہاپجاری...... تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری دھمکی سے ڈر کے اپنے محسن کا نام بتا دوں گی۔ تم نے مجھ پر ظلم کا ہر پہاڑ توڑا، ایک کمزور عورت کو اپنی مردانگی کا نشانہ بنایا۔ مجھے تو تم میں اور جنگلی سؤر میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تم پرلے درجے کے احسان فراموش ہو۔ میں نے تمہارے بیٹے کی اس وقت جان بچائی جب وہ مر رہا تھا۔ اسے اس وقت پیار کا لمس دیا جب اس کا دل زخموں سے چور تھا۔ تم اپنے آپ کو دھرم کا پردھان سمجھتے ہو لیکن حقیقت میں تم ایک شیطان ہو، میں اب بھی کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو، کیونکہ صرف میں ہی اپنی جان پر کھیل کر سنتوش کو واپس لا سکتی ہوں۔ اگر تم نے مجھے مار دیا تو یقین جانو تم جیسے نامردوں میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ سنتوش کو واپس لاسکیں۔“

مہاپجاری پتھر کی طرح گم صم ہو کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ کسی نے اس لہجے میں بات کی تھی۔ غصہ تو اسے اتنا آیا کہ اس کا پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا، لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اس نے اپنا غصہ شیتل پر نہ اتارا۔ وہ کچھ دیر تک چپ چپ کھڑا شیتل کا چہرا تکتا رہا اور پھر بغیر کچھ بولے ہی جن قدموں آیا تھا انہی قدموں واپس پلٹ گیا۔ نہ جانے مہاپجاری کے دل میں کیا تھا اور وہ شیتل کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کسی خیال کا اظہار نہ کیا۔ خود شیتل بھی حیران تھی کہ آخر اتنی سخت باتیں سن کر بھی مہاپجاری کیوں خاموش رہا۔ ابھی مہاپجاری کو گئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ شیتل کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ ویسے ہی ٹکی بیٹھی تھی کہ تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ دو ہٹے کٹے کاہن اندر داخل ہوئے۔ شیتل نے سمجھا کہ اس کی موت کا وقت آ پہنچا ہے، اس نے بھگوان سے اپنی آخری پرارتھنا شروع کر دی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ان گنجے کاہنوں نے شیتل سے کچھ تعرض نہ کیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ اس نے وہ گٹھڑی فرش پر رکھی اور شیتل سے کہنے لگا۔

''اس میں کپڑے ہیں۔ یہ بدل لو۔ تمہیں مہا پجاری نے آزاد کردیا ہے۔ اب تم جہاں چاہو جاسکتی ہو۔لیکن مہا پجاری نے درخواست کی ہے کہ اگر تم جاتے جاتے اسے مل لوتو تمہاری مہربانی ہوگی۔''

اتنا کہہ کر دونوں کاہن باہر نکل گئے۔شیل تو جیسے سکتے میں آ گئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ مہا پجاری اس کے ساتھ یوں پیش آئے گا۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور وہ کافی دیر تک پتھر کی طرح ساکت بیٹھی کپڑوں کی گٹھڑی کو گھورتی رہی۔کافی دیر کے بعد وہ جیسے چونک سی گئی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور گٹھڑی کی طرف بڑھی۔ گٹھڑی میں کپڑوں کے ساتھ ساتھ خاصی حقدار میں نقدی بھی تھی۔شیتل نے دل میں کہا۔

''شاید مہا پجاری کو میری بات کا یقین آ گیا۔''

اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔نقدی کی ہتھیلی لباس میں اڑسی اور دروازے سے باہر نکل آئی۔ اگلے لمحے وہ تہہ خانے سے نکلنے کے زینے عبور کررہی تھی۔ زینوں کے اختتام پر بھی کوئی پہریدار اسے روکنے کے لیے نہیں تھا۔اس کا جسم بے حد زخمی تھا۔لیکن ہمت پوری طرح صحت مند تھی۔ وہ اپنی ہمت کے بل بوتے پر کاہنوں کی رہائشی عمارت کے علاقے سے بھی باہر نکل آئی۔اسے کسی نے راستے میں نہ روکا،اب وہ شاہ بلوط کے درختوں سے ڈھکی ایک اندرونی سڑک پر تھی۔ یہ سڑک کاہنوں کی رہائشی عمارت مرکزی عبادت خانے کو جاتی تھی۔شیتل بڑی بے پروائی سے مرکزی عبادت خانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔مہا پجاری سے ملاقات کرنے سے پہلے وہ ملکرت دیوتا کے سامنے شکرانے کی پرارتھنا کرنا چاہتی تھی۔ جونہی وہ عبادت گاہ کے صدر دروازے پر پہنچی۔دروازے میں موجود ایک نرتکی نے شیتل کو دیکھ لیا۔ یہ راکشی تھی۔ وہی باتونی راکشی جو شیتل کی پہلی گرفتاری کا موجب بنی۔ دوڑ کر شیتل کے پاس آئی۔

''ارے شیتل تمہیں کیا ہوگیا؟ تم اتنی کمزور اور نحیف کیسے ہوگئیں؟ اور کیا مہا پجاری نے تمہیں چھوڑ دیا؟ حیرت ہے تم آزاد گھوم رہی ہو۔اور یہ کیا تم تو مندر میں داخل ہورہی ہو۔ نہیں نہیں ایسا مت کرو۔تمہارے قدم پڑنے سے مندر کی دھرتی بھرشٹ ہوجائے گی۔اور ہاں سنتوش کو کہاں چھپا دیا؟''

''چٹاخ!''

شاید باتونی راکشی اور بھی بولتی لیکن شیتل کے ایک زوردار تھپڑ نے اس کی بولتی بند کر دی۔ شیتل کی طرف سے اس کے تمام سوالوں کا یہی ایک جواب تھا۔ شیتل نے اس کے علاوہ کچھ نہ کہا اور مندر میں چلی گئی۔ مندر کی راہداریوں میں جو کوئی ناری شیتل کو دیکھتی اپنی جگہ ششدر کھڑی رہ جاتی۔ کسی میں اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر شیتل سے کوئی بات کرتی۔ شیتل سینہ تانے اکڑ کر چلتی ہوئی عبادت گاہ کے بڑے ہال میں آ پہنچی۔ اس نے جونہی عبادت گاہ میں قدم رکھا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مہا پجاری پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ ملکرت دیوتا کے بڑے بت کے سامنے زانو تہہ کیے بیٹھا پرارتھنا کر رہا تھا۔ شیتل آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک آ گئی۔ مہا پجاری کا ہوبال ملکرت دیوتا کے بڑے بت کے سامنے ہاتھ جوڑے سر جھکائے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ شیتل نے ایک نظر اٹھا کر ملکرت دیوتا کے بت کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا یہ مشرقی نسل کا بت کارتھیوں کا سب سے بڑا خدا تھا۔ بت کی سرخ آنکھیں مہا پجاری پر ٹکی ہوئی تھیں۔ شیتل کو لگا جیسے ملکرت دیوتا مہا پجاری کو غصے سے گھور رہا ہو۔ پھر شیتل نے سر گھما کر مہا پجاری کی طرف دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔ معاً مہا پجاری نے سر اوپر اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔ شیتل اس کے سامنے تھی۔ شیتل ابھی کھڑی تھی اور وہ بیٹھا تھا اتنا بڑا پجاری ہو کر بھی وہ رو رہا تھا۔ شاید اس عمر میں رونا جلدی ہی آ جاتا ہے۔ اس نے شیتل کو اپنے پہلو میں کھڑے دیکھا تو پرارتھنا میں جڑے ہاتھ شیتل کی طرف گھما دیئے۔

''بیٹی مجھے معاف کر دو! آج تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ تم نے سچ کہا میں دھرم کا پردھان نہیں، صرف ایک شیطان ہوں۔ میں نے تمہارا تنکا نہیں چھوڑا اور تم ہو کہ اب بھی میرے بیٹے کو بچانا چاہتی ہو۔ کاش! میں نے پہلے دن ہی سنتوش کی بات سن لی ہوتی۔ بیٹی! تم مجھے معاف کر دو۔ تم اگر چاہو تو میں تمہارے ساتھ پورا دستہ بھیج سکتا ہوں۔ میں سنتوش کی واپسی کے لیے اپنا پیسہ پانی کی طرح بہا دوں گا۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟''

شیتل کو اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اس نے مارے حیرت کے ایک مرتبہ پھر ملکرت دیوتا کی طرف دیکھا۔ اب کی بار اسے لگا جیسے دیوتا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہو اور کہہ رہا ہو۔

''دیکھا میری بچی! وقت کس طرح بدلتا ہے۔ کل تک جو شخص تمہاری جان کا دشمن

تھا، آج وہ تم سے معافیاں مانگ رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں تقدیر کا پھیر۔"
شیتل نے دیوتا کی بات سنی تو فوراً ملکرت دیوتا کے سامنے کمر تک جھک گئی۔ کچھ دیر تک وہ ملکرت دیوتا کی پرارتھنا کرتی رہی اور پھر اس نے سر گھما کر مہا پجاری کی طرف دیکھا۔
"میں نے آپ کو معاف کیا مہا پجاری! مجھے کسی دستے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ابھی مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے سب سے پہلے تو میں سنتوش کے وفادار خادم کیدارا کو تلاش کروں گی۔ وہی ایک شخص سچے دل سے سنتوش کی تلاش میں میری مدد کرے گا۔"
"کیدارا؟...... تم اس حبشی کی بات کر رہی ہو جس کا نام پوچھنے کے لیے میں تمہیں دس دن تک اذیتیں دیتا رہا۔"
"ہاں! وہی حبشی۔ اذیتوں سے تو میں کبھی بھی اس کا نام نہیں بتاتی۔ میں اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ تاکہ اگر میں مر جاؤں تو وہ سنتوش کو ڈھونڈ لائے۔"
مہا پجاری کی حالت اور بھی غیر ہو گئی۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اس نے شیتل کے سامنے ایک مرتبہ پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔
"بیٹی! مجھے معاف کر دو۔ تم کتنی مہان ہو میں سمجھ ہی نہ سکا۔ میں عمر بھر تم سے شرمندہ رہوں گا۔ کاش! میں تم پر توڑے گئے مظالم کا ازالہ کر سکتا۔"
"آپ ازالہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ ان زیادتیوں کا بدلہ چکائیں جو میرے اور سنتوش کے ساتھ ہوئیں تو آپ ان لڑکوں کو گرفتار کریں، جنہوں نے معصوم سنتوش کو دیوتاؤں کی دیوار کے پاس تار تار کیا تھا۔ وہ یہیں کے رہنے والے ہیں۔"
مہا پجاری یک لخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"تم مجھے ان کے نام بتاؤ! میں ان میں سے ایک ایک کو قرار واقعی سزا دلواؤں گا۔
اب شیتل اور مہا پجاری آمنے سامنے کھڑے تھے۔ شیتل نے کہا۔
"کاش! مجھے ان کے نام معلوم ہوتے۔ خود سنتوش بھی انہیں الٹے ناموں سے جانتا تھا۔ ہاں البتہ ایک لڑکا ہے جو ان کی نشاندہی کر سکتا ہے۔"
"کون؟ وہ کون ہے؟"
"اشمون کے مندر کے مہا پجاری کا بیٹا غفرانس۔ وہی لڑکا ان اوباشوں کو جانتا

ہے۔"

مہاپجاری کی گھنی بھنویں سکڑ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ "عفرانس؟؟ لیکن وہ تو انکاری ہے...... اچھا؟؟ میں اسے پھر کھنگالتا ہوں۔ میں نے اسے پوچھا تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ لیکن تم ٹھیک کہتی ہو۔ اصل میں مجھے پہلے اس کہانی میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔

"کاش! میں نے تمہیں اذیتیں نہ دی ہوتیں تو شاید اب تک ہم سنتوش کی تلاش کا آغاز کر چکے ہوتے۔ شیتل بیٹی!...... اب مجھے سمجھ آ گئی ہے، میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم جس طرح بھی سنتوش کو ڈھونڈنے جانا چاہتی ہو جاؤ۔ میں یہاں ان اوباشوں کو دیکھتا ہوں جنہوں نے میرے بیٹے کو اس حال تک پہنچایا۔ ملکرت دیوتا کرے کہ تمہیں کیدارا مل جائے۔ تمہیں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہے تم حاصل کر سکتی ہو۔ کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تم سنتوش کو تلاش کرنے کہاں جاؤ گی؟"

"روم! کوناڈس...... مال غنیمت اور اپنے قیدیوں کو روم بھیج دیتا تھا۔ جہاں وہ غلام بنا کر بیچ دیئے جاتے۔ میرے خیال میں سنتوش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ مہاپجاری جی! اگر آپ میری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں تو اس لڑکی کو آزاد کروا دیں جو مال غنیمت کے جہازوں پر میرے ساتھ یہاں لائی گئی تھی۔ اس کا نام کلاڈینا ہے اور وہ رومی النسل ہے۔"

مہاپجاری کی آنکھوں میں یکدم بے پناہ حیرت نظر آئی۔

"کک...... کیا...... وہ رومی لڑکی تو چند دن پہلے بازار میں بیچ دی گئی۔ سنا ہے ایک یہودی سوداگر نے اسے ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کے عوض خریدا ہے۔ لیکن تم اسے کیوں آزاد کرانا چاہتی ہو؟"

شیتل نے حیرت اور تجسس کے عالم میں مہاپجاری کی بات سنی اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں مہاپجاری کی بات کا جواب دیا۔

"اس لیے کہ مجھے سب سے زیادہ بھروسہ اسی پر ہے۔ وہ رومی النسل ہے۔ رومی زبان بول سکتی ہے۔ قرطاجنی بھی۔ اس کے علاوہ وہ میری طرح چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ اس لیے وہ میری وفادار دوست ہے۔"

مہاپجاری کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے بوڑھے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ اور اس کی بھنویں ابھی تک سکڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اس یہودی سوداگر کو ایک لاکھ ٹیلنٹ سے زیادہ چاندی دے کر اس لڑکی کو خرید لوں گا۔ تم فکر مت کرو اور اب تم میری ایک چھوٹی سی درخواست اور بھی مان لو۔ تم بہت زخمی اور کمزور ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دل سے مجھے معاف کر دو اور سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میرے پاس رہو۔ میرے گھر میں، میں تمہارا علاج کروں گا۔"

مہا پجاری نے ڈرتے ڈرتے دل کی بات کہہ دی۔ آج اس کے اندر کا اچھا انسان پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ شیتل نے مہا پجاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی بات سنی اور پھر نہایت سنجیدہ لہجے میں دھیرے سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ملکرت دیوتا کی آنکھوں کے سامنے میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کر رہی ہوں۔ دیوتا ہمارا ساکشی ہے۔ اگر آپ نے مجھے دھوکہ نہ دیا تو میں سمجھوں گی دیوتا سچا ہے۔ اور اگر دھوکہ دیا تو میں یقین کر لوں گی کہ دیوتا صرف ہمارے وہم کی پیداوار ہوتے ہیں۔"

مہا پجاری کی روح کانپ گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔

"ایشور کے لیے ایسا مت کہو۔ تم بہت اچھی بیٹی ہو۔ دھوکہ نہ دینے کا وعدہ تو دور کی بات ہے، میں ملکرت بھگوان کے سامنے تمہیں اپنی بہو سویکار کرتا ہوں۔ آج سے تم میری بہو ہو۔ میرا بیٹا چاہے مجھے ملے یا نہ ملے۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں تم میرے گھر میں میری بہو بن کر رہ سکتی ہو۔"

شیتل کو زندگی میں شاید اتنی شدید حیرت کبھی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اب ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھے ہوئے تھے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں یہ کیا ہو گیا۔ اچانک اس کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ یکا یک وہ حیرت کے عالم سے نکلی اور دوڑتی ہوئی ملکرت دیوتا کے بڑے بڑے بھاری قدموں میں جا گری۔ وہ دیوتا کے چرنوں پر بازو پھیلائے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ وہ بار بار سر اوپر اٹھاتی، دیوتا کے مسکراتے ہوئے چہرے کو تکتی اور پھر سر جھکا کر ہچکیاں لینا شروع کر دیتی۔ کافی دیر تک دیوتا کے چرنوں میں آنسو بہانے کے بعد وہ اٹھی اور مہا پجاری کا ہوبال کے چرنوں میں جھک گئی۔ مہا پجاری نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تمہارے سب دکھوں کا مداوا کروں گا۔"

چند روز قبل کلاڈینا کو آزادی ملی اور آج شیتل کو مل گئی۔ قسمت ان کے حالات بدل رہی تھی۔ مندر کے بڑے ہال کے باہر کھڑی نرتکیاں مارے حیرت کے پتھر کی طرح ساکت تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ان کے دیدے گھوم گھوم کر ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیا انہونی ہوگئی۔ انہوں نے سب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ چند ایک گنجے کاہن بھی منہ بسورے ناک بھوں چڑھائے نرتکیوں کے پاس کھڑے تھے۔ باتونی نرتکی راکشی ابھی تک اپنے بائیں ہاتھ کو اپنے بائیں گال پر رکھے سہلا رہی تھی۔ مہا پجاری شیتل کو لے کر معبد کے بڑے ہال سے باہر نکلا۔ نرتکیاں اور کاہن دائیں بائیں چھٹ گئے۔ مہا پجاری ایک لمحے کے لیے ان کے بیچ رکا۔ اس نے سب نرتکیوں اور کاہنوں کو ایک تیرتی ہوئی نظر کے ساتھ دیکھا اور پھر کہا۔

"شیتل آج سے میری بہو ہے اور اس لیے تم سب پر اس کا احترام واجب ہے۔"

نرتکیاں اور کاہن ششدر کھڑے رہ گئے۔ ان کے منہ ہونقوں کی طرح کھلے تھے۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

سمندری شکست نے رومی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اصل غم و غصے کی بات یہ تھی کہ قرطاجنی بیڑا ان کے ساحلوں پر چڑھ آیا تھا۔ ارمیدس کی طرح کوناڈس بھی قریب قریب قرطاجنیوں کے شکنجے میں آ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا خاص سہ منزلہ جہاز بھی اب موآ برلیس کے زیر استعمال تھا۔ موآ برلیس نے بے شک اپنے حریف کو شکست سے دوچار کیا تھا، لیکن ابھی تک اس کے دل کے ارمان پورے نہ ہوئے تھے۔ اس نے سہ منزلہ جہاز پر تو قبضہ کرلیا، لیکن بدقسمتی سے کوناڈس اس کے ہاتھ نہ لگا۔ دراصل حملے کے دوران کوناڈس کے خاص طبیبوں نے اسے نہایت چابکدستی کے ساتھ ایک تیز رفتار کشتی میں ڈالا اور سہ منزلہ جہاز کو چھوڑ کر نکل بھاگے۔ اس وقت ابھی کیدارا کا چوبردار دستہ جہاز میں دندناتا پھر رہا تھا۔ اور قرطاجنی فوجی ابھی سہ منزلہ جہاز میں داخل نہ ہوئے تھے۔ کیدارا زخمی کوناڈس کو طبیبوں کے نرغے میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس نے رومی امیرالبحر کو نظرانداز کردیا اور شیتل تک پہنچنا چاہا۔ ادھر کیدارا اپنے چوبردار دستے کو لے کر تیسری منزل کی طرف بڑھا اور ادھر کوناڈس کے وفادار طبیبوں نے اسے بڑی مہارت کے ساتھ سہ منزلہ جہاز سے نکال لیا۔ کوناڈس بچ گیا اور موآ برلیس کے دل میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کردینے کا ارمان باقی رہ گیا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اس یقین کی وجہ وہ اطلاعات تھیں جو جنگ کے بعد موآ برلیس کو ملیں۔

موآ برلیس کو بتایا گیا کہ رومی امیرالبحر اپنی ہی داشتاؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔

رومی بحریہ کے بچے کھچے جہاز، کوناڈس کا نائب سپہ سالار شیراٹن بچا کر لے گیا۔ وہ الٹے پاؤں بھاگا تھا۔ اور داریون کے ساحل پر کھڑے اپنے باقی ماندہ بیڑے کی طرف بڑھا تھا۔ شیراٹن نے کمال کر دکھایا تھا۔ اس نے اپنے بیڑے کا ایک مختصر حصہ کامیابی کے ساتھ بچا لیا اور اپنے زخمی سپہ سالار کوناڈس کو شہر رومہ کی طرف بھیج دیا۔ اب موآ برلیس واپس جا چکا تھا

اور بحر روم کے رومی ساحلوں کو شیر اٹن اپنے تسلط میں لے چکا تھا۔

رومی مجلس شوریٰ نے ارمیدس اور کوناڈس کی شکست پر خوب ماتم کیا۔ کئی روز تک مجلس میں غم و غصے کی کیفیت غالب رہی۔ تمام اعیان مجلس ایک دوسرے پر برہم تھے۔ زمینی حقائق کو نظرانداز کرتے ہوئے ہر ایک ان شکستوں کا الزام دوسرے پر دھر رہا تھا۔ ابھی رومی سلطنت زمانے میں اتنی باوقار نہ ہوئی تھی۔ رومی سلطنت کے مقابلے میں یونانی ساری دنیا میں معتبر سمجھے جاتے تھے۔ ابھی رومہ، رومتہ الکبریٰ نہ ہوا تھا۔ ابھی تو رومی سالار قزاقوں اور ڈاکوؤں کی طرح گردونواح کے سمندروں اور خشکیوں کو لوٹتے پھر رہے تھے۔ دنیا میں طاقت کا دھارا ابھی پوری طرح مشرق سے بہہ کر مغرب میں منتقل نہیں ہوا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ایران تھا۔ جہاں ابھی تک ہنحامنشیوں کی حکومت چل رہی تھی۔ رومیوں کے مقابلے میں یونانیوں نے زیادہ تیک پر پرزے نکال لیے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''سکندر'' کا باپ ایک آنکھ والا یونانی سردار ابھی فارسی بادشاہوں سے اپنی شکست کے بدلے لینے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ فارسیوں کی عظیم سلطنت دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی تھی ''سائرس'' کمبائیس اور دارا'' کا دور گزر گیا تھا۔ پارسا گرد کے مغ مذہب کے نام پر لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ ابھی دنیا کی بڑی قومیں اپنی شناخت بنانے کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ یہ سکندر اعظم کے زمانے سے لگ بھگ چالیس، پینالیس سال پہلے کا دورہ تھا۔

رومی مجلس شوریٰ نے ایک تھکا دینے والی بحث وتمحیص کے بعد بالآخر اپنی نئی حکمت عملی کا اعلان کیا۔ مجلس کے سربراہ نے تمام اعیان مجلس کے سامنے نئی حکمت عملی پڑھ کر سنائی۔

''محترم اراکین سلطنت اور اعیان مجلس!

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ قوموں کی شناخت بنانے کا دور ہے۔ مشرق میں فارسیوں کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اہل یونان جو کبھی ہماری طرح گروہ در گروہ اور جتھہ جتھہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اب ایک یونانی سردار کے پرچم تلے جمع ہو رہے ہیں۔ ہمارے دشمن قرطاجنہ والے براعظم افریقہ پر تمام ملکوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی اونچی عمارتوں کے سامنے ممفس کے کلس اور یروشلم کے ہیکل بھی ماند پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں اطالیہ جو ہماری دھرتی ہے، بھی اپنی شناخت کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ہم بھی کچھ عرصے پہلے تک گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ آج مجلس میں جتنے سردار موجود ہیں، یہ سب پہلے

اپنے اپنے علاقوں میں الگ الگ حکمران تھے۔ لیکن آج ہم سب ایک جگہ اکٹھے بیٹھے ہیں۔ یونانی بھی بالکل اسی طرح کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم یونانیوں کے مقابلے میں قدرے تاخیر سے متحد ہوئے تو یقین جانئے یونان ہم سے پہلے پوری دنیا پر غلبہ پالے گا۔ ہمیں اصل مقابلہ تو یونانیوں کے ساتھ درپیش ہے۔ لیکن ہم اس وقت تک اپنے وطن کو ایک سلطنت نہیں کہہ سکتے جب تک ہمارے سامنے قرطاجنی موجود ہیں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ گزشتہ دنوں ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ ہمارے دو بڑے سالار کاتھیوں سے بری طرح شکست کھا گئے۔ ہمارے بری سپہ سالار ارمنیدس کے پاس ستر ہزار کا لشکر تھا، جو ریزہ ریزہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود ارمنیدس بھی مارا گیا۔ ہمارے بحری سپہ سالار کوناڈس کو بھی ناگہانی جنگ کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا بھی آدھا لشکر تباہ ہو گیا۔ کوناڈس خود بری طرح زخمی ہوا جو آج دو ماہ بعد بھی بمشکل چل پھر سکتا ہے۔

محترم اعیانِ مجلس!

یہ تھے وہ حالات جو گزشتہ دو ماہ میں ہمارے زیرِ غور رہے۔ ہم نے ان حالات پر خوب خوب بحث کی اور اچھے سے اچھے فیصلے کرنے کی کوشش۔ دیوتاؤں کی تعلیم یہ ہے کہ اتفاق رائے سے جو فیصلہ ہو وہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ ہم نے اتفاق رائے سے کچھ فیصلے کیے ہیں۔ جنہیں ہم نے رومہ کی نئی حکمت عملی کا نام دیا ہے اور وہ فیصلے یہ ہیں:

نمبر ایک:۔ برتھارس کیخلاف اب کوئی فوج نہیں بھیجی جائے گی۔ وہ جن پہاڑیوں میں بھٹکتا پھر رہا ہے وہاں اسے غریبوں کی بستیوں کے سوا کچھ ملنے والا نہیں۔

نمبر دو!۔ ہم اپنے سب سے بہترین سپہ سالار ''اورلیس'' کو ایک بڑا لشکر دے کر براہ راست قرطاجنہ بھیجیں گے۔ اورلیس جو ایک منجھا ہوا، سمجھدار، قومی اور بہادر انسان ہے، کارتھیج کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔

نمبر تین: ہم اپنے بحری بیڑے کو پھر سے منظم کریں گے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کردیں گے۔ ایک حصہ جس کا سپہ سالار شیراٹن ہوگا، قرطاجنہ پر حملہ کرنے والی فوج کو کارتھیج کے ساحل پر اتار کر خود سمندر میں شہر قرطاجنہ کی ناکہ بندی کردے گا جبکہ دوسرا بحری بیڑا جس کا سپہ سالار بدستور کوناڈس ہی رہے گا، سمندر میں موآبریس کو الجھائے رکھے گا۔ تاکہ وہ قرطاجنہ کی مدد کے لیے نہ پہنچ سکے۔ مجھے امید ہے جب تک یہ تیاریاں مکمل ہوں گی، کوناڈس صحت

یاب ہو چکا ہوگا۔

نمبر چار: رومہ میں شہریوں اور مضافاتیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کی جائے گی جو سلطنت کو برتھاس جیسے لٹیروں کے حملوں سے محفوظ رکھے گی۔

محترم اعیان مجلس!

ہماری نئی حکمت عملی کے یہ چار نکات ایسے ہیں جن پر سب رومی سردار متفق ہیں۔ چنانچہ آج ہماری بحث ختم ہوئی۔ میں نے یہ تمام تحریر اس لیے پڑھ کر سنا دی تاکہ آپ لوگ مطمئن ہو کر دستخط کر دیں۔"

رومی مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر تیزی سے عملدرآمد کیا جانے لگا۔ کوناڈس تیزی سے روبہ صحت ہو رہا تھا۔ اسے زخمی حالت میں روم پہنچایا گیا تھا۔ جہاں بڑے بڑے طبیبوں نے قدرتی جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج کیا اور اس کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ لیکن ابھی وہ بہت نحیف اور لاغر تھا۔ وہ دن بھر اپنی بڑی حویلی میں آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ ٹہلتا رہتا، خوب کھاتا اور خوب آرام کرتا۔ کوناڈس کو مجلس کے فیصلے سے خوشی ہوئی۔ وہ حیران بھی تھا کہ مجلس نے اسے سزا دینے کی بجائے دوبارہ امیر البحر بنا دیا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک بحری قزاق تھا اور موآبریس جیسے شخص کو الجھائے رکھنے کا کام اس سے بہتر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ مجلس نے نہ صرف اسے بحال کیا بلکہ اس کی مراعات بھی بڑھا دیں اور اب وہ بہت جلد تازہ دم بحری بیڑے کو لے کر بحر روم کے پانیوں میں موآبریس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے والا تھا۔

اوریس جسے قرطاجنہ پر حملہ کرنے والی بری فوج کا سپہ سالار بنایا گیا تھا، ایک نہایت بہادر رومی سردار تھا۔ اس کی عمر چالیس سے کم تھی۔ وہ بال بچے دار تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کوناڈس کی طرح عورتوں کا رسیا نہیں تھا۔ شراب بھی کم ہی پیتا تھا اور اپنا زیادہ وقت جنگی مشقوں میں گزارتا تھا۔ تیسرا سپہ سالار شیراٹن تھا۔ یہی نوجوان تھا جس نے بحر روم کے جزیروں پر بحری جنگوں کی تربیت حاصل کی تھی اور یہی وہ نوجوان تھا جس نے کوناڈس کے بے ہوش ہونے کے بعد اپنے بچے کھچے بیڑے کو موآبریس کے غضب سے بچایا تھا۔

ان تین سپہ سالاروں پر رومی قوم نے بھروسہ کیا اور اب اہل رومہ کے رنج و غم نئی

حکمت عملی کی وجہ سے کسی قدر کم ہو گئے تھے۔ پچھلی جنگوں میں جن گھروں کے جوان مارے گئے تھے، ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بہت سے سر پھرے قرطاجنہ پر حملہ کرنے والے لشکر میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ جگہ جگہ فوجی بھرتیاں شروع ہو گئیں۔ نئی افواج کے لیے بے پناہ رقم کی ضرورت تھی۔ رومی مجلس کے نمائندوں نے قریہ قریہ، شہر شہر جا کر عوام سے درخواست کی کہ وہ نئی افواج کے لیے چندہ دیں۔ غیض وغضب سے بھری مقتول فوجیوں کی بیواؤں نے اپنے زیورات تک خزانے میں جمع کروا دیئے۔ چار قسم کے لشکر تیار کیے جا رہے تھے۔ دو بحری اور دو بری۔ دوسرا بری لشکر خود رومی سلطنت کی حفاظت کے لیے مرتب کیا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ جنگی مشقوں اور تربیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ رومی عوام قرطاجنہ کی مخالفت پر ایک جٹ ہو کر کمر بستر ہو گئی تھی۔ قرطاجنی سپہ سالار برتھاس کو انہوں نے بھلا دیا تھا اور ایسا کر کے انہوں نے فی الحقیقت اپنے حق میں اچھا کیا تھا۔ آخر برتھاس کب تک کچی آبادیوں اور مضافاتی بستیوں کو تاراج کرتا۔ رومی سلطنت کے بڑے شہروں کی طرف بڑھنے کی جرأت وہ نہ کر سکتا تھا۔ ایک تو اتنے سالوں میں اس کا لشکر تھا کر چور ہو چکا تھا۔ اور اس پر مستزاد ان کی تعداد کی کمی تھی۔ جونہی برتھاس کو نئی حکمت عملی کی خبریں ملیں وہ سچ مچ سٹپٹا گیا۔ اس کے لشکر کی کل تعداد انیس ہزار تھی۔ ارمنیدس کو شکست دینے کے بعد وہ وادیٔ داریون سے نکل آیا تھا۔ اور اب وہ یونان کی ساحلی سرحدات کے ساتھ ساتھ رومی علاقوں میں دھیرے دھیرے گشت کر رہا تھا۔ لیکن برتھاس ذہنی طور پر الجھن کا شکار تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب سے کلاڈینا برتھاس کے چنگل سے نکل بھاگی تھی، وہ بہت مضمحل رہنے لگا تھا۔ وہ رومی حسینہ جو ہمیشہ سے سچ بولتی تھی اور جس نے برتھاس کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ایک دن بھاگ جائے گی۔ جب قرطاجنی سپہ سالار کو چھوڑ کر گئی تو برتھاس جیسا سفاک اور پتھر دل انسان بھی نہ جانے کیوں ٹوٹ سا گیا۔ اوپر سے یہ نئی حکمت عملی اس کو مزید الجھائے دے رہی تھی۔ ایک ماہر جنگجو ہونے کے باوجود اس کے دماغ نے شاطرانہ چالیں چلنا چھوڑ دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کلاڈینا کو ڈھونڈنے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنے ماضی پر نظر کرتا، اپنے وفادار ماتحتوں کے چہرے دیکھتا اور اپنے محبوب شہر قرطاجنہ کی بقا کے بارے میں سوچتا تو اپنے ذہن سے کلاڈینا کے خیال کو جھٹک دیتا۔ لیکن ایک عجب بات ہوئی تھی۔ جب سے کلاڈینا اسے چھوڑ کر گئی تھی، تب سے اب تک اس نے کسی انسان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس

نے نئی بستیوں کو لوٹا اور نہ ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ وہ کچھ بدل سا گیا تھا۔ اس کے ماتحت سالار بھی اس کی اس کیفیت پر حیران اور پریشان تھے۔ حتی کہ اس کی خاص پسندیدہ لڑکیاں بھی بے حد حیران تھیں کیونکہ اب وہ اپنی راتیں اکیلے ہی گزارتا تھا۔ فوج کے دکھاوے کے لیے اس کے حرم کی تمام لونڈیاں ہنوز اس کے ہمراہ تھیں۔ لیکن اب اس کی نگاہ میں ان کے لیے وہ جنسی پیغام نہیں تھا جو شراب کے نشے میں بدمست برتھاس کے مزاج کا خاصا تھا۔

وہ جہاں بھی جاتا اس کی نظریں کلاڈینا کو ڈھونڈتی رہتیں اور پھر ایک روز اسے ایک نہایت عجیب خبر سننے کو ملی۔ قرطاجنہ سے آنے والے اس کے پیغامبروں نے اسے بتایا کہ اس کی پسندیدہ داشتہ کلاڈینا' قرطاجنہ میں دیکھی گئی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ وہ سر بازار بیچی گئی اور اسے ایک یہودی سوداگر نے ایک لاکھ ٹیلنٹ چاندی کے عوض خریدا۔ برتھاس اپنی جگہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر قرطاجنہ چلا جاتا۔ لیکن وہ تو ایک سپہ سالار تھا۔ اس کی ذمہ داریاں اس ایک لڑکی کے پیچھے بھاگنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ وہ بری طرح الجھ گیا۔ شاید اسی کیفیت میں برتھاس بیمار بھی پڑ جاتا کہ اسے چند روز بعد ایک نہایت خوشگوار پیغام ملا۔ مجلس قرطاجنہ کے نمائندہ خصوصی نے برتھاس کو وزیراعظم اشلکر کا مکتوب پڑھا کر سنایا۔

"محترم سپہ سالار برتھاس! جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ رومی سلطنت نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی ہے اور اب وہ روم کی سرزمین پر جنگ لڑنے کی بجائے قرطاجنہ کی سرزمین پر جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔

محترم برتھاس!...... ہمارا مقصد پورا ہوا۔ ہم رومیوں کو اس قسم کے حالات اور اسی قسم کے فیصلوں پر مجبور کر دینا چاہتے تھے۔ کسی کے ملک میں جا کر لڑنا آسان کام نہیں۔ آپ کو سرزمین روم میں بھیجا گیا تھا کہ آپ رومیوں کو قرطاجنہ کے ساحلوں تک آنے پر مجبور کر دیں۔ آپ نے اپنا کام بخوبی نبھایا اور اب رومی ہم سے لڑنے آ رہے ہیں۔ اس لے اب آپ کا مزید یہاں رہنا عبث ہوگا۔ اس وقت قرطاجنہ کو آپ کی ضرورت ہے لہٰذا آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح اپنے لشکر کو قرطاجنہ واپس لانے کی کوشش کریں۔ سردست ہم آپ کے لیے کوئی بحری بیڑا نہیں بھیج سکتے۔ لیکن پھر بھی ہم آپ سے امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے مخصوص طریقوں سے اپنے لشکر سمیت قرطاجنہ پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

برتھاس کو جیسے سکھ کی سانس آ گئی۔ وزیراعظم کے خط نے اس کی ساری الجھن دور

کردی۔ چاہتا تو وہ خود بھی یہی تھا کہ اپنا لشکر لے کر قرطاجنہ واپس لوٹ جائے۔ اس کے وطن کو اب اس کی ضرورت تھی، لیکن وہ خود سے کوئی فیصلہ نہ لے سکتا تھا۔ ایک طرح سے اسے انتظار تھا کہ کب مجلس قرطاجنہ اسے واپس بلاتی ہے۔ البتہ اب اس کے سامنے ایک اور بڑی مشکل تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ بحر روم کس طرح عبور کرے۔ اس کے پاس نہ تو کوئی جہاز تھے اور نہ ہی وہ رومیوں کے کوئی جہاز لوٹ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ مشکل مسئلہ اپنے سالاروں کے سامنے رکھ دیا۔ اور کافی غور و خوض کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ وہ لوگ یونانی ملاحوں سے چند جہاز اور بڑی کشتیاں کرائے پر لینے کی کوشش کریں گے۔ شاید ایسے ہی کسی دن کے لیے برتھاس نے اپنے پاس کچھ جمع پونجی رکھ چھوڑی تھی۔ سب سالاروں نے یک جا ہو کر ایک بھاری رقم اکٹھی کی اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ لوگ وقفے وقفے سے روانہ ہوں گے تاکہ رومی قزاقوں کی دست برد سے بچ سکیں۔ برتھاس نے اپنے دو خاص جاسوس یونان کی سرحد عبور کرنے کے لیے بھیجے تاکہ وہاں جہاز رانوں کیساتھ کرائے کی بات چیت اور راستوں کا تعین کیا جا سکے۔ اور اب وہ اپنے لشکر میں بے چینی کے ساتھ ان جاسوسوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

بحری سپہ سالار موآبرلیس کی حالت سب سے بہتر تھی۔ مجلس قرطاجنہ کے نمائندے موآبرلیس کے پاس بھی پہنچے اور انہوں نے موآبرلیس کو بھی نئے احکامات سنائے۔ جن احکامات کی رو سے اسے ابھی سمندر میں رہنا تھا اور کوناڈس کے لشکر کا جلد از جلد خاتمہ کر کے قرطاجنہ پہنچنے کی کوشش کرنی تھی۔ موآبرلیس بہت منجھا ہوا انسان تھا۔ وہ بوڑھا تھا لیکن لگتا نہ تھا۔ اسے روم کی مجلس شوریٰ کی نئی حکمت عملی کا پتہ چل چکا تھا۔ اور یہ جان کر اسے خوشی ہوئی تھی کہ کوناڈس زندہ ہے اور اسے پھر اس کے مقابلے میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں ارمان رہ گیا تھا کہ کوناڈس اپنی داشتاؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن اس کے زندہ ہونے کی خبر سن کر اسے یک گونہ اطمینان ملا تھا۔ موآبرلیس کو یہ سوچ کر لطف آنے لگا کہ اس کا پرانا حریف پھر میدان میں آنے والا تھا۔ بحر روم کے پانیوں پر ان دونوں حریفوں کا آمنا سامنا فی الحقیقت دونوں افواج کی دلی خواہش تھی۔ الغرض بوڑھا موآبرلیس خوب بے چینی سے رومیوں کا انتظار کرنے لگا۔

رومی مجلس شوریٰ کی طرح مجلس قرطاجنہ بھی آج تک خاصی سرگرم تھی۔ قرطاجنی امراء آنے والی جنگ کے لیے خود کو اچھی طرح تیار کرنا چاہتے تھے۔ یہاں بھی روز کے روز

مجلس عامہ کے اجلاس برپا ہوتے اور روز نئی نئی حکمت عملیوں پر غور کیا جاتا۔ مینو خاندان کے سردار جو ہمیشہ سے وزیراعظم ارفلکر کے مخالف رہے تھے، اس جنگ سے پہلے ارفلکر کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے۔ اور یہ صورتحال مخلص اہل قرطاجنہ کے لیے پریشان کن تھی۔ ایسے حالات میں جب رومی لشکر کی آمد آمد تھی، مینو خاندان کو یہ قضیہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ تو گویا ایک طرح سے وطن کے ساتھ غداری تھی۔ لیکن مینو خاندان کے حاسد امراء کے لیے بھی یہی وقت بڑا مساعد تھا۔ انہوں نے مجلس عامہ میں طوفان کھڑا کر دیا اور مسلسل ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ اگر وزیراعظم، برتھاس اور موآبریس کو نہ بھیجتا تو آج قرطاجنہ پر رومی حملہ نہ کرتے۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ وزیراعظم نے ملک کو جنگ کی طرف دھکیلا۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ مجلس عامہ کی گرماگرمی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مینو خاندان کے سب سرداروں کا یہ اصرار تھا کہ وزیراعظم استعفیٰ دے اور اس کی جگہ کسی نئے شخص کو وزیراعظم بنایا جائے۔ شہزادی جافیکس کی فراست آمیز اور نصیحت آموز تقریروں کے باوجود بھی مینو خاندان کے سردار اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ ایک روز ایک مینو سردار نے قرطاجنہ کی کنواری کو قریب قریب ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"محترمہ جافیکس!...... یہ اتفاق ہے کہ آپ دونوں باپ بیٹی کے پاس ملک کے دو بڑے عہدے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے کبھی ایسے نہیں ہوا۔ قرطاجنہ کی کنواری ہمیشہ الگ خاتون ہوتی ہے اور وزیراعظم الگ۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ مجلس عامہ قرطاجنہ کی کنواری کو اپنے عہدے سے ہٹا نہیں سکتی، ورنہ ہم لوگ آپ کو بھی معزول کر دیتے۔ آپ روز اول سے ہی اپنے باپ کی حمایت کرتی ہیں اور قرطاجنہ کی ایک سچی کنواری ہونے کا حق ادا نہیں کرتیں۔ مینو خاندان کے سردار یہ کوشش کریں گے کہ اس سلسلے میں مہاپرش طالوسا سے ملیں۔ تاکہ آپ کو ہٹایا جا سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اور آپ کے باپ نے قرطاجنہ کے حسین ملک کو پوری طرح جنگ کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جب رومی فوجیں یہاں آن اتریں گی تو یونان و فارس کا کوئی سوداگر ہماری سرزمین پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔ قرطاجنہ کی منڈیاں ویران ہو جائیں گی اور عوام بھوکوں مرنے لگیں گے۔ لیکن اب ہم آپ دونوں باپ بیٹی کو ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ ہم مجلس کے سامنے مطالبہ رکھتے ہیں کہ فوری طور پر رومی مجلس شوریٰ کی جانب صلح کا وفد بھیجا جائے جو ان سے معافی مانگے اور رومی لشکر کو یہاں آنے سے

روکے۔ اس کے سوا اہل قرطاجنہ کو اور کوئی راستہ منظور نہیں۔"

یہ حالات کافی مایوس کن تھے۔ بظاہر ایسا نہیں لگتا تھا کہ قرطاجنہ کی مجلس عامہ کسی ایک فیصلے پر متفق ہو سکے گی۔ دونوں فریقین غصے کا اظہار کرتے اور ہر روز مجلس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی برخاست کر دی جاتی۔ قرطاجنہ کی کنواری اپنی جگہ فکرمند تھی۔ آج تک ایسا نہ ہوا تھا کہ قرطاجنہ کی کنواری کو اس کے عہدے سے ہٹایا جاتا۔ گزشتہ صدیوں کی تمام کنواریاں بوڑھی ہو کر مر چکی تھیں۔ قرطاجنہ کے قانون میں یہ عجب روایت چلی آ رہی تھی کہ ایک نہ ایک کنواری دھرتی کی ماں کے روپ میں ہمیشہ موجود رہتی۔ شہر قرطاجنہ ایک کنواری نے ہی آباد کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دور میں ایک نہ ایک کنواری اس مقدس عہدے پر فائز ہوتی۔ اہل قرطاجنہ نے پچھلے ادوار کی تمام کنواریوں کے مجسمے بنا کر اپنے مندروں میں رکھے ہوئے تھے اور انہیں "کاتھی ماتا" کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ لوگ ان کے چرنوں میں چڑھاوے اور محبت کرنے والے جوڑے ان کے سامنے منتیں مانتے۔

جافیکس موجودہ دور کی کارتھی ماتا تھی۔ وہ کنواری تھی۔ وہ پچھلی تمام کنواریوں سے زیادہ حسین اور ذہین تھی۔ اہل قرطاجنہ اسے کسی دیوی کی طرح پوجتے تھے۔ لیکن قرطاجنہ کی مجلس عام میں مینو خاندان کے سرداروں نے اس کی توہین کی تھی۔ عظیم دماغ جافیکس کو اپنی توہین کا دکھ نہیں تھا۔ اسے فکر تھی تو قرطاجنہ کی سلامتی کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسے حالات میں امراء شہر کے مابین پھوٹ پڑ جائے اور پھر جافیکس نے خود ہی مہاپرش طالوسا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے خدام نے رتھ تیار کیا اور وہ برج اعظم کی طرف روانہ ہو گئی۔

مہاپرش کا قیام برج اعظم میں تھا۔ جہاں مہاپرش کے چند خدام کے سوا کوئی نہ رہتا تھا۔ جافیکس چاہتی تھی کہ وہ مینو خاندان کے سرداروں سے پہلے میں مہاپرش سے مل لے۔ جافیکس کا رتھ برج اعظم میں پہنچا تو اس کی نگاہیں پہلے سے کھڑے ہوئے ایک رتھ پر پڑیں۔ وہ چونکی۔ اس نے یہی سمجھا کہ مینو خاندان کا کوئی سردار مہاپرش سے ملنے آیا ہوگا۔ وہ دل میں تھوڑی سی پریشان ہوئی لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اگر مہاپرش دونوں طرف کی باتیں سن لیں تو دیوتاؤں سے صحیح ہدایات لے سکیں گے۔ وہ اپنے رتھ سے اتری اور برج اعظم کی طرف بڑھی۔ برج اعظم ایک بلند عمارت تھی۔ جس کی نچلی منزل کا صدر دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ بڑے ہال میں چاروں طرف چکردار زینے اوپر کی

منزلوں کی طرف اٹھتے تھے۔ مہاپرش ایک بوڑھا شخص ہونے کے باوجود سب سے اوپر والی منزل پر رہتا تھا۔ وہ وہاں دیوتاؤں کی پرارتھنا کرتا اور گیان دھیان کرتا تھا۔ اہل قرطاجنہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مہاپرش طالوسا فنیقیوں کے پرکھوں کی روحوں سے ربط رکھتا ہے۔ قرطاجنہ میں جب بھی کوئی مرتا، اس کے سوگواران ایک بڑی رقم برج اعظم کے لیے چندے کے طور پر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ مہاپرش کو خوش رکھنے سے ان کے مرنے والوں کی روحوں کو شانتی ملے گی۔ برج اعظم کے چاروں طرف برگد کی شکل کے بوڑھے پیڑ ے تھے۔ جن کے پتے جامن کے درخت کے پتوں سے مشابہہ تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں رنگین چڑیاں برج اعظم کے چاروں طرف پھیلے پیڑوں پر بسیرا رکھتی تھیں۔ وہ کسی وقت ایک ساتھ اڑتیں تو ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے پورے ماحول میں توانائی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ یوں لگتا جیسے قرطاجنہ کی قسمت نے انگڑائی لی ہو۔ برج اعظم کی مضبوط عمارت قیمتی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ یہ عمارت ابھی نئی تھی اور اس میں بوسیدگی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اس کے نئے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ طالوسا قرطاجنہ کا پہلا مہاپرش تھا۔ اہل قرطاجنہ صور کے فنیقیوں کی اولاد تھے۔ صوریوں اور فنیقیوں کا ذکر بائبل میں بھی آیا۔ جب سے قرطاجنہ آباد ہوا تھا، طالوسا پہلا مہاپرش بنا تھا۔ چنانچہ برج اعظم، طالوسا نے اپنی نگرانی میں بنوایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ قرطاجنی باشندے فنکار ہونے کی وجہ سے ذہانت، فطانت اور گہری سوجھ بوجھ کے حامل تھے اور ان میں سب سے بڑا دماغ یا تو مہاپرش طالوسا کا تھا اور یا قرطاجنہ کی کنواری جافیکس کا برج اعظم جس زمین پر واقع تھا یہ جگہ پورے قرطاجنہ میں سب سے حسین تھی۔ صدر دروازے کے سامنے ریشم کی طرح نرم سبز گھاس کا قالین بچھا تھا۔

جافیکس برج عظم کی پہلی منزل کے صدر دروازے سے اندر دخل ہوئی۔ برج اعظم کا فرش قیمتی پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ جافیکس ان کی چمک میں اپنی شبیہہ محسوس کرسکتی تھی۔ وہ چمکتے فرش پر باوقار قدموں سے چلتی ہوئی پہلے زینے تک آئی۔ اس کے دل میں تجسس تھا کہ آخر اس سے پہلے کون آیا تھا۔ وہ زینے چڑھنے لگی۔ ایک، دو تین، چار۔ معا اس کے کانوں میں ٹھک، ٹھک کی آواز سنائی تھی۔ اسے لگا جیسے اوپر سے کوئی شخص زینے اتر کر نیچے آرہا تھا۔ جافیکس نے فوراً اپنا لباس سیدھا کیا اور قرطاجنہ کی کنواری کی مخصوص جالی دار نقاب کھینچ کر ناک پر رکھ لی۔ اب سیاہ جالی کے عقب سے اس کے یاقوتی ہونٹ جھانک رہے تھے۔ نقاب

سے باہر صرف اس کی آنکھیں تھیں۔ گوری، چٹی، چوڑی پیشانی کی مالک جافیکس کی پلکیں دو کمانوں کی صورت اس کی حسین آنکھوں پر حاشیے بنائے ہوئے تھیں۔ وہ بدستور زینے اتر تا رہا۔ جافیکس نے سوچا یہ یقیناً وہی مینو سردار ہوگا جس کا رتھ باہر کھڑا تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ مینو سردار اپنی بات کر کے واپس لوٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا شکایتی سردار جافیکس کو دیکھ کر ٹھٹک جائے گا۔ نہ جانے کیوں وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ درودیوار میں سے بھی جھلکنے لگی۔ یہ مسکان اتنی لطیف تھی کہ خود جافیکس کو اپنے اوپر پیار آجاتا تھا۔ وہ آج بھی قرطاجنہ کی سب سے حسین دوشیزہ تھی۔ وہ زینے پر زینہ چڑھتی رہی اور ہر لمحہ اترنے والے شخص سے نزدیک تر ہوتی جارہی تھی۔ نہ جانے کیوں جافیکس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ ایسا جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب نیچے سے اوپر جاتی ہوئی جافیکس اور اوپر سے نیچے آتا ہوا شخص آمنے سامنے آگئے۔ وہ ایک دراز قد اور خوبصورت مرد تھا۔ پہلی نظر میں ہی جافیکس جان گئی کہ وہ مینو خاندان کا کوئی فرد نہیں۔ اس کی چال ڈھال مینو خاندان کے سرداروں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ دونوں آمنے سامنے آئے تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا اور جیسے کہیں کھو گئے۔ دونوں کی آنکھیں کچھ انوکھے سے پیغامات نشر کر رہی تھیں۔ ان پیغامات کو نہ تو جافیکس سمجھ سکی اور نہ ہی وہ شخص۔ دونوں کے دلوں کی حالت بھی عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے دل لپک کر ہتھیلیوں پر آبیٹھیں گے۔ درودیوار کو بھی یہ آمنا سامنا منفرد لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے پورے ماحول میں سوگوار اور خوشگوار حیرت گھل مل گئی ہے۔ لیکن دونوں ہی یہ نہ جان پا رہے تھے کہ آخر ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ یہ سرتاسر قلبی کیفیت کا معاملہ تھا۔ اس لیے ان کے دماغ اپنی اس کیفیت کو کوئی معانی نہ پہنا رہے تھے۔ البتہ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور سانسوں کی حرکت بھی۔

جافیکس ڈری کہ اگر وہ کچھ دیر اور رکی رہی تو کچھ نہ کچھ انہونا ہو جائے گا۔ وہ قرطاجنہ کی مقدس کنواری تھی اور اس کے لیے کسی مرد کو ایسی نظروں سے دیکھنا روا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اگلے زینے پر قدم رکھ دیا۔ البتہ زینے اترنے والا شخص وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس نے سر گھما کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ اسی رخ پر کھڑا رہا جس پر وہ کھڑا تھا۔ لیکن اس کے دل میں عجیب عجیب طوفان اٹھ رہے تھے۔ جافیکس پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہی جانتی تھی کہ وہ مرد

ابھی وہیں کھڑا ہے۔ اس کی قلبی کیفیت ابھی تک اس کے قابو میں نہ تھی۔ چنانچہ وہ نہ رکی اور چکردار زینے چڑھتی چلی گئی۔ جلد ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں کی پہنچ سے دور ہوگئے۔ جافیکس کو اپنی کیفیت پر شدید حیرت تھی۔ اس کے ساتھ آج تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آج کے واقعہ میں نہ جانے کون سی ایسی چیز تھی جو اسے بار بار اس اجنبی کی طرف کھینچتی۔ جس کے ساتھ ابھی زینوں پر جافیکس کی آنکھیں دوچار ہوئی تھیں۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر وہ کون ہوسکتا ہے۔ اس کا لباس تو قرطاجنی امراء جیسا تھا، لیکن خدوخال قرطاجنیوں سے مختلف تھے۔ ابھی تک جافیکس کا دماغ اس کے دل کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔

بالآخر وہ آخری منزل تک پہنچ گئی۔ سب سے پہلے اس کی نظر مہاپرش طالوسا کے دو بوڑھے خادموں پر پڑی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ جس کے دروازے پر وہ قالین کے دو ٹکڑے ڈالے ایک طرح سے چوکڑی جمائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے قرطاجنہ کی کنواری کو دیکھا تو اس کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جافیکس نے ان کے سلام کا جواب اپنی میٹھی مسکراہٹ سے دیا اور آگے بڑھ کر مہاپرش کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ مہاپرش طالوسا پتھر کے ایک ننگے چبوترے پر دھونی رمائے بیٹھا دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جافیکس نے اسے جھک کر سلام کیا اور اس کے سامنے مؤدب ہوکر کھڑی ہوگئی۔ تب مہاپرش نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے جافیکس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ جافیکس نے بیٹھتے ہی بات شروع کی۔

"مقدس مہاپرش! مجلس عامہ کے حالات مخدوش ہیں۔ آپ کی نظروں سے تو کچھ پوشیدہ نہیں۔ مینو خاندان کے سردار بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ میں یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ آپ مجلس عامہ کے اجلاسوں میں شرکت کریں اور قرطاجنہ کو تباہی سے بچالیں۔"

مہاپرش نے سر ہلا کر گویا یہ کہا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"تمہارے باپ کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے یہ تو ہونا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کا بویا کاٹ رہا ہے۔ تم اپنے باپ کی فکر چھوڑ دو۔ اس کا عہدہ باقی رہے یا نہ رہے لیکن تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اور قرطاجنہ کو بھی۔"

مہاپرش کی بات سن کر جافیکس ششدر رہ گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے باپ نے کیا بویا اور وہ کیا کاٹ رہا تھا۔ وہ تو ساری عمر اپنے باپ کے ساتھ رہی تھی۔ اس کی زندگی

میں کوئی ایسا لمحہ نہ آیا تھا جب وہ باپ سے الگ رہی ہو۔ اسے تو اپنے باپ کا کوئی جرم یاد نہیں تھا۔ پھر مہاپرش ایسے بات کیوں کر رہا تھا۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ مہاپرش طالوسا نے جانیکس کو متذبذب دیکھا تو کہنے لگا۔

”تم زیادہ مت سوچو! وقت پر تمہیں سب باتوں کا پتہ چل جائے گا۔ ارفلکر نے محبت کے دیوتا کو ناراض کیا ہے۔ اور تم جانتی ہو کہ قرطاجنہ محبت کا گھر ہے اور ہاں!...... جنگ تو ہوگی۔ رومی یہاں آئیں گے اور یہاں سے اپنا مقدر لے جائیں گے۔ لیکن قرطاجنہ ابھی قائم رہے گا۔ یہ میرا گیان ہے۔“

جانیکس اب بھی بے حد حیران تھی۔ اس کے باپ نے محبت کے کون سے دیوتا کو ناراض کیا تھا اور کب کیا تھا؟ وہ مہاپرش طالوسا کی باتوں کو مختلف معانی پہنا کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے باپ کے بارے میں سن کر وہ خاصی متفکر ہوگئی تھی۔ جانیکس نے کسی قدر دھیمے لہجے میں کہا۔

”مہاپرش!...... اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ایسے حالات میں جب میرے باپ وزیراعظم نہیں رہیں گے، ہم دشمن کا مقابلہ کس طرح کر پائیں گے۔ میری سوچ کے مطابق یہ وقت آپس کے جھگڑوں کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لیکن مینو خاندان کے سرداروں نے یہ قضیہ کھڑا کر کے پوری قوم کے لیے پریشانی پیدا کر دی۔ اب آپ ہی اس مشکل کو سلجھا سکتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔“

مہاپرش طالوسا نے اپنے جھریوں بھرے چہرے پر فکر انگیز تاثرات ڈالے۔ اس نے کچھ دیر کی خاموشی اختیار کی اور پھر اپنی بوڑھی آنکھوں کو سکیڑ کر گویا ہوا۔

”بیٹی!...... تمہیں وہی کرنا چاہیے جو تمہارا من کہے، سرِراہ کسی سے آنکھیں چار ہوں تو اسے نظر انداز کر دینا دانشمندی نہیں۔ پیاسے صحراؤں پر بادل کبھی کبھی برستے ہیں۔ میں مجلس قرطاجنہ میں شرکت کروں گا۔ لیکن شاید میں وزیراعظم کی حمایت نہ کر سکوں۔ اب بوڑھا ہو چکا ہے، مگر قرطاجنہ کے لیے تمہیں ہمت کرنی ہوگی۔ اس جنگ کے دوران قرطاجنہ میں تمہارے سوا کوئی رہبر نہیں۔ یہ خلا تمہیں پر کرنا پڑے گا۔ میں تمہارے لیے پرارتھنا کروں گا۔“

مہاپرش طالوسا کی باتیں خاصی گہری تھیں۔ جانیکس اس کے ہر جملے پر چونک چونک جاتی تھی۔ خاص طور پر جب اس نے کہا کہ سرِراہ کسی سے آنکھیں چار ہوں تو اسے

نظر انداز کر دینا دانشمندی نہیں۔ تو جافیکس کا دل زور سے دھڑکا۔ آخر مہاپرش کے کہنے کا مقصد کیا تھا۔ آج برج اعظم کے زینے چڑھتے ہوئے جس آدمی سے اس کا سامنا ہوا تھا، کیا وہی سرراہ ملنے والا شخص نہیں تھا؟ جافیکس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ مہاپرش سے اس شخص کے بارے میں سوال کرے گی جو یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ یہی فیصلہ کر کے اس نے مہاپرش کو مخاطب کیا۔

''مقدس مہاپرش! جب میں برج اعظم کے زینے چڑھ رہی تھی تو ایک شخص شاید یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ وہ سرراہ مجھ سے مل گیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میرے دل کی کیفیت بدلنے لگی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ شخص کون تھا؟ اور اسے دیکھ کر میرے دل کی ایسی حالت کیوں ہوئی؟''

مہاپرش نے پہلی بار سر گھما کر جافیکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔

''وہ ایک یہودی سوداگر تھا۔ مجھ سے اپنے لمبے سفر کے لیے آشیرواد لینے آیا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان ہے، پہلے بھی میرے پاس آتا رہتا ہے۔''

یہودی سوداگر کا سن کر جافیکس کا ماتھا ٹھنکا۔ یکا یک اسے کچھ ایسا یاد آیا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ یک لخت جوش سے بھر گئی۔ اسے بھول گیا کہ وہ قرطاجنہ کی سب سے سنجیدہ خاتون ہے۔ اس نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔

''اس کا نام کیا ہے، مہاپرش!؟''

''نام میں کیا رکھا ہے۔ ہمیں افراد کا مقام دیکھنا چاہیے کہ وہ زندگی کے کون سے درجے پر فائز ہیں۔ اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ کیونکہ وہ عشق کرتا ہے۔ نہ جانے کتنے سالوں سے وہ اپنے محبوب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ جب بھی میرے پاس آتا ہے، مجھے پرارتھنا کے لیے کہتا ہے۔ میں نے آج تک ضروری نہیں سمجھا کہ اس کا نام پوچھوں۔''

اب تو جافیکس کی حالت اور بھی غیر ہوگئی۔ اسے زینے اترنے والے شخص کی آنکھوں میں کچھ پرانی یادوں کی جھلک سی محسوس ہوئی، وہ گھبرا کر اٹھی اور بعجلت مہاپرش سے اجازت لینے لگی۔ اب وہ اس شخص کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ مہاپرش کی باتیں سن کر اسے یقین ہوگیا تھا کہ زینوں پر ملنے والا شخص دانیال ہی تھا۔ اس کا محبوب۔ وہی نوعمر یہودی لڑکا، جس کے ساتھ سرخ سیبوں کے گھنے باغ میں وہ دن بھر آوارہ بھنوروں کو پکڑنے کی کوشش کرتی۔

اس وقت جافلیکس کا نام جافلیکس نہیں آموسا تھا اور اس کے باپ ارفلکر کا نام۔ ارفلکر نہیں ہسدروتھا۔ یہ نام تو اس کے باپ نے تبدیل کیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو بھر آئے۔ اس کا سینہ جذبات سے لبریز ہو گیا۔ مہاپرش نے سر ہلا کر اسے اجازت دی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلی۔ اب وہ ٹھکاٹھک زینے اتر رہی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے تمام زینے اتر کر برج اعظم سے باہر آئی تو اسے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ دوسرا رتھ جا چکا تھا۔ اب وہاں صرف اس کا اپنا رتھ کھڑا تھا۔ وہ یکدم رک گئی۔ اب وہ کیا کرتی؟ دانیال کو ڈھونڈنے کہاں جاتی۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ مہاپرش نے اسے دانیال کے لمبے سفر کی بابت بتا دیا تھا۔

دانیال پھر اس کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ وہ جان گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد از جلد دانیال سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن اتنے بڑے شہر میں اس کو کہاں سے ڈھونڈتی۔ اسے خیال آیا کہ شہر میں زیادہ یہودی سوداگر نہیں ہوں گے اور دانیال نام کے شخص کو ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ سرعت کے ساتھ اپنے رتھ میں سوار ہوئی اور کوچوان کو سرپٹ دوڑانے کے لیے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ اندھیرا چھانے سے پہلے دانیال نام کے یہودی سوداگر کو تلاش کر لے۔ لیکن ابھی شاید ان دونوں محبت کرنے والوں کا ملاپ کاتب تقدیر نے لکھا نہیں تھا۔ کیونکہ جس وقت وہ اپنے محل میں داخل ہوئی اس وقت دانیال اپنے جہاز پر سوار ہو چکا تھا۔

قزاقوں کا جزیرہ

یہ دانیال کا اپنا جہاز تھا۔ اس نے حال ہی میں خریدا تھا۔ وہ ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ آخر وقت میں اسے یاد آیا کہ اس مرتبہ وہ مہاپرش طالوسا سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اور اپنی اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے عین روانگی سے پہلے مہاپرش سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک اس کے ساتھی جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ وہ انہیں وہیں روک کر ایک تیز رفتار رتھ کے ذریعے برج اعظم پہنچا۔ مہاپرش سے ملا، آشیرواد لی اور واپس چل دیا۔ وہ یہودی تھا۔ بت پرست نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی بت پرستوں کے سردار مہاپرش سے ملنے آیا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ دراصل اسے مہاپرش کے گیان پر یقین تھا۔ وہ بہت پہلے سے یہاں آیا کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی جب بھی اسے مستقبل کا کوئی شگون لینا ہوتا وہ مہاپرش سے ملنے آتا۔ جہاں تک مہاپرش کی بت پرستی کا تعلق تھا تو دانیال اچھی طرح جانتا تھا کہ مہاپرش کے درجے کا کوئی شخص فی الحقیقت بت پرست نہیں ہوسکتا۔ وہ جانتا تھا کہ مہاپرش دیوتاؤں کے بتوں کو محاریب و تماثیل سے زیادہ درجہ نہیں دیتا تھا۔ ایسے تجربے اور ایسی عمر کے لوگ حقائق سے واقف ہوجاتے ہیں۔ مہاپرش کے لیے ملکرت، اشمون یا تائیت دیوتا کے بت محض مجسمے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے پیچھے حقیقت مطلقہ محض ایک ہے اور وہ ہے ایشور۔

دانیال مہاپرش سے مل کر لوٹ رہا تھا تو اس کا سامنا ایک نقاب پوش خاتون سے ہوگیا۔ نہ جانے کیوں دانیال کے قدم رک گئے۔ اس کے دل کی حالت غیر ہوگئی۔ اور وہ گہری سوچوں میں گم ہوگیا۔ آخر وہ خاتون کون تھی؟ وہ بچپن سے لے کر اب تک اپنی محبوبہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہر لڑکی اسے اپنی آموسا ہی لگتی تھی۔ اس نے باہر نکل کر تصدیق کی تو پتا چلا کہ وہ خاتون قرطاجنہ کی کنواری جافیکس تھی۔ دانیال نے اپنے سر کو بیزاری

کے عالم میں جھٹکا دیا اور رتھ پر سوار ہو کر واپس چلا آیا۔ لیکن وہ دل میں سوچتا تھا کہ قرطاجنہ کی کنواری کی آنکھوں میں عجب کشش تھی۔ اس نے دل ہی دل میں قرطاجنہ کی کنواری کے حسن کو سراہا اور پھر اس کا خیال دل سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے جہاز پر سوار ہو چکا تھا۔

یہ بالکل نیا نویلا جہاز تھا۔ وہ لوگ روم جانا چاہتے تھے۔ جہاں ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ ایک تو رومی حسینہ کلاڈینا کو بخیر و عافیت اس کے وطن پہنچانا اور دوسرا سنتوش کو تلاش کرنا۔ ایک تیسرا مقصد جو دانیال کے دل میں پوشیدہ تھا، وہ تھا آموسا کی تلاش۔ وہ آموسا جو اس کی بچپن کی محبت تھی۔ اور جو کئی سال پہلے اپنے باپ ہمسدرو کے ساتھ فلسطین کے سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر کبھی واپس نہ لوٹی۔ دانیال اب اپنی خاندانی ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اب مرتے دم تک آموسا کو تلاش کرے گا، یہی وجہ تھی کہ وہ دل جلوں کے اس قافلہ کو لے کر روم کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اس کا جہاز نہایت خوبصورت تھا۔ یہ ایک چھوٹا جہاز تھا۔ جس میں گول چکردار مشین لگی ہوئی تھی۔ جس کے بڑے بڑے ہینڈلوں کو کولہو کی طرح گھمایا جاتا اور اس کی تہہ میں لگے لوہے کے پنکھ پانی کو پیچھے دھکیلتے۔ یہ جہاز قرطاجنہ کے کاریگروں نے بنایا تھا۔ لیکن اس کی بناوٹ کا طریقہ سیرا کیوز کے سائنسدانوں کی ایجاد تھا۔ وہ شہر جہاں آنے والی صدی میں ارشمیدس پیدا ہونے والا تھا۔ ایک ایسا سائنسدان جس کے لیور کی ایجاد پوری دنیا کے عملی ڈھانچے کو میکانیات کی طرف موڑنے والی تھی۔ دانیال نے ایسا جہاز اس لیے خریدا تاکہ اسے غلاموں کی ضرورت نہ پڑے۔ عام حالات میں دو بیل جہاز کے کولہو کو گھماتے اور جہاز عام رفتار سے چلتا رہتا۔ ضرورت پڑنے پر ان بیلوں کو چابک یا چھڑی کے ذریعے تیز دوڑا کر جہاز کی رفتار کو تیز بھی کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ تیز دوڑانا مقصود ہوتا تو جہاز کے تہہ خانے میں چپو چلانے کے رخنے بھی بنے ہوئے تھے۔ یوں گویا یہ مشینی جہاز بجلی کی رفتار حاصل کرنے کی صلاحیت کا حامل تھا۔ ایسا دانیال نے اس لیے کیا تھا تاکہ قزاقوں سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں وہ نہایت تیزی سے فرار ہو سکے۔ دانیال نے جس سوداگر سے یہ جہاز خریدا تھا اس کا پالتو بندر چھمو بھی جہاز کے ہمراہ دانیال کے حصے میں آ گیا تھا۔ عام بندروں سے شرارتی اور خطرے کے وقت چیخ چیخ کر خبردار کرنے والا چھمو اس جہاز کو اپنا گھر سمجھتا تھا۔ دانیال نے خریدتے وقت سوداگر سے جہاز کا نام بھی پوچھا تھا۔ بیچنے والا سوداگر اس جہاز کو برقہ کہہ کر پکارتا تھا۔ اب برقہ، چھمو، سمیت

دانیال کی ملکیت تھا۔ بیچنے والے سوداگر نے آخر وقت میں دانیال سے درخواست کی تھی کہ وہ چھمو کا خاص خیال رکھے اور اسے کیلے کھلائے۔ کیونکہ کیلے چھمو کی پسندیدہ غذا تھی۔ دانیال کے ساتھی سارے اپنے ہی تھے۔ کلاڈینا، شیتل اور کیدارا۔ انہوں نے کیدارا کو بہت جلد ڈھونڈ لیا تھا۔ ان چاروں کے علاوہ اس جہاز پر عملے کے زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ''آرفان'' جہاز کا پرانا ملاح تھا۔ وہ اس جہاز کی ایک ایک کل کو سمجھتا تھا۔ جہاز خریدتے وقت دانیال نے سوداگر سے درخواست کی تھی کہ وہ جہاز کے پرانے تجربہ کار ملاح کو بھی اسی جہاز پر رہنے دے۔ ''آرفان'' پہلے پچھلے سوداگر کا ملازم تھا اور اب دانیال کا۔ وہ جزیزہ کریٹ کا رہنے والا تھا۔ اور بحرروم کے تقریباً تمام جزائر سے اسے بخوبی واقفیت تھی۔ اس کی زندگی کے اڑتالیس سال سمندر میں ہی گزرے تھے۔ آرفان کے علاوہ جہاز پر سات لوگ اور تھے۔ جن میں ایک آرفان کی بیوی ''موزیکا'' اس کے دو بیٹے ''مالو'' اور ''میران'' اور باقی چار چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے یا بوقت ضرورت چپو چلانے والے بھاڑے کے مزدور تھے۔ بارہ افراد پر مشتمل یہ قافلہ ''برقہ'' پر سوار ہو کر بحرروم کے پانیوں پر تیرنے لگا۔ روانگی سے پہلے ہر کسی نے اپنے اپنے خداؤں سے پرارتھنا کی تھی کہ ان کا سفر بخیر گزرے اور انہیں کامیابی ہو۔ کلاڈینا اور شیتل کے چہروں پر اب پہلے جیسا ذہنی دباؤ ذرا بھی نہیں تھا۔ شیتل نے سنتوش کے باپ مہا پجاری سے اجازت لیتے وقت اس کی طرف سے دی گئی مالی امداد قبول کر لی تھی۔ اگرچہ دانیال کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اب شیتل بھی ایک بہت بڑی رقم اپنے ہمراہ لائی تھی۔ مہا پجاری نے اسے روانہ کرتے وقت ہزار ہزار دعائیں دی تھیں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ چند طاقتور سپاہیوں کو اپنے ہمراہ لے لے۔ لیکن شیتل نے اسے جواب دیا۔

''میں ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہی ہوں جہاں ہمسفروں میں سے کسی کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے ساتھ جو لوگ ہیں وہ میری طرح شکستہ دل اور جانثار ہیں۔ میں ان دیکھے راستوں میں نئے چہروں پر بھروسہ کر کے اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔''

سموجن کی بیٹی سندینا نے بھی سفر میں دانیال کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ دانیال کی عاشق تھی۔ لیکن دانیال نے اسے منع کر دیا۔ شیتل اور کلاڈینا کے آنے کا تو کوئی مقصد تھا۔ لیکن سندینہ اس سفر میں محض دانیال کی وجہ سے شامل ہونا چاہتی تھی۔ دانیال نے

پاکستان ورچوئل لائبریری

اسے کہا تھا کہ وہ جلد واپس آئے گا اور اگر خداوند یہواہ نے چاہا تو اس کی آموسا اس کے ہمراہ ہوگی اور اگر اس کی آموسا اس کے ہمراہ نہ ہوئی تو آموسا کی تلاش کے آئندہ سفروں میں وہ سندینا کو ضرور ساتھ لے جائے گا۔

عاشق سندینا اس بات سے بھی خوش ہوگئی۔ برقہ اسم بامسمی تھا۔ اس کی عام رفتار تھی۔ عام جہازوں سے تیز ہی تھی۔ اس پر مستزاد "مٹھو" کی قلقاریاں تھیں، جو پلک جھپکنے کی دیر میں عرشے سے مستول کی چوٹی تک اور پھر مستول سے جہاز کے پشتے تک پھدکتا پھدکتا پہنچ جاتا تھا۔ بناوٹ کے لحاظ سے بھی برقہ باقی جہازوں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی بظاہر ایک ہی منزل تھی، لیکن اگر یہ تہہ خانے کی پہلی منزل شمار کرلیا جاتا تو برقہ دو منزلہ جہاز تھا۔ یعنی تہہ خانے کے اوپر اس کی پہلی منزل، تہ خانے کی وجہ سے دوسری منزل، ایک الگ منزل شمار کی جاسکتی تھی۔ جہاز کی پہلی منزل پر چار چھوٹے کمرے اور ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ یہ بڑا ہال تھا...... برقہ...... کے بیچوں بیچ ایک گول کمرہ تھا۔ جس کے عین وسط میں کولو تھا۔ جہاز کھینے وال بیل کافی عرصہ سے اسی جہاز کیساتھ تھے۔ وہ اس کولہو کے گرد گھومنے کے اتنے عادی تھے کسی بڑی لہر کے ہچکولوں کے دوران بھی وہ اپنا توازن برقرار رکھ سکتے تھے۔ شدید طوفان کی صورت میں بیلوں کو بٹھا دیا جاتا۔ کولہو روک دیا جاتا، لنگر گرا دیئے جاتے اور بادبان باندھ دیئے جاتے۔ برقہ کا عرشہ خاصا وسیع وعریض اور صاف ستھرا تھا۔ تین مستولوں پر لگے چھ بڑے بادبان موٹی ترپال کے کپڑے سے بنائے گئے تھے۔ مٹھو سارا دن ان ترپالوں پر پھسلتا رہتا۔ لیکن ترپال کے کپڑے کو ذرا سی آنچ بھی نہ آتی۔ عام جہازوں میں ایک مستول کے ساتھ ایک بادبان ہوتا تھا اور اتنے چھوٹے جہاز پر تو مستول بھی ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن برقہ پر تین مستول اور چھ بادبان تھے۔ کیونکہ اسے تیز رفتاری کے نقطہ نظر سے بنایا گیا تھا۔ سمندر میں اگر قدرے تیز ہوا چل رہی ہوتی تو کولہو کے بیلوں کو ایک طرف بٹھا کر ان کی "کھرلی" میں چارا ڈال دیا جاتا اور برقہ ایک بادبانی کشتی کی طرح صرف ہوا کے زور پر دوڑتا۔ اسی بڑے گول کمرے میں جہاز کو دائیں بائیں موڑنے اسے گھمانے یا اس کا رخ سیدھا رکھنے کے لیے بڑے بڑے ہینڈلوں والے آلات بھی نصب تھے۔ یہ سب کام آرفان خود کرتا تھا۔ بیلوں کو چارہ ڈالنے سے لے کر جہاز کو سیدھا رکھنے تک تمام کام آرفان خود انجام دیتا تھا۔ وہ ایک طرح سے جہاز کا کپتان تھا۔ لیکن عہدے کے لحاظ سے اس جہاز کا کپتان بہرحال دانیال خود

ہی تھا۔

برقہ تین دن میں ہی بحرروم میں بہت اندر تک چلا گیا۔ انہیں اپنے سفر میں بہت احتیاط کرنی تھی۔ ایک تو انہیں قزاقوں کا خطرہ تھا۔ اوپر سے رومی بحریہ کے سرگرم ہونے کی اطلاعات تھیں۔ وہ زیادہ تر راتوں کو سفر کرتے، دن میں جہاز کی رفتار بہت مدھم کر دیتے۔ لیکن رات کی تاریکی میں جہاز کو بگ ٹٹ دوڑاتے۔ آرفان آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر راستوں کا تعین کرتا تھا اور جس طرح اس کی واقفیت بحرروم سے تھی اسی طرح وہ آسمان سے بھی شناسا تھا۔ جہاں ستارے ہی ستارے تھے۔ جو بحرروم کے ایک ایک جزیرے کو جانے والے راستے کا تعین یوں کرتے گویا سمندر پر بنی سڑکوں کا عکس آسمان میں نظر آرہا ہو۔ اوپر دیکھ کر نیچے چلنے والوں میں آرفان اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا تو خاندان بھی اسی جہاز پر آباد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو سمندر کا بیٹا کہتا تھا۔ ''ابن البحر''۔

تیسرے روز انہیں پہلا جزیرہ دکھائی دیا۔ آرفان نے بغیر پوچھے ہی سب کو بتایا۔

''یہ موگاس کا جزیرہ ہے۔ چھوٹا چٹانی جزیرہ۔ اس جزیرے کا سبزہ، جزیرے کے جانور چٹ کر گئے اور پھر خود ہی مر گئے۔ یہ ایک طرح سے مردہ ہے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے قزاقوں کے کسی گروہ نے اس میں اپنی کوئی پناہ گاہ بنا رکھی ہو۔ اس طرح کے بہت سے جزیرے ہیں سمندر میں۔ جو بے آباد پڑے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ لٹیروں نے آباد کر رکھے ہیں۔''

شیتل اور کلاڈینا نے گہری دلچسپی سے آرفان کی بات سنی۔ وہ جزیرے کو دور سے متجسس نگاہوں کے ساتھ دیکھتی رہیں۔ تینوں دنوں میں وہ آرفان کی بیوی کی بھی دوست بن چکی تھیں اور اب تو اہل قافلہ کا کھانا وہ تینوں عورتیں مل کر ہی بناتیں۔ کیدارا کے ذمہ اس بار بڑا دلچسپ کام لگا تھا۔ وہ دن بھر جہاز کے پشتے میں کھلے فرش پر بیٹھا مچھلیاں پکڑتا رہتا۔ اہل قافلہ کیدارا کی پکڑی ہوئی مچھلیاں کھاتے اور اسے داد دیتے۔ کیدارا کے پاس ایک چھوٹا جال تھا۔ جس کے کناروں پر لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے طاقتور بازوؤں کو پھیلا کر زور سے جال پھینکتا تو لوہے کے بٹے پانی میں ڈوبنے لگتے اور اس طرح جال پانی میں ایک چھتری کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس چھتری کے نیچے جو بھی مچھلی آتی وہ برقہ کے باسیوں کا لقمہ بنتی۔ شیتل کبھی کبھی سوچتی تھی کہ سمندر کی زندگی بھی بڑی پرلطف ہے۔ لیکن

جب بھی چاروں طرف نگاہیں پھیلاتی اور اسے پانی کا آسمان اپنے پیروں تلے بچھا نظر آتا تو وہ گھبرا جاتی اور سوچتی سمندر کی زندگی کتنی مشکل ہے؟ لیکن ان سب سوچوں سے زیادہ اس کے ذہن پر سنتوش کی سوچ سوار تھی۔ چشم تصور میں سنتوش کو بکتا ہوا دیکھتی اور پھر فوراً آنکھیں موند لیتی۔ اس کی سسکاری نکل جاتی۔ وہ جلد سے جلد سنتوش کو قید سے چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن کس کی قید سے؟ یہ بات تو وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ دانیال اور شینل ایک لحاظ سے ایک جیسے تھے۔ دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے محبوب کہاں ڈھونڈیں۔ البتہ کلاڈینا ایسی باتیں نہیں سوچتی تھی۔ وہ تو دانیال کے چہرے کو تکتی اور یوں لگتا جیسے یہ آدمی کوئی مہربان دیوتا ہے۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ دانیال کو چاہے لیکن جانتی تھی کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی نظروں میں بھی دانیال کے لیے کوئی تمنا نہ لانا چاہتی تھی۔ اس کا گھر بار تو اب دنیا میں تھا نہیں اور یہی بات تو یہ تھی کہ وہ باقی زندگی دانیال کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے سوچ سمجھ کر دانیال کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ صرف شہر روم تک ان کی ہمسفر تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی۔ شینل کبھی کبھی اس سے کہتی۔

کلاڈینا! تم کہاں جاؤں گی؟ اور کہاں سے کھاؤ گی؟ ضرور تم کسی رومی امیر سے شادی کرو گی، ہے نا!"

کلاڈینا اس کی بات سنتی، اسے مصنوعی غصے سے ایک بار دیکھتی اور پھر فوراً سنجیدہ ہو جاتی۔

"میں اب کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کروں گی۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔"

آرفان کی بیوی موزیگا مداخلت کرتی۔

"کیوں شادی نہیں کرو گی؟ شادی تو عورت کی شان ہے۔ مرد جو کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا، بیوی کے آگے جھکتا ہے۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے، تمہیں شادی کرنی پڑے گی۔"

شینل اور کلاڈینا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ اب وہ موزیگا کو کیا کہتیں؟ آرفان کی بیوی کو ان کی کہانی معلوم نہیں تھی۔ کیدارا کا وقت بھی اچھا گزر جاتا تھا۔ آرفان کے دونوں بیٹے جن میں بڑا پندرہ سال کا تھا اور چھوٹا نو سال کا، سارا دن اس کے ساتھ مل کر مچھلیاں پکڑتے۔ اس جہاز پر اگر کسی کی حالت اچھی نہیں تھی تو وہ دانیال ہی تھا۔

دراصل گزشتہ تین دن سے اس کی آنکھوں میں برج اعظم کے زینوں پر ملنے والی قرطاجنہ کی کنواری کے حسن کا منظر ٹھہر سا گیا تھا۔ پہلے دن تو اس نے سر کو جھٹک دیا تھا، لیکن بعد میں اسے رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ آخر وہ لڑکی بھی تو اسے دیکھ کر اتنی ہی ٹھٹکی تھی، جتنا کہ وہ خود۔ کہیں وہ اس کی آموسا تو نہیں تھی۔ اس بات کو سوچ کر وہ بری طرح سٹپٹا گیا تھا۔ اب نہ تو وہ واپس جاسکتا تھا، کیونکہ اس کے سر پر بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ اسے کلاڈینا کو روم پہنچانا تھا۔ اور شیتل کے لیے سنتوش کو ڈھونڈنا تھا۔ یہ دونوں وعدے وہ کر بیٹھا تھا۔ ورنہ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ اڑ کر واپس چلا جائے۔ ایک بار تو اس کے دل میں آیا کہ وہ برقہ کا رخ واپس قرطاجنہ کی طرف موڑ دے۔ لیکن اس نے سوچا یہ اچھا شگون نہیں ہوگا۔ شروع کیا گیا سفر یوں بیچ میں توڑنا اچھا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے حد بے چین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زینے پر ملنے والی لڑکی قرطاجنہ کی کنواری تھی۔ اور یہی بات اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔ وہ گومگو کا شکار ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قرطاجنہ کی کنواری وزیراعظم ارفلکر کی بیٹی تھی۔ اور اب وہ ارفلکر کا چہرہ بشرہ یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کاش اس نے کبھی کارتھیج کے وزیراعظم کو غور سے دیکھا ہوتا۔ ایک آدھ بار کسی میلے ٹھیلے یا تہوار میں اس نے اگر دور سے ارفلکر کو دیکھا بھی تو زیادہ دلچسپی نہ لی۔ وہ شش و پنج سے نکل ہی نہیں پارہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ نہیں نہیں یہ اس کا وہم ہے۔ اسے ہر خوبصورت لڑکی آموسا نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ لڑکی آموسا ہی تھی۔ بہرحال سفر شروع ہونے سے عین پہلے اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس نے دانیال کے سفر کا تجسس بے مزا کردیا۔ اب اسے آگے بڑھنے کی بھی جلدی تھی اور واپس پلٹنے کی بھی۔

وہ دن بھر جہاز کے عرشے پر کھڑا نیلے سمندر کو گھورتا رہتا اور سوچتا کہ سمندر اتنا نیلا کیوں ہے؟ پھر خود ہی زیرلب بڑبڑاتا...... سمندر اپنے محبوب کا عکس اپنی آنکھوں میں لئے دن بھر مچلتا رہتا تھا۔ اس کا محبوب کون تھا۔ آسمان؟ کیونکہ اس کی آنکھوں میں تو آسمان کا عکس تھا۔ وہ نیلا تو اسی لیے تھا۔ ہاں شاید آسمان اور زمین بھی ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ دانیال ایسا عاشق صدق دل تھا کہ اسے ہر چیز میں پیار کرنے والے جوڑے دکھائی دیتے۔

اگلے روز ان کے جہاز سے ایک کشتی نظر آئی۔ آرفان عرشے پر آگیا۔ اس نے دور سے آتی ہوئی کشتی کو متجسس نگاہوں سے دیکھنا شروع کردیا اور پھر دانیال سے بات کرنے لگا:۔

”یہ مچھیروں کی کشتی تو نہیں ہو سکتی۔ یہاں آس پاس کوئی جزیرہ نہیں ہے۔ یہ یقیناً کسی بڑے جہاز کی ناؤ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناؤ کس کے جہاز کی ہے، قزاقوں کے؟ تاجروں کے؟...... یا سپاہیوں کے۔“

دانیال نے اس کی بات سن کر استفہامیہ انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو! ہمیں کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ بس محتاط رہنا ہماری ذمہ داری ہے۔“

کشتی قریب آتی جا رہی تھی۔ شینل اور کلاڈینا بھی عرشے پر آ گئیں۔ اب سب کی نگاہیں کشتی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس میں غالباً دو آدمی سوار تھے۔ جو چپو چلاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کیدارا مچھلیاں پکڑنے کا کام چھوڑ کر عرشے پر آ گیا۔ دانیال نے سب کو مستعد رہنے کو کہا۔ لباس سے تو وہ دونوں کشتی ران قزاق نہ لگتے تھے۔ لیکن ابھی یقین سے کچھ نہ کہا جا سکتا تھا۔ دھیرے دھیرے کشتی اور نزدیک آ گئی اور پھر دانیال نے دیکھا کہ دونوں کشتی ران جو شروع سے اس جہاز کو تکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اچانک واپس پلٹنے لگے۔ انہوں نے کشتی گھمائی اور واپسی کے لیے چپو چلانے لگ گئے۔ دانیال نے انہیں واپس ہوتا دیکھا تو چونکا اور آرفان سے کہنے لگا۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ قزاقوں کے کسی جہاز کی ہی کشتی ہے۔ دیکھو! وہ لوگ پلٹ گئے ہیں۔ شاید اپنے سرداروں کو اطلاع دینے کے لیے۔“

لیکن آرفان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

”تین وجوہات کی بنا کر میں ایسا نہیں سمجھتا جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ نمبر ایک یہ کہ کشتی موڑ کر وہ اطمینان سے واپس جا رہے ہیں۔ ان کی حرکت میں عجلت نہیں۔ میرے خیال میں وہ کسی جہاز کی حفاظتی کشتی ہے۔ جو یہ دیکھنے کے لیے آئی ہے کہ کہیں یہ جہاز قزاقوں کا تو نہیں۔ نمبر دو یہ کہ میری چھٹی حس نے میرے دل میں خطرے کی کوئی گھنٹی نہیں بجائی۔ اور نمبر تین یہ کہ ہمارا چھمو ابھی تک خاموش ہے۔ اگر اس کشتی میں قزاق ہوتے تو وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔“

جس لمحے وہ چھمو کے بارے میں بات کر رہا تھا، چھمو مستول کے سرے پر بیٹھا واپس لوٹتی ہوئی کشتی کو گھور رہا تھا۔ سب کی نگاہیں پیار سے چھمو کی طرف اٹھ گئیں۔ کلاڈینا نے

کہا:۔

”یہ جانور بھی کتنے کام کی چیز ہیں۔ بیل ہمارا جہاز چلا رہے ہیں اور بندر ہمارا پہرہ دے رہا ہے۔“

آرفان نے سر گھما کر کلاڈینا کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں! اور اس کے بدلے ہم انسان انہیں کیا دیتے ہیں، صرف کھانے پینے کا سامان؟ کھانے پینے کی چیزیں تو وہ جنگل میں بھی حاصل کر لیتے تھے۔“

دانیال نے اس کی بات میں مداخلت کی۔

”لیکن جنگل میں وہ خود کو محفوظ تصور نہیں کرتے، جبکہ ہمارے ساتھ وہ ہر قسم کے خطرے سے بے خوف ہو کر رہتے ہیں۔ ہم نے انہیں صرف کھانے پینے کی چیزیں نہیں دیں، ہم نے انہیں تحفظ اور امن جیسی انمول چیز دی ہے۔ جو مہنگے سے مہنگے داموں بھی خریدی نہیں جاسکتی۔“

کلاڈینا کو دانیال کی بات بہت اچھی لگی۔ اس نے داد دینے والی نظروں سے دانیال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ساتھ اپنے جملے کا اضافہ کیا۔

”لیکن افسوس! کہ ہم انسان اپنے آپ کو امن نہیں دے سکے۔ ہم روز اول سے آپس میں لڑتے آرہے ہیں۔ کاش! جس طرح ہم نے جانوروں کو تحفظ دیا اس طرح کا تحفظ ہمیں خود بھی حاصل ہوتا۔“

سب نے کلاڈینا کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔ شیتل ابھی تک سمندر میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر موضوع بدل دیا۔

”ناؤ تو اب بہت دور جا چکی ہے۔ بہت چھوٹی دکھائی دے رہی ہے۔ کتنا تجسس ہے سمندر میں؟“

سب ناؤ کو دیکھنے لگے۔ وہ واقعی اب بہت مختصر دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ سیدھے راستے سے روم کی طرف نہیں بڑھ رہے تھے۔ بلکہ وہ مغرب کی طرف کافی آگے بڑھ کر ایک قوس کی شکل میں گھومتے ہوئے واپس آنا چاہتے تھے۔ قرطاجنہ سے رومہ کی طرف جانے کا آسان راستہ تو سسلی تھا۔ جو اتنا مختصر سمندری راستہ تھا کہ زیادہ سے

Pakistanipoint Waqar Azeem

زیادہ دو دنوں میں ہی پاٹا جاسکتا تھا۔ لیکن اس راستے سے سسلی جانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ سلطنت رومہ کی بحری چوکیاں جگہ جگہ قائم تھیں اور وہ رومی فوجیوں سے بچ کر نکلنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے لمبا راستہ اختیار کیا۔ ابھی انہیں مغرب میں کچھ اور بھی آگے بڑھنا تھا۔ شاید ایک دن کی مزید مسافت طے کر کے وہ اپنے جہاز کا رخ شمال کی طرف کرتے۔ انہیں گویا ایک نیم بیضوی قوس پر سفر کرنا تھا۔ مغرب میں آگے جا کر وہ دھیرے دھیرے واپس مشرق کی طرف پلٹتے اور ساتھ کے ساتھ شمال کی طرف بھی۔ یہ آرفان کی حکمت عملی تھی۔ جو ستاروں کے راستوں پر چلنے میں ماہر تھا۔

شام سے پہلے آرفان نے دانیال کو بتایا کہ عنقریب وہ ایک جزیرے کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ یہ جزیرہ بھی قزاقوں نے آباد کیا ہے۔ لیکن اب یہاں قزاقوں کا ایک گروہ نہیں بلکہ کئی الگ الگ گروہ آباد ہیں۔ پورے مغربی بحرروم کو لوٹنے والے جہاز اس جزیرے پر پلٹتے ہیں۔ یہ ایک بڑا جزیرہ ہے۔ اس کے مختلف ساحلوں پر مختلف گروہوں کا قبضہ ہے اور خشکی پر ہر گروہ کے قزاقوں نے اپنے لیے الگ علاقے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ جہاں ان کی کئی کئی جھونپڑیاں اور مکانات ہیں۔ عام قزاقوں کے بیوی بچے انہی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ جزیرے کے بیچوں بیچ ایک بڑا بازار ہے جس کی کئی شاخیں ہیں۔ ہر شاخ پر ایک گروہ کا قبضہ ہے۔ ان بازاروں میں لوٹا ہوا مال فروخت ہوتا ہے۔ ہم اس جزیرے پر جان بوجھ کر رکیں گے کیونکہ اگر ہم نہ رکے تو ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ قزاق اپنے جزیرے پر کسی کو نہیں لوٹتے۔ نہ ہی وہ جزیرے کے آس پاس کسی مسافر جہاز کو لوٹتے ہیں۔ یہاں امن قائم رکھنا ان کی مجبوری ہے۔ کیونکہ اگر اس مقام پر بھی لوٹ مار جاری رہے تو وہ خود امن سے نہیں رہ سکتے۔ اس جزیرے کا نام ہے "مارفیس"۔

دانیال مارفیس جزیرے کے بارے میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ چنانچہ اسے کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ یہ عجیب آبادی پر مشتمل جزیرہ تھا۔ پورے مغربی بحروم کے قزاق اس جزیرے پر اتفاق سے رہتے تھے۔ کبھی کسی بدامنی کا اندیشہ تک نہ ہوا تھا۔ صرف اس وجہ سے کیونکہ ہر کوئی سیر کے مقابلے میں سوا سیر تھا۔ اس جزیرے پر چار بڑے گروہ تھے۔ جن کے ماتحت چھوٹے چھوٹے کئی گروہ کام کرتے تھے۔ ان چار بڑے گروہوں کی طاقت تقریباً برابر تھی۔ جزیرے کے بازار میں خریدار کون ہوتے تھے؟ دانیال کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بڑی بڑی

حکومتوں کے امراء مارفیس جزیرے پر آتے، کئی کئی دن قیام کرتے، انوکھی انوکھی چیزیں خریدتے اور پھر چپ چاپ واپس چلے جاتے۔ اگر یہاں آنے والے اور یہاں سے جانے والے جہازوں کو کوئی لٹیرا لوٹتا تو گویا اس کی قسمت پھوٹ جاتی۔ اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ مارفیس جزیرے کے قوانین صرف قزاقوں کے سینوں میں لکھے ہوئے تھے۔ چاروں گروہوں کے سرداروں میں سب سے بوڑھا ''جیدان'' تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی دوربین کی طرح دور تک دیکھ لیتی تھیں۔ سمندر میں بھی دور تک اور کسی کے دماغ میں بھی دور تک۔ سب باتیں سن کر دانیال نے آرفان سے پوچھا۔

''یہاں رکنے کا ہمارے پاس بہانہ کیا ہوگا۔ کیا ہم بلامقصد مغربی بحرروم تک بڑھ آئے ہیں۔''

آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں یہاں پہلے بھی آتا رہتا ہوں۔ یہاں میرے واقف کار بھی ہیں۔ ہم یہی بتائیں گے کہ ہم دو انسانوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ایک عورت اور ایک لڑکا۔ یہی ہمارا حقیقی مقصد ہے اور یہی ہمارا بہانہ۔''

دانیال مطمئن ہوگیا۔ بلکہ دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔ فی الواقعہ اس جزیرے پر سنتوش کو تلاش کیا جاسکتا تھا۔ آخر سنتوش کو بھی تو ایک قزاق نے ہی قیدی بنایا تھا۔ معاً کسی خیال کے تحت دانیال نے آرفان سے دریافت کیا۔

''کیا ہماری عورتوں کو یہاں کوئی خطرہ تو نہیں۔''

''نہیں۔ بالکل نہیں! میں نے آپ کو بتایا نا کہ قزاق اپنے علاقے میں امن اور شانتی سے رہتے ہیں۔''

دانیال بظاہر آرفان کی باتوں سے مطمئن ہی لگتا تھا۔ وہ دونوں عرشے سے اتر آئے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کو قزاقوں کے جزیرے کی بابت بتا رہا تھا۔ شینتل اور کلاڈینا حیرت بھری آنکھوں سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ لیکن خاموش رہیں۔ ان کے برعکس کیدارا خاموش نہ رہا۔ اس نے دانیال کو مخاطب کیا۔

''دانیال!...... آپ کو اتنی جلدی آرفان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ ہمیں ایک اجنبی اور خوفناک جزیرے پر لے جارہا ہے اور ہم ہیں کہ چپ چاپ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئے ہیں۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے۔''

شیتل اور کلاڈینا کی آنکھیں کیدارا کی بات سن کر دانیال سے یہی سوال پوچھنے لگیں۔ دانیال پہلے زیرلب مسکرایا اور پھر اس نے ہولے سے جواب دیا۔

"اصل بات یہ ہے کہ مارفیس جزیرے کے بارے میں، میں پہلے سے بہت کچھ جانتا ہوں۔ آرفان مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس جزیرے پر سنتوش کے ملنے کی توقع ہے۔ یہاں قزاق رہتے ہیں۔ ممکن ہے سنتوش یہاں لایا گیا ہو۔ فرض کرو وہ ہمیں نہیں بھی ملتا تو ممکن ہے اس کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ نادانی ہوگی کہ ہم مارفیس کے قریب سے تو گزریں۔ لیکن قزاقوں کے خوف سے اپنے اصل مقصد کو فراموش کر دیں۔"

شیتل اور کلاڈینا نے استفہامیہ انداز میں سر ہلایا۔ وہ دانیال کی بات سمجھ گئی تھیں۔

اگلے روز انہیں صبح سویرے ہی دور ایک جزیرہ دکھائی دیا۔ شیتل کلاڈینا اور دانیال عرشے پر ہی موجود تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ لٹیروں کے جزیرے پر جا رہے ہیں۔ یہ ضروری تھا۔ آرفان نے بتایا تھا کہ اگر وہ لٹیروں کے جزیرے پر نہ گئے تو لٹیرے انہیں پوچھ کچھ کے لیے روک لیں گے۔

اس کے برعکس اگر وہ چلے گئے تو وہ کچھ تعرض نہ کریں گے۔ مارفیس جزیرے پر لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ یہاں کسی اجنبی جہاز کا آنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس پورے ماحول میں خود قزاقوں نے لوٹ مار پر سختی سے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ان کا جہاز دھیرے دھیرے جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب انہیں چند ایک کشتیاں بھی ادھر ادھر تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مارفیس کا جزیرہ فی الواقع ایک بڑا جزیرہ تھا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ مارفیس کے ساحل پر آ لگے۔ ناریل کے درختوں سے ڈھکا جزیرے کا ساحل قدرتی شادابیوں سے مالا مال تھا۔ وہ کسی گودی پر نہ رکے تھے، نہ ہی کسی بندرگاہ پر۔ یہ ایک چھوٹا سا ساحل تھا۔ ریتلا ساحل۔ جس پر جہاز کو آگے تک کھینچ لیا جاتا اور وہ گھسٹ کر ریت پر چڑھ جاتا۔

برقہ کوس مختصر ساحل پر کھینچ لیا گیا۔ مزدور مصروف ہو گئے۔ جھمو چھلانگیں مارتا آن واحد میں مستول سے عرشے پر، عرشے سے پھدکتا پھلانگتا جہاز کے آخری کنارے پر اور پھر کسی بازیگر کی طرح ریتلے ساحل پر اترتا چلا گیا اور اب وہ نہایت تیزی سے ناریل کے درختوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آج وہ کئی روز بعد اپنی کسی پسندیدہ جگہ پر آیا تھا۔ وہ خوشی سے

پھولے نہ سما رہا تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھیوں نے چھمو کے کرتب دیکھے تو ہنسنے لگے۔ اب وہ دور ناریل کے ایک اونچے درخت پر بیٹھا ان کا منہ چڑھا رہا تھا۔ آرفان جہاز کے رسے ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ لوگ بھاڑے کے مزدوروں کو جہاز پر چھوڑ کر ساحل کی طرف بڑھے اور خشک ریتلے ساحل پر بیٹھ کر آرفان کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنے عملے کی مدد سے جہاز کو باندھ چکا تو ان کے نزدیک پہنچ آیا۔ اوپر بیٹھے چھمو نے اپنے ساتھیوں کو جزیرے میں آگے بڑھتے دیکھا تو قلقاریاں مارتا، چیختا چلاتا ایک شاخ سے دوسری شاخ تک جھولتا، وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ ابھی تک ان کا سامنا جزیرے کے کسی باشندے کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ جنگل میں پہنچ کر چھمو اچانک چپ ہو گیا۔ اس کی چیخوں کا انداز بدل گیا۔ اب وہ چیخنے کی بجائے صرف چخ چخ کرتا ادھر سے ادھر پھدک رہا تھا۔ آرفان نے کہا۔

"چھمو نے کچھ دیکھ لیا ہے۔ آپ لوگ فکرمند مت ہوئیے۔ میں سب معاملہ دیکھ لوں گا۔ نرمی سے بات کرنے کا دستور نہیں۔ آپ سے جو کوئی بھی گفتگو کرے آپ لوگ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت اکڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔ مارفیس پر توازن قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ رائج ہے۔"

ابھی وہ آرفان کی بات پر اثبات میں سر ہی ہلا رہے تھے کہ یکایک چھمو کی فلک شگاف چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ اتنے زور سے چلا رہا تھا کہ سب کے دل دہل گئے۔ سب نے ایک ساتھ اوپر دیکھا اور فوراً سمجھ گئے کہ کیا ماجرا ہے۔ برقہ جہاز کا پالتو بندر جنگلی بندروں کے نرغے میں پھنس چکا تھا۔ چھمو تو پرانی دنیا کا ہلکا پھلکا بندر تھا۔ لیکن اب جن غنڈوں کے بیچوں بیچ وہ پھنس چکا تھا وہ سب بڑے سائز کے گبن تھے۔ چھمو کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔ اتنے بڑے بڑے بندر جواب نہایت کریہہ آوازوں کے ساتھ چھمو پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے بہت بری طرح مارنے والے تھے۔ شینتل اور کلاڈینا کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ دانیال نے دیکھا کہ آرفان جیسا شخص بھی پریشان ہو گیا۔ ناریل کے پیڑ بہت اونچے تھے اور وہ چھمو کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ صرف دیکھ سکتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیدارا جو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہو کر ان کے ہمراہ چل رہا تھا، چپکا کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے جھٹ سے اپنی کمان اتاری اور اس میں تیر

ڈال کر چلا کھینچ دیا۔ اس نے سب سے بڑے گبن پر نشانہ باندھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تیر چھوڑتا آرفان نے چیخ کر اسے منع کیا۔

"خبردار! تیر مت چلانا۔ اگر ہم نے یہاں کا ایک بھی بندر مار دیا تو ہمیں اس کی بھرپائی کرنی پڑے گی۔ تم جانتے ہو کہ یہ قزاقوں کا جزیرہ ہے۔"

کیدارا رک گیا۔ اسی لمحے شیتل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہم کیا کریں؟ کیا چھمو کو مرنے دیں؟"

شیتل کی بات ختم ہوئی تو کلاڈین بولی۔

"مجھے لگتا ہے اس جزیرے کے بندر بھی قزاق ہیں۔"

کلاڈینا کی بات پر سب تھوڑا سا مسکرا دیئے۔ لیکن حقیقت میں سب پریشان تھے۔

اچانک ناریل پر بے پناہ شور بلند ہو گیا۔ سب کے سب بندر ایک ساتھ چلانے لگے۔ وہ جن ٹہنیوں پر بیٹھے تھے، ان پر زور زور سے اچھلتے اور اپنے ہاتھ پوری قوت سے ٹہنیوں پر مارتے۔ ان کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔ وہ غالباً چھمو کو پکڑ کر مار دینا چاہتے تھے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بڑے بندروں کی جماعت چاروں طرف سے چھمو پر جھپٹ پڑی۔ وہ ہاتھوں پیروں کے ناخنوں اور دانتوں سے چھمو کو بھنبھوڑنے لگے۔ لیکن پھر ایک کرشمہ ہوا۔ کسی طرح چھمو ان کے ہاتھوں سے چھوٹا اور سیدھا زمین پر آ رہا۔ دھپ۔ اتنی بلندی سے گر کر ایک بار تو اس کے سارے طبق تاریک ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ اور وہ جیسا تھا۔ جہاں تھا کی بنیاد پر چند ثانیے بے ہوش پڑا رہا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے دائیں آنکھ کھولی اور دز دیدہ نظر سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس اثنا میں اس کے ساتھی اس کے پاس آ چکے تھے۔ آرفان نے اسے دوسری آنکھ کھولنے سے پہلے ہی کسی بچے کی طرح اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ساتھ کے ساتھ چھمو کو دلاسا بھی دے رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں میرے بچے! تم بچ گئے۔ میں نے تمہیں سو بار منع کیا کہ اجنبی جگہ پر بے احتیاطی سے مت چلا کرو۔ لگتا ہے تمہیں شمشیر زنی کی تربیت دینی پڑے گی۔ بے وقوف یہ قزاقوں کا جزیرہ ہے۔ یہاں کے بندر بھی لٹیرے ہیں۔ اب تم درختوں پر نہیں چڑھو گے۔ ہمارے ساتھ چلو گے۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے چھمو کو پیار سے پچکارا اور گود میں اٹھا لیا۔ کچھ دیر تک چھمو کسی ڈرے

ڈرے اور سہمے سے بچے کی طرح اس کی بغل میں سر چھپائے رہا۔اس کا جسم کہیں کہیں سے زخمی بھی تھا۔تھوڑی دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد چھمو کی کیفیت بہتر ہونے لگی۔اب وہ بغل کی بجائے آرفان کے کندھے پر سوار تھا۔

دانیال اور اس کے ساتھی احتیاط کے ساتھ جنگل عبور کر کے جزیرے کے نیم میدانی، نیم چٹانی علاقے میں پہنچے تو انہیں قزاقوں کی جھونپڑیاں اور مکان نظر آئے۔بہت سے لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔آرفان سچ کہتا تھا۔ہر شخص کی چال میں ایک عجیب اکھڑ پن تھا۔چند ایک عورتیں بھی اپنے مکانوں اور جھونپڑیوں کے باہر چمکتی دھوپ میں کام کاج کر رہی تھیں۔معاً شیتل نے آرفان کو مخاطب کر کے سوال کیا۔

''قزاقوں کی عورتیں...... کہاں سے آئی ہیں؟ یہ کون عورتیں ہیں؟ جوان کے بچوں کی مائیں بن کر اس جزیرے پر آباد ہیں۔''

آرفان نے شیتل کی طرف چہرہ گھمائے بغیر اس کی بات کا جواب دیا۔

''مارفیس بہت پرانا مسکن ہے قزاقوں کا۔شاید ان کی تیسری یا چوتھی پیڑھی چل رہی ہوگی۔اور اس لحاظ سے ان کی عورتیں بھی ان کی اپنی اولادیں ہوں گی۔ہاں البتہ شروع شروع کے لٹیروں نے شاید کچھ ''لوٹی'' ہوئی عورتوں کو جزیرے کی گرہستی سپرد کی ہوگی۔آخر یہ لٹیرے ہیں،ان کے پاس لوٹ کے مال کی کمی نہیں ہوتی۔''

اب وہ رہائشی علاقے کے قریب سے گزر رہے تھے۔قزاقوں کے بچے جو چمکیلی دھوپ میں کھیل رہے تھے،دوڑ دوڑ کر ان کے پاس آنے لگے۔کام کاج میں مصروف عورتیں بھی سر اٹھا اٹھا کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔پیڑوں کی بہتات تھی۔دانیال اور اس کے ساتھی کھلی سڑک پر آ گئے۔یہ سڑک مارفیس جزیرے کے بازاروں کی طرف جاتی تھی۔وہ جونہی سڑک پر نمودار ہوئے ان کی نگاہ سامنے سے آتے ہوئے چند قزاقوں پر پڑی۔تین ضعیف العمر قزاق اور ان کے ہمراہ دو تین نوعمر لڑکے غالباً رہائشی علاقے کی طرف جانے کیلئے اسی سڑک پر چلے آ رہے تھے۔وہ دور سے ہی دانیال اور اس کے ساتھیوں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔کلاڈینا اور شیتل تو خاص طور پر محتاط ہو گئیں۔وہ آرفان کا دیا ہوا سبق یاد کرنے لگیں کہ ہر اس جزیرے پر ہر شخص کے ساتھ اکھڑ لہجے میں بات کرنی ہے۔پیدل چلتے ہوئے قزاق اب ان کے نزدیک آ چکے تھے۔لیکن دانیال اور اس کے ساتھی رکے بغیر چلتے رہے۔اور جونہی

دونوں طرف کے پیدل چلنے والے آمنے سامنے آئے، گھورتی نظروں سے دیکھنے والے بوڑھے قزاقوں میں سے ایک نے کڑک دار لہجے میں اجنبیوں کو مخاطب کیا۔

”رک جاؤ......کون ہو تم لوگ اور ہماری بستی میں کیوں گئے تھے؟“

آرفان کو اس قسم کے سوال کی توقع تھی۔ اس نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

”ہم آپ کی بستی میں نہیں گئے تھے۔ بلکہ ساحل سے آرہے ہیں۔ آپ کی بستی ہمارے راستے میں پڑتی تھی۔ اس لیے ہم وہاں سے گزرے۔“

بوڑھے قزاق نے بھنویں اچکاتے ہوئے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ پھر دانیال اور کیدارا کو گھورا اور تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

”ساحل سے آرہے ہو؟ کیا تم اجنبی ہو؟ ابھی ابھی جزیرے پر آئے ہو؟ کون سے ملک سے آئے ہو؟“

اس کا لہجہ ابھی بھی سخت تھا۔ آرفان نے ضرورت محسوس کی کہ اب وہ بھی اس قضیے کو سختی سے نمٹائے۔ اس نے اپنے شانے پر بیٹھے جھمو کو نیچے اتارا اور بوڑھے قزاق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، محترم بزرگ؟ کیا آپ جیدان ہیں؟ یا منگورا؟“

اس نے چار بڑے گروہوں میں سے دو سرداروں کے نام لیے تھے۔ بوڑھا قزاق ٹھٹک گیا۔ آرفان کے درشت لہجے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مہمان کوئی تر نوالہ نہیں ہے۔ وہ بدستور انہیں گھورتا رہا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ ان کے ہمراہ موجود نوعمر لڑکے تجسس بھری نگاہوں سے کلاڈینا اور شینتل کے بدن کو دیکھ رہے تھے۔ معاً کلاڈینا نے ان نوعمر لڑکوں کو سخت نگاہوں سے گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

”اے لونڈو!...... کیا دیکھتے ہو؟ کیا کبھی عورت نہیں دیکھی؟ یا کوئی عورت نہیں تمہارے گھر میں؟“

لڑکے سٹپٹا گئے۔ اب مارفیس کے یہ راہ چلتے باشندے ان مہمانوں کو سمجھ چکے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے اجنبی خود نہلوں پر دہلے ہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی راہ چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد یہ قافلہ بھی چل پڑا۔ دانیال اس گفتگو کے دوران خاموش رہا تھا لیکن اب اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آرفان! تم سچ کہتے تھے۔ اس جزیرے پر کوئی بھی آ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی آنکھ میں کڑواہٹ ہو۔"

راستے میں انہیں اور بھی لوگ ملے جو حسب روایت انہیں گھورتے ہوئے گزرے۔ لیکن پیچھے ملنے والے بڈھوں کی طرح کسی نے ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ دراصل اب وہ خود بھی گھورنے والوں کو گھور رہے تھے۔ جیسے کو تیسا والا کلیہ کام آ رہا تھا۔ بالآخر وہ مارفیس کے پہلے بازار میں پہنچ گئے۔ دانیال، شیتل، کلاڈینا اور کیدارا دنگ رہ گئے۔ یہ بہت عجب بازار تھا۔ یہاں سب کچھ جائز تھا اور ایک لحاظ سے سب کچھ ناجائز تھا۔ دکاندار شکل سے غنڈے لگتے تھے۔ اور خریدار بدمعاش۔ بازار میں زیادہ بھیڑ تو نہ تھی لیکن کم چہل پہل بھی نہ تھی۔ بازار کیا تھے میلوں ٹھیلوں کی طرز پر سجائی گئی دکانیں، جن میں سے زیادہ تر بانس اور لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھیں۔ ہر طرح کے مال سے اٹی پڑی تھیں۔ حرافہ عورتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ جو تتلیوں کی طرح بازار میں ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھیں۔ وہ ہاتھ میں کھجور کی شراب کی صراحیاں لیے جام بیچتی پھر رہی تھیں۔ جو کوئی گاہک ان سے جام خریدتا ان کے ساتھ اٹکھیلیاں بھی کرنے سے باز نہ رہتا۔ کلاڈینا کو یہ سب کچھ بہت عجب لگا۔ اس طرح شراب بیچنے والیاں اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ایک حرافہ نے دانیال کو دیکھا تو کسی تیر کی طرح اس کی طرف لپکی۔

"کھجور کی عمدہ شراب، دوہری کشید شدہ، ایک جام پی کر دیکھئے۔ اس کے لطف و سرور کو آپ کبھی نہ بھولیں گے۔"

دانیال بھی عجب انسان تھا۔ عورت کے معاملے میں تو بہت ہی عجب۔ عاشق تھا نا اس لیے۔ صراحی والی حسینہ کی بات سن کر بڑے خلوص سے مسکرا دیا۔

"ضرور! ضرور! مجھے خوشی ہوگی کہ میں ایک حسین عورت کے ہاتھ سے نے پیوں گا۔" حرافہ نے صراحی فوراً جام میں جھکائی۔ پیمانہ بھرنے لگا۔ یوں کھڑے کھڑے سربازار شراب پینے کا تجربہ دانیال پہلی بار کر رہا تھا۔ دانیال کو شراب پیتا دیکھا کر کیدارا کا بھی من للچانے لگا۔ لیکن آرفان برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگ گیا۔ حرافہ نے کیدارا کے لیے دوسرا جام انڈیلا۔ اس کی پیٹھ پر لٹکتی ہوئی ریشمی زنبیل میں جاموں کی کمی نہیں تھی۔ معاچھمو نے ارمان کے شانے سے چھلانگ لگائی اور کیدارا کے سر پر جا بیٹھا۔ کیدارا کے منہ سے لگا جام چھلکا اور تھوڑی سی شراب زمین پر آ گری۔ کیدارا کی گردن اور سر پر ایک بندر کے پنجے پڑے تو

اسے بہت عجیب لگا۔ وہ اپنے سر سے چھمو کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ حرافہ ہنس رہی تھی۔ بازار میں پہنچتے ہی وہ عام راہگیروں میں شامل ہو گئے۔ اب انہیں کوئی بھی پہلے جیسی نظروں سے نہ دیکھ رہا تھا۔ دانیال نے آمدم برسر مطلب کے تحت حرافہ سے سوال کیا۔

''ہم ایک لڑکے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کی عمر بمشکل پندرہ سال ہے۔ گورا چٹا قرطاجنی ہے۔ مہاپجاری کا بیٹا ہے۔ اس لیے شہزادگی میں پلا بڑھا۔ چند ماہ پہلے ایک جہاز قرطاجنہ سے یونان کی طرف جا رہا تھا کہ لوٹ لیا گیا۔ اسی میں وہ لڑکا تھا۔ ہمیں اس کی تلاش ہے۔''

حرافہ نے سر سے لے کر پاؤں تک دانیال کو گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ دیدے گھما کر کچھ سوچنے لگی۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کی آنکھوں میں چمک نظر آئی اور اس نے دانیال سے کہا۔

''کون سے علاقے میں لوٹا گیا تھا وہ جہاز؟ آپ تو غالباً مشرقی بحر روم کا ذکر کر رہے ہیں، ہے نا!''

''ہاں! اس مشرقی بحر روم کا ذکر کر رہا ہوں۔''

''لیکن وہ علاقہ تو مارفیس کی پہنچ سے باہر ہے۔ مارفیس جزیرے کے قزاقوں کا تسلط صرف مغربی بحر روم پر ہے۔ مشرقی بحر روم قزاقوں کے کسی مسکن کے ماتحت نہیں۔ وہاں تو مہذب لٹیرے کوناڈس اور موآبریس لوٹ مار کرتے ہیں۔ آپ کے لڑکے کو یقیناً ان دونوں میں سے کسی ایک لٹیرے نے قیدی بنایا ہوگا۔''

مارفیس کی ایک عام سی حرافہ اتنی معلومات رکھتی تھی۔ دانیال اور اس کے ساتھی ششدر رہ گئے۔ شیتل فرط جذبات سے دو قدم آگے بڑھ آئی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے حرافہ کا کندھا تھامتے ہوئے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہاں! ہمارے جہاز پر کوناڈس نے ہی قبضہ کیا تھا۔ میں بھی سنتوش کے ساتھ تھی۔ میں چھوٹ گئی لیکن اس کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ اور اب ہم سنتوش کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آ پہنچے ہیں۔''

''نہیں! وہ آپ کو یہاں نہیں ملے گا۔ پھر بھی آپ چاہیں تو قزاقوں کے بوڑھے سردار جیدان سے مل لیں۔ اگر آپ کے جہاز کو کوناڈس نے لوٹا تھا تو یقیناً وہ لڑکا، جسے آپ

ڈھونڈ رہے ہیں...... روم بھیج دیا گیا ہوگا مشرقی بحرروم کے لٹیرے اپنے آپ کو سپاہی کہتے ہیں اور لوٹا ہوا مال...... مال غنیمت کے طور پر اپنے اپنے ملکوں کو بھیج دیتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ روم کا سفر کریں۔"

روم کا سفر تو وہ کر ہی رہے تھے۔ مارفیس کے جزیرے پر تو وہ محض "رکنے" کی غرض سے رکے تھے۔ وہ یہاں زیادہ دیر نہ رکنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صبح صبح جزیرے کے ساتھ آ لگے تھے۔ آرفان کا تو ارادہ تھا کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے واپس جہاز میں سوار ہو جائیں گے۔ حرافہ کو شراب کی قیمت ادا کر کے انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل دیئے۔ قزاقوں کا جزیرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت عجب تھا۔ ہر کوئی اپنی دھن میں مست تھا اور ہر کوئی سوا سیر تھا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ایک ایک چیز کو دیکھتے، بڑے بازار کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں سب دکانیں پکی تھیں۔ پتھر اور گارے سے بنائی گئیں اور دکانوں میں بیٹھے دکاندار بھی قزاقوں کی بجائے تاجر معلوم ہوتے تھے۔ یہ دکاندار جزیرے پر ہی رہتے تھے اور کبھی لوٹ مار کے لیے سمندر میں نہ گئے تھے۔ بڑے بازار میں قدرے بھیڑ تھی۔ ہر شخص سینہ تانے بازو مارتا ہوا چل رہا تھا۔ معاً ایک طرف سے شور سا بلند ہوا۔

وہ غلغلہ تھا۔ جو اچانک بازار کی ایک سمت سے اٹھا۔ عجیب عجیب آوازیں تھیں۔ کچھ بڑھکیں، کچھ چیخیں اور ہاؤ ہو، شاید کوئی تماشا ہو رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اسی طرف اٹھ گئیں۔ دانیال کو فضا میں ایک تیر نظر آیا۔ جس کے ساتھ لپٹے ہوئے کپڑے کو آگ لگی ہوئی تھی۔ جونہی تیر فضا میں بلند ہوا، شوروغل اور زیادہ بڑھ گیا۔ دانیال کے دل میں تجسس پیدا ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"چلو! چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا ماجرا ہے۔"

"نہیں! ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہمیں جیدان سے ملنا چاہیے اور واپس چل دینا چاہیے۔ یہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔"

یہ آرفان کی آواز تھی۔ دانیال کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے سوچا آرفان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں فالتو چیزوں میں اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے لیکن ٹھیک اسی وقت تماشے کی جگہ پر موجود بھیڑ اندھا دھند بھاگ کھڑی ہوئی۔ جس کا جس طرف منہ آ رہا تھا، وہ اس طرف کو بھاگ رہا تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا تو تماشے کی جگہ پر کوئی

چیز دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ دانیال کو لگا جیسے وہ کوئی انسان ہو۔ اور لوگوں کی طرح دانیال اور اس کے ساتھی ادھرادھر نہ بھاگے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ معاً ان کی نگاہ چند گھڑ سواروں پر پڑی۔ جو اب اس کی جگہ کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں چند لمحے پہلے تماشا لگا ہوا تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ماجرا ہے۔ اچانک آرفان کی آواز بلند ہوئی۔

"تو یہ جیدان ہے، وہ دیکھو! وہ...... وہ گھڑ سواروں کے بیچ کالے لباس والا بوڑھا۔ وہی جیدان ہے۔"

دانیال اور اس کے ساتھیوں نے بڑے غور سے جیدان کی طرف دیکھا۔ جیدان بڑے شاندار طریقے سے آ رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں خوفناک چہروں والے تنومند لٹیرے تھے۔ اور سیاہ مشکی گھوڑے پر سوار جیدان خود سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے سر پر فارسیوں کی طرح بھاری بھرکم کپڑے کی سیاہ پگڑی بندھی تھی۔ جس کا ڈھاٹا اس کی داڑھی کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد بوڑھا تھا۔ غالباً تماشا دیکھنے والی بھیڑ جیدان کو آتا دیکھ کر چھٹ گئی تھی۔ جیدان جلی ہوئی لاش کے قریب آ کر رکا۔ وہ بیچ بیچ ایک آدمی کی لاش تھی۔ جو اب کوئلہ ہو چکا تھا۔ اور مڑا تڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھی اپنی سانسیں روکے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس وقت جیدان لاش کے قریب کھڑا تھا اس وقت گویا بازار میں سب کچھ تھم گیا۔ اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جیدان کی کڑک دار آواز سنائی دی۔

"یہ کس کا کام ہے؟ کون جیتا؟...... کہاں ہیں سب لوگ؟ سردار منگورا کے کسی آدمی کو بلواؤ۔"

جیدان کے چہرے پر غصہ نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بات کر رہا تھا۔ اچانک آرفان نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ شرط لگا کر کسی نے غلام کو جلایا۔ یہ یہاں کا کھیل ہے۔ سمجھ لو جوا۔ غلام کے کپڑوں پر تیل ڈال کر اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنی آگ بجھانے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا آقا شرط جیت جاتا ہے۔ اگر وہ ناکام ہو جائے تو مخالف شرط لگانے والا شرط جیت جاتا ہے۔ یہ کھیل نہیں بہت ہی بھیانک ظلم ہے۔ غلام تو مجبور ہوتا ہے، زرخرید۔ وہ نہ اپنے آقا کو انکار کر سکتا ہے اور نہ اس کے مخالف کو۔"

دانیال اور اس کے ساتھی آرفان کی بات سن کر پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کلاڈینا کو تو شدید غصہ آ گیا۔

"کک...... کیا...... کیا کہا تم نے؟ یہ غلام کو آگ لگا کر صرف جوا کھیلتے ہیں۔ اب تو مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ دیوتا کہیں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ ایشور کی دھرتی پر اتنا بڑا ظلم جاری ہے اور ایشور سو رہا ہے۔"

سب نے نظریں گھما کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شیتل کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ مڑی تڑی ہوئی کوئلہ لاش ان کے سامنے پڑی تھی۔ یہ کیسی دنیا تھی؟ یہاں کون لوگ رہتے تھے؟ ایشور کی پناہ۔ یہ جزیرہ پھٹ کیوں نہیں گیا۔ معاً دانیال کے اندر کا یہودی بیدار ہو گیا۔ وہ بغیر کسی سے کوئی صلاح کیے بوڑھے سردار جیدان کی طرف بڑھا۔ جو مجمع چھٹ چکا تھا وہ اب ایک بار پھر لگ گیا تھا۔ جیدان کی آمد سے ڈر کو جو لوگ بھاگے تھے وہ اب پھر واپس وہیں اکٹھے ہو گئے تھے۔ دانیال آگے بڑھا تو آرفان اور اس کے باقی ساتھی بھی دانیال کے پیچھے لپکے۔ کچھ دیر بعد وہ بوڑھے جیدان کے سامنے کھڑے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے جیدان ان کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ وہ ابھی تک اپنے ہی معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ جیدان نے حکم دیا تھا کہ سردار منگورا کے کسی آدمی کو بلایا جائے اور اب سردار منگورا کے دو خاص آدمی جیدان کے سامنے کھڑے تھے۔ جیدان نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

"سردار منگورا کہاں ہے؟"

"وہ دیوتاؤں کے میناروں تک گیا ہے۔"

یہ دیوتاؤں کے مینار سمندر کا وہی مشہور زمانہ مقام تھا جسے تاریخ میں ہرکولیس کے ستونوں کے نام سے یاد رکھا گیا۔ ہر قزاق گروہ کا اپنا علاقہ مخصوص تھا۔ منگورا کے آدمی سے سردار منگورا کی بابت جان کر سردار جیدان نے آہستگی سے سر ہلایا اور دوبارہ بات کی۔

"تو اس کی جگہ سردار کون ہے یہاں؟"

"اس کا بھائی شارق۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"غالباً اپنے ڈیرے پر۔"

"تو جاؤ جا کر اسے بتاؤ کہ تمہارے آدمیوں نے قواعد کی خلاف ورزی کی ہے۔

اس غلام پر بازار میں سرعام جوا کھیلا گیا۔ حالانکہ پچھلی بار سب سرداروں کے درمیان طے ہوا تھا کہ غلاموں پر کھیلا جانے ولا جوا بازاروں میں نہیں کھیلا جائے گا۔ اس طرح ہمارے مہمانوں پر برے اثرات پڑتے ہیں۔ شارق سے کہنا کہ آئندہ اس قسم کی غلطی نہ ہونے پائے۔ ورنہ دونوں بھائیوں کو اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور اب یہ لاش اٹھوا کر سمندر میں پھنکوا دو۔"

سردار جیدان شاید کسی کی شکایت پر یہاں وارد ہوا تھا۔ ایک انسان کو زندہ جلا دیا جانا غالباً اس کے نزدیک بھی کوئی خاص بڑی غلطی نہیں تھی۔ اس نے اسے ایک معمولی واقعہ کے طور پر دیکھا اور سردار منگورا کے بھائی کو معمولی تادیب کر کے واپس پلٹنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گھوڑے کو ایڑھ لگاتا، دانیال اس کے سامنے آ گیا۔

"محترم سردار!...... میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار جیدان اور اس کے بھیانک چہروں والے خونخوار ساتھیوں نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے دانیال کو سرتاپا دیکھا۔ دانیال کو دیکھنے کے بعد وہ دانیال کے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگے۔ اسی اثنا میں بوڑھے سردار جیدان کی آواز سنائی دی۔

"کون ہو تم لوگ؟"

دانیال نے اسی طرح سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، جس طرح سردار خود اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں اس مرنے والے کا بھائی ہوں اور مارفیس کے جزیرے کے سرداروں سے اس کی موت کا ہرجانہ طلب کرتا ہوں۔"

دانیال کی بات سن کر ایک بار تو اس کے ساتھی بری طرح سٹپٹا گئے۔ تماشا گاہ میں موجود ہر شخص عجیب عجیب نظروں سے دانیال کو گھورنے لگا گویا اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ دانیال کے لہجے میں ایسا ٹھہراؤ تھا کہ سردار جیدان سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ایک بوڑھا جہاندیدہ شخص تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دانیال کو پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے قزاق ساتھی بے صبرے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جیدان سے پہلے ہی بیک وقت دانیال کو مخاطب کیا۔

"تمہاری یہ جرأت، ہم تمہیں بھی اسی طرح جلا کر راکھ کر دیں گے۔"

لیکن جیدان نے کسی فارسی شہنشاہ کی طرح اپنا داہنا بازو فضا میں بلند کیا اور قزاق

ساتھیوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اب وہ حیران کن حد تک نرم لہجے میں دانیال سے بات کر رہا تھا۔

"یہودیوں کے نبی لگتے ہو۔ اس غلام کو تم نے اپنا بھائی کہا۔ اس طرح کی بات صرف بنی اسرائیل کے نبی ہی کر سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم ہمارے جزیرے پر آئے۔ تمہارے بھائی کی موت کا ہرجانہ میں دوں گا۔ لیکن تم بتاؤ کہ...... کیا تم سچ مچ یہودیوں کے نبی ہو؟"

"نہیں! میں صرف ایک سچا یہودی ہوں اور آپ سب کے ذہن میں صرف یہ بات ڈالنا چاہتا ہوں کہ ہمارے غلام بھی ہماری طرح انسان ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک نہیں کر سکتے تو کم از کم جانوروں جیسا تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اس لاش کو دیکھیے۔ اس کے ساتھ جو ہوا کیا کبھی کسی جانور کے ساتھ بھی ایسا ہوا؟ ضروری تو نہیں کہ ہر غلام پشت در پشت سے غلام ہو۔ ہم خود ایک ایسے لڑکے کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں جو قرطاجنہ کے مہاپجاری کا بیٹا ہے اور غلام بنا کر بیچ دیا گیا ہے۔ اب کسے معلوم کہ مارفیس جزیرہ کے جواریوں نے جس غلام کو آگ میں جھونک دیا وہ کون تھا؟"

سردار جیدان کی آنکھوں میں پہلی بار حیرت کا شائبہ نظر آیا۔ اس نے دانیال کو مسکراتی ہوئی نظروں کے ساتھ دیکھا اور پھر سوال کیا۔

"جس لڑکے کو تلاش کرتے ہوئے ہوئے تم لوگ یہاں آئے ہو، وہ کون سے سمندر میں گرفتار کیا گیا؟"

"اسے کوناڈس نے گرفتار کیا۔"

"پھر تم لوگ یہاں کیا لینے آئے؟ کوناڈس نے گرفتار کیا تو یہ قرطاجنہ اور رومہ کا جنگی معاملہ ہے۔ تم لوگوں کو روم جانا چاہیے۔ اب تک تو وہ لڑکا روم کے بازاروں میں بک چکا ہوگا۔ یہاں مارفیس کے جزیرے پر آنے کا مشورہ تمہیں کس نے دیا؟"

"سارا مجمع دانیال اور سردار جیدان کا مکالمہ سن رہا تھا۔ لوگ حیرت سے دانیال اور اس کے ساتھیوں کو گھور رہے تھے۔ سچ مچ انہیں مارفیس کے جزیرے پر آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ معاً دانیال نے کہا۔

"یہ باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ہم اس لیے یہاں آئے ہیں کہ شاید وہ بکتا بکاتا یہاں

آ پہنچا ہو۔"

دانیال کی بات سن کر جیدان خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اپنا سر بلند کر کے نہایت زوردار آواز میں سارے مجمع کو مخاطب کیا۔

"یہاں کوئی قرطاجنی غلام ہے؟...... کسی کے پاس؟...... یا کسی کو معلوم ہو؟"

وہ اپنی تیرتی ہوئی نگاہوں سے مجمع میں کھڑے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری اور تیسری بار پوچھنے کے بعد بھی جب کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دانیال کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"مجھ یقین ہے کہ تمہارا مطلوبہ نوجوان یہاں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اب تک پتا چل گیا ہوتا۔ لیکن تم ہمارے مہمان ہو۔ سردار جیدان کے مہمان۔ اپنے نبیوں کے پاس جانا تو ان سے کہنا مارفیس کے جزیرے پر ایک بوڑھا قزاق ہے جوان کی عزت کرتا ہے...... اور ہاں! تم لوگ جب تک یہاں ہو میرے مہمان ہو۔"

سب کچھ دانیال کی توقع کیخلاف ہو رہا تھا۔ وہ تو آگے بڑھا تھا تاکہ ہمت کر کے قزاقوں کے سردار کو نیکی کا بھاشن دے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھا تھا اور اپنا فرض سمجھا تھا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرے۔ یہی یہودیوں کا طریقہ تھا۔ دنیا کا پہلا آسمانی مذہب، جو بت پرستی کیخلاف تھا۔ یہودیت کی عظمت، ان صدیوں کے لوگوں پر عیاں تھی۔ یروشلم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کے عہد میں پوری دنیا پر راج کیا تھا۔ یہودیوں کے انبیاء کو دنیا بھر کے تمام داناؤں پر فوقیت حاصل تھی۔ دانیال، بوڑھے سردار کے دل میں یہودیت کے لیے عزت دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اس نے مہمان نوازی کے لیے سردار جیدان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کی۔

"سردار جیدان!...... آپ کا بہت بہت شکریہ، لیکن ہم یہاں رک نہیں سکتے۔ ہاں اگر کبھی اس طرف سے دوبارہ گزر ہوا تو آپ کی میزبانی کا لطف لیتے ہوئے ہمیں بے حد فخر ہوگا۔"

یہ بہت عجیب گفتگو تھی۔ اس لیے کہ سرعام ہو رہی تھی۔ اب اہل بازار دانیال اور اس کے ساتھیوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک اسی قسم کے رسمی جملوں کا تبادلہ رہا اور پھر جیدان اپنے ہم رکاب ساتھیوں سمیت واپس پلٹ گیا۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ چند

نوکر پیشہ لوگ غلام کی جل کر کوئلہ ہوئی لاش کو اٹھانے لگے اور آرفان نے دانیال سے کہا۔

''ہمارا یہاں آنے کا مقصد تو پورا ہو چکا ہے...... اگر کسی قسم کی خریداری نہیں کرنی تو ہمیں واپس چل دینا چاہیے۔''

دانیال نے اس کی بات سنتے ہی کہا۔

''بالکل...... اب ہمیں مزید یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم نے جیدان سے کوئی نشانی حاصل کر لی ہوتی تو بحر روم کے قزاقوں سے ہم آئندہ بھی بچے رہ سکتے تھے۔''

آرفان نے ایک لمحے کیلئے کچھ سوچا اور پھر گویا ہوا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جیدان کا نام ہی کافی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور انہی قدموں واپس پلٹنے لگے۔ بازار میں موجود اکھڑ مزاج قزاقوں کی نظریں ابھی تک ان پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کلاڈینا اور شینل کو گھورنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کیدارا کو ان لوگوں پر غصہ آرہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی انہی نظروں کے ساتھ ان کو گھورنے لگا۔ وہ اب واپسی کے لیے چل رہے تھے۔ بڑے بازار میں سے گزرتے ہوئے دانیال کو احساس ہوا کہ اسے اتنے زیادہ لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ غریب الدیار تھے اور ان کے ساتھ مارفیس کے باشندوں میں سے کوئی بھی کچھ بھی کر سکتا تھا۔

یکا یک انہیں رکنا پڑا۔ اچانک ایک گھڑ سوار نے ان کا راستہ کاٹ لیا تھا۔ اس نے پورے زور سے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچی تھیں۔ دانیال اور اس کے ساتھی بری طرح چونک گئے یہ گھڑ سوار ایک خوبصورت، لیکن اکھڑ مزاج نوجوان تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی، گھنگریالی، سیاہ داڑھی اور بھاری گچھے دار مونچھوں نے اس کے رعب حسن کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لباس اور پہناوے سے وہ کوئی خاصا متمول آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا گھوڑا بھی بہت عمدہ تھا۔ دانیال سوچ میں پڑ گیا۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان نے دانیال اور آرفان کو باری باری گھورنے کے بعد سوال کیا۔

''تم میں سے کون ہے؟...... جس نے جلنے والے غلام کا بھائی بن کر اہل جزیرہ سے ہرجانہ طلب کیا تھا؟''

دانیال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر وہ کون ہے اور ان سے اس طرح سوال کیوں

کررہا ہے۔ وہ کچھ دیر تک نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا اور پھر اس نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کردیا۔

''پہلے تم بتاؤ......تم کون ہو؟ اور تم نے اس طرح ہمارا راستہ کیوں کاٹا؟''

''میں شارق ہوں، سردار منگورا کا چھوٹا بھائی۔ تمہیں ہرجانہ چاہیے تو تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس غلام کی موت کا ذمہ دار میں ہوں، سردار جیدان نہیں۔ اب بتاؤ! تمہیں کتنا ہرجانہ درکار ہے؟''

شارق کا نام وہ سن چکے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی نے سردار جیدان کو بتایا تھا کہ سردار منگورہ کا بیٹا شارق، اپنے ڈیرے پر ہوگا۔ دانیال کو ساری بات سمجھ آ گئی۔ اس نے اپنے لہجے کو کسی قدر نرم کرتے ہوئے کہا۔

''محترم شارق!...... اس وقت ہرجانے کی بات کرنے کا مقصد اس ظلم کیخلاف احتجاج کرنا تھا جو ایک ہمارے جیسے انسان کے ساتھ ہوا۔ ہمیں ہرجانے کی کوئی طلب نہیں، ہم تو اس غلام کو جانتے تک نہیں۔ آپ کو اگر ہم نے نادانستگی میں کوئی تکلیف پہنچائی تو اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن میں آپ سے بھی کہوں گا کہ اگر آج ہم انسانیت کو نہیں سمجھیں گے تو آنے والے کل کے لوگ ہمیں جنگلی جانور اور درندہ کہہ کر پکاریں گے۔ اس لیے میں گزارش کرتا ہوں کہ آئندہ یہ بھیانک کھیل مار فیس پر کسی کو نہ کھیلنے دیا جائے۔''

وہ نوجوان جس نے اپنا نام شارق بتایا تھا، اچانک ایک جست کے ساتھ اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی آنکھیں، انگارے کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ وہ بے پناہ غصیلی نظروں سے دانیال کو گھورتا ہوا، اس کی طرف بڑھا اور پھر دانیال کے روبرو آ کر کھڑا ہوگیا۔

''اچھا! تو وہ تم ہو، جسے ہرجانے کی ضرورت ہے۔ بہت خوب! تم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے۔ پہلے تمہیں میرے ساتھ اپنا حساب بے باک کرنا ہوگا کیونکہ تمہاری وجہ سے میری ساکھ پر حرف آیا۔ جب تک میرا بڑا بھائی، سردار منگورا...... دیوتاؤں کے ستونوں سے واپس نہیں آجاتا تم لوگ اپنے آپ کو میرا قیدی سمجھو!''

یہ کیا آفتاد آپڑی تھی۔ کلاڈینا اور شینل تو بری طرح سٹپٹا گئیں۔ آرفان بھی ادھ کھلا منہ لیے نوجوان کے چہرے کی جانب تکے جارہا تھا۔ البتہ کیدارا کی آنکھوں میں غضب در

غصے کی جھلک تھی۔ کیدارا نے مزید سوچنا، سمجھنا بے کار جانتے ہوئے ایک زوردار آواز کے ساتھ اپنی شمشیر بے نیام کرلی۔ لوہے کے نیام میں سے لوہے کی تلوار باہر آئی تو اس کی آواز آس پاس بھی سنائی دی۔ آرفان کے کندھے پر بیٹھے چھمو نے زور زور سے چلانا شروع کردیا۔ وہ سنگین حالات کی بو پا چکا تھا۔ چھمو کی چیخوں نے بازار میں موجود لوگوں کو اسی طرف متوجہ کردیا۔ کیدارا نے تلوار نکالی تو شارق نے بھی کسی توقف کے بغیر اپنی شمشیر برہنہ کرلی۔ اور کیدارا کی اس حرکت نے اسے اتنا مشتعل کردیا کہ اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ دانیال نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ اس قدر آگے بڑھے۔ لیکن اب بات بہت بگڑ چکی تھی۔ آرفان نے چاہا کہ اسی مرحلے پر کسی طرح معاملہ رفع دفع ہوجائے۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت متانت کے ساتھ، شارق کو مخاطب کیا۔

”دیکھو! نوجوان شارق، ہم مارفیس جزیرے کے سب سے بوڑھے سردار جیدان کے مہمان ہیں۔ تم اس طرح زبردستی ہمیں اپنا قیدی نہیں بنا سکتے۔ اور پھر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے جو کچھ کہا...... جیدان سے کہا...... تمہیں تو ہم جانتے تک نہیں۔“

آرفان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شارق کسی درندے کی طرح غرایا۔

”خبردار! اب بکری کی طرح منمنانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے ساتھی نے مجھ پر تلوار سونتی ہے اور وہ بھی سربازار۔ اب تو کسی صورت میں تم لوگوں کو معاف نہیں کرسکتا اور جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ تم سردار جیدان کے مہمان ہو تو میری ایک بات غور سے سن لو! میں شاید تم لوگوں کو کچھ نہ کہتا لیکن جب میں نے سنا کہ جیدان نے تمہیں سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اپنا مہمان کہا ہے تو میں سب کچھ چھوڑ کر اڑتا ہوا یہاں چلا آیا۔ جانتے ہو کس لیے؟...... محض اس لیے کہ آج سالوں بعد شارق کو یعنی مجھ کو بوڑھے جیدان سے اپنا بدلہ لینے کا موقع ملا ہے۔ میں ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ جیدان کو بھول گیا ہوگا لیکن میں نہیں بھول سکتا، جب اس نے میرے ایک مہمان دوست کو یہ کہہ کر قیدی بنا لیا تھا کہ وہ...... اس کا مجرم ہے۔ حالانکہ میرا دوست کسی کا مجرم نہیں تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے جیدان کی بیٹی سے پیار کیا تھا۔ جیدان نے میرے دوست کو قتل کرکے سمندر میں پھنکوا دیا۔ اور جزیرے کی مجلس مشاورت میں جیدان، ہرجانہ ادا کرکے بچ گیا۔ آج جب میں تم لوگوں کی لاشیں سمندر برد کروں گا تو جیدان کو پتہ چلے گا کہ بدلے کی آگ کسے کہتے ہیں۔“

دانیال اور اس کے ساتھیوں کو سچ مچ پسینے چھوٹ گئے۔ جس جیدان کی میزبانی پر تھوڑی دیر پہلے انہیں فخر ہو رہا تھا اب اسی جیدان کا مہمان کہلوانا ان کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ وہ مارفیس جزیرے کے دو سرداروں کی دیرینہ مخاصمت کا شکار ہونے والے تھے۔ شارق نے مزیدان کی کوئی بات نہ سنی۔ اس نے فضا میں تلوار لہرائی اور کیدارا کو للکارا۔

''تمہاری شمشیر رک کیوں گئی۔ اے کالے حبشی!...... آگے بڑھو!...... ورنہ میں خود آگے بڑھ کر تم پر وار کردوں گا۔''

کیدارا...... کسی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس نے شارق کی للکار سنی تو سچ مچ لڑائی کے لیے آگے بڑھ آیا۔

قریب تھا کہ کیدارا اور شارق کے درمیان ایک خونریز جنگ چھڑ جاتی، لیکن اسی اثنا میں کلاڈینا آگے بڑھی اور ان دونوں کے بیچ آ گئی۔

''ٹھہرو!...... یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ تم اپنی ذاتی دشمنی کے لیے جزیرے پر آنے والے مہمانوں کو یرغمال نہیں بنا سکتے۔ تم ہمیں جانے دو۔ ہم بہت مجبوری کے عالم میں سفر پر نکلے ہیں۔ تم ایک اچھے انسان معلوم ہوتے ہو۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ ہمیں جانے دو۔''

شارق نے خونخوار نظروں کے ساتھ کلاڈینا کی جانب دیکھا۔ کلاڈینا کے قمر مثال حسن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے، ٹھٹک پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ اپنے سابقہ لہجے پر آ گیا۔

''نہیں! تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ لڑکی۔ شارق اپنے دشمنوں کو معاف نہ کرنے کیلئے مشہور ہے۔''

اتنا کہتے ہی اس نے کیدارا پر حملہ کر دیا۔ دانیال کے لیے یہ صورتحال خاصی پریشان کن تھی۔ وہ نہ چاہتا تھا کہ ایک اکیلے شخص پر وہ بھی حملہ کر دے۔ لیکن اس طرح خاموش کھڑا رہنا بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ابھی گومگو کے عالم میں ہی تھا کہ مجمع میں سے دو تین نوجوان برہنہ شمشیریں لیے میدان میں نکل آئے۔ ان لوگوں کے گرداگرد ایک بار پھر لوگوں کا ٹھٹھ لگ چکا تھا۔ شارق کو تو سب جانتے تھے۔ وہ اس جزیرے کا سب سے نڈر اور جنگجو قزاق تھا۔ اس کے سامنے بڑے سے بڑا شمشیرزن بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔ پھر ایک لیبیائی حبشی کی کیا...... مجال تھی کہ وہ

شارق جیسے مرد کا مقابلہ کرتا۔ لوگ نہایت جوش کے ساتھ شارق اور کیدارا کی لڑائی دیکھنے لگے۔ میدان میں اترنے والے نوجوان کو شارق نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور اپنا پینترا بدلتے ہوئے ان سے کہا:

”نہیں! تم لوگ رکو!...... ایک بمقابلہ ایک۔ ہاں اگر اس کے ساتھی حملہ کریں تو پھر تم کو بھی اجازت ہے۔“

وہ شاید شارق کے وفادار ساتھی تھی۔ شارق کے اشارے پر فوراً رک گئے۔ دانیال سمجھ گیا کہ اگر وہ بھی کیدارا کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو یہ لڑائی پھیل کر جنگ بن جائے۔ وہ اس خوامخواہ کی افتاد سے جلد از جلد چھٹکارا چاہتا تھا۔ ابھی تک کیدارا، شارق کا نہایت چابکدستی سے مقابلہ کر رہا تھا لیکن سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شارق کے سامنے ٹھہرنا آسان کام نہیں ہے۔ کیدارا جو کسی سے کم نہیں تھا۔ ایک تو وہ لحیم شحیم اور خوب زور آور تھا۔ اس پر مستزاد اس کی خوبی تھی کہ وہ تھکتا نہیں تھا۔ لوہے سے لوہا متواتر ٹکرا رہا تھا۔ لوگ اس لیے بھی دم سادھے کھڑے تھے کہ وہ شارق کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ نوجوان اس جزیرے پر اپنی مثال آپ تھا۔ اسے کبھی کسی سے شکست نہ ہوئی تھی۔ اس کی پھرتی اور جھپٹ پلٹ کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ دانیال ہر قیمت پر اس لڑائی کا خاتمہ چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جلد یا بدیر کیدارا مات کھا جائے گا اور وہ اتنے قیمتی ساتھی کو یوں رفعت میں نہ گنوانا چاہتا تھا۔

معاً دانیال کے دماغ میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ اس نے بہ آواز بلند شارق کو مخاطب کیا۔

”نوجوان شارق! ہم تمہاری بات کیلئے تیار ہیں۔ ٹھیک ہے تم ہمیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤ۔ لیکن یہ لڑائی ختم کردو۔ ہم تمہارے بھائی، سردار منگورا کے واپس آنے تک، یہاں رہنے کیلئے تیار ہیں۔“

کلاڈینا اور شیتل نے ایسی نظروں کے ساتھ دانیال کی طرف چہرہ گھمایا، جیسے وہ اس کی دماغی حالت پر شک کر رہی ہوں۔ لیکن وہ کیا جانتی تھیں کہ دانیال کے دل میں کیا ہے۔ آرفان کو بھی حیرت ہوئی، لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ چلو وقتی طور پر لڑائی تو ختم ہوگئی۔“

لڑائی یکدم ختم ہوگئی۔ دونوں جنگ بازوں کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ شارق کی آنکھوں میں بھی دانیال کی بات پر حیرت کی جھلک تھی۔ اس نے اپنے برہنہ شمشیر ساتھیوں کو

اشارہ کیا۔ وہ آگے آئے اور پھر کچھ دیر بعد دانیال اور اس کے ساتھی سردار منگورا کے چھوٹے بھائی، مشہور قزاق اور ماہر جنگ باز شارق کے قیدی بن کر اس کی حویلی کی طرف جا رہے تھے۔

پیچھے سے بازار میں موجود لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔

"بہت منحوس تھے، یہ لوگ جن کی وجہ سے جزیرے کا امن خطرے میں پڑ گیا۔ اب ایشور جانے کیا ہوگا۔ سردار جیدان اور شارق کے درمیان مخالفت ٹھیک نہیں۔ بہت خون بہے گا۔"

یہ قزاقوں کا جزیرہ تھا۔ اول تو ایک دوسرے کے خوف کی وجہ سے یہاں لڑائی ہوتی ہی نہ تھی اور اگر کبھی کبھار لڑائی شروع ہوجاتی تو پھر بہت خون بہتا تھا۔ بہت دنگا فساد ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارفیس کے لوگ دانیال اور اس کے ساتھیوں کی آمد کو برا شگون سمجھ رہے تھے اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، اس جزیرے پر گزشتہ کئی سال [illegible] کوئی [illegible]ائی نہ ہوئی تھی۔ چار قزاقوں کے گروہ یہاں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن کبھی کوئی [illegible] نہ [illegible] تھا۔ اگر کبھی کبھار نوک جھوک ہوجاتی اور بات بڑھنے لگتی تو جو کوئی معاملے [illegible] جانبدار ہوتا باقی گروہوں کی صلح کروا دیتا۔ مارفیس اپنی نوعیت میں ایک مثالی جزیرہ تھا۔

دانیال اور اس کے ساتھیوں کو شارق اپنی بڑی سی حویلی میں لے آیا۔ عجب سماں تھا، بہت سے گھوڑے آزاد گھوم رہے تھے۔ صحن میں سبزہ اگا تھا۔ جس میں موروں کے جوڑے اپنے پنکھ پھیلائے ایک دوسرے کو لبھا رہے تھے۔ کوئی پہریدار یا چوکیدار نہیں تھا۔ دانیال نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ حویلی خالی تھی، ماسوائے گھوڑوں کے۔

چھمو نے حویلی میں داخل ہوتے ہی آرفان کے کندھے سے جست لگائی اور تیزی سے حویلی کے صحن میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے صحن کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ اُگے شہتوت کے درخت دیکھ لئے تھے۔ جن کے سائے میں ڈھیروں پکے شہتوت اور ریشم کے بھورے کیڑے ایک ساتھ موجود تھے۔ صرف کیڑوں کی حرکت ہی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شہتوتوں سے مختلف ہیں۔ چھمو نے زمین پر گرے شہتوت اٹھا اٹھا کر کھانے شروع کر دیئے۔ کئی بار شہتوت کی جگہ اس نے کیڑا اٹھا لیا۔ لیکن پھر فوراً ڈر کر اسے نیچے پھینک دیا۔

شارق کے مسلح ساتھی پوری طرح مستعد تھے۔ ان کی نگاہیں خاص طور پر کیم شیم

کیدارا پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں اگر کسی قسم کا خطرہ تھا تو صرف کیدارا سے۔ حویلی میں پہنچ کر شارق نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''انہیں اندرونی کمروں میں لے جاؤ اور تم لوگ یہیں رکو۔ میں تھوڑی دیر تک آ تا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ دانیال اس سے کچھ کہتا وہ باہر کی طرف پلٹ گیا۔ شارق کے مسلح ساتھی دانیال اور اس کے ساتھیوں کو کڑی نگاہوں کے ساتھ گھورتے ہوئے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ آرفان سوچ رہا تھا کہ دانیال نے غلام کے قضیے میں ٹانگ اڑا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہوگئی۔ اب نہ جانے وہ کب تک یہاں پھنسے رہیں گے۔

لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ دانیال کے ذہن میں کیا ہے۔ جب کہ دانیال اس طرف خود آیا تھا۔ شارق کے ہمراہ۔ اس نے شارق کے ایک مسلح ساتھی کو مخاطب کیا۔

''شارق کو جا کر بتاؤ کہ میں اس کے ساتھ علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مسلح ساتھی نے دانیال کو غور سے دیکھا اور پھر جواب دیا۔

''وہ ابھی آنے والے ہیں۔ تم باتیں کر لینا۔ اب تم ہمارے مہمان ہو، ایک لمبے عرصے کے لیے۔ تمہیں بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔''

شارق کے مسلح ساتھی نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بات کی۔ اتنا کہہ کر شارق کے مسلح ساتھی ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے کمرے کا دروازہ بند نہ کیا۔ وہ باہر صحن میں جا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ جھمو ابھی تک شہتوت کے درختوں پر ایک شاخ سے دوسری شاخ تک اچھلتا پھر رہا تھا۔

اب کمرے میں دانیال اپنے تمام ساتھیوں سمیت موجود تھا۔ سب سے پہلے کلاڈینا نے دانیال سے بات کی۔

''اب کیا ہوگا...... لگتا ہے ہم خوامخواہ پھنس گئے۔''

دانیال نے کلاڈینا کو پیار بھری نظروں کے ساتھ دیکھا اور کہا۔

''نہیں!...... ہم پھنسے نہیں، ہم خود آئے ہیں۔ سوچا اگر سنتوش کو تلاش کرنے والا ہماری جگہ جزیرہ مارفیس کا کوئی قزاق ہو تو کون جلد کامیاب ہوگا۔ میں شارق کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اس قبیل کے نوجوان مہم جوئی کے بے حد شائق ہوتے ہیں اور پھر ہمارے

مقابلے میں ایک تجربہ کار قزاق کو زیادہ پتہ ہوگا کہ اسے سنتوش کو کہاں ڈھونڈنے جانا چاہیے۔ میں شارق کے ساتھ معاملہ طے کرنے والا ہوں۔ سنتوش اور آموسا کی تلاش میں وہ ہماری مدد کرے گا اور بدلے میں ہم اسے بھاری رقم دیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ انکار کرے گا۔"

وہ سب دانیال کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ تو بہت بڑا فیصلہ تھا، جو دانیال نے ازخود کرلیا تھا۔ ایک قزاق کو تلاش کے کام پر لگانا۔ قرطاجنہ سے روانگی کے وقت جب وہ اس مہم پر نکلنے کی منصوبہ بندی کررہے تھے تو یہی مسئلہ درپیش تھا کہ کس طرح اس مہم کا آغاز کیا جائے اور کہاں سے؟۔ سنتوش یا آموسا کو تلاش کرنا بھوسا میں سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ اس وقت بھی طرح طرح کے مشورے سامنے آئے تھے۔ لیکن بالآخر طے ہوا تھا کہ کسی سے بھی مدد نہ لی جائے۔ بلکہ اس مہم کو ازخود سر کرنے کی کوشش کی جائے۔ آج دانیال شارق کو تلاش کرنے کی مہم سوچنے کی بات کررہا تھا۔ دانیال کے تمام ساتھی ششدر رہ گئے۔ اسی اثنا میں شینل نے کہا۔

"اچھا تو آپ اس لیے چپ چاپ یہاں چلے آئے۔ میں حیران تھی اور سوچتی تھی کہ ضرور آپ کے دل میں کوئی بات ہے۔ لیکن کیا شارق مان جائے گا۔ وہ بہت سخت مزاج اور اکھڑ ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ میں اسے منالوں گا۔"

"لیکن فی الحال تو ہم اس کے قیدی ہیں اور اسی کے رحم و کرم پر ہیں۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم یہاں سے کب تک نکل سکیں گے۔"

یہ آرفان کی آواز تھی۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اصل میں اسے جہاز پر موجود اپنے بیوی، بچوں کی فکر ہورہی تھی۔ اور اس بات کا ذکر وہ جان بوجھ کر زبان پر نہ لا رہا تھا۔ وہ اب تک اکتا چکا تھا۔ دانیال نے اس کی اکتاہٹ محسوس کی اور اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم فکر مت کرو! تمہارے بیوی بچے، بس اب آتے ہی ہوں گے۔ شارق...... انہی کو لینے گیا ہوا ہے۔"

دانیال کی بات سن کر سب چونک گئے اور ان کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔

"کیا؟؟......"

شیتل نے پہلو بدلتے ہوئے دانیال کے چہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
''کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا یا آپ اندازہ لگا رہے ہیں؟''
''مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ ہمارے باقی ساتھیوں کو لینے کے لیے جا رہا ہے۔ آپ ایک تجربہ کار قزاق کے ذہن سے سوچیں تو شاید آپ بھی اس طرح کے اقدامات کا اندازہ کر سکیں۔ وہ یقیناً ہمارے جہاز کی تلاشی لے گا اور یہ جاننے میں اسے دیر نہ لگے گی کہ ہمارے پاس اچھی خاصی دولت ہے۔ وہ ہماری دولت یہاں لوٹنے سے پرہیز کرے گا اور چاہے گا کہ ہم کو سمندر میں لوٹے۔ کیونکہ یہاں کے قوانین کے مطابق کسی مہمان کو مارفیس پر لوٹنا جائز نہیں۔ ہمارے جہاز کی تلاشی کے دوران وہ ہر خفیہ مقام کو اچھی طرح پرکھ لے گا۔ آخر وہ ایک قزاق ہے۔ جب ہم کافی آگے نکل جائیں گے تو وہ ہمیں گھیر کر لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ میں چاہتا ہوں اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی میں اسے اپنا ''زرخرید'' ملازم بنا لوں۔ شیتل ایک بھاری رقم لائی ہے۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں۔ ہم شارق کو خرید سکتے ہیں۔ وہ روم میں ہمارے بہت کام آئے گا۔ اسے ہر اس جگہ کا پتہ ہوگا، جہاں نئے غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میرا ذہن تو یہی باتیں سوچتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟'' سب خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کچھ دیر یہی عالم رہا اور پھر آرفان نے بات کی۔
''آپ کی باتوں میں بہت وزن ہے دانیال! حالات تو یہی بتاتے ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں وہی کرنا مناسب ہوگا جو آپ نے سوچا، لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمارے ساتھ ایک ملازم کی حیثیت سے چل پڑے گا۔ وہ بظاہر ایک مغرور اور مال دار آدمی دکھائی دیتا ہے۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو آرفان۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ ہر انسان کی کوئی نہ کوئی قیمت ضرور ہوتی ہے۔ اور شارق تو پھر ایک قزاق ہے۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔ ہم بہت جلد روم کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔''
ابھی یہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ شارق لوٹ آیا۔ وہ سچ مچ جہاز پر موجود باقی لوگوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ سب سے پہلے کمرے میں آرفان کی بیوی داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بول رہی تھی۔ ماں کے

بعد، اس کے دونوں بیٹے کمرے میں داخل ہوئے اور سب سے آخر میں بھاڑے کے چار مزدور۔ سب لوگ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ انہیں مار دیا جائے گا۔ آرفان اپنے بیوی بچوں کو تسلیاں دینے لگا۔ آرفان کے دونوں بیٹے ''مالو'' اور ''میران'' باپ کی بجائے اپنے دوست کیدارا کے پاس جا بیٹھے۔ سب سے آخر میں شارق خود کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خطرناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''اب تم لوگ...... سب کے سب شارق کے قیدی ہو۔ اس مکان پر سخت پہرہ ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جان گنوائے گا۔ تمہارا جہاز بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ اس لیے تم لوگ اب واپسی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔''

شارق نے دانیال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنا کہا اور پھر دانیال کا جواب سننے کیلئے وہیں کھڑا رہا۔ دانیال جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن دانیال اسے ایک ہی بار میں سارے پتے نہ دکھانا چاہتا تھا۔ تب دانیال نے شارق کو گھورتے ہوئے، اس کی بات کا جواب دیا۔

''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو شارق! اس جزیرے کا امن اور سلامتی تباہ کرنے کی تمام ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔ سردار جیدان اپنے مہمانوں کے لیے لڑے گا۔ وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ اگر تمہیں سردار جیدان سے بدلہ لینا تھا، تو اس کے ساتھ کھلے سمندر میں پنجہ آزمائی کرتے جزیرے کا امن برباد کر کے تمہیں کیا ملے گا۔ کیا یہ دانشمندی ہے؟''

دانیال نے جان بوجھ کر اس طرح بات کی۔ وہ شارق کی آنکھوں میں اپنے خیالات کی تائید پا چکا تھا۔ شارق اسے سمندر میں لوٹنے کیلئے کھلا چھوڑنا چاہتا تھا اور اس وقت کی قید کا تماشا محض دکھلاوا تھا۔ لیکن پھر بھی دانیال شارق کو اپنے دام میں لینے کیلئے اس طرح بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ گویا شطرنج کی بساط جیسے حالات تھے۔ وہ شارق کے قیدی تھے بھی، اور نہیں بھی۔ شارق انہیں اپنے داؤ کی گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ شارق جو کچھ کرنا چاہتا تھا دانیال پہلے ہی جان گیا تھا۔ شارق انہیں کھلے سمندر میں لوٹ لینا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس دانیال چاہتا تھا کہ وہ شارق کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اسے ملازم رکھ لے، اسے سنتوش کو ڈھونڈنے کے لیے استعمال کرے۔ گویا دونوں طرف سے ذہنی حربے استعمال ہو رہے تھے۔

شارق نے دانیال کی بات سن کر سوچتی ہوئی آنکھوں سے کلاڈینا اور شینل کی طرف دیکھا۔ اور

پھر یوں مخاطب ہوا۔

''سردار جیدان کے ساتھ وہی ہوگا جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔اس نے میرے مہمان کو قتل کیا تھا، اور میں بھی اس کے مہمانوں کا قتل کرنے والا ہوں۔حساب برابر!''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنے دونوں بازو باہر کی طرف پھیلائے۔لیکن اس کے لہجے میں جارحیت نہیں تھی۔لڑکیوں کو حیرت تھی کہ وہ بار باران کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ کلاڈینا نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا اور بڑے سخت لہجے میں کہا۔

''میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ کیا مرد ایسے بھی ہوتے ہیں۔نہ تمہارا کوئی اصول ہے اور نہ کوئی زبان۔تم نے لوگوں سے سنا کہ ہم جیدان کے مہمان ہیں اور تم چلے ہمیں پکڑنے۔دشمنی تمہاری جیدان سے ہے اور پکڑ تم نے ہمیں لیا ہے۔یہ ہے تمہاری مردانگی۔ ارے نادان آدمی...... تم سوچو تو...... ہم صرف جیدان کے نہیں پورے مارفیس جزیرے کے مہمان ہیں۔میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتادوں۔ہم میں سے کوئی تم سے خوفزدہ نہیں۔یہاں تک کہ ہمارا بندر بھی۔ہم جس وقت چاہیں یہاں سے جاسکتے ہیں۔تم ہمیں بالکل نہیں روک سکتے۔تم کیا سمجھتے ہو تمہارے کرائے کے ان ٹٹوؤں سے ہم خوفزدہ ہوجائیں گے؟ ہم تو یہاں تمہارے ساتھ اس لیے آئے کہ یہ معاملہ صلح، صفائی سے نمٹ جائے۔لیکن اگر تم خون خرابہ چاہتے ہو تو آؤ...... ہم میں سے کسی ایک کو چھو کر دیکھو۔ ''ایشور'' کی قسم تم نے ہمیں چھوا تو پھر کسی چیز کو چھونے کے لائق نہیں رہو گے۔''

شارق کی حالت غیر ہوگئی۔کلاڈینا کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر ہتھوڑے کی طرح برسا۔اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔بھنویں سکڑ گئیں اور کنپٹیاں تمتمانے لگیں۔وہ کلاڈینا کے سامنے یوں کھڑا تھا گویا کوئی مجرم۔دانیال، آرفان اور کیدارا بھی کلاڈینا کا یہ انداز دیکھ کر دنگ رہ گئے۔دانیال اور کیدارا کے علاوہ شیتل کے جذبات کو تو سکون ملا، البتہ آرفان، اس کے بچے اور کرائے کے مزدور کلاڈینا کے لہجے سے کانپ گئے اور سوچنے لگے کہ اب یہ قزاق انہیں کسی قیمت پر رہا نہ کرے گا۔شارق کے مسلح ساتھی تو اتنے غصے میں تھے کہ بار بار شارق کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے گویا اس سے اجازت طلب کررہے ہوں کہ اس لڑکی کو ابھی کے ابھی سزا دی جانی چاہیے۔

ہر کسی کو معاملہ سنگین لگ رہا تھا۔لیکن کلاڈینا مطمئن تھی۔ وہ اب کسی بات سے نہ

ڈرتی تھی۔ ایک تو پوری دنیا میں اب اس کا کوئی ''خونی'' رشتہ دار باقی نہ رہا تھا۔ دوسرے اس نے اس قدر دکھ درد جھیلے تھے کہ اب وہ مزید کسی تکلیف سے نہ ڈرتی تھی۔ سب کی نگاہیں شارق کی پھڑکتی ہوئی مونچھوں پر ٹکی تھیں اور وہ ابھی تک کھا جانے والی نظروں سے کلاڈینا کو گھور رہا تھا۔ معاً اس نے کلاڈینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری جرأت کی داد دیتا ہوں لڑکی! بلاشبہ تم بہت بہادر ہو۔ شارق کے سامنے پورے مارفیس پر اور پورے مغربی بحرروم میں کسی کی ہمت نہیں کہ آنکھ اٹھا کر بات کرے، لیکن تم نے آج سب کے سامنے میری مردانگی کو للکارا۔ پہلے تو میرا کچھ اور ارادہ تھا، لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ دوں۔ میں تمہیں اس گستاخی کی سزا دے سکتا ہوں لیکن اس وقت معاملہ مردانگی ثابت کرنے کا درپیش ہے اور میں اپنی مردانگی ثابت کر رہا ہوں۔ تم لوگوں کی رہائی اس کا ثبوت ہے۔''

شارق نے اپنی شعلہ بار نگاہوں سے ایک ایک قیدی کو گھورا اور پھر نہ جانے کیوں سر جھکا کر باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کے ساتھی بری طرح سٹپٹا گئے۔ وہ کبھی اپنے قیدیوں کو دیکھتے اور کبھی شارق کو۔ اس سے پہلے کہ شارق کمرے سے باہر نکلتا۔ اسے پیچھے سے کلاڈینا کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم ہمیں کیوں چھوڑ رہے ہو۔ محض اس لیے کہ تم اس جزیرے پر ہمارا جہاز نہیں لوٹ سکتے۔ تم کھلے سمندر میں ہم پر حملہ کرو گے اور اس وقت مجھے اپنے تئیں اذیت ناک سزا دے کر اس توہین کا بدلہ لو گے۔''

شارق کے قدم یکدم رک گئے۔ وہ انہی پیروں پر واپس پلٹا اور نہایت متحیر نگاہوں سے کلاڈینا کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

''حیرت ہے!! تم بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ میں نے ایسا ہی سوچا تھا۔ کیونکہ میں نے تمہارا جہاز کو دیکھتے ہی تم لوگوں کی دولت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا...... میں اپنا سابقہ ارادہ ختم کر چکا ہوں اور تمہیں سچ مچ رہا کر رہا ہوں تم لوگ آزاد ہو اور جا سکتے ہو۔''

کچھ دیر بعد وہ سب واپس اپنے جہاز کی طرف لوٹ رہے تھے۔ راستے میں شینتل نے دانیال کو مخاطب کیا۔

''آپ تو شارق کو...... سنتوش کی تلاش کیلئے اپنے ہمراہ لینے کی بات کر رہے تھے۔

کیا اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس ضمن میں اب کچھ کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔کلاڈینا نے اس کی بہت سخت توہین کی ہے۔وہ بہت شرمسار ہوا۔سوچتا ہوں اگر شارق جیسا کوئی قزاق ہماری مدد کیلئے تیار ہو جائے تو ہمیں ہر قدم پر آسانی ہوگی۔“

کلاڈینا بھی ساتھ ہی چل رہی تھی۔اس نے چلتے چلتے دانیال سے کہا۔

”بے شک ایک قزاق سمندر کے باقی سفر میں ہمارے خوب کام آ سکتا ہے،لیکن روم میں ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ہم قرطاجنہ میں ہی سن چکے ہیں کہ کوناڈس ابھی زندہ ہے اور شہر روم میں موجود ہے۔اگر ہم براہ راست کوناڈس تک رسائی حاصل کر کے اس سے پوچھ گچھ کریں تو ہمیں سنتوش کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔“

شیتل تو اس تجویز پر بہت خوش ہوئی،لیکن دانیال متفکر لہجے میں بولا۔

”میں نے اس رخ پر سوچا ہے۔اس کام میں بھی ایک قزاق صفت انسان ہی کام آ سکتا ہے۔کیونکہ کوناڈس خود ایک قزاق ہے،ہم میں سے کوئی بھی اس طرح کی ذہنیت کا حامل نہیں۔خاص طور پر میں نے تو تمام عمر تجارت کی ہے اور میں ایک عاشق ہوں، مجرمانہ ذہنیت سے بہت دور۔“

کلاڈینا نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے محسن دانیال کو دیکھا اور پھر گویا اسے سمجھانے کے سے انداز میں کہنے لگی۔

”ہمارے ہمراہ......کیدارا جیسا جنگجو شخص ہے۔آپ نے دیکھا نہیں اس نے کس طرح شارق کے پسینے نکال دیئے۔“

کیدارا کا سینہ پھول کر کپا ہوگیا۔کلاڈینا جیسی حسین لڑکی نے اس کالے حبشی کے لیے تعریفی کلمات کہے تھے۔وہ خوشی سے مست ہوگیا اور فوراً کہنے لگا۔

”بے شک بے شک!......ہمیں کسی قزاق سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔“

کلاڈینا اور شیتل ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

غروب آفتاب سے پہلے پہلے وہ اپنا جہاز مارفیس کے ساحل سے ہٹا چکے تھے۔ارطان کو یقین نہیں تھا کہ شارق انہیں آسانی سے جہاز دے گا۔وہ مسلسل قزاقوں کے حملے کی

بابت غور کرر ہا تھا۔ اور خود کو نئے حالات کے لئے تیار کرنے کی ذہنی کوشش میں مصروف تھا۔ بھاڑے کے مزدور بھی اسی خوف میں مبتلا تھے۔ لیکن دانیال اب فکرمند نہیں تھا۔ وہ شارق کی آنکھوں میں سچائی کی رمق دیکھ چکا تھا۔ یہ سب تو ٹھیک تھے، لیکن خود شارق ٹھیک نہیں تھا۔

قیدیوں کی رہائی سے تھوڑی دیر بعد اسے سردار جیدان کا پیغام ملا کہ وہ سردار جیدان کے سامنے حاضر ہو۔ شارق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے سردار جیدان کے آدمیوں کو نہایت سخت الفاظ کہہ کر واپس کر دیا۔ اور وہ اس بات کے لیے فکرمند تھا کہ سردار جیدان ضرور بڑوں کا اجلاس طلب کرے گا۔ اور شارق کی اس حرکت پر اسے سب کے سامنے معافی مانگنے کیلئے کہا جائے گا۔ اس کا ساتھی سردار منگورا دیوتاؤں کے ستونوں سے دو روز بعد لوٹنے والا تھا۔ شارق جانتا تھا کہ دو روز بعد مارفیس کے سرداروں کا اجلاس طلب کیا جائے گا اور اس میں شارق کو ہر کسی کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

آج اس کی قیدی لڑکی نے اسے بے حد سخت لہجے میں مخاطب کیا تھا۔ شارق نے اپنی پوری زندگی میں ایسا لہجہ نہیں سنا تھا۔ اور وہ بھی ایک کمزور عورت کے منہ سے۔ اس کا بدن ابھی تک اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ وہ کبھی اضطراری حالت میں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا تو اسے خود سے شرم آنے لگتی۔ وہ فوراً ہاتھ ہٹا لیتا۔ اس کی کنپٹیاں ابھی تک تمتما رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سردار جیدان کے آدمیوں کے ساتھ نہایت درشت سلوک کیا تھا۔ وہ فی الحقیقت ذہنی دباؤ کا شدید شکار تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کلاڈینا کی صورت ٹھہر گئی تھی اور کانوں میں بار بار کلاڈینا کی آواز اور اس کے کہے ہوئے جملے گونج رہے تھے۔

"نہ تمہارا کوئی اصول ہے نہ تمہاری کوئی زبان۔ ارے نادان آدمی ہم پورے جزیرے کے مہمان ہیں۔ دشمنی تمہاری جیدان کے ساتھ ہے اور تم ہمیں گرفتار کر لائے۔ مرد ہو تو ہمیں چھو کر دکھاؤ۔ ہمیں چھوا تو کسی چیز کو چھونے کے لائق نہیں رہو گے۔"

یہ الفاظ بار بار مختلف ترتیبوں کے ساتھ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اس کا دماغ مسلسل سنسنا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کیفیت کو کس طرح دور کر سکتا ہے اور اب تو اس نے سردار جیدان کے آدمیوں کی بے عزتی بھی کر دی تھی۔

وہ اپنے کمرے کے فرش پر بے چینی کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ وقت گزرتا گیا، گزرتا گیا، لیکن وہ خود کو سنبھال نہ پایا۔ اور پھر دو روز بعد جب اہل اجلاس نے شارق کو سب کے سامنے

جیدان سے معافی مانگنے کیلئے کہا تو اس نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ تب تمام سرداروں نے مل کر اسے یہ سزا سنائی کہ وہ مارفیس جزیرے پر نہیں رہ سکتا۔ جزیرے کے امن کی خاطر اسے حکم دیا گیا کہ وہ جزیرہ چھوڑ کر چلا جائے۔ شارق خود یہی چاہتا تھا۔ جونہی اس نے سزا کے الفاظ سنے، فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور اہل مجلس سے کہنے لگا۔

"مجھے منظور ہے۔ میں اب مارفیس پر مزید رہ بھی نہیں سکتا۔"

اس نے اپنے دوشالے کا پلو گھما کر کندھے پر ڈالا اور بھری مجلس میں سے نکل گیا۔

اسے اس کا بھائی سردار منگورا پیچھے سے آوازیں دیتا رہا...... یہاں تک کہ وہ اٹھ کر شارق کے پیچھے لپکا، لیکن اب شارق رکنے والا نہیں تھا۔ وہ نہ رکا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

دیوتاؤں کا زندان

سلطنت رومہ کے دارالحکومت میں خاصی چہل پہل تھی۔ روم و یونان اپنی تاریخ بنانے کے سب سے اہم مرحلے میں تھے۔ سکندر اعظم یونانی کا دور ابھی شروع نہ ہوا تھا۔ جس کے بعد یونان روئے زمین کی سب سے عظیم طاقت بننے والا تھا۔ ابھی سکندر کے باپ کی حکومت تھی۔ لیکن رومہ میں سرداروں کی مشترکہ حکومت تھی۔ وہ کسی ایک پرچم تلے جمع ہونے کے آرزومند تھے۔ رومہ کی مجلس شوریٰ کی نئی حکمت عملی پر زور و شور کے ساتھ عمل درآمد جاری تھا۔ یوں لگتا تھا پورا ملک جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ ہر چہرے پر ایک عجیب طرح کا جوش تھا۔ اہل رومہ قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ رومہ تو رومہ پورے اطالیہ میں میلے کا سا سماں رہنے لگا تھا۔ دور دراز کے ملکوں سے لوگ آ کر رومہ میں اپنی مصنوعات بیچ رہے تھے۔ بازاروں میں اہل رومہ کے ساتھ ساتھ یونانی، ایرانی حتیٰ کہ ہندوستانی بھی نظر آتے تھے۔ پوری سرزمین ایک جٹ ہو کر براعظم افریقہ کے قرطاجنہ پر چڑھائی کرنے والی تھی۔

گزشتہ کئی روز سے دانیال اور اس کے ساتھی شہر رومہ میں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے طور پر سنتوش کو تلاش کر رہا تھا۔ کلاڈینا یہاں پہنچ کر بھی ان لوگوں سے الگ نہ ہوئی تھی۔ اس کا روم میں کون تھا؟ وہ اطالیہ کے دور دراز کی رہنے والی تھی۔ بے شک اس کی قوم ''رومی'' تھی، لیکن خاص شہر رومہ میں کون ایسا تھا جس کے پاس وہ چلی جاتی۔ اب تو اس کا پریوار یہی لوگ تھے۔ دانیال نے یہاں پہنچ کر کلاڈینا کو چلے جانے کا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''کلاڈینا! تمہارا وطن آ گیا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تم چاہو تو جا سکتی ہو اور

اپنی نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔"

کلاڈینا نے پہلی بار خوفزدہ نظروں سے دانیال کی جانب دیکھا اور تڑپ کر جواب دیا۔

"ایشور کے لیے مجھے خود سے الگ نہ کیجئے! میرا وطن تو اب آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ مجھے خود سے الگ نہ کر دیں۔"

شیتل نے دیکھا کہ کلاڈینا رو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس بہادر رومی دوشیزہ کو گلے سے لگا لیا۔ دانیال بھی کلاڈینا کی محبت دیکھ کر مسکرا دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ کوئی بھی کلاڈینا کو جانے نہ دینا چاہتا تھا۔ کلاڈینا کو اپنے پاس دیکھ کر اورتو اور آرفان کے دونوں بیٹے بھی خوشی سے نہال ہو گئے۔ اور کلاڈینا نے پہلی بار فرط جذبات سے دانیال کا دامن لیا۔

"آپ نے مجھے خریدا ہے۔ کوئی اپنے غلاموں کو اس طرح جانے دیتا ہے کیا؟ آپ میرے آقا ہیں اور میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" ایشور کی قسم اگر غلامی کسی پہلو سے جائز ہے تو وہ صرف یہی ہے۔ میں آپ کی سچی...... باندی ہوں۔"

اور اب وہ سب اپنے اپنے طور پر سنتوش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیدارا کسی سے یہ نہ پوچھتا تھا کہ سنتوش کہاں ہے۔ وہ تو سب سے پوچھتا تھا کہ امیر البحر کوناڈس کی ملاقات کس طرح ممکن ہے۔ وہ کوناڈس پر براہ راست ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا، لیکن خوش قسمتی سے اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ رات کو جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس سرائے میں لوٹا تو ایک خوشخبری اس کی منتظر تھی۔

آج دن میں دانیال کو پتہ چلا تھا کہ کئی روز پہلے ایک خوش شکل نوعمر لڑکے کو بطور غلام فروخت کیا گیا تھا جو قرطاجنی تھا اور جس کی بولی بہت اونچی لگی تھی۔ اور دانیال کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ سنتوش کو برفانی علاقے کوہ مغرب کا کوئی سوداگر خرید کر لے گیا تھا۔ سب سے بڑی خوشی کی بات تو یہ تھی کہ انہیں پہاڑی سوداگر یا لاطینی ساہوکار کا نام بھی پتہ چل گیا تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھیوں کی توقع کے برخلاف سنتوش کا سراغ جلدی مل گیا تھا۔ اب تو انہیں نئے سفر کی تیاری کرنی تھی۔

قلطی ساہوکار پولا بیس کوہ مغرب کی "وادی برف" کا رہنے والا تھا۔ وہ زمرد کا تاجر تھا اور کوہ میں اس کی اپنی زمرد کی کانیں تھیں۔ قلطی اقوام بڑی خوشحال تھیں اور اس خوشحالی

کی وجہ صرف قیمتی پتھر زمرد تھا۔ وادی برف کوہ مغرب کی برفانی چوٹیوں کے عقب میں واقع تھی۔

یہ تمام معلومات دانیال نے بڑی آسانی سے حاصل کرلی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے کوہ کو عبور کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ کام آسان تھا یا مشکل لیکن بہرحال ان لوگوں کو اب برفانی پہاڑیوں کا سفر درپیش تھا۔ دانیال نے فی الفور تیاریاں شروع کردیں۔ اس نے آرقان، اور اس کے بیوی بچوں کو برقہ پر واپس بھیج دیا تاکہ برقہ جیسے قیمتی جہاز کو صرف بھاڑے کے مزدوروں کے رحم وکرم پر ہی نہ چھوڑا جائے۔

دانیال پوری دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مشکل سفر کی تیاری میں مشغول ہوگیا۔ اسے کسی ایسے رہبر کی تلاش تھی جو یا تو کوہ مغرب کا رہنے والا ہو اور یا کوہ مغرب کے طویل پہاڑی راستوں، قصبوں اور وادیوں سے واقف ہو۔ بغیر رہبر کے وہ اس دشوار گزار سفر پر جانے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ وہ دن بھر کسی اچھے انسان کی تلاش کرتا...... جو کوئی، جہاں بتاتا، وہاں چلا جاتا۔ اور اسی طرح کے ایک دن، جب وہ...... ''للیتا'' کے شراب خانے پہنچا تو اس کے ساتھ ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔

ہوا یہ کہ اسے کسی نے بتایا ''تم للیتا کے شراب خانے چلے جاؤ! وہاں تمہیں تمہارے مطلب کا آدمی مل جائے گا۔'' اور جب وہ شراب خانے پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں ایک ہنگامہ جاری تھا۔ شاید ابھی ابھی کوئی لڑائی ہوئی تھی۔ کچھ غنڈے شراب خانے میں دندناتے پھر رہے تھے۔ کچھ ملازم پیشہ لوگ نیچے زمین پر اوندھے منہ پڑے مٹی چاٹ رہے تھے۔ اور باقی تماشائی تھے۔ شراب کی صراحیاں الٹی ہوئی تھیں اور شراب پتھریلے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والے غنڈے شراب خانے کے عملے سے بار بار کسی شخص کا نام اور پتہ پوچھ رہے تھے۔ لیکن وہاں شاید اس شخص کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ دانیال نے ان کا مکالمہ غور سے سنا تو دنگ رہ گیا۔ ان کی گفتگو سن کر اسے پتہ چلا کہ وہ کسی قزاق کو تلاش کررہے تھے، جس کا نام شارق تھا۔ دانیال کی آنکھوں کے سامنے مارفیس جزیرہ کے تمام حالات و واقعات گھوم گئے۔ لیکن شارق کو یہاں شہر رومہ میں ڈھونڈنے کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ یہاں موجود تھا؟ اور یہ غنڈے اتنی شدت کے ساتھ اسے کیوں تلاش کررہے تھے۔ وہ چپ چاپ کھڑا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ ایک عجیب الہیبت غنڈہ بار بار با آواز بلند شارق کا نام لیتا اور کہتا۔

"کوئی ہے جو اسے جانتا ہو۔ ہم اسے منہ مانگا انعام دیں گے۔ جو ہمیں قزاق شارق کا پتہ بتائے گا۔"

دانیال نے دیکھا کہ وہ لوگ جزیرہ مارفیس کے نہیں لگتے تھے۔ وہ خاص رومی النسل لوگ تھے۔ البتہ ان کے حلیے سمندری قزاقوں سے مختلف نہیں تھے۔ معاً دانیال کے کانوں میں اس عجیب الہیت شخص کی آواز پھر گونجی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"رومی امیر البحر کو...... اس خطرناک قزاق شارق کی تلاش ہے۔ ہم رومی بحریہ کے لوگ ہیں اور تمہیں آخری بار کہتے ہیں کہ ہمیں اس قزاق کا پتہ بتا دو جو آج صبح تک اس شراب خانے میں مقیم تھا۔ وہ قرطاجنہ کا جاسوس ہے اور جو کوئی اسے پناہ دے گا، وہ بہت بری موت مارا جائے گا۔"

بات کرنے والے کی آواز بہت بھاری تھی۔ دانیال کو یہ ماجرا نہایت عجیب لگا۔ وہ شارق کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن اسے یہ معاملہ اس لیے عجیب لگ رہا تھا کہ شارق کا یہاں شہر رومہ میں کیا کام؟ وہ تو اپنے جزیرے پر ہوگا۔ آخر یہ غنڈے اسے یہاں کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اور پھر یہ بات کہ یہ لوگ رومی بحریہ کے سپاہی تھے، بھی عجیب تھی۔ کیونکہ یہ تمام غنڈے شکل وصورت سے مکمل طور پر ڈاکو، لٹیرے یا اچکے لگتے تھے۔ ان میں بحریہ کے سپاہیوں والی شان وشوکت کی بجائے سمندری ڈاکوؤں والی بدخلقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔ بڑی مونچھوں والے غنڈے نے شراب خانے کے مالک کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے قزاقوں والے کلہاڑے کے وار سے شراب خانے کے مالک کی ران پر زبردست گھاؤ لگا دیا تھا۔ زخمی کی چیخوں سے دیکھنے والوں پر عجیب ہیبت چھا رہی تھی۔ لیکن بڑی مونچھوں والا غنڈہ بدستور ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"آج صبح تک شارق یہیں تھا۔ اسی شراب خانے میں مقیم تھا۔ اگر تم لوگوں نے اس کا پتہ نہ بتایا تو ایک ایک کا خاتمہ کر دوں گا۔"

"میں یہاں ہوں...... گھٹیا غنڈے!"

یکایک دانیال کے کانوں میں ایک مانوس آواز پڑی۔ اور سارے کے سارے تماشائی اندرونی دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہاں ایک خوبصورت نوجوان موجود تھا۔ یہ

شارق تھا۔ دانیال اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا۔ ”تم نے یہاں جو توڑ پھوڑ کی اور جن لوگوں کو زخمی کیا...... اس کا حساب تمہیں ابھی کے ابھی دینا پڑے گا۔ شارق کے لہجے میں عجب بے خوفی اور کمال کا دبدبہ تھا مجمع میں موجود ہر شخص شارق کی آمد پر دنگ رہ گیا۔ بڑی مونچھوں والے غنڈے نے شارق کو دیکھا تو یکدم اکڑ گیا اور بے ساختہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ وہ غنڈوں کے مخصوص بھونڈے انداز میں مسکرا بھی رہا تھا۔

”اچھا تم ہو شارق۔ تمہاری جان لیتے ہوئے مجھے دکھ ہوگا۔ کیونکہ تم ایک خوبصورت نوجوان ہو لیکن کیا کروں یاری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں مجبور ہوں دوست!“

اب بڑی مونچھوں والے غنڈے کے باقی ساتھی بھی ادھر ادھر سے توجہ ہٹا کر اپنے سردار کے گرداگرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ تعداد میں گیارہ تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی خطرناک ہتھیار تھا۔

شراب خانے کے فرش سے شراب کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔ شراب خانے میں ناچنے والی پیشہ ور رقاصائیں ایک طرف سہمی کھڑی تھیں۔ عام شرابی جو یہاں روز کے روز شراب پینے آتے تھے، حیرت بھری نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ تمام چہرے انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ شارق آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا بڑی مونچھوں والے غنڈے کے نزدیک آ رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ لیکن اس کی چال میں غضب کا اعتماد تھا۔ شراب خانے کا تمام عملہ ہکا بکا ہو کر اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ توڑ پھوڑ کرنے والے غنڈوں نے جس شخص کا مطالبہ کیا تھا وہ خود چل کر ان کے سامنے آ گیا تھا۔

شارق کو حیرت تھی کہ آخر بڑی مونچھوں والے غنڈے نے کس کی یاری کا ذکر کیا تھا۔ اس نے تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔

”تم کس کے یار ہو، جس کی یاری نے تمہیں یہاں اس قدر ہنگامہ کرنے پر مجبور کیا؟ تم نے کچھ دیر پہلے کوناڈس، امیر البحر کا ذکر کیا تھا، کیا تم اس کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاہاہا...... ہاہاہا......“

بڑی مونچھوں والا غنڈہ قہقہے لگانے لگا۔ اس کی آواز پورے شراب خانے کی عمارت میں گونج رہی تھی۔ اس نے کافی دیر تک قہقہے لگانے کے بعد کہا۔

”تم ”ماگوشال“ کو جانتے ہو؟...... میں ماگوشال کی بات کر رہا ہوں۔“

کافی دیر تک قہقہے لگانے کے بعد بڑی مونچھوں والے غنڈے نے کہا تو دانیال نے شارق کو بری طرح چونکتے دیکھا۔

''کک کیا؟؟...... تم ماگوشال کی بات کر رہے ہو۔ وہ سردار جیدان کا بڑا بیٹا؟''

''ہاہاہا...... ہاہاہا...... کیوں؟؟؟...... نکل گئی ناں جان...... ہاہاہا...... ماگوشال کا نام سن کر تمہاری...... روح کانپ گئی...... ہاہاہا۔''

سردان جیدان کا بیٹا بیٹا؟؟؟...... دانیال خود سوچ میں پڑ گیا۔ اب صورتحال کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ لیکن بڑی مونچھوں والے غنڈے نے پہلے تو کہا تھا کہ وہ رومی بحریہ کا آدمی ہے۔ اچھا تو اس نے جھوٹ بولا ہوگا۔ ہوں۔ دانیال کی سوچوں کا دھارا تیزی سے بہنے لگا۔ اسی اثنا میں دانیال کو شارق کی آواز سنائی دی۔

''تم کیا جانتے ہو؟؟...... بلکہ سردار جیدان کا بڑا بیٹا، ماگوشال مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

''تمہاری جان! ہاہاہا...... ہاہاہا''

''میری جان؟؟...... مگر کیوں؟؟...... میرا جرم کیا ہے؟''

شارق کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ دانیال بھی ابھی تک ششدر کھڑا تھا اور باقی تمام تماشائی بھی کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے۔ بڑی مونچھوں والے غنڈے نے پھر کہا۔

''تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے سردار جیدان کے مہمانوں کو یرغمال بنا کر پورے مارفیس جزیرے پر ماگوشال کے باپ کی توہین کی ہے۔ اگر جزیرے کے امن کو خطرہ نہ ہوتا تو تمہیں وہیں مروا دیا جاتا۔'' شارق پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ سردار جیدان اس کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ قزاقوں کے کچھ اصول تھے اور وہ اپنے اصول کبھی نہ توڑتے تھے۔ سردار جیدان نے جزیرے کی مجلس مشاورت طلب کر کے، شارق پر جو الزامات لگائے تھے، ان کے نتیجے میں شارق کو مارفیس کا جزیرہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ بس معاملہ ختم۔ لیکن اب یہ لوگ سردار جیدان کے بیٹے کا نام لے کر اس کی جان لینے آئے تھے۔ اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے ایک بار مجمع کی طرف دیکھا اور پھر سوال کیا۔

''کیا تمہیں خود سردار جیدان نے حکم دیا ہے؟ اور تم لوگ ہو کون؟؟؟ میں نے اپنے جزیرے پر تم لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہم ادھر کبھی نہیں گئے۔ لیکن ماگوشال میرا یار ہے۔ اسی نے مجھے تمہاری جان لینے کیلئے کہا۔ اس کے بڈھے باپ کو تو شاید اس بات کی خبر ہی نہیں۔''

اب شارق پورا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ اسے پتہ چل گیا کہ ماگوشال نے اپنے طور پر شارق کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ شارق سردار جیدان کے بڑے بیٹے ماگوشال کے گندے ذہن سے واقف تھا۔ شارق تو جزیرہ چھوڑ کر روم چلا آیا تھا لیکن ماگوشال کے آدمی اس کے پیچھے لگ چکے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے جاسوس خود شارق کے جہاز پر موجود تھے۔ لیکن شارق ان کی موجودگی سے لاعلم رہا تھا۔ اب شارق کو ساری حقیقت سمجھ آ گئی تھی۔ تب اس نے یکدم اپنا لہجہ بدل لیا۔

''تو پھر ٹھیک......تم اپنی پوری کوشش کر کے دیکھو!......اور جب ناکام ہو جاؤ تو اس توڑ پھوڑ کا ہرجانہ ادا کر کے چلے جانا۔''

شارق کے لہجے میں موجود بلا کا اعتماد دیکھ کر دانیال سچ مچ عش عش کر اٹھا۔ بڑی مونچھوں والے غنڈے نے شارق کی آخری بات سنی تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر زور سے کہا۔

''ختم کر دو اسے، بچنے نہ پائے۔''

اچانک بہت سے غنڈے شارق کی طرف لپکے۔ ان سب کے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار تھے۔ دانیال کو یوں لگا، جیسے وہ آن واحد میں شارق کی تکا بوٹی کر دیں گے۔ اب وہ مزید چپکا کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی شمشیر برہنہ کی اور شارق کی مدد کیلئے آگے بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میدان میں اترتا وہ شارق کی پھرتی اور داؤ دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ تو وہ تماشائیوں میں سے ہر ایک کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''واہ''

شارق نے سامنے سے آنے والے غنڈوں کو وار کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ خود لپک کر آگے بڑھا اور جونہی وہ مسلح غنڈوں کے نرغے میں پہنچا۔ یکا یک زمین پر بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے اس کی دائیں لات پوری قوت سے گھومی اور ایک غنڈے کی ٹانگوں کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہ ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا دھڑام سے نیچے گرا۔ لیکن شارق کی لات نہ رکی وہ ایک ہی لمحے میں دوبارہ گھومی اور دوسرے غنڈے کو گرا دیا۔ اسی اثنا میں اوپر سے اس پر غنڈوں کے خطرناک ہتھیار گرے، مگر وہ صاف بچ گیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے خود کو تمام واروں کے

نیچے سے ایک طرف نکال لیا اور دوبارہ حرکت میں آ گیا۔ جن دو غنڈوں کو اس نے نیچے گرا لیا تھا وہ پھر کھڑے ہو گئے۔ معاً دانیال کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے با آواز بلند شارق کو پکارا:۔

"شارق!...... یہ لو"

شارق نے آن واحد میں دانیال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت کی جھلک نظر آئی اور دوسرے مرحلے میں وہ دانیال کا مدعا سمجھ گیا۔ دانیال اسے تلوار دینا چاہتا تھا۔ شارق نے "ہاں" کہنے کے انداز میں سر ہلایا اور دانیال نے اپنی شمشیر شارق کی طرف پھینک دی۔ تلوار ہوا میں کسی پرند کی طرح اڑتی ہوئی شارق تک پہنچی اور اس نے جھپٹ لی۔ دانیال کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ آخر شارق اتنے غنڈوں کے سامنے یوں نہتا ہو کر کیوں چلا آیا تھا۔ شارق نے شمشیر اچک لی اور اب تو وہ رعد و صاعقہ بن چکا تھا۔ پھرتیلا پن تو اس کا خاصا تھا ہی۔ اب اس کے ہاتھ شمشیر لگی تو اس کی رفتار میں بھی بجلی بھر گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے غنڈوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ بڑی مونچھوں والا قزاق دور کھڑا اپنے ساتھیوں کی درگت پر تاؤ کھا رہا تھا۔ شارق، ان کو تھکا تھکا کر مارنا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ شہر رومہ میں کسی کا قتل نہ کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ اب تک اس نے ان میں سے تین چار کو تو گرا دیا ہوتا۔ یکایک دانیال کو ایک اچھوتا خیال سوجھا۔ اس نے ایک نظر شراب خانے کے ملازموں پر ڈالی جو کچھ فاصلے پر دیوار کے سامنے کھڑے اس عجیب اور بے جوڑ جنگ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اور پھر اگلے لمحے دانیال ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ عملے کے نزدیک آیا اور کسی قدر تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔

"تمہارے شراب خانے کی توڑ پھوڑ کا حساب لینے کیلئے وہ اکیلا لڑ رہا ہے اور تم سب یہاں کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو۔ اس لڑائی کے ختم ہوتے ہی مالک تمہیں نوکری سے نکال دے گا۔ کیونکہ تم لوگ نکمے ہو۔ وہ دیکھو!...... تمہارا مالک زخم کی وجہ سے بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔" شراب خانے کے ملازموں کی تو جیسے آنکھ کھل گئی۔ اچانک انہیں اپنا اپنا غصہ بھی یاد آ گیا۔ آخر ان غنڈوں نے پہلے انہی کو تو پیٹا تھا۔ وہ سب کے سب پہلے تو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر ان میں سے ایک نے اپنی تلوار سنبھالی اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ پھر کیا تھا؟...... شراب خانے کے تمام ملازم...... جس کے ہاتھ جو اسلحہ آتا...... جنگ

میں شریک ہو جاتا۔ دانیال کی حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی اور میدان جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اتنے سارے مسلح لوگوں کو دیکھ کر غنڈوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ حملہ کرنے کی بجائے دفاعی انداز میں لڑنا شروع ہو گئے۔ غنڈوں کے سردار کی حالت بھی دیکھنے والی ہو گئی۔ اب اسے اپنی موت یا گرفتاری صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اچانک چلایا۔

''بھاگو!......نکل بھاگو......اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

اندھا کیا مانگے دو آنکھیں...... سردار کے منہ سے ''بھاگو'' کے الفاظ نکلے تو تمام غنڈے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور شراب خانے سے یوں غائب ہوتے گئے گویا گدھے کے سر سے سینگ۔ عملے کے لوگ ان غنڈوں کو یوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا دیکھتے اور ان کے پیچھے قہقہے لگاتے رہے۔ ہنگامہ فرو ہو چکا تھا۔

اور پھر کچھ دیر بعد حالات یکسر بدل چکے تھے۔ الٹی ہوئی کرسیاں اور میزیں دوبارہ درست کی جانے لگیں۔ فرش پر سے شراب صاف کی جارہی تھی۔ اور شراب خانے کے مالک کو فوری طبی امداد کیلئے خصوصی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ شارق کی وجہ سے ان لوگوں کا نقصان تھا۔ اس لیے وہ اس نقصان کا ہرجانہ دینے کی بابت سوچنے لگا۔ لیکن اسے ابھی تک دانیال کی اچانک امداد پر حیرانی تھی۔ وہ جنگ کے ختم ہوتے ہی دانیال کو ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ لیکن اسے حیرت ہوئی تھی کیونکہ دانیال اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ چنانچہ شارق شراب خانے کے فرش پر کھڑا ابھی تک متفکر تھا۔ معاً کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں نے ان کے نقصان کی بھرپائی کردی۔ شراب خانے کا مالک تو رقم لینے سے انکار کررہا تھا اور تمہارا بہت بہت شکریہ بھی ادا کر رہا تھا۔ لیکن میں نے زبردستی اسے پیسے دے دیئے۔ آؤ کہیں باہر چل کر بات کرتے ہیں۔''

یہ دانیال تھا۔ شارق نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پھر تھوڑی سی جھجھک کے بعد گلے سے لگا لیا۔ اب وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

''آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟ معزز مہمان!!''

''معزز مہمان...... یا...... معزز قیدی؟''

دانیال نے شارق کی بات کا جواب طنزومزاح کے انداز میں دیا۔ شارق تھوڑا سا

شرمندہ ہوا اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا:۔

"وہ تو محض ایک اتفاق تھا۔ میں آپ لوگوں کو قیدی بنا کر رکھنے والا نہیں تھا۔ دراصل آپ لوگوں کے جہاز کو دیکھتے ہی میری رگ قزاقی پھڑک اٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر پھر لوٹ لوں گا۔ لیکن آپ کی ساتھی لڑکی نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اسی لیے تو میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔"

شارق نے فراخدلی سے اعتراف جرم کیا اور دانیال کو بتایا کہ وہ اب قزاقی کا پیشہ ترک کر چکا ہے۔ یہ سن کر دانیال کو اور بھی خوشی ہوئی۔ اس نے بلا تامل کہا۔

"اچھا!!!...... تو یہ بات ہے۔ تو پھر تم ہمارے ساتھ کام کیوں نہیں کرتے۔ تم بہادر ہو، مہم پسند ہو اور پھر سب سے بڑی بات کہ دل سے ایک اچھے انسان ہو۔ اگر تم ہمارے ساتھ چلو تو "یہواہ" کی قسم ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔"

دانیال نے بے ساختہ اپنی سابقہ خواہش کا اظہار کر دیا۔ حالانکہ وہ ابھی ابھی دوبارہ ملے تھے۔ اور دانیال خود اس سے ابھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ یہی حال شارق کا بھی تھا۔ لیکن دانیال نے سب باتوں کو بعد میں دیکھیں گے...... کا رویہ اپناتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کر دی۔ شارق اس اچانک سوال سے سٹپٹا گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش نگاہوں سے دانیال کے چہرے کو تکتا رہا اور پھر اس نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن کیا یہ جلد بازی نہ ہوگی۔ ہمیں ایک دوسرے سے اچھی طرح بات کر لینی چاہیے۔"

دانیال مسکرا دیا۔

"مجھے تو مزید بات کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ تم چاہو...... تو جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔"

شارق دل ہی دل میں خوش ہوا، اس طرح وہ اس لڑکی کے نزدیک رہ سکتا تھا۔ جس نے اس کو مردانگی کا اصلی روپ دکھایا تھا۔ وہ بے اختیار کہنے لگا۔

"نہیں نہیں...... مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ میں تو آپ کی تسلی کے لیے کہہ رہا تھا۔ بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا...... آپ کے ساتھ۔"

"کچھ بھی نہیں۔ بس ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ اس لڑکے کی تلاش میں، جسے ہم ڈھونڈ

رہے ہیں۔"

دانیال نے اسے مختصراً بتایا۔ شارق نے حامی بھرلی۔ تب دانیال نے اسے کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم مزید باتیں کرسکتے ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

شراب خانے سے تو وہ کب کے باہر آچکے تھے۔ اور سڑک پر چل رہے تھے۔ دانیال، شارق کو لے کر شہر کے بیچوں بیچ موجود اہل مجلس کی جلسہ گاہ میں آ گیا۔ یہ ایک خوبصورت اور کھلا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے چاروں طرف آدمی کے قد سے اونچی چاردیواری تھی۔ یہاں رومہ کی مجلس شوریٰ کے ارکان بوقت ضرورت عوام سے خطاب کیا کرتے۔ میدان کے فرش پر نہایت عمدہ اور نفیس سبزہ ریشم کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ دونوں سرسبز فرش پر بیٹھ گئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ اس سبزہ زار میں اور بھی لوگ گھوم رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے شہریوں کی تفریح گاہ تھی۔ جہاں گھوڑوں کو دوڑانے کے لیے الگ الگ سڑکیں، سبزے کے بیچوں بیچ سے ہوکر گزرتی تھیں۔ دونوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تو دانیال نے چاروں طرف موجود لوگوں پر نظر دوڑائی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر شارق کی طرف متوجہ ہوا۔

"دیکھو شارق!...... ہم نے یہاں آ کر معلومات لی ہیں تو ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا مطلوبہ نوجون کوہ مغرب کے علاقے میں ہے۔ اسے یہاں روم کے بازار میں بطور غلام فروخت کیا گیا۔ اور کسی فلطی ساہوکار نے اسے بھاری رقم کے عوض خریدا۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو کوہ مغرب کی وادی برف تک ہماری رہنمائی کرے۔"

"وادی برف؟؟..... وہ تو بہت خوفناک علاقہ ہے۔ کیا آپ لوگ وادی برف جانا چاہتے ہیں؟" شارق کے لہجے میں دانیال نے حیرت اور ہچکچاہٹ دیکھی تو کہنے لگا۔

"کیا تم وادی برف کی طرف جاتے ہوئے گھبراتے ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر میں نے غلط جگہ کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ مشکل مہم بھی تمہارے لیے کوئی معانی نہیں رکھتی ہوگی۔"

دانیال کو مایوسی تھی لیکن اس کی مایوسی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ شارق نے کسی قدر سخت لہجے میں دانیال کو مخاطب کیا۔

"معزز مہمان! آپ کو بات کرتے ہوئے کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میں وہاں جاتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ کیا میں نے ایسا کچھ کہا؟ میں نے تو آپ

کے اور آپ کے ساتھیوں کے خیال سے اس طرح بات کی تھی۔ میں قلطی ساہوکاروں کو جانتا ہوں۔ وہ آپ کے ہمراہ موجود لڑکیوں کو دیکھ کر پاگل ہو جائیں گے اور آپ کے لیے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ پھر بھی چاہتے ہیں کہ وہاں جایا جائے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اب دانیال کی تسلی ہو گئی تھی اس نے پھر شاق سے بات شروع کر دی۔

"ہاں تو کیا تم کسی ایسے...... شخص کو جانتے ہو جو یہاں سے کوہ مغرب کی وادی برف تک ہماری رہنمائی کرے؟...... ہم کئی دن سے محض اس لیے رکے ہوئے ہیں کہ ہمیں کوئی اعتماد کا شخص نہیں مل رہا۔"

شارق کا ذہن تیزی سے مختلف لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ جنہیں وہ شہر رومہ میں جانتا تھا۔ دانیال کا خیال درست تھا کہ شارق ضرور ایسے کسی شخص کو جانتا ہوگا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد شارق نے کہا۔

"عمید ون سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ بھی ایک قلطی باشندہ ہے۔ لیکن وہ ساہوکار نہیں۔ وہ جب سے رومہ آیا یہیں بس گیا۔ دو تین سال میں ایک آدھ بار وطن واپس جاتا ہے۔ میری اس سے دوستی، مارفیس میں ہوئی تھی۔ وہ ہمارے جزیرے پر کچھ سامان خریدنے کیلئے آیا تھا۔"

دانیال ابھی اس کے بارے میں اور بھی کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن اس کے پوچھنے سے پہلے ہی شارق نے بتانا شروع کر دیا۔

"وہ ایک اچھا انسان ہے۔ دھوکا نہیں دے گا۔ بالکل تم لوگوں جیسا ہے۔ باتیں بہت کرتا ہے، لیکن فضول نہیں بولتا۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر ہوگی۔ بال بچے دار ہے، خوشحال ہے۔ ہم اس کی خدمت میں درخواست کر سکتے ہیں اسے کوئی لالچ نہیں دے سکتے۔"

دانیال کو "عمید ون" کا تعارف پسند آیا۔ اس نے شارق سے فوراً کہا۔

"پھر تو بہت اچھا ہے۔ چلو چل کر اس سے بات کرتے ہیں۔"

دانیال اب مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے ہر روز رات کو بستر پر قرطاجنہ کی کنواری یاد آ جاتی تھی۔ جس نے اسے نہایت عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں میں

کوئی ایسی بات تھی کہ دانیال، انہیں آج تک نہیں بھلا نہ سکا۔ وہ ایک بار قرطاجنہ کی کنواری سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قرطاجنہ تیزی کے ساتھ جنگ کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ دانیال جنگ سے پہلے قرطاجنہ واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اب وہ اپنی آموسا کو تلاش کرنے کی بجائے صرف سنتوش کی بازیابی میں ہی لگ گیا تھا۔ کہیں اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ اس کی آموسا اسے قرطاجنہ میں ہی ملے گی۔ وہ قرطاجنہ واپس جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی اس کے سفر کا اصل مقصد باقی تھا۔ اور وہ تھا سنتوش کی تلاش۔ حقیقت میں تو سنتوش کی تلاش وہ اضافی وعدہ تھا جو اس نے اپنی زرخرید کلاڈینا کے ساتھ کیا تھا۔ ورنہ کلاڈینا کو روم تک پہنچا کر اس کی اخلاقی ذمہ داری پوری ہو چکی تھی۔ شیتل ہر وقت اپنے دل پر دانیال کے احسانات کا بوجھ لے کر یہ سوچتی رہتی کہ سنتوش کی تلاش اس کی اپنی ذمہ داری تھی جو اس نے دانیال اور کلاڈینا کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ لیکن کلاڈینا ہر بار اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیتی کہ دانیال سنتوش کے ساتھ ساتھ اپنی محبت ''آموسا'' کو بھی ڈھونڈ رہا ہے۔ حالانکہ دانیال نے روم کے شہر میں بھی اتنی شدت کے ساتھ آموسا کے بارے میں نہ پوچھا جتنی تندہی کے ساتھ وہ سنتوش کا سراغ لگا رہا تھا۔ اور پھر اسے سراغ مل گیا۔

شارق اور دانیال لوگوں سے پوچھتے پچھاتے بالآخر فلسطی تاجر عمیدون کے گھر آ پہنچے اور یہ اتفاق تھا کہ عمیدون گھر پر ہی مل گیا۔ اس نے شارق کو پہچان کر تپاک کا اظہار کیا اور اسے لے کر اپنے مہمان خانے میں آ گیا۔

''ہاں...... اب کہو!...... شارق!...... کیا معاملہ ہے۔ لگتا ہے اس بار تم کسی کام سے آئے ہو۔''

''ہاں! ٹھیک پہچانا۔ میں اس بار واقعی کسی کام سے آیا ہوں۔''

''کہو کہو! مجھے خوشی ہو گی تمہارے کام آ کر۔''

تب شارق نے عمیدون کے سامنے سارا قصہ کہہ دیا۔ اس عرصہ میں دانیال خاموش بیٹھا رہا۔ جس وقت عمیدون کو شارق یہ قصہ سنا رہا تھا۔ اس وقت دانیال نہ جانے کیوں بار بار عمیدون کی طرف دیکھ کر یہ سوچنے لگتا کہ عمیدون سردار پولابیکس کو ذاتی طور جانتا ہے اور پھر وہی ہوا، جب قصہ تمام ہوا تو عمیدون نے شارق اور دانیال کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں سارا معاملہ سمجھ گیا ہوں۔ میں سردار پولابیکس کو ذاتی طور پر جانتا ہے اور میں

نے اس غلام لڑکے کو بھی دیکھا ہے، جسے پولابیئس نے بولی کے دوران خریدا۔لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ قلطی، سرداروں میں خوبصورت لڑکوں کو رکھنا دستور ہے۔اور جو کوئی نیا لڑکا لے کر آتا ہے اس کی شان بڑھتی ہے۔ایسی صورتحال میں ان کا سر چلا جائے تو جانے دیتے ہیں۔لیکن لڑکا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔اوپر سے ستم یہ ہے کہ سردار پولابیئس نہایت کینہ پرور انسان ہے۔اسے اگر ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ میں نے آپ لوگوں کا ساتھ دیا یا آپ کی کچھ مدد کی ہے تو وہ میرے بوڑھے والدین اور بہن بھائیوں کو زندہ جلا دے گا۔اس لیے میں تو آپ لوگوں کے کسی کام نہیں آ سکتا۔اور نہ ہی پولابیئس کیخلاف آپ کو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں۔"

شارق اور دانیال، عمیدون کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے۔اس نے تو دوٹوک الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان کا ساتھ نہ دیتا۔دانیال کے شاطر دماغ نے تو یہاں تک بھی سوچ لیا تھا کہ عمیدون مدد تو ایک طرف ان کی مخالفت کرتے ہوئے سردار پولابیئس کو قبل از وقت ان کی آمد کی اطلاع بھی پہنچا دے گا۔دانیال دل ہی دل میں پریشان ہوگیا۔اس نے شارق کی طرف دیکھا، پھر عمیدون کی طرف دیکھا، پھر شارق کی طرف دیکھا اور پھر وہ بات کہہ دی جسے کہتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔اس نے کہا۔

"شارق! تمہارا دوست اچھا ہے۔اس نے صاف انکار کر دیا کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔لیکن یہ اس وقت اچھا نہیں ہوگا جب ہمارے پہنچنے سے پہلے سردار پولابیئس کو ہماری آمد کی خبر مل جائے گی۔"

شارق نے اس نقطے اور اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔معاً اسے بھی عمیدون کے رویے سے ایسی ہی بو آنے لگی۔ سچ مچ وہ ایسا کر سکتا تھا۔شارق اسے جانتا تھا اور پھر سردار پولابیئس تو اس کا ہم وطن بھی تھا۔معاً شارق کے اندر موجود قزاق نے انگڑائی لی اور اس نے عمیدون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے دانیال سے کہا، اصل میں وہ مخاطب تو دانیال کو کر رہا تھا لیکن اس کا روئے سخن عمیدون کی طرف ہی تھا۔اس نے کہا تھا۔

"دانیال! تمہارے نزدیک ایسی قوم کی کیا سزا ہو سکتی ہے جو عورت کی بجائے لڑکوں سے جنسی فعل کی عادی ہو؟"

عمیدون کے پلے کچھ نہ پڑا کہ شارق ایسی بات کیوں پوچھ رہا ہے۔ وہ خاموش

رہا۔ دانیال نے شارق کی بات کا جواب دیا۔

"ہمارے مذہب میں ایسے گنہگار کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ یعنی پتھر اور کنکروں کی بارش کر کے جان سے ہی مار دیا جاتا ہے۔"

عمیدون کی روح کانپ گئی۔ حالانکہ وہ خود امرد پرست نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ڈر گیا۔ شارق کے لہجے میں تلخی ہی اتنی تھی کہ عمیدون خوفزدہ ہو گیا۔ تب شارق نے براہ راست عمیدون سے بات کی۔

"سنو! تم میرے اچھے دوست ہو، ہم ایک عرصے سے ایک دوسرے کو مل رہے ہیں۔ میری ایک بات غور سے سنو! ہماری بابت سردار پولا بیکس سے کوئی بات نہ کرنا۔ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔ اگر وہاں تمہارے والدین اور بہن بھائیوں کو خطرہ ہے تو یہاں رومہ میں تمہارے بیوی بچوں کو خطرہ ہے۔ بہتر ہے تم اس معاملے کو بھول جاؤ۔ ہم جانیں ہمارا کام۔"

عمیدون اکھڑ مزاج شارق کو اچھی طرح سے جانتا تھا وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح سر ہلانے لگا، اس نے فوراً کہا۔

"میں سمجھتا ہوں، شارق تم فکر مت کرو! یہ بات مجھ تک ہی رہے گی۔ لیکن میں تمہیں اتنا بتا دوں تمہارا ساتھ کوئی بھی قلطی نہیں دے گا۔ چاہے تم انہیں کتنی بھی دولت کا لالچ دے دو۔ وہاں زمرد کی کانیں ہیں اور قلطی باشندے دھن دولت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔"

بظاہر شارق اور دانیال کے لیے یہ صورتحال لانیحل تھی۔ لیکن پھر بھی شارق نے واپسی پر دانیال کو تسلی دی اور کہا۔

"ہم ابھی ہمت نہیں ہاریں گے۔ ہم اور لوگوں کو آزمائیں گے۔ اور اگر بغرض محال کوئی راضی نہیں ہوا تو پھر ہم "وادیٔ برف" کی طرف چل پڑیں گے۔ کیا ہم ازخود نہیں جا سکتے؟"

شارق کی بات معقول تھی۔ دانیال نے جواب میں سر ہلایا۔ اور وہ دونوں واپس بازار کی طرف پلٹ گئے۔ شام ہونے والی تھی۔ اور اندھیرا چھانے کے بعد ان کا کہیں نکلنا ویسے بھی درست نہیں تھا۔ چنانچہ دانیال، شارق کو لے کر اپنی سرائے چلا آیا۔

سرائے میں دانیال اور کیدارا کے لیے الگ کمرہ تھا۔ اور شیتل اور کلاڈینا کے لیے الگ۔ دانیال، شارق کو اپنے کمرے میں لے کر داخل ہوا تو کمرے میں موجود کیدارا اچھل کر

کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مارفیس جزیرے کا قزاق، جس نے انہیں گرفتار کیا تھا اور جس کے ساتھ کیدارا کی جنگ ہوئی تھی یوں، ان کے پیچھے روم اور حتیٰ کہ ان کے کمرے تک چلا آئے گا۔ کیدارا نے سوال پوچھنے کے انداز میں دانیال کی طرف دیکھا۔ تو دانیال نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

"کیدارا!...... شارق اب ہمارا دوست ہے۔ اسے ہماری وجہ سے اپنا جزیرہ چھوڑنا پڑا۔ یہ جزیرہ بدر ہو کر یہاں چلا آیا۔ اب یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

کیدارا عجیب عجیب نظروں سے شارق کی جانب دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور شارق سے سلام لیا۔ دانیال نے پھر کہا۔

"نہیں کیدارا اس طرح نہیں، دوستوں کی طرح ملو! شارق اب ہمارا دوست ہے۔"

کچھ دیر گزری تو دوسرے کمرے سے شیتل اور کلاڈینا بھی آ گئیں۔ دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہوں نے ناگواریت سے شارق کی جانب دیکھا تو شارق کو دھچکا لگا۔ وہ اپنی جذباتی کیفیت ضبط کر کے نہایت خلوص سے کہنے لگا۔

"آپ لوگوں کو میری وجہ سے دکھ پہنچا۔ لیکن اب میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔"

اس کا خاص روئے سخن...... کلاڈینا کی طرف تھا۔ کلاڈینا کے چہرے پر یک لخت سرخی چھا گئی۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی، لیکن سرخ چہرہ اور حیرت بھری نظروں سے شارق کو تکتی رہی اور پھر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو گیا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری

سنتوش کو یہاں آئے ہوئے آج دو ماہ ہونے والے تھے۔ وہ سردار پولا بیکس کی قید میں تھا۔

قید خانہ کیا تھا۔ بس ایک نہایت خوبصورت رہائش تھی۔ جہاں وہ صرف ایک ہی کام کے لیے پالا جارہا تھا۔ اور وہ تھا سردار پولا بیکس کی ہوس کو پورا کرنا۔ کیسا اندھیر تھا ایک نو عمر مرد کو کسی داشتہ کی طرح استعمال کیا جارہا تھا۔ قبل مسیح کی صدیوں میں یہ قباحت اپنے عروج پر تھی۔

چند صدیاں قبل شہر سدوم کے لوگوں کو خدا کے عذاب نے آلیا تھا۔ وہ قوم تباہ کردی گئی تھی۔ اور ان کی بستیاں الٹ دی گئی تھیں۔ وہاں حضرت لوطؑ کی قوم آباد تھی۔ جو اپنی عورتوں کو بھلا کر نوعمر لڑکوں کے ساتھ جنسی فعل کرنے کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ انہوں نے لوطؑ کے مہمان فرشتوں کو بھی معاف نہ کیا۔ لوطؑ ان کی منتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے اس محترم نبی نے کہا کہ میری بیٹیوں سے شادیاں کرلو! لیکن میرے مہمانوں کو کچھ مت کہو۔ یہ خدا کے فرشتے ہیں۔ مگر لوطؑ کی قوم نہ مانی۔ وہ آپ کے گھر میں گھس آئے اور چاہا کہ ان مہمانوں کے ساتھ بدفعلی کریں لیکن وہ تو اللہ کے فرشتے تھے۔ اس لیے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا اور لوطؑ کی پوری بستی کو عذاب شدید کا مزہ چکھایا۔"

قبل مسیح کی صدیاں لواطت کے حوالے سے اس قدر آلودہ تھیں کہ پھر کبھی ان کی مثال قائم نہ ہوسکی۔ یہ بہت مشکل دور تھا۔ اور سنتوش بے چارہ اسی دور میں پھنس گیا تھا۔

وہ جس پہاڑی پر قید تھا، یہ بہت پرفضا پہاڑی تھی۔ یہاں برف نہیں تھی بلکہ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ تا حد نگاہ حسن ہی حسن تھا۔ یہ ایک پھولوں اور سبزے سے لدی پہاڑی تھی۔ جس کے بڑھے ہوئے پیٹ پر چنار اور دیودار کے درخت بہت کم کم فاصلے پر گویا

ایک گھنے جنگل کی صورت اگے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے سینے پر کھڑے ہوں تو سامنے کی پہاڑی کا منظر گویا جنت کا نظارہ تھا۔ نیچے گہری کھائی تھی اور سامنے دوسری سرسبز پہاڑی تھی۔ گھنے، چنار کے درختوں میں سفید برفانی ریچھ ٹہلتے رہتے تھے اور اونچے دیودار پر دن بھر سفید گلہریاں...... دوڑ دوڑ کر چڑھتی اور دوڑ دوڑ کر اترتی تھیں۔

سنتوش کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ وحشی کی درندگی نے اسے گھائل کردیا تھا۔ سردار پولابیکس کا طبیب اس کا علاج کررہا تھا۔ سنتوش بہت کمزور ہوگیا تھا۔ غار میں خندق کی طرح کھود کر بنایا گیا خوبصورت مکان سنتوش کا حسین قید خانہ تھا۔ اس جگہ کا نام ''غالت زار'' تھا۔ فی الحقیقت یہ ایک مختصر سا پہاڑی گاؤں تھا۔ یہاں کی تمام آبادی زمرد کی سوداگر اور جنگجو تھی۔ یہ مکان خاصہ بڑا تھا۔ شاید کثیر المقاصد۔ زیادہ تر کمروں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ پولابیکس کے طبیب کا نام ''شاانان'' تھا۔ طبیب کے علاوہ اس مکان کی نگرانی کے لیے کوئی پہریدار نہ بٹھایا گیا تھا۔ سنتوش کے دل میں بار ہا بھاگ جانے کا خیال آیا۔ لیکن وہ سوچتا تھا کہ یہاں سے بھاگ جانا ممکن نہیں۔ یقیناً آس پاس پولابیکس کے آدمی اس کی نگرانی کے لیے موجود ہوں گے۔ شاانان نے سنتوش کو بتایا کہ غالت زار کے باشندے جنگلی اور وحشی ہیں۔ وہ دن بھر عمارت کے باہر ایک بڑے پتھر پر بیٹھا رہتا۔

پہاڑی کے سامنے سرسبز شاداب وادی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بیٹھتا تو اسے سکون سا محسوس ہوتا۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان نیچے ایک نالہ بہتا تھا۔ جو برف باری کے موسم تک خوب چیختا چنگھاڑتا اور سردی بڑھتی تو ٹھٹھر کر سفید چادر اوڑھتا اور چپ کر کے سو رہتا۔ برف گرمیوں کے موسم میں ڈھلنی شروع ہوتی تو نالہ پھر بیدار ہوجاتا۔ سنتوش نے محسوس کیا کہ قرطاجنہ میں ابھی گرمی چل رہی ہوگی۔ ساری پہاڑی گل کیسو اور چنبیلی کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دیودار کے درخت آسمان کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے محسوس ہوتے۔ نالے پر دوپہر کے وقت جنگلی بکریوں کے پانی پینے کا نظارہ سنتوش کو مبہوت کردیتا۔ لیکن اس کا دکھ ہر چیز کی تاثیر سے بڑھ کر تھا۔ شاانان دن بھر اس کے آس پاس رہتا۔ وہ ادھیڑ عمر کا قلطی تھا۔ دن بھر طرح طرح کے قہوے بناتا۔ خود بھی پیتا اور سنتوش کو بھی پلاتا۔ وہ طبیب تھا لیکن وہ بھی سنتوش کے بدن کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا۔ سنتوش اس کی چبھن کو محسوس کرتا اور اس کا دل اپنے عہد کے المیے پر رونے لگتا۔ کبھی

کبھارشانان اسے دیکھ کر ہنسنے لگتا۔ جانے کیا سوچ کر۔ سنتوش ابھی تک اپنے لیے کچھ کر سکنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے شیتل کی یاد آتی تو بے حد پریشان ہو جاتا۔ سوچتا اس قدر وقت گزر جانے کے بعد شیتل کس حال میں ہوگی۔ کیا ضروری ہے کہ ابھی تک وہ زندہ ہو؟ لیکن اس کے اندر سے جواب آتا وہ زندہ ہے۔

کئی روز گزر جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے یہاں سے خود نکلنا ہوگا۔ وہ دھیرے دھیرے شانان سے معلومات لینے کی کوشش کرتا اور باتوں ہی باتوں میں اس نے طبیب سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ اسے پتا چلا کہ یہ مکان پولابیکس کا مہمان خانہ تھا۔ یہاں حقیقت میں کل پانچ ملازم تھے۔ شانان کے علاوہ ایک باورچی، ایک چوکیدار اور باقی دو افراد صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتے تھے۔ وہ دن میں آتے اور دوپہر سے پہلے چلے جاتے۔ یہ لوگ آپس میں قلطی زبان بولتے تھے۔ سنتوش اب ان کی کچھ کچھ باتیں سمجھنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھار اس کے بارے میں بھی بات کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ وہاں سے فرار نہیں ہوسکتا۔ سنتوش کا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ یہاں سے شمال کی جانب تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر "تالیوم" کی شاہراہ تھی۔ اور اس کے پہلو میں بوڑھا درہ "بولانگ" جو صدیوں سے کسی اژدھے کی طرح منہ کھولے اور اطالیہ پر آنکھیں ٹکائے نہ جانے کس کا منتظر تھا۔ یہاں سے درہ بولانگ کو آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا تھا۔ وادی برف کا یہ علاقہ سپین کی سرحد کے نزدیک تھا۔ یہاں سے شمال مغرب میں ستر کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے بوتان اپنے پانیوں کو لے کر نیچے جنوب کی طرف دوڑتا تھا۔ شمال کی طرف سنتوش کی فرار کی کوشش بے معنی تھی۔

شاہراہ کی طرف بھی جانا ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں سب سے زیادہ مشکل تھی۔ اس نے جنوب کی طرف فرار ہونے کا ارادہ کیا۔ وہ کسی طرح غالت زار سے قریبی "شہر طومار" تک پہنچ جاتا تو وہاں کچھ رومی آباد تھے جو قلطی اقوام سے الگ تھے۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا تاکہ شیتل کو چھڑا سکے۔ وہ فرار ہونے کے منصوبے بنانے لگا۔ یہ معلومات اس نے شانان سے حاصل کی تھیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے سوچا کہ کسی رات مشرق کی جانب ایشور کا نام لے کر نکل جائے۔ لیکن اس کا یہ فیصلہ بچگانہ تھا۔ اتنا طویل سفر بغیر کسی زادراہ کے اور بغیر کسی رہنمائی کے قریب قریب ناممکن تھا۔ اس کے بھٹک جانے یا کسی قلطی وحشی کے ہاتھ لگ جانے کے سو فیصد امکان تھے۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ یہاں کب تک رہ سکتا تھا۔ زیادہ

سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ فرار کی کوشش کے دوران مر جاتا۔ اور اب وہ اس کے لیے تیار تھا۔ یہاں عمر بھر سڑتے رہنے سے تو بدرجہا بہتر تھا کہ وہ بھاگ جائے۔ اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس روز آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ اس کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ رات ہوتے ہی تمام منصوبہ بندی سوچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بار بار خود کو تسلیاں دیتا کہ یہاں سے فرار ہونے میں وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ نصف شب کے قریب وہ احتیاط کے ساتھ اٹھا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا انتہائی خاموشی کے ساتھ برآمدے میں آ گیا۔ چوکیدار عمارت کے صدر دروازے کے قریب بڑی سی چارپائی پر لحاف اوڑھے خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے سر پر پہنچ کر رک گیا۔ چوکیدار کا نیزا چارپائی کے نزدیک دیوار کے ساتھ ترچھا پڑا تھا۔ سنتوش کے بدن میں پارہ دوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی طرح مستعدی اتر آئی تھی۔ اس نے دل میں ایشور کا نام لیا۔ چوکیدار کا نیزا اٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ باہر یخ بستہ ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ انتہائی سرد اور تیز ہوا کی آواز اور درختوں کے درمیان ہوا کے گزرنے سے پیدا ہونے والی سنسناہٹ کے سوا وادی میں کوئی آہٹ نہ تھی۔ ہر طرف تاریکی نے دھاوا بول رکھا تھا اور ماحول اس قدر خوفناک تھا کہ کسی عام انسان میں ایک قدم چلنے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن اس نے ایک عزم کے ساتھ بائیں جانب چنار کے درختوں کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اس کے بدن پر گرم لباس تھا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا، تقریباً دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے اسے پہاڑی موڑ کاٹتی ہوئی دکھائی دی۔ اب اس کے سامنے ایک ہیبت ناک پہاڑ منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ طومار کی جانب سفر کرنے کے لیے اسے پہاڑ کے سائے میں چلنا تھا۔ اس عظیم پہاڑی کے عقب میں درہ 'بولانگ تھا۔ رات ابھی کافی باقی تھی۔ وہ جلد از جلد غالت زار کے علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن سردی کی شدت کی وجہ سے وہ محسوس کرتا تھا کہ شاید ایسا نہیں کر پائے گا۔ وہ چلتا رہا، مسلسل چلتا رہا۔ پہاڑی راستوں اور ان دیکھی راہوں کی وجہ سے اس کی رفتار سست تھی۔ مسلسل چلتے رہنے کی بدولت اس کا بدن گرم ہو گیا۔ کبھی کبھار کسی درندے کی غراہٹ اسے چونکا دیتی، لیکن ابھی تک اس کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی تھی۔ صبح ابھی دور تھی۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ یہ جگہ

دور دور تک ویران تھی۔ سارا علاقہ گھنے جنگلات سے اٹا ہوا تھا۔ اس سمے رات کا دوسرا پہر گزرنے والا تھا۔ اس کی تمام حسیات بیدار ہوگئیں۔ اس قدر سردی میں یہاں اس وقت کون ہوسکتا تھا؟ اسے لگا جیسے دو آدمی باتیں کررہے ہوں۔ اس نے اپنی توجہ اسی طرف مبذول کردی۔ تیز ہوا کے ساتھ باتوں کی مدھم سی آواز اسی جانب سے آرہی تھی جس طرف سنتوش کھڑا تھا۔ سنتوش نے ان آوازوں کو مزید بہتر طور پر سننے کے لیے چند قدم اور آگے تک جاکر اور چھپ کر سننا مناسب سمجھا۔ لیکن اب وہ احتیاط کے ساتھ کھٹکا کیے بغیر آگے چل رہا تھا۔ وہ جس پہاڑ کے پہلو میں چل رہا تھا۔ وہ اس کے بائیں جانب کسی فلک بوس دیوار کی طرح استادہ تھا۔ اور دائیں جانب گہری کھائیاں تھیں۔ یہ قدرتی راستہ اس قدر چوڑا تھا کہ یہاں سے پوری فوج کو گزارا جاسکتا تھا۔ باتیں کرنے کی آواز قریب ہی کسی بلندی سے آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں اسے دکھائی دیا کہ چند قدم کے فاصلے پر ہی کوئی عمارت تھی۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس ویرانے میں عمارت؟ وہ سوچنے لگا۔ آخر ان ویرانیوں میں کون لوگ تھے جو یہاں نہ صرف مقیم تھے بلکہ آدمی رات کو جاگ کر باتیں کررہے تھے۔ اس نے چپکے سے نکل جانا چاہا۔ لیکن معاً اس کی نگاہ قدرے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑے ایک شخص پر پڑگئی۔ وہ فی الفور بیٹھ گیا۔ ایک بڑے پتھر کے پیچھے۔ آخر یہ کیا ماجرا تھا؟ وہ فوری طور پر سانپ کی طرح رینگتے ہوئے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ سنتوش کے یہ مرحلے اعصاب شکن تھے۔ اس نے فیصلہ کررکھا تھا کہ وہ دن کی روشنی میں سفر نہیں کرسکے گا۔ سوچتا تھا کہ سورج طلوع ہوتے ہی کسی پہاڑی غار میں گھس جائے۔ اس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ عمارت کے قریب سے گزرنا اس کے لیے ناگزیر تھا۔ لیکن چونکہ وہ چند قدم بلند تھی اس لیے شاید وہ رینگتا ہوا کامیابی سے نکل جاتا۔ اور پھر جب وہ عمارت کے عین نیچے پہنچا تو اسے آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ یہ دو افراد کی آوازیں تھیں۔ وہ شاید کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ سنتوش نے لیٹے ہی لیٹے اندھیرے میں کھڑے اس شخص کی طرف دیکھا جو ایک سایہ بن کر شاید عمارت میں بیٹھے افراد کا پہرا دے رہا تھا۔ ناہموار پہاڑی پر رینگتے ہوئے اس کے بدن، رانوں، گھٹنوں اور سینے کے نیچے نوکدار پتھر آتے تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ جاتی۔ اس نے کہنیوں کے بل چلنے کی بجائے اپنے بازوؤں کو آگے پھیلا لیا اور پنجوں کے زور پر خود کو آگے کھینچنا شروع کردیا۔ اس کی کہنیاں زخمی ہوچکی تھیں۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی

جانور کی غراہٹ سنائی دی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کی روح لرز گئی۔ اسے لگا جیسے کوئی خطرناک جانور اس کے آس پاس ہی موجود ہے۔ جانور یا درندہ؟ جس کی غراہٹ کسی کتے یا بھیڑیئے جیسی تھی۔ اس کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے لباس میں اڑسا خنجر نکال لیا۔ چوکیدار کا نیزا بھی اس کے پاس تھا۔ اب وہ غراہٹ کی سمت میں گھور رہا تھا۔ معاً اسے ایک بڑے پتھر کے پیچھے دو انگارے سے دیکھتے ہوئے دیکھائی دیئے۔ وہ کسی درندے کی آنکھیں تھیں۔ جو تاریکی میں دہک رہی تھیں۔ نوعمر سنتوش کو لگا جیسے اس کی جان نکل گئی ہو۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور بدن کا درجہ حرارت تیزی سے گرنے لگا۔ پتھر کے پیچھے خوفناک برفانی چیتا موجود تھا۔ جس کی غراہٹ متواتر سنائی دے رہی تھی۔ اسے عمارت والوں اور ان کے پہریدار کے چونک جانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ سنتوش ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ دیوتاؤں کو یاد کرنے لگا۔ ملکرت، اشمون، تانیت وہ سب دیوتاؤں کے نام لیتا، درندے کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔ اسے اپنے زخم بھول چکے تھے۔ معاً درندے کی غراہٹ نے سناٹے کا سینہ چیر دیا۔ اس کی گرج نے بھیانک انداز میں فضا کا سکوت توڑ دیا۔ وہ ایک لمبی جست بھر کر سنتوش پر حملے کے لیے لپکا۔ قریب تھا کہ سنتوش کی سانسیں رک جاتیں، درندہ اس پر آ رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح اضطراری کیفیت میں سنتوش نے اپنا خنجر والا ہاتھ سیدھا کر دیا۔ خنجر کا پھل خاصا لمبا تھا۔ چیتا فضا میں اڑتا ہوا اس پر آ گرا۔ لیکن خوش قسمتی سے سنتوش کی جان بچ گئی۔ اب سنتوش کا لمبے پھل والا خنجر برفانی درندے کے دل میں کھب چکا تھا۔

لیکن اس اتفاقیہ جنگ نے عمارت میں موجود لوگوں اور عمارت کے باہر کھڑے پہریدار کو بری طرح چونکا دیا۔ سنتوش توقع کر رہا تھا کہ وہ لوگ سنتوش کو دیکھ چکے ہوں گے۔ یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ باہر کھڑا سایہ سنتوش کو پکڑنے کی بجائے عمارت کی طرف بھاگا۔ سنتوش کو بھی حیرت ہوئی۔ اس نے سائے کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی اٹھ کر ایک پتھر کی اوٹ میں دبک گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ عمارت پر نظریں جمائے رہا اور پھر اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ عمارت میں موجود جھگڑ جھگڑ کر باتیں کرنے والے دو افراد بھی نہایت عجلت کے ساتھ عمارت سے نکلے اور ایک طرف کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ سنتوش کو محسوس ہوا جیسے وہ کوئی چور تھے۔ انہوں نے کچھ سامان بھی اٹھا رکھا تھا۔ آخر وہ کون لوگ تھے۔ سنتوش کا تجسس بے پناہ بڑھ گیا۔ وہ اب اس عمارت کو خالی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ نہ جانے سنتوش کے دل میں کیا

آئی کہ وہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ شاید یہ سوچ کر کہ وہاں سے اسے کچھ کھانے کا سامان یا کوئی تلوار مل جائے گی۔ کیونکہ اب وہ جانتا تھا کہ یہ عمارت خالی ہو چکی ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے عمارت کی طرف بڑھا رہا تھا۔ چیتا کچھ فاصلے پر تڑپ کر مر چکا تھا۔ اس نے مڑ کر چیتے کو ایک نظر دیکھا تو دل میں سوچا کہ اس نے ایک خوفناک درندہ مار دیا اور یہ کہ وہ ایک بہادر آدمی ہے۔ اس کا سینہ یکا یک فخر سے پھول گیا۔

عمارت کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بوسیدہ عمارت تھی۔ جس کمرے سے وہ لوگ بھاگے تھے اس میں مشعل جل رہی تھی۔ آس پاس کچھ سامان بکھرا ہوا تھا جسے دیکھ کر سنتوش کو اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ یہاں بیٹھ کر ضرور کوئی غلط کام کر رہے تھے۔ کچھ تھیلے، کچھ تیشے، کھدائی کا سامان اور اسی طرح کی بعض چیزوں کو دیکھ کر سنتوش کا ماتھا ٹھنکا۔ معاً اس کی نگاہ نیچے فرش پر پڑی تو اسے لہو کے چند قطرے بھی دکھائی دیئے۔ لگتا تھا ان چوروں میں سے کوئی معمولی زخمی ہوا تھا۔ سنتوش نے آگے بڑھ کر مشعل اٹھا لی ور دوسرے کمرے کا جائزہ لینے کے لیے بغلی دروازے کی طرف بڑھا۔ دوسرے کمرے میں کوئی مشعل نہیں تھی۔ لیکن وہ جونہی اندر داخل ہوا ٹھٹک گیا۔ اندر ایک شخص نیم جان حالت میں پڑا موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ سنتوش دوڑ کر زخمی شخص کے نزدیک آیا۔ اس کا پیٹ پھٹ چکا تھا اور آنتیں باہر کو لٹک رہی تھیں۔ مشعل کی روشنی میں سنتوش کو دکھائی دیا کہ جہاں اس مرتے ہوئے شخص کا جسم پڑا تھا، قریب ہی ایک تہہ خانے کا راستہ تھا۔ لیکن تہہ خانے میں اترنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی راہ چلنا تھی۔ وہ کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر بے وقوفی نہیں کر سکتا تھا۔ معاً اسے زخمی شخص کی کراہ سنائی دی۔ وہ مشعل قریب لا کر اس شخص کا چہرہ دیکھنے لگا۔ شاید وہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا۔ سنتوش نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ مشعل اور دائیں ہاتھ میں چیتے کے خون سے بھرا خنجر تھا۔ مرتا ہوا شخص کچھ کہہ تھا:

”مم......میں......مم......مر......وہ......زم......زم......زمرد......“

اس نے صرف اتنا کہا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ اب مر چکا تھا۔ سنتوش کا خیال ٹھیک نکلا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ زمرد کے چور شاید زمرد کی کان کے خفیہ راستے تک آ پہنچے ہوں گے۔ زخمی تو مر چکا تھا۔ اس کا مزید یہاں رکنا بے معنی تھا۔ چنانچہ اس نے فوری واپسی کی ٹھانی۔ وہ باہر جانے کے لیے مڑا لیکن اگلے لمحے اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

دروازے میں چند وحشی اور خونخوار لوگ کھڑے تھے۔ وہ کبھی مرے ہوئے شخص کو، کبھی سنتوش کو اور کبھی سنتوش کے ہاتھ میں تھمے خون آلود خنجر کو دیکھتے اور نہایت غضبناک ہو کر اپنے گلوں سے درندوں جیسی آوازیں نکالتے۔ سنتوش کو یوں لگا جیسے آج تو اس کی موت ہر حال میں آ پہنچی ہے۔ لیکن اس نے پھر بھی صفائی دینے کی کوشش کی:۔

''اس کو میں نے نہیں مارا۔ اس کو چوروں نے مارا ہے۔ وہ کچھ سامان بھی لے کر بھاگے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھا۔''

لیکن شاید وہ سنتوش کی بات سن ہی نہیں رہے تھے۔ ان میں سے ایک غراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اپنا بڑا سا ہاتھ پوری طرح گھما کر سنتوش کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

پاکستانی ورچوئل لائبریری / اردو ڈائجسٹ

سنتوش کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی یادداشت لوٹنے لگی۔ ایک ایک کر کے اسے تمام واقعات یاد آتے گئے۔ اسے یاد آیا کہ آخری بار اسے ایک لحیم شحیم وحشی کا تھپڑ لگا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے بدن کو ٹٹولنا شروع کر دیا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کا پورا جسم سلامت تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ بدن کا ایک ایک انگ دکھ رہا تھا لیکن سنتوش نے کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو خود کو ایک کہنہ سال زندان میں پایا۔ یہ زندان ان ویرانوں میں کس نے بنایا ہوگا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی، جس کے فرش پر وہ پڑا تھا، کسی پہاڑی کو کھود کر بنائے گئے کسی عظیم زندان کا حصہ تھی۔ یہ اندازہ کہ اسے کسی صدیوں پرانے زندان میں ڈال دیا گیا ہے اس نے اس امر سے لگایا کہ اس کے سامنے کوٹھڑی کا اکلوتا دروازہ مضبوط آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا۔ بلکہ ان کو سلاخیں کہنے کی بجائے لوہے کے ڈنڈے کہنا زیادہ مناسب تھا۔ زندان میں تاریکی کی وجہ سے وہ صحیح طور پر ماحول کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ فی الواقع ایک ناقابل تسخیر زندان تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آیا اور زندان کی راہداری میں دیکھنے لگا۔ سامنے بھی اسی طرح کی کوٹھڑی تھی۔ جو خالی تھی۔ شاید اسی طرح کی کوٹھڑیاں دو رویہ تھیں۔ وہ کراہتے ہوئے اپنے زخموں کو محسوس کر رہا تھا۔ زندان کے بیچوں بیچ تقریباً چھ فٹ کی راہداری تھیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنی کوٹھڑی کی چھت کو دیکھا۔ کوٹھڑی کی چھت اس کی توقع سے زیادہ ہی تھی۔ موٹی موٹی دیواروں کی شکستہ اور خستہ حالت ان کے بہت ہی قدیم ہونے کا پتا دیتی تھی۔ اس نے سلاخوں کو پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی تو اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ سامنے کی کوٹھڑی کو وہ خالی سمجھ رہا تھا۔ لیکن اسی کوٹھڑی سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ وہ بری طرح

چونک کر سامنے والی کوٹھڑی میں گھورنے لگا۔ شاید وہاں بھی کوئی قیدی تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو اسے ایک بھوت نظر آیا۔ وہ بھوت نہیں تھا بلکہ کوئی خطرناک قیدی تھا۔ جس کی داڑھی اور مونچھیں جنگلی گھاس کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور سر کے بال شانوں کو چھو رہے تھے۔ اندھیرے میں سنتوش کو اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سامنے والے قیدی کا قہقہہ دیر تک زندان کے ماحول میں گونجتا رہا۔ سنتوش اسے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر اس نے اپنی ہمتیں جمع کر کے اس قیدی سے سوال کیا۔

"کون ہو تم؟"

سنتوش کی آواز یوں گونجی جیسے چاہ بابل کی گہرائی میں کسی نے پتھر پھینک دیا ہو۔ گونج کی وجہ سے ایک آواز کی سات سات بن رہی تھیں۔ یہ بازگشت کا اثر تھا۔ اس کی آواز کے جواب میں بیک وقت عجیب وغریب غراہٹیں ابھریں۔ جیسے بہت سے درندے دھاڑے ہوں۔ سنتوش خاموش ہو گیا۔ وہ بری طرح سہم گیا تھا۔

کوٹھڑی کی چھت بھی اتنی ہی بلند تھی جتنی کہ راہداری کی دائیں اور بائیں جانب کی دیواریں تین تین فٹ موٹی تھیں۔ ہر دیوار میں اس قدر سوراخ تھا کہ ایک کوٹھڑی کا قیدی اپنے آس پاس کے دو پڑوسی قیدیوں سے مکالمت کر سکتا تھا۔ ایک قیدی دوسرے قیدی سے ہاتھ بھی ملا سکتا تھا۔ سنتوش سلاخوں سے پلٹ آیا اور ایک طرف کی دیوار کے سوراخ کے پاس آ کر ساتھ والی کوٹھڑی میں جھانکنے لگا۔ پہلے تو اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن جب اس نے دھیان بڑھایا تو یکا یک دہل گیا۔ دوسری طرف کا قیدی بھی سوراخ سے آنکھیں لگائے سنتوش کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک زندان کا ماحول ایک گونجدار آواز میں بدل گیا۔ وہ گالی تھی۔ جو اسی قیدی نے خواہ مخواہ دی تھی جو سنتوش کی کوٹھڑی کے سامنے والی کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس نے گرج کر کہا تھا:۔

"کتے کے بچے!...... جنگلی سور کی اولاد!"

اس گالی کے بعد باقی کوٹھڑیوں سے بھی پہلے جیسی غراہٹ ابھری۔ سنتوش سوچ رہا تھا کہ ان کوٹھڑیوں میں انسان نہیں جانور قید ہیں۔ جیسے ریچھ، بھالو، شیر، چیتے، سب کے سب درندے لگتے تھے۔ اس پر قید خانے کی کہنہ سالی ماحول کو بھیانک بنانے میں اور بھی اہم کردار

ادا کر رہی تھی۔ سنتوش کو اپنے بدن میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اپنی کوٹھڑی کے فرش پر پھر سے چپکا ہو کر بیٹھ رہا۔ کوٹھڑی میں ایک بدبودار گرم اونی کمبل کے سوا سامان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سنتوش کو اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔ چند لمحوں کی قید نے اسے اتنا مایوس کر دیا کہ وہ سوچنے لگا۔ شاید عمر بھر یہاں سے نکل نہ پائے گا۔ پہلی بار نا امیدی نے اسے گھیرنا شروع کر دیا۔ یہ قید ہی عجب تھی۔ زندان کچھ اس درجہ ہولناک اور طلسماتی تھا کہ سنتوش دہل سا گیا تھا۔ اسے بے بسی اور لاچاری کی کیفیت نے اپنے پنجوں میں بری طرح جکڑنا شروع کیا۔ وہ ایک بار پھر اٹھا اور اب وہ کسی لگڑ بگڑ کی طرح کوٹھڑی کے فرش پر ٹہل رہا تھا۔ فکرمندی کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ وہ کن لوگوں میں آ پھنسا ہے۔ اس کے بدن پر کوئی زخم بھی تو نہیں تھا۔ اسے اپنے زندہ بچ جانے پر بھی افسوس ہونے لگا۔ یہ قید تو موت سے بھی بدتر تھی یقیناً وہ کئی سالوں سے اسیر تھا۔ سنتوش کانپ گیا۔ تو کیا وہ بھی اب باقی عمر کا حصہ یہیں گزارے گا۔ معاً اسے پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ اسے حاجت کی ضرورت پیش آئی اور یہ سوچتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ فراغت کہاں حاصل کرے گا۔

اس کوٹھڑی میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور جب مایوس ہو گیا تو پھر سلاخوں کے پاس آیا۔

"ایشور کے لیے! میری مدد کرو۔ مجھے حاجت آئی ہے۔"

سامنے کی کوٹھڑی والے قیدی کا خوفناک قہقہہ گونجا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ البتہ ساتھ والی کوٹھڑی سے ایک آواز ابھری۔

"کون ہو تم لڑکے؟"

سنتوش نے جھپٹ کر دوسری کوٹھڑی والے قیدی کو دیکھا وہ بھی شکل سے جنگلی ہی تھا۔ لیکن اس کا لہجہ کچھ بہتر تھا۔ وہ بھی اٹھ کر اپنی کوٹھڑی کے آہنی دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سنتوش نے پھر کہا۔

"مجھے حاجت ہے، میرے پیٹ میں درد ہے۔ میں فراغت چاہتا ہوں۔"

دوسرے جنگلی قیدی نے سنتوش کا مسئلہ نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"میں نے پوچھا تم کون ہو؟"

''میں قرطاجنی ہوں۔ ملکرت دیوتا کے مہا پجاری کا ہوبال کا اکلوتا بیٹا۔''

''قرطاجنی!! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس قیدی کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ جیسے کسی قرطاجنی کے یہاں ہونے پر وہ چونکا ہو۔ سنتوش سوچ میں پڑ گیا آخر حیرت کی اس میں ایسی کون سی بات تھی۔ کوٹھڑیوں سے کبھی کبھار غراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ جن کی بازگشت بھی پیدا ہو رہی تھی۔ اور اب تو سامنے والا وحشی بھی اٹھ کر جنگلے کے پاس آ گیا تھا۔ اب وہ حیران تھا۔ اس نے کہا۔

''تم قرطاجنی ہو؟...... تمہیں ''گوبال'' نے یہاں کیوں ڈالا؟''

یہ نام سنتوش نے پہلی بار سنا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ آخر یہ گوبال کون تھا؟ سنتوش نے اسی قیدی سے سوال کیا۔

''گوبال؟ یہ گوبال کون ہے؟ میں تو یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''پہلی بار!...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کون ہو؟ میرا مطلب ہے تم ان پہاڑیوں میں کیسے پہنچے؟ کیا تم جانتے ہو کہ تم کہاں ہو؟''

سنتوش سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی معلومات کے مطابق جواب دیا۔

''میرے خیال میں یہ قلطیوں اور غالوں کا علاقہ ہے۔ میں کوہ مغرب کی وادی برف میں ایک سردار کا قیدی تھا۔ اس نے مجھے مہنگے داموں خریدا تھا۔ مجھے شہر رومہ کے بازار میں فروخت کیا گیا تا۔ اصل میں ہم قرطاجنہ سے آ رہے تھے کہ راستے میں قزاقوں نے ہمارا جہاز لوٹ لیا اور ہمیں غلام بنا لیا۔''

اب تقریباً تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور سب کے سب سنتوش کی باتیں دلچسپی سے سن رہے تھے۔ سنتوش نے اپنے بارے میں بتایا تو سامنے والے قیدی نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر کہا۔

''تم اس وقت اپنے ہم وطن گوبال کے قیدی ہو۔ یہ پہاڑی جس میں ہمارا خاندان ہے۔ سپین اور اطالیہ کے درمیان حد فاصل ہے۔ تم تو جانتے ہو گے کہ سپین کے بہت سے حصوں میں تمہارے فنیقی بھائی رہتے ہیں۔ گوبال ایک قرطاجنی ہے۔ وہ لعل و جواہر کی کانوں کا لٹیرا اور سپین کے تمام خزانوں کا چور ہے۔ کوہ مغرب کی تمام قلطی اقوام اس قرطاجنی لٹیرے

سے تنگ ہیں۔ حیرت ہے تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔"

اب سنتوش کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ عظیم پہاڑی جس کے سائے سائے وہ چلتا رہا تھا کوہ مغرب ہی تھا۔ کوہ مغرب کی مشرقی سمت فلطی اقوام کے پاس تھی اور پرلی طرف یعنی مغربی سمت میں جاہل سپینی قبائلی آباد تھے۔ شروع شروع میں فنیقیوں نے بحر روم کے سفر کیئے تو آخر تک چلے گئے۔

فنیقی پہلی اور غالباً آخری قوم تھی جس نے اپنی تہذیب کی بنیاد صرف تجارت پر رکھی۔ اس لیے قدرتی طور پر امن کے زمانے میں وہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے لمبے سفروں میں سپین تک جا پہنچے۔ بے شک قرطاجنہ ان کا مرکز بن گیا تھا۔ لیکن سپین میں بھی کم فنیقی نہ تھے۔ سنتوش کو یاد آیا کہ اس نے اپنے آباؤ اجداد سے سپین میں رہنے والے فنیقیوں کے بارے میں سنا تھا۔ وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ اس خبر کو جان کر خوش ہو یا خفا۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ قیدی تھا اور دوسری طرف ایک قرطاجنی سردار کا قیدی۔ اسے بار بار حیرت ہوتی تھی تو یہ سوچ کر کہ آخر وہ اطالیہ کے علاقے ابتدائی سپین میں تھا تو یوں اچانک کوہ مغرب کی دوسری طرف سپینوں کے علاقے میں کیسے پہنچ گیا۔ معاً اس کے پیٹ میں پھر گڑبڑ شروع ہو گئی۔ اس نے پھر وہی سوال کیا۔

"مجھے تکلیف ہے۔ میں رفع حاجت کرنا چاہتا ہوں۔"

تب سامنے والے قیدی نے اب نرم لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تو تمہیں یہیں کرنی پڑے گی۔ ایک طرف سے کوٹھڑی کی مٹی کو کھودنا شروع کردو، ہر روز ایک چھوٹا گڑھا کھودو اور رفع حاجت کر کے اس پر مٹی ڈال کر اس کو بند کردو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

یہ سن کر سنتوش کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ تو بہت مشکل کام تھا۔ اس نے سر دست قضائے حاجت کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ وہ خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ کیوں قید کیے گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر تو یوں لگتا تھا جیسے یہ مدتوں پہلے وہاں لائے گئے تھے۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"اور تم لوگ یہاں کیوں قید ہو؟ تم کون ہو؟ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے۔"

اب ساتھ والی کوٹھڑی کے پڑوسی قیدی نے درمیانی دیوار کے سوراخ میں منہ رکھ کر سنتوش کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ادھر آؤ! میں بتاتا ہوں۔''

سنتوش سلاخیں چھوڑ کر اپنے پڑوسی کی طرف بڑھا۔کوٹھڑی کی درمیانی دیوار کے سوراخ پر منہ رکھتے ہی اس نے محسوس کیا کہ یہی ایک جگہ ہے جہاں سے وہ دوسری کوٹھڑی کو دیکھ سکتا ہے۔اب اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔اس کے پڑوسی نے اسے بتایا۔

''میرا نام ''توکیا''، میں ایک فلطی سردار ہوں۔ یہاں کل تیرہ قیدی ہیں۔ہم سب ایک ہی گاؤں کے ہیں۔آج سے بیس سال پہلے تک یہ جگہ بھی جہاں تم موجود ہو فلطیوں کے پاس تھی۔لیکن اب یہاں فنیقیوں کا قبضہ ہے۔گوبال نے ہمارے گاؤں کو تہس نہس کر دیا۔ ہمارے چھوٹے بڑے سب مارے گئے۔ان تمام بستیوں میں فنیقیوں نے اپنے گاؤں بسا لیے۔یہی وجہ ہے کہ کوہ مغرب کے مشرق میں موجود فلطی قبائل کے ساتھ گوبال کی دشمنی ہے اور اس طرف موجود یعنی مغرب میں غالوں اور وحشی اور سپینیوں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ گوبال اس دھرتی کا راجہ ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً گوریلا کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔لیکن ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اس نے تم کو قید میں کیوں ڈالا۔''

سنتوش اپنے پڑوسی کی بات دھیان سے سنتا رہا۔معاً ایک خیال کے تحت اس نے اپنے پڑوسی قیدی سے پوچھا۔

''لیکن تم لوگوں کو اس نے قتل کیوں نہ کر دیا؟ مجھے لگتا ہے تم سب کئی سال سے قیدی ہو۔آخر وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟''

سنتوش کا سوال معقول تھا۔سامنے کی کوٹھڑی کے وحشی نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

''ہیرے!...... وہ ہم سے ہیرے کی کانوں کے پتے پوچھتا ہے۔ہم نے فنیقیوں کے حملے سے پہلے ہی اپنی کانوں کو پاٹ دیا تھا۔ اتنے بڑے الپس پہ وہ کہاں کہاں کھدائی کرے۔ جب تک ہم اسے ہیروں کی کانوں کے پتے نہیں بتا دیتے وہ ہمیں قید میں رکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہاں بیس بیس سال ہونے والے ہیں۔''

سنتوش یہ سن کر اور حیران ہوا۔

''بیس بیس سال! تو آپ اسے بتا کیوں نہیں دیتے؟ کیا وہ ہیرے آپ کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں۔''

سامنے کی کوٹھڑی کے وحشی نے یکایک پوری قوت سے گلا پھاڑ کر سنتوش کو گالی دی:۔

''بھونکو مت قرطاجنی کتے!! ہم انہیں کبھی نہیں بتائیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک یہیں مر جائے گا لیکن منہ نہ کھولے۔ گوبال نے ہمارے بچوں کی جان لی ہے۔ ہم اس سے انتقام لیں گے اور ہمارا انتقام یہ ہوگا کہ ہیرے نکالنے کے جس مقصد کو لے کر یہاں آیا تھا وہ ہم کبھی پورا نہ ہونے دیں گے۔''

سنتوش اب ساری صورتحال سمجھ چکا تھا۔ معاً سنتوش کو پانی کی پیاس لگی۔ اس نے اپنے پڑوسی سے پوچھا۔

''پانی۔''

''پانی یہاں پر کوٹھڑی کے باہر آہنی دروازے کے پہلو میں مٹکے کے اندر موجود ہے۔ تم سلاخوں سے ہاتھ نکال کر باہر پڑے مٹکے سے پیالہ بھر سکتے ہو۔''

سنتوش نے آہنی سلاخوں سے باہر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ واقعی پاس ہی ایک سیاہ مٹکا رکھا تھا۔

ان کی آوازیں زندان میں بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ ماحول کی ہولناکی سنتوش کے لیے نئی تھی۔ وہ سوچتا کہ یہ زندان دکھنے میں صدیوں پرانا لگتا ہے۔ معاً اسے اپنے مندر کے پروہتوں کی زبانی سنی داستانیں یاد آنے لگیں۔ آسمان پر بہت سے دیوتا رہتے تھے۔ ہر ملک اور ہر سرزمین کے الگ الگ دیوتا تھے۔ اس نے سنا تھا کہ جب بھی کوئی دیوتا زمین پر اترتا تو اپنے لیے اونچے پہاڑوں پر گھر بناتا۔ وہ سوچتا یہ زنداں بھی کبھی دیوتاؤں نے بنایا ہوگا۔ اور وہ یہاں اپنے بڑے بڑے دشمنوں اور شیطانوں کو قید رکھتے ہوں گے۔ سنتوش کو یہاں آئے ہوئے ابھی اتنا وقت نہ گزرا تھا۔ لیکن اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے یہاں قید ہو۔ سامنے والی کوٹھڑی کا قیدی اب خاموش تھا۔ سنتوش نے غور سے دیکھا تو وہ کوٹھڑی کے

فرش پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ یہاں کے سارے قیدی اپنی زندگی سے اس قدر بیزار تھے کہ وہ سلاخوں کے نزدیک کم ہی آتے۔

راہداری میں تاریکی بڑھنے لگی۔ وہ سوچنے لگا رات ہوتے ہی یہ رہی سہی روشنی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے سے بہرحال بہتر ہے۔ غائب ہوجائے گی تو زندان مکمل طور پر تاریک ہوجائے گا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دور زندان کے دہانے کی طرف دھمک کی آواز ابھری۔ کوئی آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی کا ایک ہالہ راہداری میں پڑنے لگا۔ روشنی کی کپکپاہٹ سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ مشعل کی روشنی تھی۔ مشعل کے شعلے کی کپکپاہٹ سے عجب قسم کا طلسماتی منظر ابھر رہا تھا۔ اندھیرا شعلے کی مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ کپکپایا ہوا شعلہ دھیرے دھیرے نزدیک آ رہا تھا۔ سنتوش مارے تجسس کے دوڑ کر پھر سلاخوں سے آلگا اور موٹی سلاخیں ہاتھ میں تھام کر آنے والے مشعل بردار کو دیکھنے لگا۔ عجیب بات یہ تھی کہ کوٹھڑیوں کے باقی قیدی ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ مشعل بردار کی آمد سے ان میں کوئی ہل چل پیدا نہ ہوئی تھی۔ شاید یہ لوگ ایسی باتوں کے عادی تھے۔ آنے والا سامنے آیا تو سنتوش نے دیکھا یہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور جسم پر پہریداروں جیسا بھاری بھرکم لباس تھا۔ سنتوش کی کوٹھڑی کے پاس پہنچ کر بھی وہ نہ رکا اور نہایت بے پرواہیانہ انداز میں گزرتا چلا گیا۔ وہ سرنگ کے اندرونی جانب جا رہا تھا۔ چند کوٹھڑیاں مزید عبور کرنے کے بعد وہ رک گیا۔ شاید اس نے مشعل کہیں راہداری کی دیوار کے ساتھ اٹکا دی۔

سنتوش کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ راہداری کو رات کے وقت روشن رکھنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہ روشنی ناکافی تھی لیکن گھٹن سے بہرحال بہتر تھی۔ اب وہ پہریدار واپس آ رہا تھا۔ اور جونہی وہ سنتوش کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرنے لگا سنتوش نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ اس نے سر گھما کر سنتوش کو دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ اسی اثنا میں سامنے والے قیدی نے سنتوش کو بتایا۔

"یہ گونگا ہے بول نہیں سکتا۔"

اتنا کہتے ہی سامنے کی کوٹھڑی کے قیدی نے حسب عادت قہقہے لگانے شروع کردیئے۔ اس کے قہقہے ماحول کو مزید بھیانک بنا رہے تھے۔ اس کی ہذیانی کیفیت کو دیکھ کر

سنتوش نے اندازہ لگایا کہ طویل قید نے اس پر برا اثر ڈالا ہے۔ اب سنتوش بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اسے رہ رہ کر شیتل کی یاد آ رہی تھی۔ شیتل نے اسے اس وقت سنبھالا تھا جب وہ جسم اور روح دونوں پر گہرے گھاؤ کھا کر لوٹا تھا۔ وہ جلد سے جلد آزاد ہونا چاہتا تھا۔ لیکن تقدیر اسے بار بار پیچیدہ سے پیچیدہ حالات میں دھکیل دیتی تھی۔ دیوتاؤں کے زندان کی اس کوٹھڑی میں اس کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ اندھیرا بڑھتا گیا تو مشعل کی روشنی بھی بڑھتی گئی۔ اپنے خیالات کو شیتل کے ساتھ مخصوص کر کے وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ تمام رات سنتوش نہ سو سکا۔ لیکن جیسے تیسے کر کے رات گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی سنتوش کی طبیعت تبدیل ہو گئی۔ اب اسے اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور دروازے کی ہیبت ناک آہنی سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا۔ وہ ان پر ٹکریں مار رہا تھا۔ انہیں کھینچ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ اس کی آواز زندان کے ماحول میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ وہ چلا رہا تھا۔ لاتوں، مکوں اور ٹکروں سے لوہے کی سلاخیں توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا اور کنپٹیاں سوج چکی تھیں۔ غم و غصے کی انتہا نے اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ اس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ لیکن سلاخوں کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ لیکن اس کے جنون میں کمی نہ آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ وہ لہولہان ہو گیا، لیکن چیختا رہا، چلاتا رہا۔ سب قیدی حیرت زدہ تھے۔ دھیرے دھیرے سنتوش تھکنے لگا۔ اس کی چیخ و پکار بے معنی اور بے سود تھی۔ اس کی چیخیں ضائع گئیں۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا، وہ اپنی بے بسی پر روتا تھا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کیوں برتی تھی۔ اس کی ہچکیاں، سسکیوں میں بدل گئیں۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ سنتوش کو انتظار تھا کہ کبھی اس علاقے کا سردار گوبال آئے اور وہ اس سے بات کرے۔ آخر گوبال بھی فقیقی تھا اور سنتوش بھی۔ زندان کے تمام ملازم گونگے تھے، اول تو وہ سننے سے بھی محروم تھے اور اگر کوئی ذرا سا سن لیتا تو وہ بول نہ سکتا تھا۔ سنتوش کے لیے ایک ایک دن، ایک ایک سال کے برابر ہو گیا۔ اور پھر مجبوراً جب اسے کوئی چارہ نظر نہ آیا تو وہ اپنے ''ایشور'' سے مدد مانگنے لگا۔ وہ مہا پجاری کا بیٹا تھا، عبادت کے سارے طریقے جانتا تھا۔ اب تک اس نے پوجا یا پرارتھنا، اس لیے نہ کی تھی کہ کوٹھڑی میں کسی دیوتا کی کوئی مورتی اس کے پاس نہ تھی، لیکن بالآخر اس نے بغیر مورتی کے ہی بھگوان کو پکارنا

شروع کر دیا۔

''اے میرے ایشور!......تو مورتیوں اور مجسموں کا محتاج تو نہیں۔ سارے دیوتا اور ان کے خاندان تو نے پیدا کیے ہیں۔ تو، تو ایک اکیلا ہے۔ تو، تو سب کا مالک ہے۔ اپنے اس مجبور بندے کو مصیبت سے نکال۔ تو مجھے اس تکلیف سے نجات دے۔ تو ساری چیزوں کا مالک ہے۔

تو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ میں تیری پوجا کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مدد مانگتا ہوں۔ میری منزل تک مجھے پہنچا دے۔ اے میرے پیارے ایشور!''

پاکستانی وقار عظیم ڈائریکٹ ڈاٹ کام

شوزینہ

قرطاجنہ کے بحرنوردوں کے لیے بحراوقیانوس کوئی راز نہیں تھا۔ فینیقی دنیا کی واحد قوم تھے جنھوں نے سب سے پہلے بحراوقیانوس کا چکر لگایا تھا۔ نہ جانے کیوں فینیقی، سپین کی جانب اپنے سفروں کو خفیہ رکھتے تھے۔ صدیوں پہلے مصر کے ایک فرعون کے ایما پر فینیقیوں نے براعظم افریقہ کا چکر لگایا۔ زیرنظر زمانے سے پانچ صدی قبل سے قادس ان کی مرکزی نوآبادی بن چکا تھا۔ اور بحراوقیانوس کی سوکھی مچھلی ٹین اور کچھ امبر "دساور" بھیجا جاتا تھا۔ جس سے پیتل بنانے میں کام لیا جاتا۔ فینیقیوں کے حریفوں کو کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ پیتل بنانے کے لیے ٹین وہ کہاں سے لاتے ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں جب قرطاجنہ کو فروغ ہوا تو بحری تجارت کے راز اور زیادہ شدت سے محفوظ رکھے جانے لگے۔ آبنائے جبل الطارق سے بیرونی سمندر کے راستے کا پہریدار قادس کو بنایا گیا۔ اس چوکی کی کامیابی بلواسطہ پیتھیاس کے قصے سے بھی واضح ہوتی ہے۔ جو یونانیوں کی نوآبادی مارسیلز کا باشندہ تھا۔ اور کسی طرح قادس والوں سے بچ کر کھلے سمندر میں جا نکلا۔ اس نے واپس آکر اپنے مشاہدات بیان کیے۔ یونانی اہل علم نے انہیں من گھڑت کہانی قرار دیا۔ وہ یورپ کے اس ٹکڑے کو زمین کا آخری سرا سمجھتے تھے اور اسے "ہسپانیہ" کہتے تھے۔ یعنی "خفیہ دیس"۔

لیکن دوسروں کو بے خبر رکھ کر خود قرطاجنہ والوں نے جزائر کینری بلکہ اس سے آگے "ازور" تک سمندر کی دیکھ بھال کی۔ انکا ایک ناخدا "ہمبلکوابیون" برطانیہ کے بڑے جزیرے کی سفید پہاڑیوں والے ساحل تک حکومت قرطاجنہ کی طرف سے گیا تھا۔ اس نے ٹین کی پیداوار کے علاقے کورن وال اور بریطانی کا چکر لگایا۔ اور برطانیہ کے چھوٹے بھائی مقدس جزیرے "آئرستان" تک جا پہنچا۔ اس بحری سفر میں ہمبلکو کے بیڑے کو بندھوا کا ایک

قطعہ آب ملا۔ جہاں مچھلیاں اور جہاز رک رک جاتے تھے۔ اگرچہ یہ کیفیت بعض دوسرے جزیروں کی بھی تھی، اس جزیرے میں کائی کی گھاس اور نرسل وغیرہ میں مچھلیوں کے جھنڈ الجھ جاتے تھے جس سے قرطاجنہ والوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ بہرحال اس بے حرکت قطعہ بحر کی کہانی ان دہشت انگیز قصوں میں اضافہ کرلی گئی جن کی مدد سے قرطاجنہ والے اپنی بحری تجارت کے بھید چھپاتے تھے۔

اسی زمانے میں یعنی 500 قبل مسیح کے قریب ایک اور قرطاجنی سردار جس کا نام ''ہنو'' تھا ایک بڑا بیڑا لے کر شمالی افریقہ کے مغربی بازوؤں کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ یہ بحری سفر صرف دیکھ بھال کی غرض سے نہ تھا۔ پچاس چپو والے پچاس جہازوں کے اس بیڑے میں ملاح اور آبادکار ملا کر تیس ہزار نفوس شریک تھے۔ ہنو ایک بڑا منصوبہ باندھ کر چلا تھا۔ اور ہر دریا کے سرسبز دہانے پر آبادکاروں کو بساتا ہوا جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر مقام سے دیسی باشندوں کو لیتا جو اگلی منزل کی رہنمائی اور ترجمانی کی خدمات انجام دیتے۔ اسی سفر میں اس کے قرطاجنی ساتھیوں کو دیسی ڈھول باجوں کی نئی نئی آوازوں کے ساتھ ساتھ ایک نئے آدمی نما جانور ''گوریلا'' کا نام معلوم ہوا۔

ان کارناموں کے علاوہ فینیقی قرطاجنی ہی دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلی قوم تھی جس نے سمندر پار نوآبادیاں بسائیں۔ اس کام کو انہوں نے ایک مصالحانہ اور آزاد تجارت کے ذریعے انجام دیا۔ یہ بھی ایک نئے دور کی ابتدا کا اقدام تھا کہ انہوں نے غیر متمدن بیرونی اقوام کے ساتھ متمدن شہر سے رابطہ کی راہ نکالی۔ اس سے پہلے اقتدار اور تصرف کا عام طریقہ فوجی فتوحات ہی ہوتی تھیں۔ چاہے وہ اشوریوں کی ظالم حکمرانی ہو یا مصریوں کا معتدل تسلط۔ اہل قرطاجنہ کسی ساحل پر صرف ایک مرکز بنا لیتے۔ اور اس کی سربراہی دور دور پھیلی ہوئی نوآبادیوں سے کی جاتی اور یہ تجارتی بستیاں اندرون ملک پر حکمرانی کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں بلکہ اکثر نواحی علاقے کی زراعت اور کان کنی کی ترقی دینے میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

''حزقیل نبی'' نے اس قسم کی ایک قدیم تجارتی بندرگاہ کی کیفیت بیان کی ہے۔

''تیرا سوداگر ترشیش تھا کہ تیرے چاندی، لوہے، ٹین اور سیسے کے ظروف اور ہر قسم کے مال کی تجارت کرتا تھا۔''

یہ ترشیش بحراوقیانوس کے ساحل پر قادس کے قریب تھا۔ وہاں کے باشندے اہل

قرطاجنہ سے جدا اپنے طور طریقے کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔

تمام کے تمام فینیقی جو خاص قرطاجنہ میں آباد تھے یا دور مغربی ساحلوں پر جہاں جاتے وہاں کی زندگی بدل جاتی۔ وہ دیسی خواتین کے ساتھ شادیاں کرتے اور ان کی زراعت اور کان کنی میں مدد کرتے۔ سپین میں آباد قرطاجنی صدیوں پہلے ہملکو اور ہنو کے ساتھ سپین آئے تھے۔ انہوں نے سپین کی زندگی بدل دی۔ سپین کی ندیوں میں ہر طرف چمڑے کی ہلکی کشتیاں دوڑنے لگیں۔ وادیوں میں ہرے ہرے گندم کے کھیت زیادہ دور تک پھیل گئے۔ پہاڑوں سے قیمتی دھاتیں گدھوں کے پالانوں اور بیل گاڑیوں میں پہلے کی نسبت سہہ گنا زیادہ لائی جانے لگیں۔ جنوبی سپین قرطاجنہ کو بڑی مقدار میں چاندی بھیجتا تھا۔

کوہ مغرب کا جدید نام کوہ الپس تھا، کوہ الپس اطالیہ اور سپین کے درمیان حد فاصل تھا۔ قرطاجنی سپین آئے تھے۔

گوبال انہی قرطاجنیوں میں سے ایک تھا۔ وہ دو تین نسلوں سے کوہ الپس کے مغربی حصے پر قابض تھا اس نے اپنا رابطہ قرطاجنہ سے توڑ دیا تھا۔ وہ سپین کی زمین پر ہی پیدا ہوا تھا۔ لیکن آج تک کبھی قرطاجنہ نہ گیا تھا۔ وہ بڑا ہوا تو اس نے ایک پہاڑی لڑکی سے شادی کر لی اور پھر اسی لڑکی کے کہنے پر اس نے باقی فینیقیوں کے ساتھ تعلق توڑ دیا۔ چند ایک فینیقی نوجوان جو اس کے دوست تھے اس کے ہمراہ اندرونی سپین چلے آئے۔ اندرونی سپین میں گھسنا فینیقیوں کی عادت نہ تھی۔ وہ ساحلوں پر رہ کر ہی تجارت کیا کرتے۔ لیکن گوبال ایک ساحلی باشندہ ہونے کی بجائے اب ایک پہاڑی باشندہ بھی بن چکا تھا۔ اس نے اپنے سسرالی خاندان کے ساتھ مل کر پہاڑی سپینیوں کی ایک فوج بنائی۔ الپس پر قلطی قوم آباد تھی۔ قلطی اپنے آپ کو رومیوں کا ساتھی اور جاہل سپینیوں کو دشمن سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گوبال نے سپینیوں کی فوج سے مغربی الپس پر آباد قلطیوں کا صفایا کر دیا۔ اس نے ہیرے کی چند ایک کانیں ڈھونڈ لیں اور دن رات اپنی دولت بڑھانے لگا۔ گوبال نے جس زندان میں تیرہ قلطی سرداروں کو قید کر رکھا تھا، وہ صدیوں پہلے کسی قوم نے تراشا تھا۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں مشہور تھیں۔ اسے زندان کی شکل دینے والا گوبال خود تھا۔ اسی نے ہر کوٹھڑی میں لوہے کی سلاخیں نصب کروائی تھیں۔ اس سے قبل تو وہ ایک لمبی غار تھی۔ جس کے دائیں بائیں تراشی گئی کوٹھڑیاں تھیں۔ سب کچھ پرانے پتھر کا تھا۔ لیکن کوٹھڑیوں کے فرش میں کچی مٹی ڈالی

گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قبل از تاریخ کے انسانوں میں سے کسی نے اس غار کو اپنی رہائش بنا رکھا ہو۔

گوبال کو اپنے فینیقی ہونے پر تو فخر تھا۔ لیکن اسے قرطاجنہ والوں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سنتوش قرطاجنی ہے۔ اصل واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ قلطیوں کی ایک کان میں گوبال کے آدمی چوری کے لیے گھسے۔ انہوں نے پہریداروں کو مار دیا۔ جن میں سے ایک کو مرتے ہوئے سنتوش نے بھی دیکھا تھا۔ لیکن ایک پہریدار فرار ہو گیا۔ اسی کی تلاش میں دو چار جاہل فینی باہر کو نکل کھڑے ہوئے اور ایک دو وہیں رہ گئے۔ سنتوش نے جس وقت عمارت کو دیکھا تو اس کے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت اندر موجود دو فینی قلطی پہریداروں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے پہریداروں کو قتل کر دیا اور نیچے کان میں پھینک دیا۔ صرف ایک ادھ مرا پہریدار باہر پڑا رہ گیا۔ جنگلی درندے کا اتفاقاً خاتمہ کرنے کے بعد جب سنتوش عمارت میں داخل ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ یہاں چوری ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ وہاں سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ جاہل فینی واپس لوٹ آئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لڑکا پہریدار کا قاتل نہیں۔ قاتل تو وہ خود تھے۔ لیکن سنتوش یہ سمجھا کہ یہ کان کے مالک ہیں اور سنتوش کو چوروں کا ساتھی اور پہریدار کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ سنتوش نے اپنی طرف سے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے قرطاجنی زبان کے الفاظ سن کر گوبال کے بھیجے ہوئے فینی حیران رہ گئے۔ انہوں نے اسے اپنے سردار کے لیے ایک تحفہ سمجھا اور بے ہوش کر کے گوبال کے سامنے لے گئے۔ گوبال کو بھی یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ ایک نوعمر قرطاجنی کو کہاں سے اٹھا لائے۔ گوبال اسے فوری طور پر ہوش میں لا کر اپنے پاس رکھ لینا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی چالاک بیوی نے اسے ایک نئی راہ سجھائی اور یہ راہ بہت عجیب تھی۔ گوبال کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس طرح تو واقعی وہ اپنے زندان میں گرفتار قلطی سرداروں سے ہیرے کی کانوں کے پتے اگلوا سکتا تھا۔ گوبال کی بیوی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ "اس لڑکے کو زندان میں قید قلطی سرداروں کے ساتھ بند کر دیا جائے۔

کئی ماہ کی قید کے بعد جب "اس لڑکے کی دوستی ان سرداروں سے ہو جائے گی تو ایک قرطاجنی ہونے کے ناطے ہم اسے اپنے دام میں لے سکیں گے۔" اور یوں ہی کیا گیا۔ گوبال نے اپنی بیوی کی بات مانی اور بیچارے سنتوش کو قلطی سرداروں کے ساتھ قدیم زندان

میں قید کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام قلطی قیدی سردار یہ جان کر حیران رہ گئے تھے کہ گوبال نے آخر ایک فینیقی کو کیوں قید کیا؟ گوبال کی بیوی روز کے روز زندان کی خبروں پر نظر رکھتی تھی۔ وہ بہت لالچی عورت تھی۔ اسے چھپی ہوئی کانوں اور ان میں موجود ہیروں کے حصول کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اچانک ایک دن اس کے دل میں ایک اور ترکیب آئی۔ دراصل زندان کے قیدیوں کے ساتھ رہ کر ہیروں کی کانوں کے پتے ملنے میں زیادہ وقت لگ سکتا تھا اور گوبال کی بیوی جو پہلے کئی سال سے ان ہیروں کے لیے جنونی ہوئی تھی، مزید انتظار نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی نئی ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ نئی ترکیب کیا تھی؟ قلطی قوم کی ایک نوجوان لڑکی جس کا نام ''شوزینہ'' تھا اور جو ایک ایسے قلطی سردار کی بیٹی تھی جو گوبال کی قید میں سالوں سے ایک وحشی جیسی زندگی گزار رہا تھا، گوبال کے ہاتھ لگ گئی۔ شوزینہ کی اپنی الگ کہانی تھی۔ جو مختصراً یہ تھی کہ آج سے بیس برس قبل جب الپس کے اس حصے پر پینی جاہلوں نے گوبال کی قیادت میں یلغار کی تو ایک سردار کے بیوی بچے کسی نہ کسی طرح بچ گئے اور دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے پہاڑ کی دوسری طرف موجود دیگر قلطی قبائل میں جا پہنچے۔ شوزینہ وہی بچی تھی جو پانچ سال کی عمر میں اپنے ننھے قدموں سے چل کر اس موت سے فرار ہوئی تھی۔ اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ اس کا باپ گوبال کے ہاتھوں مارا نہیں گیا بلکہ قید کر لیا گیا تھا۔ وہ جوان ہوئی تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے باپ کو گوبال کی قید سے چھڑائے گی۔ اسی ارادے کو لے کر وہ اپنے باپ کی رہائی کے لیے نکلی۔ اپنے پرانے گاؤں پہنچی۔ جہاں اب گوبال کی حکومت تھی اور اس نے مختلف طریقوں سے اپنے قیدی باپ کو چھڑانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ٹھیک اس وقت گرفتار کر لی گئی جب وہ زندان میں پہنچ چکی تھی۔ اور اپنے سردار باپ سے سلاخوں کے پار سے ہی مل کر بات کر رہی تھی۔ گونگے پہریداروں نے اسے گرفتار کر لیا اور گوبال کے پاس لے آئے۔ گوبال کی بیوی کا خیال تھا کہ اس لڑکی نے جب اپنے باپ سے ملاقات کی ہوگی تو اس کے باپ نے اسے ہیروں کی کانوں کے پتے بتائے ہوں گے۔ چنانچہ گوبال کی بیوی نے شوزینہ کو الگ قید میں رکھا اور طرح طرح کی اذیتوں کے ذریعے اس سے کانوں کے پتے پوچھنے لگی۔ شوزینہ کا باپ وہی قیدی تھا جو زندان میں سنتوش کی کوٹھڑی کے عین سامنے والی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ گوبال کی بیوی کو سب سے زیادہ شک اسی سردار پر تھا کہ وہ ہیروں کی کانوں کے پتے جانتا ہے۔ گوبال کی بیوی کو سب

سے زیادہ شک اسی سردار پر تھا کہ وہ ہیروں کی کانوں کے پتے جانتا ہے۔ سنتوش کو اس کے سامنے والی کوٹھڑی میں قید کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ لیکن اب گوبال کی بیوی کو یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر وہ سنتوش کو اس سردار کا دوست بنوانے کی بجائے شوزینہ کے ساتھ قید کر دے تو زیادہ جلدی ہیروں کی کانوں کے پتے حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اس خیال پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ نوعمر قرطاجنی لڑکے کو زندان سے نکال کر دوسری عمارت میں لے جائیں جہاں شوزینہ کو رکھا گیا تھا۔ چنانچہ سنتوش کو زندان سے نکال لیا گیا۔

سنتوش کے لیے یہ ایک انوکھی خبر تھی۔ اس نے یہی سمجھا کہ گوبال کو اس کے قرطاجنی ہونے کا علم ہو چکا ہے اور اس لیے اسے رہا کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب اسے سلاخوں والے دروازے سے باہر نکالا گیا تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ تمام قیدی قلطی سردار اپنی اپنی سلاخوں کے پاس آ کر ٹھہر گئے اور حیرت، استعجاب اور شور شرابے کے ساتھ اس کی رہائی کا منظر ملاحظہ کرنے لگے۔ سنتوش کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لایا گیا۔ علاقے سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ بالکل اندازہ نہ کر سکا کہ کہاں کہاں سے گزر رہا ہے۔ اسے پھر ایک عمارت میں لایا گیا تو اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ پرانی طرز کی ایک بوسیدہ عمارت تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ علاقہ کوہ الپس کا دل تھا۔ اسے چلنے کے لیے کہا گیا۔ عمارت کئی بڑے بڑے کمروں، راہداریوں اور برآمدوں پر مشتمل تھی۔ الپس کی اقوام کو کان کنی نے برفیلے پہاڑوں میں رہتے ہوئے بھی دولت مند بنا دیا تھا۔ اسے ایک طویل راہداری سے گزارنے کے بعد ایک کمرے میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ کمرہ کھلا تھا۔ اس نے اندر قدم رکھا تو کمرہ خالی تھا۔ سپاہیوں نے اسے ایک طرف رکنے کا اشارہ کیا اور ان میں سے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر کمرے کی ایک دیوار میں نصب سپینیوں کے کسی دیوتا کی مورتی دونوں ہاتھوں سے پکڑی اور کھینچ کر دیوار سے باہر نکال لی۔ مورتی دیوار میں اس طرح نصب تھی کہ دیوار میں موجود خفیہ راستے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ مورتی ہٹتے ہی ایک خفیہ راستہ دکھائی دیا۔ یہ ایک تہہ خانے کا راستہ تھا۔ ایک شمشیر بردار سپاہی اس کے آگے اور دو پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ تہہ خانہ تاریک نہیں تھا۔ جانے کہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ تہہ خانے میں ایک قطار کے اندر تین بڑے بڑے

کمرے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک کمرے کے باہر ایک مسلح اور چاک و چوبند پہریدار بنچ پر بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سنتوش کے ہمراہ آنے والے سپاہی کو جھک کر سلام کیا۔ انہوں نے چینی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ تب پہلے سے موجود مسلح شخص نے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے لوہے کی زنجیر ہٹادی۔ سنتوش کو کھینچ کر دروازے کے قریب لایا گیا اور پھر اسی مسلح شخص نے اسے اندر دھکا دے دیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ سنتوش چونکہ اس غیر متوقع دھکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے فرش پر جا گرا۔ یہ کمرہ سازوسامان سے بالکل خالی تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ کوئی گٹھڑی سی پڑی تھی۔ سنتوش نے غور کیا تو وہ کوئی عورت تھی۔ جو گھٹنوں میں سر دیئے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے اندر آ کر گرنے کے شور نے بھی اس لڑکی کو متوجہ نہ کیا۔ سنتوش کو بے حد حیرت ہوئی کہ آخر اسے ایک لڑکی کے ساتھ کیوں قید کر دیا گیا۔ معاً اسے اپنی شیتل کا خیال آیا اور وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس لڑکی کے بال بے طرح بکھرے اور الجھے ہوئے تھے اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ یہ شوزینہ تھی۔ شوزینہ کے پیروں پر سنتوش کی نظر پڑی تو اس کے منہ سے ”سی“ کی آواز نکل گئی۔ اس کے پیر بری طرح زخمی تھے۔ شاید اسے دہکتی ہوئی سلاخوں سے داغا گیا تھا۔ سنتوش کے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ بہت بری طرح تشدد کا نشانہ بنائی گئی تھی۔ سنتوش کو خیال آیا کہیں وہ مر ہی نہ گئی ہو۔ کیونکہ اس نے ابھی تک لڑکی میں کوئی ہلکی سی حرکت بھی محسوس نہ کی تھی۔ سنتوش اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے بیٹھے سنتوش کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی اور اس نے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی شوزینہ کے کندھے کو ہولے سے چھوا۔

”سی......“

اس کی سسکاری نکل گئی۔ ظالموں نے اس نازک پھول کو اس طرح مسلا تھا کہ سنتوش سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ سنتوش کے ہاتھ لگانے سے اس نے سر اٹھایا اور حیرت سے اسے گھورنے لگی۔ اس کا چہرہ سامنے آیا تو سنتوش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یوں لگا جیسے جنت کی کسی حور کو جہنم کے فرشتوں نے اغوا کر کے وحشت کا نشانہ بنایا ہو۔ اس کا چہرہ ریشم کی طرح ملائم اور اس پر کٹورے جیسی بڑی بڑی نیلی آنکھیں، جیسے برفباری میں جھیل کا منظر۔ سچ مچ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے نرم ہونٹ اس طرح کٹے پھٹے تھے جیسے کسی نے انہیں

بھنبوڑا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کے ساتھ ساتھ نفرت کے شعلے بھی سنتوش نے محسوس کیے۔ سنتوش کی نظریں اس کے گریبان پر پڑیں تو وہ چونک گیا جواں سینے کے مخروطی ابھاروں پر سے اس کا لباس پھٹ چکا تھا اور اس کی چھاتیوں کو اتنی درندگی سے داغا گیا تھا کہ وہاں کا گوشت جل کر ناسور کی سی شکل اختیار کر چکا تا۔ اس کے زخموں سے پیلے رنگ کا پانی رستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

افسوس!...... یہ حال کس نے کیا تمہارا؟''

سنتوش کو اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اس نے سنتوش کو کوئی جواب دینے کی بجائے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ شاید اس کی وجہ سنتوش کی زبان تھی۔ کیونکہ شوزینہ اتنا تو جانتی تھی کہ گوبال فینقی ہے۔ وہ خاموش رہی۔ سنتوش نے پھر پوچھا۔

''تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں قید ہو؟ مجھے بتاؤ! میں خود ایک بدنصیب قیدی ہوں۔ تمہارا دشمن نہیں۔''

شوزینہ نے شعلہ بار نگاہوں سے پھر سنتوش کو گھورا اور کہا۔

''میں تم لوگوں کے کسی جال میں نہیں آؤں گی۔ تم میرے بدن کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کر دو...... تب بھی۔''

''وہ درد کی شدت سے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بول رہی تھی۔ سنتوش بار بار اپنی شیتل کو یاد کرتا اور یہی سوچتا کہ اس کا بھی کسی نے ایسا حال نہ کر دیا ہو۔ اس نے اپنے لہجے کو خلوص سے بھرتے ہوئے پھر پوچھا۔

''میں تم سے تمہارا غم پوچھ رہا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں میں تمہارا دشمن نہیں۔ بے شک میں قرطاجنہ کا رہنے والا ہوں۔ لیکن تم میرا یقین کرو۔ میں خود گوبال کا قیدی ہوں۔''

شوزینہ نے بدستور اسی لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے سنتوش کی بات کا یوں جواب دیا:۔

''میں جانتی ہوں تمہیں میرے ساتھ اس لیے قید کیا گیا ہے تاکہ تم مجھ سے ہیروں کی کانوں کا راز اگلوا سکو۔ لیکن میں خود نہیں جانتی کہ وہ کانیں کہاں ہیں۔ تم لوگوں نے میرے باپ کو بیس سال سے قید کر رکھا ہے۔ تم دیکھنا تم فینیقیوں پر ایشور کا قہر نازل ہوگا۔''

اب سنتوش کو سمجھ آئی کہ گوبال نے اسے رہا نہیں کیا تھا بلکہ اپنے مطلب کے لیے

ایک قلطی دوشیزہ کے ساتھ بند کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں گوبال کی چالاکی پر ششدر رہ گیا۔ تب اس نے نہایت سچائی کے ساتھ کہا۔

''مجھے دیوتاؤں کی قسم یہ بات میں نہیں جانتا تھا۔ ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو اور یقیناً درست ہوگا۔ لیکن میں تم سے کسی کان کا پتا نہیں پوچھنے والا۔ تمہاری ایک بات نے ہی مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی اسی زندان سے نکال کر لایا گیا جس میں تمہارے بابا قید ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان میں کون تمہارا باپ تھا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ لوگ گوبال کو کبھی بھی کانوں کے پتے نہیں بتائیں گے۔ میں خود ایک عرصے سے مصائب کا شکار ہوں۔ تم چاہو تو میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا۔ تم مجھ سے بالکل نہ ڈرو۔ میں تو اپنی شیتل کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ وہی میری ہیرے کی کان ہے۔ مجھے اور کسی ہیرے کی ضرورت نہیں۔''

پہلی مرتبہ شوزینہ نے باقاعدہ سنتوش کا جائزہ لیا۔ اب وہ اس نوعمر لڑکے کی باتوں پر کچھ کچھ یقین کر رہی تھی۔ جب شوزینہ نے یہ سنا کہ وہ اس کے باپ کے پاس سے ہو کر آیا ہے تو وہ اور زیادہ متجسس ہوگئی۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''کیا تم نے میرے بابا کو دیکھا؟ وہ دراز قد ہیں۔ ان کا نام ''ڈایودورس'' ہے۔ اونچی ناک اور چوڑے چکلے شانوں والا قیدی۔ تم نے دیکھا۔ وہی میرے بابا ہیں۔''

''ڈایودورس؟ ہاں میں اسی سردار کی کوٹھڑی کے سامنے والی کوٹھڑی میں قید تھا۔ اور اسی کے ساتھ میری سب سے زیادہ باتیں ہوئیں۔ وہ بہت غصیلا آدمی ہے۔ پہلے دن اس نے مجھے بہت گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں دھیرے دھیرے وہ میرا دوست بن گیا۔''

شوزینہ نہایت تجسس کے ساتھ سنتوش کی باتیں سننے لگی۔ وہ اپنے بابا کے بارے میں اور بہت کچھ بھی پوچھنے والی تھی۔

اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھل چکے تھے۔ سنتوش شوزینہ کو اور شوزینہ سنتوش کو اپنی اپنی کہانی سنانے لگے۔ شوزینہ سنتوش سے عمر میں لگ بھگ دس سال بڑی تھی۔ اسی طرح کافی وقت گزر گیا۔ بالآخر سنتوش نے اس سے کہا۔

''میں تو بھگوان کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس بھیانک زندان سے نکالا۔ اب میں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ اگر تم چاہو تو ہم دونوں مل کر یہ کوشش

کر سکتے ہیں۔"

اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔ شوزینہ نے فوراً حامی بھر لی۔ لیکن پھر یکایک وہ اداس ہو گئی۔

"لیکن میں تو اٹھ کر چل بھی نہیں سکتی۔ میں بہت زخمی ہوں۔ اب تو بس موت کا انتظار ہے۔ میرے جسم کا ہر حصہ سلاخوں سے داغا گیا ہے۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت گال بھی پھٹے ہوئے تھے اور ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ سنتوش نے اسے تسلی دی۔

"تم فکر مت کرو، دیوتا ہماری مدد کریں گے۔ ہم دونوں مل کر کوئی اچھا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے تمہاری حالت کا ٹھیک ہونا ضروری ہے اگر یہ بات ہے کہ گوبال نے مجھے تمہارے ساتھ اس نیت سے قید کیا ہے تاکہ میں تم سے کانوں کے پتے اگلوا سکوں تو پھر ہمارے لیے منصوبہ بنانا اور بھی آسان ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آ رہی ہے۔ اگر تم کہو تو تمہیں بتاؤں۔"

شوزینہ توجہ سے سنتوش کی بات سن رہی تھی۔ اس نے ہاں کہنے کے انداز میں سر ہلایا۔ تو سنتوش نے اس سے کہا۔

"تم انہیں کہہ دو کہ تم کانوں کا پتا بتانے کے لیے تیار ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے تمہاری صحت بحال کریں۔ اس طرح یہ لوگ کسی طبیب کا بندوست کریں گے۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

شوزینہ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے سنتوش کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں کانوں کا پتا نہیں جانتی۔ کیا وہ میرا جھوٹ پکڑ نہ لیں گے۔"

یکایک سنتوش کے ذہن میں جھماکہ ہوا اور اس کا چہرہ پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے شوزینہ کی طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ! کیا گوبال نے تمہیں تمہارے بابا کے سامنے اذیتیں دی ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ اگر وہ ایشور نہ کرے تمہارے بابا کے جذبۂ پدری کا ناجائز فائدہ

اٹھانا چاہیں تو کیا ہوگا؟ اگر ایسا ہوا تو تمہارے بابا کانوں کے پتے بتانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"نہیں! میرے بابا کبھی نہیں بتائیں گے۔ وہ مجھے مرنے دیں گے لیکن گوبال کے آگے سر نہیں جھکائیں گے۔ بہرحال تمہاری بات میں وزن ہے۔ ٹھیک ہے میں یہ جھوٹ بولنے کے لیے تیار ہوں۔"

اب وہ ایک دوسرے کا نام جان چکے تھے۔ سنتوش نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور شوزینہ سے کہا۔

"اٹھو! میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کرو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم چل سکنے کے قابل ہو یا نہیں......شاباش! اٹھو!"

نوعمر سنتوش کے مربیانہ لہجے کا اثر تھا یا کچھ اور کہ شوزینہ نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے حسین چہرے پر ایسی ملکوتی مسکراہٹ بکھر گئی جیسے کوئی نوعمر بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑنے سے پہلے مسکراتا ہے۔ سنتوش نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ اور وہ حیرت انگیز طور پر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سنتوش نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے میں ٹہلانا چاہا۔ وہ بالکل اس بچے کی طرح چل رہی تھی جو پہلے پہل چلنا سیکھتا ہے۔ وہ مسلسل کراہ رہی تھی۔ سنتوش نے اسے مبارکباد دی۔

"شوزینہ!......تم ٹھیک ہو۔ تم چل سکتی ہو۔ تمہارے زخم جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

کچھ دیر بعد سنتوش نے اسے پھر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ بیٹھتے ہی بولی۔

"ہاں شاید!......شاید تمہاری وساطت سے میں ٹھیک ہو جاؤں۔"

شوزینہ کے لہجے میں ممنونیت تھی۔ اب سنتوش اور شوزینہ اپنے اپنے دکھ کی وجہ سے ایک دوجے کے دوست بن چکے تھے۔

شام ہونے سے پہلے شوزینہ نے سنتوش کے ساتھ مل کر منصوبے پر عمل کا آغاز کر دیا۔ سنتوش نے اپنے قید خانے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ باہر موجود مسلح شخص نے باہر سے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تکلیف ہے؟"

سنتوش نے اسے جواب دیا۔

''کوئی تکلیف نہیں۔ یہ لڑکی مر رہی ہے۔ اس کا علاج کرو۔ کسی طبیب کو بلاؤ۔''
''مرنے دو! جب تک یہ راز نہیں اگلتی اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔''
''یہ راز اگلنے کے لیے تیار ہے۔ تم جلدی سے کسی طبیب کو بلاؤ۔''
باہر خاموشی چھا گئی۔ شوزینہ نے نقاہت آمیز انداز میں سنتوش کی طرف مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ شوزینہ کی آنکھوں کی جھیل سے پانی اچھل اچھل کر باہر آ رہا تھا۔ سنتوش کو پھر شیتل یاد آ گئی۔ اس کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ اچانک دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی اور اگلے لمحے دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ دوسری طرف تین مسلح نوجوان نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ وہ اندر کمرے میں چلے آئے۔ ان کا رخ سیدھا شوزینہ کی طرف تھا۔ ان میں سے ایک نے فرش پر بیٹھی شوزینہ کو پیر کے ٹھڈے سے ہلایا اور سوال کیا۔
''کیا تم ہیروں کی کانوں کے پتے بتانے کے لیے تیار ہو؟''
شوزینہ نے سر اوپر اٹھایا اور نہایت تکلیف زدہ چہرے کے ساتھ جواب دیا۔
''ہاں!''
تینوں مسلح نوجوانوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں تھمی ایک پوٹلی سی سنتوش کی طرف اچھال دی۔ سنتوش کچھ نہ سمجھا۔ لیکن پھر بھی اس نے پوٹلی اچک لی۔ اگلے لمحے وہ تینوں مسلح اشخاص مزید کوئی بات کیے بغیر واپس جا رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سنتوش نے پوٹلی کھول کر دیکھی۔ اس میں طبی سامان تھا۔ سنتوش اگرچہ دواؤں کے استعمال کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا لیکن پھر بھی اس نے مرہم اور کھانے کی دوائیاں الگ الگ کر لیں۔
اس نے شوزینہ کے زخم ایک دوائی کے ساتھ اچھی طرح صاف کیے۔ ان میں سے پیپ نکالی اور پھر اس کے جسم پر جگہ جگہ مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس کام کے دوران اسے ہر لمحہ شیتل کی یاد ستاتی رہی۔ کیونکہ ایک مرتبہ شیتل نے بھی اس کے نازک حصوں پر مرہم لگایا تھا۔ یہ تمام کام مشکل تھا۔ لیکن سنتوش نے کر دکھایا۔ درد کی وجہ سے شوزینہ کی چیخیں اور کراہیں بھی مسلسل ابھرتی رہیں۔ لیکن اس نے پھر بھی خاصے صبر سے کام لیا۔ زخم پر مرہم لگانے کے دوران جب وہ درد سے کراہتی تو سنتوش اسے بچوں کی طرح پچکارتا اور نہایت پیار سے کہتا۔
''بس تھوڑی دیر اور۔ تم بہت پیاری ہو، تم بہت بہادر ہو۔''

نہ جانے کیوں سنتوش کے لہجے نے قلطی دوشیزہ کو جذباتی کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سنتوش کے شانے تھام لیے۔

"تم مسیحا ہو!"

سنتوش کو یوں لگا جیسے اس کے سامنے اس کی اپنی شیتل کھڑی ہو۔ وہ ابھی کم عمر تھا۔ پیار کی رمزیں نہ جانتا تھا۔ شوزینہ پر بھی ویسے ہی فدا ہونے لگا جیسا شیتل پر تھا۔ معاً سنتوش نے شوزینہ سے کہا۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"ہاں! مجھے بھی یوں لگتا ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار، ممنونیت اور جذبۂ تشکر تھا۔ دونوں دیوار کی اوٹ لے کر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ سنتوش نے اتنی کم عمری میں ایسی ایسی دنیائیں دیکھ لی تھیں کہ اب اس کے چھوٹے منہ سے بڑی بڑی باتیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"شوزی!...... انسان نے خود کو ایک دوسرے سے بہت دور کر رکھا ہے۔ دیکھو! شکل وصورت کے حوالے سے ہم سب ایک جیسے ہیں۔ جنگل میں جانوروں کی ایک نوع کس طرح اکٹھی رہتی ہے۔ اور اگر کبھی ایک نسل کے جانور آپس میں لڑتے ہیں تو نوبت قتل تک نہیں پہنچتی۔ ہم انسان کیوں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ کیا ہم جانوروں سے بھی بدتر ہیں؟"

شوزینہ بہت حیران ہو رہی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر کا لڑکا، کتنی حکمت بھری بات کر رہا تھا۔ اس نے سنتوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہاں!...... جانور تو ہلکی پھلکی غراہٹوں سے کام چلا لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو پنجے مار کر رک جاتے ہیں۔ لیکن انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اپنی ہی نوع کے افراد کو قتل کرتی ہے۔ جان سے مار دیتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اس لیے تم اجنبی نہیں ہو، نہ ہی میں تمہارے لیے اجنبی ہوں۔"

شوزینہ کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ سنتوش نے پھر کہا۔

شوزی!...... انسان سارے وہی کام کرتے ہیں جو جانور بھی نہیں کرتے۔ شوزی

میں نے اپنی زندگی کے گزشتہ مشکل دنوں میں سب سے زیادہ کون سا کام کیا ہے بتاؤں؟؟......سوچا ہے۔ میں ہر وقت سوچتا رہا۔ میرا باپ قرطاجنہ کے سب سے بڑے مندر ملکرت کا مہاپجاری ہے۔ میں نے مندر کی اور دھرم کی سب تعلیمات حاصل کر رکھی ہیں۔ میرا باپ چاہتا تھا کہ میں مہاپرش بنوں۔ اس کی خواہش تھی کہ میں ایشیا میں واقع فینیقیوں کے قدیم شہر صور کے کھنڈرات میں لمبی تپسیائیں کروں۔ آباؤاجداد کی روحوں کے سامنے لمبی لمبی پرارتھنائیں کروں۔ اور تمام دھارمک مشقتوں کے بعد میں قرطاجنہ کا مہاپرش بن جاؤں۔ وہ اس لیے ایسا چاہتا تھا تاکہ دھرم کا سب سے بڑا عہدہ اس کے بیٹے کو ملے۔ لیکن اب سوچتا ہوں۔ ان مصائب اور مشقتوں کے مقابلے میں تپسیائیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ میں نے سچ اور جھوٹ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

انسان طبعی زندگی کے حوالے سے ضرور جانور ہے۔ لیکن معاشرتی زندگی اسے جانوروں سے ممتاز کردیتی ہے۔ تم دیکھو! بطخ کا بچہ پانی میں تیرتا ہے۔ مرغی کا بچہ نہیں تیرتا۔ بلی سے، سانپ سے، چیل سے ڈر کر مرغی کا بچہ ماں کے پروں تلے چھپ رہتا ہے۔ شیر گھاس نہیں کھاتے، بکری گوشت نہیں کھاتی، اور اس کے برعکس انسان' انسان کا بچہ نہ سانپ سے ڈرتا ہے نہ آگ سے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے تجربے کی بنیاد پر نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے لیکن پھر بھی وہ جانوروں سے بدتر حرکتیں کرنے پر کیوں مجبور ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے شوزی!''

سنتوش کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے سر گھما کر شوزی کو دیکھا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سنتوش کو گھور رہی تھی۔

''سچ بتاؤ! تم انسان ہو، مجھے تو تم دیوتا لگتے ہو۔ یا دیوتاؤں کے اوتار۔ میں نے تو سنا ہے کہ ایسی باتیں ملک یونان کے لوگ کرتے ہیں۔ جو دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔''

سنتوش ابھی تک دکھ سے باہر نہیں آیا تھا۔ اس کا لہجہ اب بھی بہت مغموم تھا۔

''مجھے انسان بہت بھیانک لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے والا۔ انسان، انسان کو ختم کردے گا ایک دن۔ لیکن پھر سوچتا ہوں شاید کوئی ایسا انسان آئے جو لوگوں کو اچھائی کا راستہ دکھا سکے۔''

شوزی کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ششدر تھی۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز

کے ساتھ کہا:۔

''مجھے تمہارے ساتھ ہونے پر ایک عجب سے تحفظ کا احساس ہو رہا ہے۔ اب مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں وہ لوگ مجھے تم سے الگ قید نہ کر دیں۔''

''گھبراؤ مت! کسی سہارے کا انتظار مت کرو۔ سہارے آدمی سے استقامت چھین لیتے ہیں۔ میری وجہ سے تحفظ محسوس مت کرو۔ خود اپنی وجہ سے کرو۔ ہم اکٹھے ہی فرار ہوں گے۔ لیکن پھر بھی تم سمجھو کہ تمہیں یہاں سے اکیلے ہی نکلنا ہے۔''

آج سنتوش پہلی بار بول رہا تھا۔ اس کی مسین مشکل سے بھیگی تھیں۔ یہ عمر اور یہ دانائی، یہ سب کچھ اسے گہرے دکھ کی بدولت ملا تھا۔

دوسرے دن گوبال نے خود درشن دیئے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوبال تو خاموش رہا لیکن اس کی چالاک بیوی نے طرح طرح کے سوال کر کے شوزی کو الجھا دیا۔ شوزی ہر سوال کے جواب میں یہ کہتی رہی...... ''میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی اور اب آپ لوگوں کے ساتھ چل کر آپ کو وہ نشانیاں سمجھاؤں گی، جو میرے باپ نے مجھے سمجھائیں۔......

خلاف توقع گوبال اور اس کی بیوی چلے گئے۔ حالانکہ سنتوش بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا کہ اس کا فیقیقی بھائی شوزی کے ساتھ سوال و جواب سے فارغ ہوتے ہی اس کی طرف التفات کرے گا۔ نہ جانے سنتوش نے کیا کیا سوچ رکھا تھا کہ وہ گوبال سے کہے گا۔ لیکن گوبال کی چالاک بیوی مسلسل بولتی رہی اور جب اس کی باتیں ختم ہوئیں تو وہ واپس چل دیئے۔ جب وہ جانے لگے تو سنتوش نے گوبال کو مخاطب کرنے کیلئے پکارا۔ لیکن گوبال نے اس کی آواز سنی ان سنی کر دی۔ اور قید خانے سے نکل گیا۔

حقیقت میں شوزی اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ایک دن اس نے سنتوش سے کہا:۔

''اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔ میں پوری طرح صحت یاب ہوں اور تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

سنتوش تو پہلے سے ہی ہر وقت فرار کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ عمارت اس نے سرسری طور پر دیکھی تھی اور ویسے بھی وہ ایک تہہ خانے میں قید تھا۔ اچانک اس کا ذہن اسی روشنی کی طرف گیا جو پورے تہہ خانے کو دن کے وقت روشن رکھتی تھی۔ وہ سوچنے لگا، سورج کی

یہ روشنی تہہ خانے میں کہاں سے داخل ہوتی ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چھت کو دیکھنے لگا۔ کمرے کی چھت زیادہ روشن تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کمرے میں کوئی روشندان نہیں تھا۔ کمرے کا اکلوتا داخلی دروازہ جس دیوار میں تھا اس دیوار کے آخری سرے سے روشنی چھن چھن کر کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ یہاں لمبائی رخ ننھے ننھے سوراخ تھے۔ لیکن یہ روشنی تہہ خانے میں کسی طرح ڈالی گئی۔ اچانک سنتوش کے ذہن میں دواؤں کی پوٹلی کا خیال آیا۔ اس میں زخموں کو جلانے کی غرض سے چقماق بھی موجود تھا۔ یک لخت سنتوش نے شوزی کو متوجہ کیا۔

شوزی! تم تیار ہو ہم آج ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔'' اس نے تیز لہجے میں شوزی کو اپنا منصوبہ سمجھانا شروع کردیا۔ شوزی اس کی حکمت عملی سن کر حیران رہ گئی۔ دن حسب معمول گزر گیا اور رات آ گئی۔ رات ہوتے ہی دونوں مستعد ہوگئے۔ دونوں ننگے پاؤں تھے اور قید سے چھٹکارا پانے کی خوشی میں پر جوش۔ رات جب آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ تو وہ ایشور کا نام لے کر دروازے کے قریب آئے اور دواؤں کی پوٹلی میں رکھی ہندوستانی کپاس کو چکماک سے آگ لگا دی۔ سنتوش نے زخموں پر لگانے والا تیل لکڑی کے دروازے پر انڈیلا اور اسے شعلہ دکھا دیا۔ شوزی کے چہرے پر سنسنی کی شدت تھی۔ سنتوش نے مسکراہٹ اچھال کر اسے تسلی دی۔ جلد ہی لکڑی کا دروازہ دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ سنتوش نے شوزی کو کھانسنے سے منع کیا اور خود بھی اپنی گردن پر ہاتھ ملنے لگا۔ وہ دونوں چوبی دروازے کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ چمٹے کھڑے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ آگ بھڑکتے ہی مسلح پہریدار شور مچادے گا اور انہیں آدھے جلے اور آدھے ٹوٹے دروازے کو دھکیل کر ہی اسے دبوچنا پڑے گا۔ وہ ایسی ہر صورت کے لیے تیار تھی۔ لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پہریدار شاید سو رہا تھا۔ اور دروازہ پورا جل جانے کے بعد بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ دراصل دروازہ جلنے سے جو روشنی یا حرارت پیدا ہوئی وہ پہریدار کو جگانے کے لیے ناکافی تھی۔ کیونکہ وہ دروازے کے عین سامنے نہیں تھا بلکہ چند قدم دور راہداری کی دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ وہ انتہائی احتیاط کے ساتھ چلتے ہوئے دروازے سے نکل آئے۔ تہہ خانے میں موجود نمی کی وجہ سے بھی آگ کے شعلے کڑکڑاہٹ پیدا کررہے تھے۔ وہ جیسے ہی راہداری سے واپس آئے پہریدار نیند کی حالت میں کسمسایا۔ سنتوش کا پورا بدن یک لخت تن گیا۔ سنتوش نے تیزی سے آگے بڑھ کر پہریدار کی تلوار اٹھالی۔ اب سنتوش اپنی لگائی ہوئی آگ خود ہی بجھانے کی کوشش کررہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ آگ پھیل جائے۔

وہ جلد ہی اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ معاً ایک خیال کے تحت سنتوش نے پہریدار کے ساتھ رکھے اس کے جوتے بھی اٹھا لیے۔ وہ پہریدار غضب کی نیند میں غرق تھا۔ یہ تمام کام شوزی اور سنتوش نے آناً فاناً بھگتائے۔ اب وہ دونوں واپسی کے راستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راہداری کے اختتام پر زینے تھے۔ جو اوپر جا کر اسی دروازے پر ختم ہوتے تھے جس کی پرلی طرف سپینیوں کے کسی دیوتا کی مورتی نصب تھی۔ وہ راہداری میں چل کر پہلے زینے کے قریب پہنچے تو سنتوش کو ایک کمرہ نظر آیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے زینے پر قدم رکھنے سے پہلے کمرے کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔ کمرہ تاریک تھا اور ان کے پاس روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کیے بغیر کمرے میں داخل ہوگیا۔ مکمل خاموشی سے اس نے اندازہ لگایا کہ کمرہ خالی ہے۔ شوزی اس کے عقب میں تھی۔ راہداری میں لگی مشعل کی روشنی کی وجہ سے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔ ویسے بھی زندان کی قید نے اسے اندھیرے میں دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا کردی تھی۔ کمرے کی عقبی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ جس پر پڑا ہوا تالا دیکھ کر وہ رک گئے۔ سنتوش نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ پہریدار کا رہائشی کمرہ ہے۔ خوش قسمتی سے ایک تلوار اور دو خنجر مزید مل گئے۔ سنتوش اور شوزی زینوں کی طرف پلٹ آئے۔ اب وہ موت کے منہ میں داخل ہونے جا رہے تھے۔ آخری زینے پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ اب سنتوش مورتی کو ہٹانے کا طریقہ سوچ رہا تھا۔ دروازے میں رکھی مورتی یوں دروازے میں نصب ہوجاتی تھی گویا دیوار میں تراشی گئی ہو۔ یہ دونوں طرف سے سیدھی نظر آنے والی مورتی تھی۔ کچھ کوشش کے بعد سنتوش کو مورتی تھامنے کا طریقہ مل گیا۔ یہ دو رخنے تھے۔ جس میں ہاتھ ڈال کر اس نے مورتی کو کھسکایا تو وہ اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ سنتوش نے پورا زور لگا کر مورتی ہٹا دی۔ مورتی ہٹی تو گویا دروازہ کھل گیا۔ وہ اور شوزی اچھل کر باہر آ گئے۔ لیکن مورتی ہٹانے کی آواز سے نہ صرف تہہ خانے میں سویا پہریدار بیدار ہوگیا بلکہ دوسری طرف سوئے ہوئے لوگ بھی جاگ گئے۔ اب وہ بری طرح پھنس چکے تھے۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ دوڑ کر باہر برآمدے میں نکل آئے اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوگئے۔ سنتوش کا رخ ان زینوں کی طرف تھا جو برآمدے کے اختتام پر عمارت کی چھت کی طرف چلے گئے تھے۔ اچانک بہت سی مشعلیں روشن ہوگئیں۔ اور خطرے کے بھونپو

بجنے لگ گئے۔ سنتوش فوراً فرش پر لیٹ گیا۔ شوزی اس کی تقلید کررہی تھی۔ لیکن وہ دیکھ لیے گئے تھے۔ کیونکہ اب ان پر تیر برسائے جارہے تھے۔ وہ تیروں سے بچنے کیلئے فرش پر پلٹیاں کھاتے ستونوں کی آڑ تک جا پہنچے۔ سامنے کی طرف کے سپاہی عمارت کے پائیں باغ میں اگے ہوئے اخروٹ کے گھنے درختوں کی آڑ لے کر تیر چلا رہے تھے۔ انہیں چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ان لوگوں کے پاس بھی تیر ہوں گے۔ معاً کچھ لوگوں نے درختوں سے نکل کر ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یکا یک سنتوش نے چھت کے زینوں کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑ لگا دی کہ ”شوزی! چھت پر پہنچو۔“ اس کے عقب میں شوزی کے قدموں کی آواز ابھری۔

عمارت کی چھت بالکل خالی تھی۔ سنتوش تو اس بات پر حیران تھا کہ گوبال کے سپاہی ضرورت سے زیادہ مستعد تھے۔ چھت پر پہنچتے ہی دونوں نے عقبی جانب دوڑ لگا دی۔ منڈیر کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ عقبی جانب نیچے نظر پڑتے ہی ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ تب ان کی سمجھ میں آیا کہ چھت پر کسی پہریدار کی ضرورت کیوں نہ محسوس کی گئی۔ عقبی جانب گہری کھائی تھی۔ جس وقت سنتوش کو یہاں لایا گیا تھا تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور وہ عمارت کے باہر کا ماحول نہ دیکھ سکا تھا۔ چھت پر پہنچ کر جو خوشی انہیں نصیب ہوئی تھی۔ اب وہ رخصت ہو چکی تھی۔ وہ چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔ دائیں اور بائیں جانب کی صورتحال بھی وہی تھی جو عقبی جانب کی تھی۔ اچانک سنتوش نے کہا۔

”شوزی! ہم کسی طرح عقبی جانب عمارت کی جڑ تک اترنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر گرتے پڑتے کھائی میں پہنچ ہی جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہر طرف موت ہے۔“

شوزی نے سنتوش کی بات سنی اور اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”میں تمہارے ساتھ جہنم میں بھی چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوں، تم آگے بڑھو۔“

انہیں چھت پر پہنچے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے، نیچے والے کسی بھی لمحے اوپر پہنچنے والے تھے۔ سنتوش نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور جب اسے کوئی چیز نظر نہ آئی تو اس نے اپنے اوپری دھڑ کا لباس اتار لیا۔ اسے دراصل کسی رسے کی ضرورت تھی۔ وہ خود تو منڈیر کے ساتھ لٹک کر پچھلی طرف چھلانگ لگا سکتا تھا لیکن شوزی کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں

تھا۔ کیونکہ چھت خاصی اونچی تھی۔ اس نے اپنے لباس کا ایک سرا شوزی کو تھمایا اور اسے کہا نیچے پھسل جاؤ۔ شوزی نے ہمت کی اور دیوار کے ساتھ گھسٹتی، پھسلتی عمارت کی عقبی ڈھلان پر جا اتری۔ یہاں کھڑے ہونے کے لیے جگہ بہت مختصر تھی۔

شوزی کے بعد سنتوش نے ہمت کی اور وہ بھی اتر آیا۔ اب دونوں نیچے گہری کھائی میں اتر رہے تھے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ اتر کر اس گھاس کو پار کر لیتے اور سامنے کے پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچتے۔ ابھی وہ چند ہی قدم اترے تھے کے عمارت کی چھت پر ہلچل نظر آئی۔ لیکن اب وہ بے شمار اونچی نیچی چٹانوں کی آڑ میں تھے۔ وہ بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے۔ عجب بے ترتیب جگہ تھی۔ ہر طرف ابھری ہوئی نوکیلی چٹانیں اور بے طرح بڑھی ہوئی جنگلی گھاس کے ساتھ ساتھ اخروٹ کے کھردرے تنوں والے دیوہیکل درخت۔ اترائی اس قدر بے ساختہ تھی کہ جلد ہی ان کی سانسیں پھول گئیں۔ انہیں ہر قدم پر جھٹکا لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے اتر رہے ہوں۔ کھائی اتنی گہری تھی کہ دن میں بھی اس کی تہہ آسانی سے نظر نہ آتی۔ کہیں کہیں ایک قدم اترنے کے لیے اتنی جدوجہد کرنا پڑتی کہ ان کا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ وہ بہت زیادہ وقت میں بہت کم فاصلہ طے کر پا رہا تھا۔ اچانک بھونپوؤں کی آواز سے پورا پہاڑ لرز اٹھا۔ اور اب کچھ مشعلیں کھائی میں اترتی ہوئی بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

سنتوش نے شوزی کے کراہنے کی آواز سنی تو اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟......تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں! شاید کوئی زخم رسنے لگا ہے۔ تم چلو!''

شوزی نے اپنی آواز کو پراعتماد بناتے ہوئے کہا۔ لیکن سنتوش نے اندازہ لگا لیا تھا کہ شوزی کو شدید تکلیف کا سامنا ہے۔ بہرحال اس وقت تو کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ مسلسل کھائی میں اتر رہے تھے اور ان کے پیچھے اترنے والی مشعلیں بھی مسلسل نیچے آ رہی تھیں۔ سنتوش اور شوزی کو کھائی کی تہہ میں اترنا تھا اور پھر دوسری طرف پہاڑ پر چڑھنا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس پہاڑی کے سینے پر موجود تھے اور جس عمارت سے وہ فرار ہوئے تھے وہ چوٹی پر تھی۔ اگر وہ کھائی کی تہہ میں اتر جاتے تو شاید کوئی پناہ گاہ تلاش کر لیتے۔ موسم خاصا سرد تھا۔ لیکن انہیں گرمی لگ رہی تھی۔ انتھک مشقت نے ان کی روح کے بھی پسینے نکال

دیئے۔ اب شوزی پہلے سے زیادہ کراہنے لگی تھی۔ سنتوش نے اسے سہارا دینا چاہا تو اس نے منع کر دیا اور کہا:۔

"خود ہی تو کہتے ہو کہ سہارے آدمی سے استقامت چھین لیتے ہیں۔"

وہ مسکرائی تو سنتوش کی شریانوں میں گھونگرو کھنک اٹھے۔ لیکن خطرہ اب ان کے سر پر پہنچنے والا تھا۔ سنتوش نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چھ مشعلیں اب ان سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ اس نے فوری طور پر راستہ بدلنے کا فیصلہ کیا اور جنگلی گھاس کے بیچوں بیچ سے ہوتا ہوا کھائی میں اترنے کی بجائے پہاڑی پر ہی ایک جانب کو چل دیا۔ اس نے کہا:۔

شوزی! ہم عمارت سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ اگر تم چاہو تو کچھ دیر آرام کر سکتے ہیں۔ یہاں ان جھاڑیوں میں وہ ہمیں آسانی سے نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔"

"نہیں!...... ہمیں صبح سے پہلے کھائی کی تہہ تک پہنچنا ہے۔"

شوزی نے پورے عزم کے ساتھ جواب دیا۔ ہانپنے کی وجہ سے باتیں کرنا خاصا دشوار تھا۔ اس لیے وہ چپ ہو گئی۔

اب وہ تعاقب میں آنے والے مشعل برداروں کو تاریکی اور جنگلی گھاس کی وجہ سے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ رات کا پچھلا پہر چل رہا تھا۔ ستارے مغرب کی جانب دوڑتے جا رہے تھے۔ ثریا ان کے سروں پر تھی۔ اخروٹ، چلغوزہ اور سیب کے درخت ان کے اردگرد تھے۔ جگہ جگہ کسی نہ کسی پتھر کی اوٹ سے شفاف پانی کا کوئی جھرنا رات کے پچھلے پہر کا گیت گا رہا تھا۔

اب انہیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ کھائی کی تہہ کی طرف بڑھے اور صبح کاذب سے پہلے کھائی کی تہہ میں پہنچ گئے۔ پو پھٹنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اب وہ دو پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت قطعہ ارض پر تھے۔ صبح ہونے والی تھی۔ پہاڑ کی جڑ کے ساتھ ساتھ ایک تیز برفانی نالہ بہہ رہا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی شوزی ایک طرف ہو کر لیٹ گئی۔ سنتوش نے نالے سے پانی پیا۔ پانی انتہائی شفاف، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سنتوش کو یوں لگا جیسے پانی کے پہلے گھونٹ نے ہی اسے نئی زندگی بخش دی ہو۔ اس نے شوزی کو لیٹے رہنے دیا۔ اب وہ شوزی اور اپنے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس نے نالے کے کنارے اگے ناشپاتی کے درمیانے قد کے پودوں کو گردن سے پکڑا اور جھکا لیا۔ اس نے

بہت سی ناشپاتیاں توڑیں۔ انہیں نالے کے پانی میں دھویا اور شوزی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے شوزی؟...... تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"ہوں!...... نہیں!...... میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں کتنی خوش کن ہوا چل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ہم دونوں یہیں رہ جائیں۔"

شوزی نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا تو سنتوش شرارت سے مسکرا دیا۔

"ہاں! شاید!...... لیکن شوزی ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ ہم تو الگ الگ قوموں سے ہیں۔ سچ بتاؤ! کیا اطالیہ والے محبت کرتے ہیں؟"

سنتوش نے جان بوجھ کر ایسی بات کی۔ وہ چاہتا تھا کہ شوزی کی طبیعت بحال ہو جائے۔

شوزی نے فوراً کہا:۔

"کیوں؟ کیا اطالیہ والوں میں دل نہیں ہوتا۔"

"ہوتا ہے، لیکن طبیبوں کا خیال ہے کہ دل میں جذبات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

"اگر طبیب ایسا کہتے ہیں تو غلط کہتے ہیں۔ انسان کے لیے دنیا کا سب سے عظیم تحفہ محبت ہے۔"

شوزی کی بات سن کر سنتوش کے دل کو دھکا لگا۔ اسے اپنی محبت یاد آ گئی۔ اس نے غمزدہ دل کے ساتھ کہا۔

"اور اگر کسی کی محبت کھو گئی ہو تو...... میں تو سمجھتا ہوں اس کے لیے جینے کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ محبت کبھی نہیں کھوتی۔ محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔"

سنتوش نے کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھی ہوئی شوزی کی طرف ناشپاتیاں بڑھا دیں۔

"ٹھہرو! میں منہ دھو کر آتی ہوں۔"

شوزی ندی کی طرف بڑھ گئی۔ سنتوش نرم گھاس پر بیٹھا دونوں پہاڑوں کے بیچ سے گزرنے والے نالے کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا:۔

"یہ نالہ یقیناً ان چٹانوں میں چلتا ہوا سطح زمین تک جاتا ہوگا۔ اگر ہم سامنے والے پہاڑ کو عبور کرنے کی بجائے اس نالے کے ساتھ ساتھ سفر کریں تو اس کھائی سے نکلا جا سکتا

ہے۔“

اگرچہ یہ سارا علاقہ چاروں طرف سے پہاڑیوں اور چٹانوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ اس کھائی سے نکلنے کی کوئی صورت ماسوائے چڑھائی عبور کرنے کے نہ تھی۔ یہ ندی آخر کہاں جارہی تھی۔ شوزی واپس لوٹی تو سنتوش نے اسے یہی بات بتائی۔ تب شوزی جو پیدائشی طور پر پہاڑوں کی باسی تھی کہنے لگی۔

”تمہاری بات ٹھیک بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔ یہ ندی جو یہاں زمین پر بہتی ہوئی تمہیں نظر آرہی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی تنگ سی سرنگ میں داخل ہوجائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کسی چھوٹے سے درے سے گزرتی ہوئی اس کھائی کے علاقے سے نکلی ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگے جاکر کسی پہاڑی پر سے آبشار کی طرح نیچے گررہی ہو۔“

شوزی کی معلومات نے اسے حیران کردیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ صبح ہورہی تھی۔ معاً سنتوش نے کہا۔

”شوزی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ سورج نکلتے ہی وہ لوگ پوری کھائی میں پھیل جائیں گے۔“

یکایک شوزی نے کچھ محسوس کرنا شروع کردیا۔ اس نے کھڑے کھڑے آنکھیں بند کرلیں، جیسے پوجا کررہی ہو۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر سنتوش کو بتایا۔

”یہ ہوا بتاتی ہے کہ کسی طرف کوئی درہ ہے۔ اگر کھائی چاروں طرف سے بند ہوتی تو ہوا نہ ہوتی یہاں۔“

سنتوش معصوم بچوں کی طرح شوزی کی بات پر سر ہلانے لگا۔

”تو کیا خیال ہے اس ندی کا تعاقب کیا جائے؟ ہوسکتا ہے ہم کٹھن چڑھائی سے بچ جائیں۔“

”بالکل! ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

انہوں نے کھائی میں بہنے والی اس ندی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ کھائی کی تہہ طوالت کے حوالے سے بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ البتہ دونوں پہاڑوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے تنگ تھی۔ وہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ سنتوش ابھی تک ننگے پیر تھا۔ البتہ اس نے پہریدار کے جوتے شوزی کو پہنا دیئے تھے۔ جو شوزی کے پیروں سے بڑے تھے

اس لیے سنتوش نے انہیں ایک کپڑے کی مدد سے شوزی کے پیروں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ ندی کے ساتھ ساتھ وہ تقریباً آدھا گھنٹہ چلتے رہے۔ اب صبح ہو چکی تھی۔ لیکن گہری کھائی میں ہونے کی وجہ سے ابھی تک وہ خاصے اندھیرے میں تھے۔ البتہ پہاڑ کی چوٹی پر سورج کی روشنی پڑی تو پہاڑ کی سفید کلغی روشن ہوگئی۔ شوزی کی بات درست نکلی۔ ندی پانی کی طرح بل کھاتی، پتھروں اور چٹانوں سے ٹکریں مارتی ایک چھوٹے سے درے میں داخل ہو رہی تھی۔ دور سے اس پہاڑی درے کو دیکھ کر سنتوش کا دل خوشی سے اچھلا۔

"بہت خوب! قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔"

لیکن شوزی کی بات سن کر سنتوش کا منہ لٹک گیا۔ شوزی نے کہا تھا۔

"قدرت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ دیکھ نہیں رہے کہ وہ صرف ندی کی چوڑائی جتنا کھلا ہے۔ اور نہ جانے دوسری جانب کیا ہے؟ ہو سکتا ہے آبشار ہو۔ ایسی صورت میں ہم کیا کریں گے؟"

سنتوش گھبرا گیا۔ اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر شوزی نسیم سحر کی طرح کھلکھلا کر ہنس دی اور کہنے لگی۔

"گھبراؤ مت جان من! میں تمہیں گود میں اٹھا کر آبشار کے پانی کے ساتھ کود جاؤں گی۔"

پہلی بار سنتوش کو اس قلفطی لڑکی پر پیار آیا۔ اس سے پہلے وہ سب کچھ ہمدردی میں کر رہا تھا۔ سنتوش کو شوزی کی بات بہت اچھی لگی۔ وہ درے کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

"کاش! ایسا ہو سکتا۔"

وہ درے کے قریب پہنچے تو واقعی درہ اس قدر مختصر تھا کہ بمشکل ندی اپنے پر سمیٹے اس کے بیچوں بیچ سے گزر رہی تھی۔ عجب ہیبت ناک منظر تھا۔ ندی کا پرشور پانی سفید جھاگ اڑاتا کسی زخمی ناگ کی طرح پھنکارتا درے میں سے گزر رہا تھا۔ پانی کے چٹانوں کے ساتھ ٹکرانے سے جو چھینٹے اڑ رہے تھے۔ انہوں نے کافی بلندی تک دونوں طرف کے پہاڑوں کو گیلا کر رکھا تھا۔ ندی کے دائیں اور بائیں آسمان کو چھوتے ہوئے پہاڑ استادہ تھا۔

"کیا خیال ہے؟ کیا ہم یہاں سے گزر سکیں گے؟ پانی زیادہ گہرا تو نہیں؟"

سنتوش نے شوزی سے مشورہ لیا۔ وہ سوچتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی۔

''پانی میں تو مشکل ہے۔ بہت تیز ہے۔ البتہ پتھروں پر ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا پھلانگتے ہوئے شاید ہم اس درے سے نکل سکتے ہیں۔''

وہ پتھروں کو پھلانگتے، گرتے پڑتے درے سے باہر آ گئے۔ یہ بہت خطرناک مقام تھا۔ وہ ذرا سی بے احتیاطی کرتے تو آبشار کے ساتھ زمین پر جا گرتے۔ یہاں قدرت کا عجب نظارہ تھا۔ درے کے اختتام پر ندی ایک دم انتہائی بلندی سے دوسری جانب کی گہری کھائی میں چھلانگ لگا گئی۔ وہ ایک آبشار کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ وہ خود ایک گہری کھائی سے نکل کر آئے تھے۔ جس کا پرشور نالا اب ایک اور گہری کھائی میں گر رہا تھا۔ آبشار کے گرنے سے دور دور تک پانی کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ درے سے باہر آتے ہی انہیں ایک دم یہ احساس ہونے لگا جیسے وہ زمین سے سینکڑوں فٹ بلندی پر ہیں۔ حالانکہ درہ عبور کرنے سے پہلے پہلے تک وہ خود کو گہرائی میں محسوس کرتے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑی چٹانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ سامنے، نیچے آبشار سے پیدا ہونے والی مختصر سی جھیل تھی۔ اور بائیں طرف سطح زمین کے ساتھ پہاڑی کھیتوں کا تہہ در تہہ سلسلہ تھا۔ کھیتوں کو دیکھتے ہی وہ چونک گئے۔ گویا قریب ہی کہیں آبادی تھی۔

''اس طرف تو جانا مناسب نہیں ہوگا۔''

سنتوش نے کسی قدر بڑبڑاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ شوزی کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ کہنے لگی۔

''ظاہر ہے یہ تمام علاقہ ان لوگوں کا ہے، ویسے بھی وہ سب سے پہلے اسی طرف ہمیں تلاش کریں گے۔ کیونکہ اتنا تو وہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ہم نے پہاڑی پر چڑھنے کی بجائے ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کو ترجیح دی ہوگی۔''

شوزی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ سنتوش بری طرح چونک گیا۔

''شوزی!...... ہمیں اس علاقے سے نکلنا ہوگا۔ ہم یہاں غیر محفوظ ہیں۔''

''یقیناً غیر محفوظ ہیں۔ انہوں نے کھیتوں کے الٹی طرف چٹانوں کے طلسماتی جنگل میں گھس کر چلنا شروع کر دیا۔ چھوٹی بڑی بے شمار چٹانیں اس طرح بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ گویا کسی نے چاند سے زمین پر پتھر پھینکے ہوں۔ نوکدار، بلند و بالا چٹانوں کے بیچوں بیچ

سے گزرنے والی تیز ہوا مسحور کن سنسناہٹ پیدا کررہی تھی۔ ان کے لباس کسی پرند کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ اب وہ دونوں خاموش تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے چٹانوں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ معاً انہیں ایک آہٹ سنائی دی۔

''شوزی! ہمارے قریب کوئی ہے۔''

سنتوش نے سرگوشی کی۔ وہ جس چٹان کے پیچھے تھے، وہ آٹھ دس فٹ بلند کسی نوکدار پتھر سے مشابہ تھی۔ وہ کسی چیتے کی طرح چوکنے ہوگئے۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ کوئی ہے۔ لیکن فوراً ہی ان کے سینوں سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ ان کے سامنے ایک انتہائی نحیف ونزار بڑھیا لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے نمودار ہوئی۔

''اوہ میرے ایشور!! میں تو ڈر ہی گئی تھی۔''

شوزی نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بات کی۔ سنتوش کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''ہاں! ڈر تو میں بھی گیا تھا۔ کیا اس سے معلومات لی جاسکتی ہیں؟ میرا مطلب ہے علاقے کے بارے میں۔''

''لیکن یہ ہمارے بارے میں کسی کو بتا بھی تو سکتی ہے لیکن ٹھہرو! میں پوچھتی ہوں۔''

شوزی نے خود ہی خطرہ ظاہر کیا اور پھر خود ہی بڑھیا سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ سنتوش چٹان کے پیچھے دبک گیا۔ بڑھیا شوزی کو دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر گٹھا سر پر اٹھائے اپنے جھریوں بھرے چہرے سے شوزی کو دیکھنے لگی۔ سنتوش دور سے بڑھیا کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد شوزی واپس لوٹی تو سنتوش نے اس سے سوال کیا۔

''کیا رہا؟''

''فکر مت کرو! ہم یہاں ''زینیا'' قصبے کے بالکل نزدیک ہیں۔ ہم زینیا کے مضافات میں ہیں۔ آبشار سے جو کھیت دکھائی دیتے تھے وہ زینیا کے کھیت ہیں۔ ہمارے جنوب میں ایک اور درہ ہے۔ جس کا نام درۂ زینیا ہے۔ وہ دیکھو یوں لگتا ہے جیسے یہ درہ زینیا قصبے پر دانت گاڑے اسے نگلنے کی کوشش کررہا ہو۔ اگر ہم کسی طرح زینیا سے بچتے بچاتے کوہ الپس کے مشہور مغربی شہر ''علیشک'' پہنچ جائیں تو ہم قطعی طور پر محفوظ ہوجائیں گے۔ شوزی

نے نہایت تفصیل کے ساتھ بڑھیا سے لی گئی معلومات دہرائیں۔ بالکل ایسے جیسے وہ ایک معلّمہ کی حیثیت سے سنتوش کو سبق پڑھا رہی ہو۔ سنتوش اس کے انداز پر ہنس دیا۔

''بس بس!!...... یہ بتاؤ! بڑھیا نے تمہارے بارے میں کیا پوچھا؟''

''یہ کہ...... میں کون ہوں؟''

''تو تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ وہ خانہ بدوش بڑھیا ہے اور اتنی عمر رسیدہ کہ شاید میرا چہرہ بھی اسے یاد نہ رہے۔''

اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور چٹانوں کا یہ تاریک جنگل پوری طرح روشن ہو چکا تھا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

سردار پولابیں کے لیے سنتوش کا فرار پاگل کر دینے والا تھا۔ جب سے سنتوش فرار ہوا تھا، قلطی سردار پولابیں ایک پل کے لیے بھی آرام سے نہ بیٹھا تھا۔ اسے صرف یہی دکھ نہیں تھا کہ اس نے سنتوش کو مہنگے داموں خریدا، بلکہ اسے یہ غصہ بھی تھا کہ قلطی سرداروں میں اس کی ناک کٹ گئی۔

سنتوش کو فرار ہوئے کئی دن بیت چکے تھے۔ پھر ایک روز اچانک سردار پولابیں کو ملنے کے لیے کچھ لوگ آ گئے۔ یہ انہی متلاشیوں کا قافلہ تھا جو مہا پجاری کے گم شدہ بیٹے کو ڈھونڈنے نکلے تھے۔ دانیال اور اس کے ساتھی بالآخر براہ راست پولابیں تک آ پہنچے۔ وہ پولابیں کے ساتھ معاملہ طے کرنا چاہتے تھے۔ دانیال کا کہنا تھا کہ اگر سنتوش پولابیں کے پاس ہے تو چھیننے کی بجائے اسے خریدنا چاہیے اور سب نے دانیال کی بات مان لی۔ وہ کئی دن کا سفر کر کے قلطی قوم کے اس سردار کے پاس مہمان بن کر آئے تھے۔

قلطیوں میں مہمانوں کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کرنے کا رواج تھا۔ اس طرح ان کی سرداری کی شان میں اضافہ ہوتا تھا۔ جونہی پولابیں کو پتا چلا کہ چند معزز لوگ بہت دور سے اسے ملنے آئے ہیں، تو اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ سنتوش کے بھاگ جانے کا غصہ کم ہوا۔ اور وہ بعجلت تمام مہمان خانے میں پہنچا۔ اس نے نہایت تواضع کے ساتھ دانیال اور اس کے ساتھیوں کو بٹھایا۔ انہیں بکرے کی بھنی ہوئی رانیں پیش کیں۔ جن کے ساتھ شراب بھی تھی اور تب ان کی آمد کا مقصد پوچھا۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے، میرے مہمان بنے، اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ اب کہیے! آپ لوگوں کا کیسے آنا ہوا؟“

دانیال اپنی نشست پر پہلو بدل کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سب کی توجہ یکایک شیتل کی

طرف مبذول ہوگئی۔ وہ کافی دیر سے اپنی جگہ بے چین بیٹھی تھی۔ اچانک سب نے اس کے آنسو دیکھ لیے۔ کلاڈینا نے اپنا ہاتھ شیتل کے شانے پر رکھا گویا اسے دلاسہ دیا اور دانیال کو اشارہ کیا کہ وہ بات کرے۔ دانیال نے کہا۔

''سردار پولابیس! آپ بڑے مہمان ہیں۔ رومہ میں بھی آپ کی بڑی عزت ہے اور یہاں بھی آپ کا شملہ سب سے اونچا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس قرطاجنی نوعمر لڑکے کو آپ نے رومہ کے بازار سے خریدا، وہ ہمارا عزیز ہے۔ وہ پیدائشی غلام نہیں بلکہ قرطاجنہ کے مہاپجاری کی آنکھوں کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ آپ نے اسے جتنے میں خریدا، ہم اس سے زیادہ رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں لوٹائیں گے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم آپ کے سامنے سوال لے کر آئے ہیں۔''

دانیال کے بات کرنے کا انداز نہایت مہذبانہ تھا۔ سردار پولابیس اس کے سامنے جزبز ہو کر رہ گیا۔ خاص طور پر یہ سوچ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے کہ سنتوش تو اب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ پریشان نظروں سے ایک ایک کا چہرہ تکنے لگا۔ مہمانوں نے اسے عزت دی تھی۔ پیسے بھی دینا چاہتے تھے۔ لیکن اب وہ انہیں سنتوش واپس نہ کر سکتا تھا۔ وہ سٹپٹا گیا۔ کبھی ایک کا منہ دیکھتا کبھی دوسرے کا۔ شیتل نے سردار پولابیس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی اور کسی خیال کے تحت اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سمجھی شاید سنتوش کو ایشور نہ کرے کچھ ہو گیا ہے۔ لیکن جب پولابیس بولا تو اس کی جان میں جان آئی۔ پولابیس نے بتایا۔

''وہ لڑکا تو اب میرے پاس نہیں ہے۔ کئی دن ہوئے وہ فرار ہو گیا ہے۔ میں نے پورا کوہ الپس چھان مارا، اس کی کچھ خبر نہیں۔ میرے کارندے ابھی تک اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن اتنے دن کی تگ و دو کے بعد اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ کوہ الپس کے علاقے سے دور جا چکا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری بات کا پورا یقین کریں گے۔''

دانیال کی تجربہ کار نگاہوں نے اس کی آنکھوں میں موجود سچائی پڑھ لی۔ دانیال نے اپنے ساتھیوں کی طرف سر گھما کر دیکھا اور کچھ ایسے تاثرات دیئے گویا پوچھ رہا ہو کہ اب کیا کیا جائے۔ نہ جانے شیتل نے کیسے اپنے آنسو روک رکھے تھے۔ شارق گھورتی ہوئی نگاہوں سے ابھی تک سردار پولابیس کو دیکھ اور اس کی بات کو پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پولابیس نے شارق کی نگاہوں کی تیزی محسوس کی اور شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کس قدر ترش لہجے میں کہا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میں کسی سے ڈرتا نہیں۔ اگر وہ لڑکا میرے پاس ہوتا اور میں آپ کو نہ دینا چاہتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے چھین نہ سکتی۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ بھاگ گیا ہے تو وہ بھاگ گیا ہے۔ ہاں! آپ کے آنے کا آپ کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اب اگر وہ لڑکا میرے ہاتھ لگا تو میں اسے ماروں گا نہیں۔ ورنہ اس سے پہلے مجھے اپنے پیسوں کے ضائع ہونے کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ جونہی مجھے ملتا، میں اس کا سر کاٹ دیتا۔"

پولابیس کی بات سے شیتل کی سسکی نکل گئی۔ شیتل کی حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہو رہی تھی۔ کلاڈینا نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے!...... جب سنتوش یہاں ہے ہی نہیں تو ہمیں مزید یہاں رکنے کی کیا ضرورت؟

اب ہمیں پھر سے سوچنا ہوگا کہ ہم اسے کہاں تلاش کریں۔"

سردار پولابیس نے کلاڈینا کی بات سنی اور پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ لڑکا گوبال کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ گوبال کے ساتھ ہماری مدتوں پرانی دشمنی ہے۔ جس رات وہ خوبصورت لڑکا یہاں سے فرار ہوا اسی رات ہماری زمرد کی ایک کان پر ڈاکہ پڑا تھا۔ ہمارے پہریداروں کو مار دیا گیا۔ اگر وہ لڑکا سیدھے راستے سے فرار ہوا ہے تو وہ یقیناً ان ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ جو دراصل گوبال کے لوگ تھے، ہم کوہ الپس کی مشرقی سمت میں آباد ہیں اور اپنے آپ کو اطالیہ کا باشندہ تصور کرتے ہیں جبکہ گوبال کوہ الپس کی مغربی سمت میں آباد ہے اور اپنے آپ کو ہسپانوی باشندہ شمار کرتا ہے۔ لیکن وہ آبائی طور پر سپینی نہیں ہے، فینیقی ہے۔ اگر وہ لڑکا گوبال کے پاس چلا گیا ہے تو گوبال ضرور اسے قرطاجنہ واپس بھیج دے گا۔ وہ اپنی قوم کے مہا پجاری کے بیٹے کو قیدی نہیں بنائے گا۔ میں خود کوشش کر رہا ہوں کہ گوبال کے علاقے میں تحقیقات کروں۔"

سردار پولابیس کی بات سے گویا انہیں نیا سراغ مل گیا۔ شارق نے بلا تامل کہا۔

"بہت بہت شکریہ!! آپ نے ہماری مدد کی۔ ہم سیدھا گوبال کے پاس جائیں گے اور مجھے امید ہے کہ وہ لڑکا ابھی وہیں ہوگا۔"

سردار پولابیس سے ملاقات فائدہ بخش رہی تھی۔ متلاشیوں کا قافلہ جس جوش و

جذبے کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا اسی جوش و جذبے کو لے کر آگے چل دیا۔
لیکن حقیقت میں سردار پولابیں کے دل میں بے ایمانی تھی۔ سنتوش کی واپسی کے لیے تو وہ پورا کوہ الپس اکھاڑ سکتا تھا۔ سنتوش نکل بھاگا لیکن پولابیں کو یہ یقین رہا کہ وہ اسے ڈھونڈ لے گا۔ لیکن جب اس کے رشتے دار آ پہنچے تو پولابیں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مہمانوں کے واپس جاتے ہی وہ کسی درندے کی طرح بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن اپنی بے عزتی نہیں۔ سنتوش کا فرار اس کی سرداری اور ناک کا مسئلہ تھا۔ اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ کبھی غصے سے مٹھیاں بھینچتا اور کبھی بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگتا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسے خود یقین تھا کہ سنتوش قلطیوں کے بڑے دشمن گوبال کے پاس ہی ہے۔ اس کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دے دی تھی۔ لیکن اس نے مہمانوں کے سامنے صرف اپنے شک کا اظہار کیا۔ یقینی طور پر نہ کہا کہ سنتوش کہاں ہے؟ اور اب جب وہ اپنے شک کا اظہار کر چکا تھا تو پچھتا رہا تھا۔ کیونکہ اب مہمان کوہ الپس کی مغربی سمت کو روانہ ہو چکے تھے۔ سردار گوبال فینقی تھا اور یہ لوگ بھی قرطاجنہ سے آئے تھے۔ اگر یہ سردار گوبال پر زور ڈالتے تو وہ ضرور سنتوش کو واپس کر دیتا۔ اور یہی بات سردار پولابیں کے لیے پریشانی کی تھی۔ وہ کسی قیمت پر سنتوش کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔
ٹہلتے ٹہلتے اچانک اس کا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ آنکھیں لال ہو گئیں اور بدن تن گیا۔ اس نے انتہائی غصے کے عالم میں ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا فیصلہ جو بیس سال سے کسی قلطی سردار نے نہیں کیا تھا۔ لیکن اس فیصلے پر عملدرآمد سے پہلے ضروری تھا کہ وہ دانیال اور اس کے ساتھیوں کو گوبال تک پہنچنے سے روکتا۔ چنانچہ اس نے چیخ کر اپنے نوکروں کو آواز دی۔ آن واحد میں ایک خادم حاضر ہو گیا۔ گوبال نے گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے اسے حکم دیا۔
”جو مہمان ابھی یہاں سے گئے انہیں گرفتار کر لو۔ قید خانے میں ڈال دو اور جب تک میں نہ کہوں انہیں وہاں سے نکلنے نہ دینا۔ جاؤ! ابھی اور اسی وقت یہ کام مکمل کرو۔“
خادم ایک نئے جوش و جذبے کے ساتھ واپس پلٹا۔ تب سردار پولابیں نے ایک اور نوکر کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو پولابیں نے حکم دیا۔

"جاؤ!......سیدو کو بلا کر لاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔"

وہ نوکر بھی الٹے قدموں بھاگا۔ پولابیس پھر ٹہلنے لگا۔ معاً وہ کمرے کے کونے میں رکھی شراب کی صراحی کی طرف لپکا۔ اگلے لمحے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ آج اس نے ایک عجیب فیصلہ کیا تھا۔ وہ ہر جام کے ساتھ اپنے فیصلے پر عمل کرتا چلا گیا اور ہر جام کے ساتھ اس کا دل اپنے فیصلے پر اور زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔

سیدو آ گیا۔ درمیانے قد کا ہلکا پھلکا نوجوان۔ اب پولابیس سنبھل چکا تھا۔ اس نے جوش اور جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے سیدو سے کہنا شروع کیا۔

"سیدو! تم آج ہی شہر رومہ روانہ ہو جاؤ۔ "عمید ون" سے جا کر ملنا۔ وہی ایک سچا قلطی تھا، اور میرا دوست بھی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ سمندری الماس کی بھاری مقدار لے جاؤ، سب ہیرے، زمرد، موتی، جو جو خزانہ ہے میرے پاس سب لے جاؤ۔ اسے کہنا مجھے بیس دن کے اندر ندر ماہر تلوار بازوں کا ایک لشکر چاہیے۔ اتنا بڑا لشکر کہ میں گوبال اور اس کے سارے قصبوں کو ملیامیٹ کر دوں۔ عمید ون سے کہنا وہ خود لشکر کے ساتھ واپس آئے۔ رومہ سے منجھے ہوئے سپاہی بھرتی کرو یا رومی فوج سے بھاری معاوضے کے عوض لشکر خریدو۔ تم اور عمید ون مل کر جو بھی کرو مجھے منظور ہے۔ لیکن مجھے بیس دن کے اندر اندر بیس ہزار کا لشکر چاہیے۔"

سیدو جوں جوں سنتا جا رہا تھا اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ سردار پولابیس نے انوکھا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بہت بڑے جگرے کا کام تھا۔ سیدو نے اپنے تیز دماغ سے فوراً اندازہ کر لیا کہ سردار پولابیس کا فیصلہ سو فیصد درست اور ممکن العمل ہے۔ اسے بھی معلوم تھا کہ گوبال کے علاقے میں ہیروں کی کئی خفیہ کانیں ہیں۔ اس نے حساب لگایا کہ اگر پولابیس اس جنگ پر اپنی ساری دولت صرف کر دیتا ہے تو اس کے بدلے میں اسے کیا ملتا ہے؟

گوبال کے قبضے میں موجود وہ قلطی سردار جو کبھی ہیروں کی کانوں کے مالک تھے، اگر وہ لوگ بیس سال کی قید سے رہا کرا دیئے جاتے تو یہ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی۔ وہ سب کے سب سردار پولابیس کے ممنون احسان ہو جاتے۔ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔ سیدو بہت تیز طرار انسان تھا۔ وہ پولابیس کے فیصلے سے بے پناہ خوش ہو گیا۔ اس نے تعمیل میں سر جھکاتے ہوئے اپنے سردار سے کہا۔

"سردار! تمہیں روم یا یونان کا بادشاہ ہونا چاہیے تھا۔ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔

میں آج ہی شہر رومہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں۔ ہمارے پاس اتنا خزانہ ہے کہ رومی لشکر سارے کا سارا الپس پر کھینچ لائیں۔"

سیدو کی خوشامد سے نشے میں دھت پولابیس کی باچھیں کھل گئیں۔

ادھر دانیال اور اس کے ساتھیوں پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ ان گنت گھڑ سواروں نے انہیں گھیر لیا۔ یہ سب وحشی قلطی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں تھیں۔ کیدارا نے تو ٹکرا جانا چاہا، کم و بیش شارق کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اگر دانیال انہیں بروقت نہ روکتا تو وہ یقیناً وحشی قلطیوں سے ٹکرا جاتے اور یقیناً مارے جاتے۔ دانیال کے کہنے پر شارق اور کیدارا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ وحشی قلطیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ دانیال نے گھڑ سواروں کے سالار سے سوال کیا۔

"تم لوگ ہمیں کیوں گرفتار کر رہے ہو؟ ہم تو تمہارے سردار کے مہمان ہیں۔"

"ہم تمہیں سردار کے حکم سے گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

سالار کی بات سن کر دانیال سے پہلے کلاڈینا بول پڑی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر نفرت تھی۔ اس نے کہا۔

"تمہارا سردار دھوکے باز ہے۔ مہمانوں کو گرفتار کرتا ہے۔ تم دیکھنا اس کا انجام بہت برا ہوگا۔"

لیکن اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ گرفتار کیے جا چکے تھے۔ گھڑ سواروں کا دستہ انہیں زنجیروں میں باندھ کر قید خانے میں لے آیا۔ انہیں ایک ہی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ عمارت بھی پہاڑی کو کھود کر بنائی گئی تھی۔ یوں گویا پہاڑ پر نصب کر دی ہو۔ انہیں ایک نیم تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا اور باہر سخت پہرا لگا دیا گیا۔ دانیال اور شارق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار پولابیس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ طرح طرح کے تبصرے کرتے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچتے۔ بالآخر شیتل نے کہا۔

"وہ نہیں چاہتا کہ ہم سنتوش کو یہاں سے لے جائیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت دیکھی تھی۔"

دانیال اور کلاڈینا قدرے خاموش اور چپ چپ تھے۔ وقت بیتتا گیا۔ انہیں کھانے پینے کی چیزیں اور دیگر ضروری سامان دے دیا گیا۔ لیکن ان کے کسی سوال کا جواب نہ دیا جا رہا

تھا۔

سیدو شہر رومہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ بیس پچیس اونٹ اور لگ بھگ دو سو قلطی تلوار بازوں کا دستہ تھا۔ سیدو کے روانہ ہوتے ہی سردار پولابیس نے اپنے نمائندے بھیج کر مشرقی الپس کے قلطی سرداروں کو بلوا بھیجا۔ وہ ہر قیمت پر کوہ الپس پر صرف قلطیوں کی حکمرانی واپس چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ایک بڑی جنگ کے لیے تیار کرنے لگا۔ چند ہی دنوں میں تمام قلطی سرداروں تک پولابیس کے ارادے کی خبر پہنچ گئی اور ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً تمام سردار گوبال پر حملے کے حق میں تیار ہو گئے۔

یہ سب واقعات اپنی جگہ پیش آ رہے تھے اور دوسری طرف شوزینہ...... سنتوش کو لے کر اپنی بستی میں واپس آ پہنچی۔ وہ بھی ایک قلطی بستی کی رہنے والی تھی۔ ایک لحاظ سے سنتوش خطرناک علاقے میں واپس آ چکا تھا۔ واپسی کے سفر میں سنتوش نے ہزار بار خود کو سمجھایا کہ شیتل اس کا انتظار کر رہی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا دل کہتا تھا کہ شیتل کسی نہ کسی طرح آزاد ہو چکی ہے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود اپنی آزادی کے بعد سنتوش کو جگہ جگہ سے عالمی حالات کی جو خبریں ملیں ان کے مطابق کوناڈس کو سمندر میں موآبریس سے شکست ہوئی تھی۔ سنتوش سوچتا تھا کہ شیتل بھی اس جنگ میں کوناڈس کے شکنجے سے رہا ہو چکی ہوگی۔ لیکن اس کے دل میں بار بار سوال اٹھتا کہ کیا شیتل قرطاجنہ واپس جائے گی؟ وہ جانتا تھا کہ قرطاجنہ میں شیتل کی زندگی کو خطرہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا دل کہتا تھا کہ وہ قرطاجنہ ضرور جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ سنتوش بھی فی الفور قرطاجنہ جانا چاہتا تھا۔ تو پھر وہ شوزی کے ساتھ یہاں کیوں چلا آیا تھا؟

کیا اس کی وجہ شوزی کی وہ پرزور دعوت تھی جو اس نے سنتوش کو اپنے ساتھ آنے کے لیے دی یا کچھ اور؟؟ اس سوال کا جواب سنتوش کے سنجیدہ چہرے پر تلاش کرنا ابھی مشکل تھا۔

یہ بستی وادیٔ برف میں واقع نہیں تھی۔ یہاں بھی سب قلطی آباد تھے۔ یہاں کا سردار اور تھا۔ وادیٔ برف کا سردار اکیلا پولابیس تھا۔ لیکن اس علاقے کا سردار اکیلا پورے علاقے کا سردار نہیں تھا۔ اس علاقے کے قلطی کانوں کی دولت سے محروم تھے۔ اور اس لیے زیادہ تر وادیٔ برف یا دوسرے قلطیوں کی کانوں میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

شوزی کی ماں ایک خوبصورت پہاڑی عورت تھی۔ شوزی کی طرح اس کی آنکھیں

بھی نیلی تھیں۔ وہ بہت بہادر تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کو چھڑا لائے۔ شوزی کی ماں کا نام ''کاموجی'' تھا۔ وہ پچاس سے اوپر کی ایک زبردست عورت تھی۔ اس بستی میں اس کے جتنے رشتہ داروں کے گھر تھے، وہ سب میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی۔ ایک طرح سے وہ اپنے رشتہ داروں میں سردار کے درجے پر تھی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ ایک نوعمر لڑکے کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکی اور شوزی سے گلے ملنے کی بجائے اس سے سنتوش کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''یہ لڑکا کون ہے؟ کیا تم کسی فینیقی کو اٹھا لائی ہو؟ جانتی ہو مجھے فینیقیوں سے کتنی نفرت ہے۔ اگر یہ فینیقی ہے تو میں اس کا سر اڑا دوں گی۔''

شوزی جانتی تھی کہ اس کی ماں ایسے ہی پیش آئے گی۔ اس لیے شوزی نے فوراً کہا۔

''ہاں!...... یہ فینیقی ہے، لیکن اس نے مجھے گوبال کی قید سے رہائی دلائی۔ یہ خود گوبال کی قید میں تھا۔ اس کے ساتھ بہت مظالم ہوئے۔ میں نے اسے خود یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ میں اسے آپ سے ملوانا چاہتی تھی۔''

کاموجی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''ایک فینیقی نے تمہیں بچایا؟...... تم نے ایک فینیقی کا احسان لیا؟ کیا تم اتنی کمزور تھی کہ خود گوبال کی قید سے نہ نکل سکتی تھی۔ اس سے کہو یہ فوراً یہاں سے چلا جائے۔ میں نے اپنے بہن بھائی اور اپنے شوہر کو فینیقیوں کے ہاتھوں کھویا ہے۔ میں اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔''

سنتوش ایک طرف خاموش کھڑا ماں بیٹی کا مکالمہ سن رہا تھا۔ شوزی نے پھر کہا۔

''ماں!...... یہ تو خود یہاں نہیں آنا چاہتا تھا...... گوبال سے پہلے یہ......''

سنتوش نے اچانک مداخلت کر کے شوزی کی بات کاٹ دی۔

''گوبال سے پہلے میں رومیوں کی قید میں تھا اور آپ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ کی نفرت بجا ہے۔ میں خود یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں شوزی کے اصرار پر انکار نہ کر سکا۔ ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔''

شوزی تڑپ اٹھی۔ اس کا محسن یوں دروازے پر سے لوٹایا جا رہا تھا۔ شوزی نے

منت کرنے والی نگاہوں سے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ماں!...... یہ بہت اچھا ہے، ایشور کے لیے اسے نہ جانے دو۔''

لیکن کاموجی کے چہرے پر مزید سختی پیدا ہوگئی۔

''تم پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہو شوزی!...... اگر یہ تمہارا محسن ہے تب بھی اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ تم جانتی ہو سردار پولابیں بہت جلد الپس کی دوسری طرف حملہ کرنے والا ہے۔ ہم فینیقیوں کو کاٹ کر پھینک دیں گے۔ وہ سارے سرداروں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ اس نے لاکھوں کے جواہرات رومی فوج کی طرف بھیجے ہیں۔ شہر رومہ سے ایک بڑا تربیت یافتہ لشکر آ رہا ہے۔ ہم گوبال کی ساری بستیوں کو پیس کر رکھ دیں گے۔ ان حالات میں کیا ایک فینیقی لڑکے کا ہمارے گھر میں رہنا ٹھیک ہوگا؟''

پولابیں کا نام سن کر سنتوش کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ شوزی کو بھی اندازہ ہوا کہ سنتوش نے اس کی بات کیوں کاٹ دی تھی۔ اب وہ دل ہی دل میں سنتوش کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ آج اگر اس کے منہ سے نکل گیا ہوتا کہ سنتوش گوبال سے پہلے سردار پولابیں کا قیدی تھا اور یہاں سے بھگوڑا ہوا تھا تو اس کی ماں بری طرح چونک اٹھتی اور شاید قلطیوں کے ہیرو سردار پولابیں کو خوش کرنے کے لیے سنتوش کو گرفتار کروا دیتی۔ ابھی شوزینہ یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک دیکھی۔ جیسے اس کی ماں کسی بات کے سمجھ آ جانے پر اچانک چونک اٹھی ہو۔ شوزی کا دل دہل گیا۔ کاموجی کی سوچتی ہوئی آنکھیں سنتوش کے چہرے پر آ کر ٹک گئیں اور وہ خاموش کھڑی سنتوش کو سرتاپا غور سے دیکھنے لگی۔ سنتوش اور شوزینہ دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخر کاموجی کیا سوچ رہی تھی؟ اور پھر کاموجی نے انہیں حیران کر دیا۔

''میں ساری بات سمجھ گئی ہوں۔ یہ وہی لڑکا ہے جس کی خاطر سردار پولابیں گوبال پر حملہ کرنے کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ مجھے سب کہانی پتا ہے۔ یہاں بچے بچے کو پتا ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی، اسے یہاں لا کر۔ یہ سردار پولابیں کا معشوق ہے۔ میں سردار پولابیں کو خوش کرنے کے لیے اس لڑکے کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔ جانتی ہو کیوں؟...... اس لیے کہ اسے پاتے ہی کہیں پولابیں کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اور وہ گوبال پر حملہ کرنے کا فیصلہ واپس لے لے۔ لیکن اب میں اسے چھوڑ بھی نہیں

سکتی۔ یہ یہاں سے نکلا تو کہیں نہ کہیں گرفتار ہو جائے گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکے کو سمجھاؤ۔ یہ ہمارے گھر میں خود کو ایک کمرے کے اندر بند رکھے۔ اس کے سوا اس کے بچاؤ کا کوئی چارہ نہیں۔ ہم مناسب موقع دیکھتے ہی اسے یہاں سے نکال دیں گے۔"

شوزی نئی صورتحال سے سٹپٹا گئی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ سنتوش کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے تو وہ کبھی سنتوش کو یہاں نہ لاتی۔ صورتحال نہایت نازک ہو چکی تھی۔ سنتوش جلد سے جلد قرطاجنہ پہنچنا چاہتا تھا اور شوزی کی ماں کاموجی اسے نظر بند ہونے کے لیے کہہ رہی تھی۔ سنتوش نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں کسی نہ کسی طرح الپس سے نکل جاؤں گا۔ آپ مجھے جانے دیں۔"

"نہیں!...... اب تم کہیں نہیں جا سکتے۔ اگر تم پکڑے گئے تو پولابیں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور میرا شوہر کبھی رہا نہ ہو سکے گا۔ جب تک یہ جنگ ختم نہیں ہو جاتی تم میرے گھر میں قید رہو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

لگتا تھا کہ سنتوش کے ستارے ابھی تک گردش میں تھے۔ اسے شوزی کے ساتھ آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ شوزی اور اس کے راستے الگ الگ تھے۔ دونوں کی منزلیں الگ الگ تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں چلا آیا اور اس کیوں کا جواب خود سنتوش کو معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں چلا آیا۔ لیکن ابھی وہ کچھ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا۔ اس نے دل میں سوچا کہ فوری طور پر کاموجی کی بات مان لینے ہی میں بھلائی ہے اور اس نے بات مان لینے کا عندیہ دے دیا۔

قلطی قبائل پورے زور و شور کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گوبال کو بھی اس کی خبر مل چکی تھی۔ وہ بھی اپنی تمام تر دفاعی قوتیں مجتمع کرنے لگا۔ قلطی قبائل کو رومہ کے منظم لشکر کی آمد کا انتظار تھا۔ ہر روز قلطی بستیوں کے نوجوان گھوڑوں پر سوار ہو کر رومہ کے راستے پر نکلتے اور دور تک آگے چلے جاتے۔ ہر کوئی رومی فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ کوہ الپس کا مشرقی حصہ پورے جوش و خروش کے ساتھ کوہ الپس کے مغربی حصے پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ بچے بچے کے دل میں فینیقیوں کو الپس سے نکال دینے کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اگر کسی کو خبر نہ تھی تو وہ تھے دانیال اور اس کے ساتھی۔ آخر ایک دن شارق طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا۔

”ہم کب تک یہاں معذوروں کی طرح پڑے سڑتے رہیں گے۔ میں کہتا ہوں ہمیں نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چاہے اس کوشش میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

کلاڈینا نے شارق کو گھور کر دیکھا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟ کیا ہم خود کو یہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کر رہے؟ تم بتاؤ کس طرح نکلیں؟“

”ہمیں ٹکرا جانا چاہیے۔ مل کر دروازہ توڑ دیتے ہیں اور باہر موجود پہریداروں کو ختم کر کے پہاڑی گھاٹیوں میں نکل جاتے ہیں۔“

”نہیں!...... ہم ایسا نہیں کریں گے۔ پہلے ہمیں یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ آخر ہو کیا رہا ہے؟ ہمیں کھانا دینے کے لیے آنے والے قلطیوں کے چہروں پر عجیب طرح کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ میں کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ باہر کوئی ہلچل ہے۔“

یہ دانیال کی آواز تھی۔ شیتل اور کلاڈینا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ شیتل نے تو یہ بھی کہا۔

”یہ تو ایشور کا شکر ہے کہ اس کی کرپا سے سردار پولابیں نے ہمیں ایک جگہ قید کیا۔ اگر ہم الگ الگ ہوتے تو کتنی مشکل ہو جاتی۔ دانیال ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں دشمن کے دل میں موجود بات تک پہنچنا چاہیے۔“

کیدارا تو شیتل کی ہر بات پر سر ہلاتا تھا۔ شارق بھی اسی ڈگر پر سوچنے لگا اور پھر وہ سب مل کر اس بارے میں غور کرنے لگے کہ کس طرح قلطیوں سے ان کے دل میں موجود بات اگلوا سکتے ہیں؟ انہوں نے پوری کوشش کی اور قید خانے کے پہریدروں کو شیشے میں اتار کر یہ پوچھنا چاہا کہ آخر وادیٔ برف میں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن جاہل اور وحشی قلطی بھی اپنی ہٹ کے بڑے پکے تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

چند دن مزید گزر گئے اور پھر ایک روز انہیں قید خانے میں بیٹھے بیٹھے بہت ہی زیادہ شور سنائی دینے لگا۔ باہر نقارے بج رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لشکر آ پہنچا ہو۔

بھونپوؤں کی آواز، ڈھول باجے، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور خرخراہٹ، گدھوں اور خچروں کے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں کی ٹن ٹن اور بے پناہ لوگوں کا شور۔ یوں لگتا تھا باہر قیامت برپا

ہے۔ دانیال اور اس کے ساتھی شدت حیرت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یقیناً باہر کوئی لشکر آ چکا تھا۔

بیس ہزار تربیت یافتہ کرائے کے سپاہی وادیٔ برف میں پدھار چکے تھے۔ عمیدون بھی ان کے ہمراہ تھا۔ لشکر کی آمد سے یوں لگتا تھا جیسے کوہ الپس کا سینہ دہل جائے گا۔ بیس ہزار کا یہ لشکر تو کرائے کے سپاہیوں پر مشتمل تھا، قلطی اقوام کے نوجوانوں نے از خود جو لشکر جمع کیا وہ اس سے بھی بڑا تھا۔

دانیال اور اس کے ساتھی جیل میں پڑے سڑتے رہے اور سردار پولابیس بادشاہوں جیسے عمطراق کے ساتھ ایک خوفناک لشکر لے کر کوہ الپس کی مغربی سمت کوچ کے لیے تیار ہو گیا۔

گوبال کو قلطی سرداروں کے اجتماع اور رومی لشکر کی آمد کی خبر ملی تو وہ اپنی جگہ لرز گیا۔ اس نے فوری طور پر جنگ کی بجائے صلح کو ترجیح دی اور اپنے ایلچی سردار پولابیس کی طرف دوڑائے جو یہ پیغام لے کر گئے تھے کہ۔

''آپ ہم پر حملہ نہ کریں۔ ہم آپ کے ساتھی قیدی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔''

سردار پولابیس نے طاقت کے نشے میں چور ہو کر گوبال کے ایلچی کا سر اڑا دیا۔ اور دوسرے ایلچی کے ذریعے وہ سر گوبال تک بھجوا دیا۔ گوبال پھر بھی طیش میں نہ آیا۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اس لیے اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس نے دیوتاؤں کے زندان میں قید تیرہ قلطی سرداروں میں سے ایک کو رہا کیا اور اپنے نئے ایلچیوں کے ہمراہ اسے پولابیس کی طرف بھیج دیا۔ یہ گویا خیر سگالی اور نیک ارادے کا اظہار تھا۔ لیکن پولابیس کہاں رکنے والا تھا۔ وہ اپنی پوری دولت اس جنگ پر صرف کر چکا تھا۔ اس نے گوبال کے دوسرے ایلچیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا، جو پہلوں کے ساتھ کیا تھا اور مسلسل آگے بڑھتا چلا آیا۔

پولابیس کے راستے میں جو بھی بستی آئی۔ اس نے اسے لوٹ لیا۔ سپینی باشندے اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے چھپ چھپ کر جانیں بچانے لگے۔ پولابیس کا خونخوار لشکر سپینیوں کی بستیوں کو روندتا ہوا اندھا دھند زینیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ مغربی الپس میں سپینیوں اور فینیقیوں کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔

''روا'' کے مقام پر پولابیس کو پہلی بار مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں گوبال

کے ہراول نے پورے جذبے کے ساتھ پولابیس کو روکا۔ لیکن قلطی لشکر کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی سیلاب کی طرح خس و خاشاک کو بہاتا چلا گیا۔ زیدیہ سے پہلے وہ اس قصبے میں جا پہنچا جس میں خود گوبال کا صدر مقام تھا۔ گوبال نے کھلے میدان میں پولابیس کے سامنے اپنی فوج کو صف آرا کر دیا۔ سپینیوں کے چہروں پر موت کا خوف صاف دکھائی دیتا تھا۔ گوبال کی چالاک بیوی اپنی فوج کے جوانوں کا جذبہ ابھارنے کے لیے دوڑی دوڑی پھرتی تھی۔

جنگ کا بگل بجا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں۔ فینیقیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ وہ کٹ کٹ کر گرتے اور گر گر کر اٹھتے۔ انہوں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ گوبال خود پوری جرأت کے ساتھ لڑا اور کئی قلطیوں کا خاتمہ کرنے کے بعد بری طرح زخمی ہو کر گر پڑا۔ سپینیوں نے اپنے سردار کو گرتے دیکھا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اس جنگ میں سپینیوں اور فینیقیوں کو شکست ہوگئی۔ گوبال کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ قلطی ہر طرف فتح کے نقارے بجانے لگے۔ وہ ظلم و تشدد کی انتہا کر رہے تھے۔ انہوں نے گوبال کے قصبے کو تہس نہس کر دیا۔ ایک ایک بچے کو مار دیا گیا۔ دیوتاؤں کے زندان میں بیس سال سے قید قلطی سرداروں کو رہا کروا لیا گیا۔ سپینی عورتیں اپنے بچوں کو اٹھا کر غاروں کی طرف دوڑیں تو قلطی گھڑسواروں نے انہیں روند ڈالا۔ پولابیس کے لشکر میں موجود بیس ہزار رومیوں کے دل فینیقیوں سے پہلے ہی بہت نالاں تھے۔ وہ یہ سمجھ کر فینیقیوں کو مارنے لگے کہ وہ برتھاس کے ہاتھوں ملنے والی شکستوں کا بدلہ لے رہے ہیں۔ گوبال کے قصبہ کی تباہی کی دیر تھی کہ پھر...... قلطی گھوڑے کہیں نہ رکے۔ زیدیہ تک انہوں نے چند ہی دنوں میں سپینیوں اور فینیقیوں کا صفایا کر دیا۔ اب کوہ الپس صرف قلطیوں یا غالوں کا تھا۔

سردار پولابیس نے پورے مغربی الپس کو چھان مارا، لیکن سنتوش اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اب وہ کوہ الپس کا حکمران تھا۔ اتنی بڑی فتح کی خوشی میں اسے سنتوش کا غم بھولنے لگا اور لشکر کی واپسی کے وقت تو اس نے سنتوش کا خیال ہی دل سے نکال کر پھینک دیا۔ اب وہ واپس آ رہا تھا۔ سردار پولابیس اب واپس آ رہا تھا۔ اب وہ ایک عام قلطی سردار نہیں تھا، بلکہ پورے کوہ الپس کا بلا شرکت غیرے حاکم تھا۔ واپسی کے سفر میں قلطی لشکر خوشیاں مناتا ہوا آ رہا

تھا۔ وہ ہر دو تین میل کے بعد شور مچانے لگتے، رقص کرتے اور گھوڑوں کی قربانی کرنے لگتے۔ انھوں نے بیس سال کی دشمنی کا یکا یک خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ہر کسی کی زبان پر سردار پولابیس کا نام تھا۔ لشکر کی واپسی کے سفر میں ایک رات جب وہ اپنے گھروں سے زیادہ دور نہیں تھے، پولابیس نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس نے اپنے لیے ''الپس کا راجہ'' کا خطاب اختیار کر لیا اور لوگوں سے کہا۔

''مقدس پہاڑ کے رہنے والو!...... ہم نے اپنے دیرینہ دشمن کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور اگر آئندہ بھی ہم اسی طرح یکجہتی کا مظاہرہ کر سکیں تو پھر کسی دشمن کی مجال نہیں کہ وہ ہمارے علاقے میں پر بھی مارے۔ ہم کل وادیٔ برف واپس پہنچ جائیں گے۔ تین دن تک فتح کا جشن منایا جائے گا اور میں راجہ کا تاج پہنوں گا۔ اور چوتھے دن ہم اپنے رومی مہمان لشکر کو الوداع کہیں گے۔ آج کی رات سب جشن مناؤ، شراب پیو اور دیوتاؤں کے حضور قربانیاں دو۔

دیوتاؤں کے زندان سے رہا ہونے والے سردار بھی لشکر کے ہمراہ واپس آ رہے تھے۔ شوزینہ کا باپ سردار دایودورس رہا ہونے سے لے کر اب تک مسلسل سردار پولابیس کے پہلو بہ پہلو گھوڑے پر سوار آزاد دنیا کی آزاد فضاؤں کو دیکھتا ہوا آیا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی جوشیلا تھا جتنا گرفتاری سے پہلے یا اس وقت تھا جب اسے سنتوش نے دیکھا۔ رہا ہونے والے باقی سردار گھوڑے کی سواری نہ کر سکتے تھے۔ انہیں گھڑسواری بھول چکی تھی۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں اناڑی پن کی وجہ سے کسی گہری کھائی میں نہ جا گریں۔ اسی لیے وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوئے تھے۔ لیکن دایودورس گھوڑے کی پیٹھ پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سر اور داڑھی کے بال تراش لیے تھے اور اب وہ قیدی نہیں بلکہ ایک خطرناک آنکھوں والا جوشیلا قلطی سردار تھا۔ لشکر واپس اپنے علاقے میں پہنچ آیا۔

ایک روز شوزینہ کی ماں کاموجی اپنے گھر کے باہر وادیٔ برف پر آنے والے راستے پر کھڑی...... آنے والوں کا انتظار کر رہی تھی۔ جب سے اسے فتح کی خبر ملی تھی وہ ہر روز اس راستے پر کھڑے ہو کر اپنے بیس سال سے بچھڑے ہوئے جیون ساتھی کا انتظار کرتی تھی۔ لشکر کی روانگی کے وقت کاموجی نے لشکر کے ساتھ چلنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن زیادہ عمر کی عورتوں کو ساتھ لے جانے پر پابندی تھی۔ اس لئے وہ لشکر میں شامل نہ ہو سکی۔ کاموجی نے اپنی بیٹی شوزی سے بااصرار کہا کہ وہ لشکر کے ہمراہ چلی جائے، لیکن شوزی نے صاف انکار کر دیا۔

اس انکار کی وجہ تھا...... سنتوش۔ جو گزشتہ کئی دنوں سے ان کے گھر میں تقریباً نظر بند تھا۔ کاموجی تو چاہتی تھی کہ سنتوش کو زنجیروں میں جکڑ کر قید رکھے۔ لیکن شوزی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس نے کاموجی کے دل میں سنتوش کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کی خاطر ہزار ہزار جتن کیے۔ سنتوش ہر وقت خاموش رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے دل میں کوئی طوفان پل رہا ہو۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب وہ کوئی نوعمر معصوم بچہ نہیں لگتا تھا۔ اب وہ گبھرو لگتا تھا۔ نہایت خوبرو اور دل موہ لینے والی صورت کا مالک تھا۔ شوزی تو اس پر مرمٹی تھی۔ لیکن کیا وہ شوزی سے پیار کرتا تھا۔ اس کی خاموشی سے تو کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سنتوش کو بھی حالات حاضرہ کی پوری خبر تھی۔ شوزی اسے بتاتی رہتی کہ پولابیس کا لشکر کہاں کہاں تک پہنچا ہے۔ اور اس نے کیا کیا فتوحات حاصل کیں۔ سنتوش کبھی اندرونی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اگر کاموجی کے گھر کوئی آ جاتا تو سنتوش اندرونی کمرے کے تاریک کونے میں چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو قیدی محسوس نہیں کیا تھا۔ کاموجی سمجھتی رہی کہ وہ موت کے ڈر سے یوں نظر بند ہونے پر آمادہ ہے۔ لیکن شوزی جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ سنتوش کی سنجیدگی کچھ اور ہی پتہ دیتی تھی۔ وہ کیا کرنے والا تھا؟ یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا اور پھر ایک روز......

ایک روز کاموجی کا شوہر سردار دایو دورس اچانک آ پہنچا۔ کاموجی انتظار کرتے کرتے غروب آفتاب کے ساتھ ہی گھر واپس لوٹ آئی۔ اسے آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کے انداز سے ہی پتہ چلتا تھا کہ آنے والا کوئی اجنبی ہے۔ کاموجی نے معنی خیز نظروں سے شوزی کی طرف دیکھا۔ شوزی یکا یک اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

"بابا!...... میرا دل کہتا ہے بابا آ گئے ہیں۔"

کاموجی کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ بھی تیزی سے دروازے کی طرف دوڑی۔ لیکن شوزی اس سے پہلے ہی دروازہ کھول چکی تھی۔ سامنے ایک خوش شکل ادھیڑ عمر بزرگ کھڑا تھا۔ یہ سردار دایو دورس تھا۔ بیس سال دیوتاؤں کے زندان میں قید رہنے کے بعد وہ اپنے بیوی بچوں کے پاس لوٹ رہا تھا۔ کاموجی نے پہلی نظر میں ہی اپنے شوہر کو پہچان لیا۔ اور شوہر نے بھی۔ شوزی تو پہلے ہی باپ سے مل چکی تھی، جب وہ اسے چھڑانے کی غرض سے دیوتاؤں کے زندان میں گئی تھی اور پکڑی گئی تھی۔

دونوں ماں بیٹی کے پیمانے جذبات سے لبریز ہو رہے تھے۔ دایودورس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ دور اندرونی کمرے کی کھڑکی میں موجود سنتوش اس جذباتی منظر کو دیکھ کر دل میں خوش ہو رہا تھا۔ کاموجی نے عمر کا لحاظ کیے بغیر آگے بڑھ کر اپنا سر اپنے شوہر کے سینے پر رکھ دیا۔ دایودورس نے بازو پھیلا کر کاموجی کو گلے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شوزینہ نے پہلی بار اپنی مضبوط اعصاب کی مالک سخت گیر ماں کو روتے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب تک وہ ایک بہت بھاری ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھی، جو آج اچانک اس کے کندھوں پر سے اتر گئی۔ دونوں میاں بیوی کافی دیر تک ایک دوسرے کے سینے سے لگے آنسو بہاتے رہے۔ بیوی سے ملنے کے بعد دایودورس اپنی بیٹی شوزینہ کو سینے سے لگا کر رونے لگا۔

اب وہ تینوں دروازے سے ہٹ کر گھر کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ شوزی نے بھاگ بھاگ کر سارے کمروں اور برآمدے کی مشعلیں جلا دیں۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اس نے اندرونی کمرے کی مشعل نہ جلائی۔ جہاں پرانے کاٹھ کباڑ کے ساتھ سنتوش بھی موجود تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور جلدی جلدی سنتوش کو بتانے لگی تھی کہ۔

"بابا آ گئے ہیں، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تو تمہیں جانتے ہیں۔ تمہاری کہانی سن چکے ہیں۔ تم ان کے ساتھ قید رہے ہو۔ اس لیے وہ تمہارا درد سمجھیں گے۔ تم فکر مت کرو، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن سنتوش حسب معمول نہایت سنجیدہ چہرہ لیے خاموش نظروں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ شوزی اس کے اس طرح دیکھنے سے سٹپٹا جایا کرتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ سنتوش سے اس طرح دیکھنے کے بارے میں بات کر چکی تھی۔ وہ شرمندگی محسوس کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی اسے یوں لگتا تھا جیسے سنتوش نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے کہہ رہا ہو کہ۔

"تم نے اچھا کیا میرے ساتھ شوزی!...... میں نے تمہیں قید سے رہائی دلائی اور تم نے مجھے قید میں ڈال دیا۔"

اکثر تو شوزی رونے لگتی تھی اور اس سے کہتی۔

"تم چلے کیوں نہیں جاتے؟ تم جانا چاہتے ہو تو بے شک کسی وقت نکل جاؤ۔"

لیکن سنتوش کوئی جواب نہ دیتا۔ حتیٰ کہ شوزی نے ایک روز یہاں تک کہہ دیا۔

"چلو سنتوش!!...... دونوں بھاگ چلتے ہیں۔"

لیکن سنتوش نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ سنتوش کی خاموشی سے تنگ آ جاتی تھی اور غصیلے لہجے میں اس پر برسنے لگتی۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟"

سنتوش زبان کو معمولی حرکت دیتا۔

"کچھ نہیں!!"

شوزی مشعلیں جلا کر واپس ماں باپ کے پاس ان کے کمرے میں لوٹنے لگی اور جوں ہی وہ دروازے کے پاس پہنچی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا باپ اور اس کی ماں سنتوش کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ شوزی کمرے میں داخل نہ ہوئی بلکہ دروازے کے پاس ہی چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

"وہ میرے پاس سردار پولابیس کے لیے ایک تحفہ ہے۔ وہ بہت بزدل ہے۔ اس نے ایک بار بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ میں نے اسے ڈرا دیا تھا کہ باہر اس کے لیے موت ہے۔"

کاموجی کی بات سن کر دایودورس بولا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اگر سردار پولابیس کو ہم وہ لڑکا دے دیں، تو سمجھو ہم قلطیوں میں سب سے بڑا مرتبہ پالیں گے۔ کیونکہ اس وقت سردار پولابیس ایک عام سردار نہیں بلکہ الپس کا راجہ بن چکا ہے۔ دو دن بعد فتح کے جشن کا آخری دن ہوگا۔ وادیٔ برف میں عظیم الشان تقریبات منعقد ہوں گی۔ اگر اس موقع پر ہم پولابیس کو سنتوش کا تحفہ دیدیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں سب سے بڑا رتبہ عطا کرے گا۔"

کاموجی دایودورس کی ہر بات پر بہت خوش ہو رہی تھی۔ اس نے پھر کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں سوچتی تھی کہ جس مرد کے لیے پولابیس نے پورے الپس کو فتح کیا وہ اگر اچانک اس کے سامنے آئے گا تو اس پر کیا بیتے گی؟ اس کی حالت دیکھنے والی ہوگی اور......"

دایودورس نے اچانک کاموجی کی بات کاٹ دی اور پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟ کہیں وہ میری آمد کی وجہ سے بھاگ نہ جائے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ہم اسے زنجیروں میں جکڑ کر قید

میں ڈال دیں۔"

کاموجی ایک بار تو چونکی۔لیکن پھر اپنے کندے ڈھیلے چھوڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں سردار!...... وہ نہیں بھاگے گا۔ وہ بہت خوفزدہ ہے۔ منہ سے ایک لفظ تک نہیں بولتا۔اور پھر جس طرح وہ رہ رہا ہے ہم اسے اسی طرح رہنے دیں تو اسے کچھ خبر بھی نہ ہوگی۔لیکن اگر ہم اسے گرفت میں لینے کی کوشش کریں گے تو شاید وہ مزاحمت کرے یا بھاگ جائے۔پھر شوزی کا مسئلہ بھی تو ہے۔ میں شوزی کی آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ پیار دیکھتی ہوں۔اگر ہمارے ارادے کا شوزی کو پتہ چل گیا تو مجھے ڈر ہے کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ چلی جائے گی۔

شوزی کے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔وہ اپنے ماں باپ کا ارادہ جان چکی تھی۔ اس کے ماں باپ سنتوش کے ساتھ بہت برا کرنے والے تھے۔شوزی نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ جان دے دی گی لیکن سنتوش کے ساتھ ایسا نہ ہونے دے گی۔"

دایودورس نے بیوی کی بات مان لی اور سنتوش کو عملاً گرفتار کرنے کا خیال ترک کردیا۔اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے کاموجی!......تمہاری بات معقول ہے۔ میں صبح اس سے ملوں گا تو اس طرح جیسے ایک دوست۔تم ٹھیک کہتی ہو۔ہمیں اسے کسی شک میں نہیں ڈالنا چاہیے۔"

سنتوش کی باتیں مکمل ہوئیں تو وہ اپنی باتیں کرنے لگے۔تب شوزی کمرے میں داخل ہوگئی۔اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے ان کی کوئی بات نہ سنی ہو۔دونوں میاں بیوی نے ایک طرف کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اطمینان دلایا اور پھر بیٹی کی طرف متوجہ ہوگئے۔اگلے لمحے تینوں...... ماں باپ اور بیٹی ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ وہ رات کو دیر تک اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

لیکن اگلی صبح جب کاموجی اور دایودورس بیدار ہوئے تو یہ جان کر بری طرح بوکھلا گئے کہ گھر میں نہ ان کی بیٹی شوزی تھی اور نہ ہی اُن کا قیدی سنتوش۔

♦♦♦♦♦

عشق دل کائنات

وادیٔ برف بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ بڑے میدان میں ہزاروں مشعلیں جل رہی تھیں۔ اور بے پناہ ہنگامہ تھا۔ رومی فوجی شراب کے پیانے کے ساتھ کھیل رہے تھے اور جگہ جگہ سالم بکرے بھونے جارہے تھے۔ کہیں کہیں لوگ چوکڑیوں میں بیٹھے شراب پی اور قہقہے لگا رہے تھے اور کہیں کہیں تماشہ دکھانے والے مداری اپنے کرتبوں اور شعبدوں کے بل پر بڑے بڑے ہجوموں کو متحیر کیے ہوئے تھے۔ سردار پولابیس نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے اور الپس کی فتح کا جشن یادگار بنادیا تھا۔ میدان کے بیچوں بیچ ہزاروں مشعلوں کی روشنی میں سردار پولابیس کا تخت لگا تھا۔ جس کے آس پاس میدان کی سبز قالین جیسی گھاس پر سینکڑوں نشستیں سجی ہوئی تھیں۔ آج ہر کوئی خوشیاں منا رہا تھا۔ اور الپس کے قلطی سردار...... پولابیس کو پھولوں کے ہار پہنا رہے تھے۔ یہ گویا اسے راجہ تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔

آج قید خانے کے پہریدار بھی جشن کی طرف متوجہ تھے۔ ماسوائے ایک بڈھے قلطی کے قید خانے میں اور کوئی پہریدار نہیں تھا۔ دانیال اور اس کے ساتھیوں کو اب تک صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ سردار پولابیس کی فوج نے پرلی طرف کے سپینیوں اور فینیقیوں پر حملہ کیا اور انہیں شکست دی۔ اس کے علاوہ دانیال اور اس کے ساتھی کچھ نہ جان سکے تھے۔ وہ یہاں کئی دنوں سے قید تھے اور آج تو شارق کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اگر کلاڈینا نہ ہوتی تو وہ فرار کا کوئی ایسا راستہ اپنائے جس سے سب کی زندگیاں چلی جائیں۔ وہ جانتی تھی کہ قید خانے میں ہمہ وقت قلطی وحشیوں کا ایک پورا دستہ پہرے پر موجود رہتا تھا۔ لیکن آج تو پہرے پر کوئی نہیں تھا۔ آج تو سارے وحشی جشن فتح میں اپنی وحشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ ایک بیزار طبیعت بڈھے کو قیدیوں کی دیکھ بھال لیے چھوڑ گئے اور خود جشن میں چلے گئے۔ یہی موقع تھا جب وہ

فرار ہو سکتے تھے۔ آج خود کلاڈینا نے شارق سے کہا تھا۔

"شارق!...... یہ وقت ہے کہ ہم لوگ یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اگر تم لوہے کا یہ دروزہ توڑ سکو تو ہم رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آج دشمن فتح کی خوشیوں میں مصروف ہے۔"

کلاڈینا کی زبان سے شہ ملنے کی دیر تھی کہ شارق اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوہے کا دروازہ توڑنا چاہتا تھا۔ دانیال نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پہلے شارق کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔

"یہ آہنی دروازہ تم کیسے توڑو گے؟ اس کے دوسری طرف یقیناً بڑا سا تالا ہے۔"

"زور اور قوت سے ہم اس دروازے کو اکھاڑ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے۔"

کیدارا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گویا وہ بھی زور اور قوت کے استعمال سے اس دروازے کو اکھاڑنے کے لیے تیار تھا۔ اسی اثنا میں کلاڈینا نے کہا۔

"ٹھہرو!...... یہ دروازہ زور سے نہیں ٹوٹے گا اور نہ ہی اکھڑے گا البتہ اگر اس کمرے کا اکلوتا روشندان اکھیڑنے کی کوشش کی جائے تو شاید ممکن ہو۔"

"وہ بھی تو لوہے کا ہے اور پھر اتنا بلند کہ ہم آسانی سے اس تک پہنچ بھی نہیں سکتے۔"

یہ آواز شیتل کی تھی۔ وہ بھی اب اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دانیال نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دروازے اور روشندان کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"ٹھہرو!...... پہلے کوئی اور تدبیر کرتے ہیں۔ شارق اور کیدارا تم دونوں کو لڑنا پڑے گا۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ۔"

سب نے بے یقینی کے عالم میں دانیال کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ کلاڈینا نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"شارق اور کیدارا اگر زور وشور کے ساتھ لڑنا شروع ہو جائیں تو بوڑھا پہریدار آوازیں سن کر دروازے کے نزدیک آئے گا اور یقیناً پوچھے گا کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ تب شیتل

چلاتے ہوئے کہے گی کہ شارق اور کیدارا آپس میں لڑ رہے ہیں۔ تب بوڑھا پہریدار پریشان ہوجائے گا۔ ظاہر ہے وہ دروازہ تو نہیں کھولے گا لیکن یہاں سے چلا جائے گا۔ اپنے مددگاروں کو اطلاع دینے کے لیے۔ اس کے ساتھ یقیناً چند پہریدار واپس آئیں گے۔ تب وہ لوگ ضرور دروازہ کھولیں گے۔ ہمیں ان کی تعداد سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ ہمیں ان کے اسلحے کی ضرورت ہے۔ ہم حکمت عملی سے ان کو دبوچ سکتے ہیں۔"

شارق نے کسی قدر منہ بناتے ہوئے دانیال کی بات سنی اور کہنے لگا۔

"ابھی ایک اکیلا بڈھا پہریدار ہے، پھر زیادہ ہوجائیں گے۔ اگر اتنے زیادہ پہریداروں سے لڑنا تھا تو آپ لوگوں نے پہلے میری بات کیوں نہ مانی۔ یہ کام تو ہم آج سے بیس دن پہلے کرسکتے تھے۔"

دانیال کے ساتھ شارق کا یہ لہجہ کلاڈینا کو بالکل اچھا نہ لگا۔ اس نے ترش لہجے میں بات کی۔

"بیس دن پہلے دشمن جشن نہیں منا رہا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم اگر اسلحہ کے بغیر یہاں سے نکلتے ہیں تو گویا ہم نے خود کو موت کے منہ میں پھینک دیا۔"

دانیال سنجیدہ چہرہ لیے اس بحث پر غور کررہا تھا۔ اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہماری قید کے ساتھ سردار پولابیس کی دلچسپی اب پہلے جیسی نہیں ہوگی۔ اس نے بہت بڑا معرکہ سر کرلیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ ایک دو دن میں ہمیں خود ہی چھوڑ دے۔ لیکن اس نے اگر ہمیں خود چھوڑا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سنتوش اس کے پاس نہیں ہے۔ بصورت دیگر اگر سنتوش اس کے پاس آچکا ہے تو وہ ہمیں ابھی نہیں چھوڑے گا۔ ممکن ہے ہمیں قتل بھی کروادے۔ لیکن اگر آج ہم اسلحہ لے کر یہاں سے نکلتے ہیں تو ہم سنتوش کو بازیاب کرنے کے لیے سردار پولابیس پر حملہ بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اسلحہ کے بغیر نکلتے ہیں تو ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم کسی طرح یہ معلوم کرلیں کہ سنتوش سردار پولابیس کے ہاتھ لگ چکا ہے یا نہیں اور شارق بیس دن پہلے ہم نکلتے تو ہمیں سنتوش کو بازیاب کرانے کے لیے خود گوبال تک جانا پڑتا۔ نہ جانے وہاں کیا صورتحال پیش آتی۔ ہم سردار پولابیس کو دیکھ چکے ہیں۔ آج اگر ہم یہاں سے نکلتے ہیں تو

اس کا ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم لڑ کر یا بات چیت کے ذریعے سنتوش کو حاصل کر سکیں گے۔ شاید میری وضاحت درست نہیں۔ ٹھیک ہے اگر تم مناسب سمجھتے ہو کہ ہم یہ دروازہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کریں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں تو ایک مشورہ دے رہا تھا۔"

دانیال کی طویل وضاحت سے شارق شرمندہ ہو گیا۔ اس نے کلاڈینا کے چہرے پر غصہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس لیے اس نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کر لیا۔

"میں نے غلط سوچا۔ آپ کا دماغ بیک وقت بہت زیادہ باتیں سوچ لیتا ہے۔ لیکن ایشور نے مجھے ایسا نہیں بنایا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جیسا آپ کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔"

کلاڈینا کا غصہ دور نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے ترش لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر اپنا دماغ زیادہ باتیں سوچ سکنے کا اہل نہ ہو تو تھوڑا سا دوسرے کے دماغ سے بھی کام لے لینا چاہیے۔"

اس کے لہجے میں چھپا طنز شارق کو اچھی طرح محسوس ہوا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ وہ جتنا چاہتا تھا کہ کلاڈینا کی خوشنودی حاصل کرے، اتنی ہی کلاڈینا کے لہجے میں ترشی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دانیال نے اندازہ کر لیا کہ اب ماحول میں کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے کسی توقف کے بغیر کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اور کیدارا آپس میں وحشیانہ لڑائی کا مصنوعی مظاہرہ کرو۔ میرا مطلب ہے ناٹک۔ میرا دل کہتا ہے آج ہمیں کامیابی ہوگی۔"

اگلے لمحے کیدارا اور شارق ایک دوسرے کے سامنے کھڑے اکڑ رہے تھے۔ انہوں نے لڑائی کا ناٹک کرنے کی بجائے سچ مچ لڑنا شروع کر دیا۔ دونوں ہی نے یہ سوچا کہ قید میں پڑے پڑے ان کے بدن کو زنگ لگ چکا ہے۔ یہی موقع ہے جب وہ اپنے لوہے کو آزما سکتے ہیں۔ پہلی مرتبہ وہ مارفیس کے جزیرے پر لڑے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ تب شارق کی برق رفتاری کیدارا کی طاقت پر بھاری ثابت ہوئی تھی۔ لیکن آج وہ نہتے تھے۔ کیدارا نے سوچا یہی موقع ہے جب وہ اپنی سابقہ خفت کا بدلہ لے سکتا ہے۔ کلاڈینا اور شینتل ششدر رہ گئیں۔ البتہ دانیال زیرلب مسکرا رہا تھا۔ ان کے اس طرح لڑنے

سے ناٹک میں حقیقت کا رنگ آ گیا تھا۔ ابھی انہوں نے ایک دوسرے کو ایک دو گھونسے اور ایک دو تھپڑ ہی جڑے تھے کہ بڈھا پہریدار بھاگتا ہوا ان کے کمرے کے پاس آیا۔ اس نے پہریداروں کی مخصوص جھری سے کمرے میں دیکھا۔ تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اگلے لمحے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا۔ وہ باقی پہریداروں کو بلانے جا رہا تھا۔ آج وادی برف میں دن کا سا سماں تھا۔ ہر طرف الاؤ اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ ایسا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بڑے میدان میں رنگ و مستی کا عروج تھا۔ قلطی سرداروں نے اپنی غیر ملکی لونڈیاں اور لونڈے رومی سپاہیوں کو پیش کر دیئے تھے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ قیامت کی مثال برپا تھا۔ رومی فوجی لڑکیوں اور لڑکوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ کسی کو آس پاس کی پروا نہ تھی۔ سب شراب کے نشے میں دھت تھے۔ عام قلطی باشندے رقص و سرود کی محفل میں مشغول تھے۔ ایک بڑی محفل سجی تھی۔ قلطی مرد و زن ایک بڑے دائرے کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے اور ممفس کی رقاصائیں اس گول میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جس کے اردگرد یونانی سازندے اپنے اپنے سازوں کو پیٹ رہے تھے۔ میدان کے بیچوں وبیچ الپس کے راجہ پولابیں کا تخت لگا تھا۔ جس کے سامنے کھلا میدان تھا اور اردگرد خصوصی نشستیں۔ سامنے کے کھلے میدان میں سردار پولابیں اور اس کے ساتھی ایک شعبدہ باز کی شعبدہ بازیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سیراکیوز کا رہنے والا یہ شعبدہ باز لشکر کی خوشنودی کے لیے روم سے ہی لشکر کیساتھ آیا تھا اور آج اسے پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اپنے منہ میں مٹی کا تیل بھر لیتا اور ہاتھ میں پکڑی مشعل پر مٹی کے تیل کی پھوار پھینکتا اور دیکھنے والے کو یوں لگتا جیسے آگ اس کے منہ سے نکل کر مشعل تک جا رہی ہے۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اور شعبدہ باز کے سازندے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ سردار پولابیں پوری طرح ان حیران کن شعبدہ بازیوں کی طرف متوجہ تھا۔ تخت کے آس پاس موجود سبھی لوگ بھی شعبدہ باز کا کرتب دیکھنے میں مصروف تھے۔ کوئی پلک بھی نہ جھپک رہا تھا۔ سردار پولابیں کے سر پر راجہ کا تاج سجا تھا۔ اس کے تخت پر اکیلی اس کی نشست تھی اور وہ سب سے نمایاں بیٹھا اپنے راجہ ہونے پر اتنا خوش ہو رہا تھا کہ گویا وہ ہفت اقلیم کا شہنشاہ بنا دیا گیا ہو۔ ڈھول کی آواز اور تالیوں کی گونج سردار پولابیں کی خوشی کو چار چاند لگا رہی تھی کہ......

اچانک کہیں سے ایک اڑتا ہوا تیر آیا اور پوری قوت سے سردار پولابیں کی گردن

کے آر پار ہو گیا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اچانک کیا افتاد آ پڑی تھی۔ سردار پولابیس ذبح ہوتی ہوئی مرغی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی بیل ڈکرا رہا ہو۔ اور لہو تھا کہ کسی فوارے کی طرح پھوٹ پڑا تھا۔ شاید سردار پولابیس کی شہ رگ کٹ گئی تھی۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ نکل رہی تھی۔

آن واحد میں ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلا کہ تیر کہاں سے آیا تھا۔ جشن میں مست قلطی جان ہی نہ پائے کہ آخر لوگ اتنی سرعت کے ساتھ ایک طرف کو دوڑ رہے ہیں۔ نشے میں دھت رومی لشکر کے سپاہی سر اٹھا کر دوڑتے ہوئے لوگوں کو دیکھتے اور پھر اپنی زناکاریوں میں مصروف ہو جاتے۔ ایسے عالم میں بھلا کون جان سکتا تھا کہ ایک قلطی دوشیزہ اور ایک قرطاجنی نوعمر لڑکا کب ہزاروں کے اس ہجوم سے نکل گئے۔

یہ تھا سنتوش کے دل میں پلنے والا وہ خیال جو اسے شوزینہ کے ساتھ واپس قلطی آبادی میں کھینچ لایا تھا۔ اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ پولابیس نے اسے بہت نوچا کھسوٹا تھا۔ وہ اس طرح ایک مظلوم انسان بن کر اب دوبارہ اپنی شیتل کے پاس واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ شیتل کو منہ تب دکھائے گا جب پولابیس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے گا اور آج اس نے بدلہ لے لیا تھا۔ اتنے دن اس نے خود کو اس لیے شوزینہ کے گھر چھپائے رکھا تھا کہ وہ ایک دن پولابیس کو اس کے انجام تک پہنچائے گا۔

کاموجی سمجھتی رہی کہ وہ بزدل ہے اور شوزی جانتی تھی کہ اس کے دل میں کچھ ہے۔ جو وہ بتانا نہیں چاہتا۔ وہ گزشتہ دو دن سے وادیٔ برف میں چھپتے چھپاتے پھر رہے تھے۔ کیدارا سے سیکھی ہوئی تیراندازی آج سنتوش کے کام آئی تھی۔ اس نے اپنے دشمن کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ سنتوش کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ شوزی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ عام رفتار سے چلتے ہوئے ہجوم سے باہر نکل آئے تھے۔

ادھر قید خانے میں بھی عجیب واقعہ ہوا تھا۔ بوڑھے پہریدار کے ساتھ پانچ قلطی سپاہی واپس آئے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب شراب پیئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی تلواریں برہنہ کر لیں اور لوہے کا تالا کھول دیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو ان پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ نشے میں وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ قیدیوں نے آن کی آن میں ان پر قابو پا لیا اور ان کا اسلحہ چھین کر انہیں ڈھیر کر لیا۔ بڈھا پہریدار پہلے ہی باہر تھا۔ وہ بساط

الٹی دیکھ کر بھاگ نکلا۔ دانیال، شارق، کیدارا، شیتل اور کلاڈینا اسلحہ سے لیس ہو کر کسی چھاتہ بردار دستے کی طرح چھپتے چھپاتے قید خانے سے باہر نکل آئے اور اب وہ رات کی تاریکی میں ایک ویران راستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ آبادی سے مخالف سمت کو جا رہے تھے۔

وہ کافی دیر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ آبادی سے بہت دور نکل آئے۔ اب وہ مطمئن تھے۔ انہیں تلاش تھی تو کسی ایسے مقام کی جہاں بیٹھ کر وہ "آگے کیا کرنا ہے؟"...... کی حکمت عملی سوچ سکتے۔ یہ ایک تاریک راستہ تھا۔ گہری رات اور خاموشی نے ان کے ہیولوں کو سنسنی خیز بنا دیا۔ راستہ قدرتی تھا۔ کسی کسی مقام پر پتھروں کی ہمواریت کو دیکھ کر اس قدرتی راستے میں انسانی ہاتھ کی دخل اندازی بھی محسوس ہوئی تھی۔ راستے کے دونوں طرف چٹانیں تھیں اور یوں گویا وہ گھاٹی میں سے گزر رہے تھے۔

یکا یک کیدارا ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کو رکتا دیکھ کر باقی لوگ بھی رک گئے۔

"کیا بات ہے کیدارا؟...... تم رک کیوں گئے؟"

شارق نے مدھم آواز کے ساتھ پوچھا۔ کیدارا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور پھر چوکنا ہو کر وہ کچھ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سب خاموش ہو گئے۔ معاً کلاڈینا کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ اس نے اپنی شمشیر سیدھی کی اور ہر قسم کے خطرے کے لیے تیار ہو گئی۔ کیدارا نے دانیال کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

"یہاں کوئی ہے؟ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی چھپا ہوا ہے۔"

شیتل بھی قریب آ کر کیدارا کی سرگوشی سن رہی تھی۔ اس نے کیدارا سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟ میں نے تو محسوس کیا ہے۔"

"کوئی جانور ہوگا۔ یہ ویران پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس قدر تجسس کی کیا ضرورت ہے؟"

شیتل نے پھر سرگوشی کرتے ہوئے گویا کیدارا کو تادیب کی۔ لیکن کیدارا نے فوراً کہا۔

"نہیں!...... میں نے باتیں کرنے کی آواز محسوس کی۔ وہ جو کوئی بھی ہے ہم سے

چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔"
اسی اثنا میں قریب ہی کوئی پتھر لڑھکا اور سب کے سب ایک ساتھ چونک گئے۔ شارق آواز کی سمت لپکا تو کیدارا نے بھی اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن دانیال نے اسے پکڑ لیا۔
"نہیں!...... ممکن ہے وہ پتھر جان بوجھ کر پھینکا گیا ہو۔ ہم لوگوں کو چٹان کی اوٹ لے لینی چاہیے۔"
شیتل اور کلاڈینا کے بدن میں سنسنی کی تیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔ کیدارا نے اچانک ایک فیصلہ کیا اور دانیال سے کہا۔
"میں اس چٹان کی اوٹ میں دیکھتا ہوں۔ مجھے شک ہے کوئی اس چٹان کے پیچھے موجود ہے۔"
دانیال کچھ نہ بولا۔ کیدارا نہایت احتیاط سے چٹان کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی جس سے کچھ دیر پہلے اس نے پہریداروں کا قتل کیا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا کسی پہاڑی چیتے کی طرح ہاتھوں اور پیروں کی مدد لیتا چٹان کے پہلو میں گھوم گیا۔ لیکن جونہی وہ عقب میں نمودار ہوا وہ قتل ہونے سے بال بال بچ گیا۔ کسی نے اس پر بڑی پھرتی سے تلوار چلائی تھی۔ کیدارا بروقت جھکائی دے گیا۔ مدمقابل کی تلوار چٹان پر پڑی اور "ٹن" کی آواز نے دانیال اور اس کے ساتھیوں کو بتا دیا کہ کیدارا کسی سے ٹکرا چکا ہے۔ وہ سب اس کی مدد کو دوڑے۔ وہ واقعی ٹکرا چکا تھا۔ وہ ایک تھا اور اس کے مقابل دو افرد تلوار چلا رہے تھے۔ لیکن کیدارا اب سنبھل چکا تھا۔ معاً اس نے محسوس کیا کہ دونوں مدمقابل تلوار بازی کے فن میں کمزور ہیں۔ کیدار چونک گیا۔ اسی اثنا میں شارق اور دانیال بھی چٹان کے عقب میں آگئے۔ اور ان کے پیچھے کلاڈینا اور شیتل۔
معاً مدمقابل تلوار باز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"کیدارا!!...... یہ میں ہوں سنتوش!"
شیتل نے وہ جملہ سن لیا تھا۔ اسے لگا جیسے یکدم وہ عالم خواب میں پہنچ گئی ہو۔ کیدارا نے تلوار روک لی اور بے یقینی سے مدمقابل کو گھورنے لگا۔ وہ واقعی سنتوش تھا۔ لیکن کیدارا کے حساب سے اب وہ بڑا ہو چکا تھا۔ اسی لیے کیدارا اسے جلدی نہ پہچان سکا۔ کلاڈینا، دانیال اور شارق ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کیدارا نے پوری قوت سے چیخ کر پکارا۔

''سنتوش!!......مہا پجاری کے بیٹے!''

سنتوش اب شیتل کو بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کی حالت یکا یک غیر ہوگئی۔ شیتل کو دیکھتے ہی وہ اپنے آپ میں نہ رہا۔ اس کے ہونٹ اور زبان اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ وہ کہتا کچھ تھا اور اس کے منہ سے نکلتا کچھ تھا۔ وہ کسی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھا۔ کبھی شیتل کو دیکھتا، کبھی کیدارا کو، سچ بھی یہی تھا۔ شیتل یا دوسرے لوگوں کے لیے سنتوش کا یہاں مل جانا غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن سنتوش کو ان لوگوں کا یوں اچانک مل جانا بہت اچنبھے کی بات تھی۔ ابھی ابھی وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کر کے آرہا تھا۔ اس کا فشارِ خون اس کے قابو میں نہیں تھا۔ وہ اور شوزی اطمینان کے ساتھ واپس جا رہے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے دور کچھ فاصلے پر چند سائے آتے ہوئے دکھائی دیئے اور وہ چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے۔ یہ تو کیدارا کی افریقی ساعت تھی جس نے ان کی سرگوشی بھی سن لی۔ ایشور نے عجیب کرشمہ دکھلایا۔ سنتوش کا چہرہ لال ہو چکا تھا۔ اس نے تلوار ایک طرف پھینک دی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر کیدارا کے سینے سے چپک گیا۔ نہ جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کیدارا اسے دیر تک سینے سے چمٹائے رہا اور آج تو اس افریقی مردِ آہن کی آنکھوں میں بھی آنسو نظر آرہے تھے۔ سنتوش کیدارا سے الگ ہوا تو شیتل اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور اب شیتل آگے بڑھ کر سنتوش کے سینے سے لگ گئی۔ قدرت نے انہیں ملا دیا تھا۔

دونوں کو اپنی سانسیں دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ ایک دوسرے کی خوشبو میں کھو گئے۔ سنتوش، شیتل کے کانوں اور گالوں پر اپنا منہ رگڑنے لگا۔ وہ والہانہ انداز میں شیتل کی گردن چوم رہا تھا۔ دو قدم کے فاصلے پر کھڑی شوزی سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا دیا اور دوسری طرف گھوم کر کھڑی ہوگئی۔

برقہ میں سب لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر جھمو کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اور جب جہاز سمندر کے دوش پر تیرنے لگا تو جھمو کبھی مستول اور کبھی عرشے پر چھلانگیں مارتا، لٹکتا، جھولتا اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

ایک روز جہاز کے عرشے پر شارق نے دانیال سے کہا۔

''بہت جلد میں آپ سے اجازت لینے والا ہوں۔ راستے میں ''مندس'' نامی ایک جزیرہ آئے گا، وہاں آپ لوگ مجھے اتار دیجئے گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ واپس مارفیس چلا جاؤں۔''

''واپس مارفیس؟ لیکن وہاں سے تمہیں نکال دیا گیا ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔''

''تم اس جزیرے پر واپس جانا چاہتے ہو جہاں زندہ انسانوں کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے؟''

''نہیں!...... میں اس جزیرے پر جانا چاہتا ہوں جہاں مجھے کسی سے کچھ حساب لینا ہے۔''

''کسی سے کچھ حساب؟...... میں سمجھا نہیں۔''

''مجھے سردار جیدان اور اس کے بیٹے سے کچھ حساب بے باک کرنا ہے۔''

دانیال خوب سمجھ گیا کہ شارق واپس مارفیس کیوں جانا چاہتا تھا۔ دانیال کو شراب خانے میں پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا۔ اس روز کچھ لوگ شارق کو قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔ اگر دانیال بروقت اس کی مدد نہ کرتا تو شاید وہ مارا جاتا اور اسی روز شارق کو پتا چلا تھا کہ سردار جیدان کا بیٹا اس کے خون کا پیاسا ہے۔ تب سے شارق نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ

بوڑھے سردار جیدان کو مارفیس کی مجلس میں شرمندہ کر کے اسی طرح معافی مانگنے پر مجبور کرے گا جس طرح اس نے شارق کو کیا تھا۔

دانیال اور شارق ابھی باتیں کر رہے تھے کہ کلاڈینا بھی عرشے پر آ گئی۔ دانیال نے کلاڈینا کو بتا دیا کہ شارق اب ان سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ شارق نے نہایت تیزی سے کلاڈینا کے چہرے پر اپنے لیے نازک جذبات تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کلاڈینا اس کی واپسی کے ذکر پر خاموشی کا اظہار کرے۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ کلاڈینا کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہ تھے۔ شارق کو دل ہی دل میں دکھ ہوا۔ اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ البتہ دانیال نے اتنا کہا۔۔

''مندس کے جزیرے پر اترنا ہی کیوں ضروری ہے؟ جتنا سفر تم یہاں سے مارفیس تک کا کرو گے اگر ہمارے ساتھ قرطاجنہ آ کر اور کچھ دن ہمارے ساتھ قیام کر کے مارفیس کا قصد کرو تو وہ بھی کوئی زیادہ سفر نہ ہوگا۔''

شارق تو دل سے یہی چاہتا تھا لیکن کلاڈینا کو خاموش دیکھ کر اس نے اپنی خواہش کو جھوٹے الفاظ کے ذریعے چھپا دیا۔ اس نے کہا۔

''نہیں!...... مندس کے جزیرے سے مارفیس کا فاصلہ کم ہے اور پھر میں قرطاجنہ جا کر کیا کروں گا۔ مجھے مارفیس میں اپنا کچھ حساب چکتا کرنا ہے۔''

''کسی کو زندہ جلانا ہوگا۔''

کلاڈینا نے گہری چوٹ کی۔ وہ اب بھی شارق پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس تمام عرصے میں شارق نے نہ جانے کلاڈینا کی خوشنودی کے لیے کتنے پاپڑ بیلے، لیکن وہ تھی کہ کسی دام میں نہ آتی تھی۔ شارق نے کلاڈینا کی بات سنی تو یکدم سر اوپر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ دانیال کو محسوس ہوا کہ کلاڈینا نے بہت سخت بات کہہ دی۔ چنانچہ اس نے کلاڈینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کلاڈینا!...... شارق ایسا نہیں ہے۔ تم اس کو قصور وار کیوں مانتی ہو؟ یہ مارفیس کے جزیرے پر پیدا ہوا ہے۔ وہ قزاقوں کا جزیرہ ہے۔ وہاں ہر کوئی مار دھاڑ اور قتل و غارت ہی سیکھتا ہے۔ آخر تم شارق کے ساتھ اس لہجے میں بات کیوں کرتی ہو؟''

دانیال کی تنبیہ سے کلاڈینا خفیف ہوگئی۔ اس نے آگے سے بحث کرنے کی بجائے

سر جھکا دیا۔ دانیال کے سامنے وہ اکثر سر جھکا لیا کرتی تھی۔ اب شارق اور کلاڈینا دونوں خاموش تھے۔ شارق اور دانیال نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور پھر دانیال مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"دراصل کلاڈینا چاہتی ہے کہ شارق واپس نہ جائے۔ اس لیے تو اس نے اتنا سخت جملہ بولا۔ یہی سچ ہے۔ بے شک تم اس سے پوچھ لو۔"

کلاڈینا جز بز ہوگئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی شارق کہنے لگا۔

"یہ پہلے دن سے مجھ سے خفا ہیں۔ غالباً مجھے ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے مجھ سے کل چند ہی جملوں کا تبادلہ کیا ہوگا۔ میں تو خود ان سے ڈرتا ہوں۔ ان کے لہجے سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے مارفیس کے جزیرے پر میں نہیں یہ پیدا ہوئی ہیں۔"

شارق کے مزاحیہ طنز پر دانیال کا قہقہہ نکل گیا۔ کلاڈینا سے رہا نہ گیا۔ وہ ترنت بولی۔

"قزاقوں کا جزیرہ ہو یا پروہتوں کا، فطرت تو فطرت ہوتی ہے۔ بعض لوگ تشدد پسند ہوتے ہیں۔ یہ خون کی بات ہے۔ اس کا علاقے سے کیا تعلق؟"

دانیال کو کلاڈینا کے جملے پر اچنبھا ہوا۔

"کیسی غلط بات کرتی ہو کلاڈینا!...... تم نے کہا خون اور علاقے کا آپس میں کیا تعلق؟

سب سے گہرا تعلق انہی دونوں کا ہے۔ خون بھی اسی مٹی سے وابستہ ہوتا ہے جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ہماری مٹی ہے، وہی ہمارا خون۔"

وہ اب برقہ کے عرشے پر کھلے آسمان تلے ابر آلود موسم میں نہایت اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ برقہ نہایت معتدل رفتار سے بحر روم کے پانیوں پر واپس اپنے گھر کی طرف روانہ تھا۔ کلاڈینا پھر خفیف ہوگئی۔ لیکن اس نے دانیال کا جواب دانشمندی سے دیا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ مارفیس کے جزیرے پر ایک اچھا انسان اور سیراکیوز جیسے مہذب شہر میں ایک برا انسان پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ تو اس کی فطرت پر منحصر ہے جو دیوتا ہمیں عطا کرتے ہیں۔

دھرم ہمیں بتاتا ہے کہ دیوتاؤں کو اس دنیا میں جس قسم کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسی قسم کے لوگ پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دیوتا انسانوں کے روپ میں بھی آجاتے ہیں۔"

دانیال، کلاڈینا کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کلاڈینا کی بات پر کہا۔

"یہ دیوتا کون ہیں؟...... کیا یہ سب ایشور کے بنائے ہوئے کارندے نہیں ہیں۔ جو اپنے اپنے فرائض انجام دینے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ دیوتاؤں کو بھی ایشور پیدا کرتا ہے اور انسانوں کو بھی۔ اس لیے زمین پر موجود تمام مخلوقات اسی ایشور کی تابعداری کرتی ہیں۔ چنانچہ انسان دیوتاؤں کے پیدا کردہ نہیں ہیں اور جہاں تک فطرت کی بات ہے تو یہ بھی اس علاقے کی مٹی پر منحصر ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والے لوگ کرخت ہوتے ہیں اور صحراؤں میں رہنے والے خشک۔ جس طرح کی مٹی ہوگی اسی طرح کی فطرت ہوگی۔ میں یہودی ہوں۔ ہمارے پاس ایشور کی کتاب ہے۔ ہم ایشور کے بھیجے ہوئے نمائندوں کو اس کا پیغامبر سمجھتے ہیں۔ ہم دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ہی دیوتاؤں سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایشور نے تمام دیوتاؤں میں سب سے بڑا دیوتا خود انسان کو بنایا ہے۔ ہم دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہیں۔ بلکہ سارے کے سارے دیوتا ہم انسانوں کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ جو لوگ بیل کی پوجا کرتے ہیں، کیا وہ جانتے نہیں کہ بیل ہم انسانوں کے حکم سے زمین پر ہل چلاتا ہے یا ہمارے جہاز کو پانی میں دوڑاتا ہے۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے برا پیدا نہیں ہوتا۔ سب بچے معصوم ہوتے ہیں۔ مارفیس جزیرے کا ماحول انہیں لڑائی بھڑائی سکھاتا ہے اور قرطاجنہ کا ماحول لوگوں کو محبت کا سبق دیتا ہے۔"

دانیال نے لمبی بات کی تھی۔ وہ نہایت دھیان سے سن رہے تھے۔ شارق کو اس وقت عجب لگا جب دانیال نے کہا کہ ہم دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز نہیں بلکہ دیوتا ہمارے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ شارق اپنی جگہ کانپ گیا۔ اسے لگا...... دانیال نے جیسے دیوتاؤں کے کرودھ کو آواز دے دی ہو۔ البتہ کلاڈینا اس کی باتوں سے دل ہی دل میں سکون محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دانیال کی بات ختم ہوتے ہی نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے کہ مارفیس کے مقابلے میں قرطاجنہ محبت کی مٹی ہے تو ہمیں اپنی

زندگی گزارنے کے لیے مارفیس جیسی دھرتی کی بجائے قرطاجنہ جیسی سرزمین کا انتخاب کرنا چاہیے۔"

بادل گھر کر آرہے تھے۔ عرشے پر چھاؤں سی ہوگئی تھی۔ دانیال نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاید بارش ہوگی۔"

"ہاں بارش ہوگی،...... زوروں کا مینہ پڑے گا۔"

یہ شارق کا خیال تھا۔ آخر وہ ایک بحری قزاق تھا۔ سمندر کے سارے موسموں کو بخوبی جانتا تھا۔ اس پر مستزاد جھمو کی قلقاریاں تھیں۔ جیسے بادلوں کے موسم میں وہ ہمیشہ بھرا کرتا تھا۔ وہ بخ بخ کرتا ہوا ان کے نزدیک آ بیٹھا۔ وہ سب جھمو کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ دانیال نے کہا۔

"آپ اس بندر کو دیکھ کر حیران نہیں ہوتے۔ یہ جنگل کا باشندہ ہے۔ لیکن ماحول نے اس کو بالکل بدل دیا۔ یہ ہم انسانوں کے پاس پیدا ہوا اور ہم انسانوں سے مانوس ہوگیا۔ اب اگر ہم اسے جنگل میں چھوڑ دیں تو یہ وہاں مرجائے گا۔ لیکن میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ شارق اگر مارفیس کو چھوڑ کر قرطاجنہ میں رہے تو جی نہیں پائے گا۔ میں تو صرف یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ ماحول ہی انسان کی فطرت بناتا ہے اور ماحول کا گہرا تعلق زمین کے ٹکڑے سے ہے۔"

"زمین کے ٹکڑے کے ساتھ کیوں؟...... کیا خانہ بدوشوں کا کوئی ماحول نہیں ہوتا؟ اور یہ بندر تو آرفان کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آرفان کسی زمینی ٹکڑے کا باشندہ نہیں رہا۔ اس کا ماضی بھی بحری جہاز ہے اور مستقبل بھی۔ نہ تو خانہ بدوشوں کا کوئی مٹی کا ٹکڑا ہوتا ہے اور نہ ہی آرفان یا اس کے بندر کا۔ پھر ایسے لوگوں کی فطرت کون سی مٹی سے بنی ہے۔"

کلاڈینا کے سوال نے دانیال کو حیران کردیا۔ اس نے باقاعدہ کلاڈینا کو خراج تحسین پیش کیا۔

"بہت خواب!...... کلاڈینا تم نے کمال کی بات کی ہے۔

تم نے بہت اچھی بات کی۔ خانہ بدوش ہوں یا آرفان اور اس کا بندر، یہی لوگ

زندگی کو جی سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی مٹی کے ٹکڑے کی حفاظت کرنے کے لیے مجبور نہیں۔ لیکن ایسے لوگوں میں احساس تحفظ کی کمی ہوتی ہے۔ گھر ایک پناہ گاہ ہے۔ جہاں ہر مخلوق کا فرد خود کو محفوظ تصور کرتا ہے۔"

آرفان کی باتیں کیا ہوئیں وہ نمودار ہوگیا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے نزدیک آرہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔

"بارش ہونے والی ہے۔ آپ لوگ نیچے آجائیں اور بادبان لپیٹنے میں ہماری مدد کریں۔ بارش زوروں کی ہوگی۔ لیکن لہریں نہیں اٹھیں گی۔ اس موسم میں زیادہ تیز ہوا نہیں چلتی۔"

آرفان کے کہنے پر وہ سب نیچے آگئے اور مختلف کاموں میں برقہ کے عملے کی مدد کرنے لگے۔ سمندر پرسکون تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ بادل گھر کر آئے تھے اور تھوڑی دیر میں مینہ پڑنے والا تھا۔ بادبان لپیٹ لیے گئے تو برقہ کی رفتار کم ہوگئی۔ لیکن بیل ابھی تک کولہو کے گرد گھوم رہے تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اور وہ سردی سے بچنے کا انتظام کرنے لگ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آرفان کی بیوی نے سب کا کھانا تیار کرلیا۔ تو اپنے ایک بیٹے کو بھیجا کہ وہ سب کو کھانے کے لیے بلا لائے۔ وہ سب بڑے کمرے میں اکٹھے ہوگئے۔ آرفان کی بیوی نے مچھلی کے تیل میں کیدارا کی پکڑی ہوئی مچھلیاں تلیں اور سب کے سامنے رکھ دیں۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ تلی ہوئی مچھلی کو دیکھ کر سب کی بھوک چمک اٹھی۔ اور وہ آرفان کی بیوی کو داد دیتے ہوئے کھانا کھانے میں مصروف ہوگئے۔ عین اس وقت جب وہ کھانا شروع کرچکے تھے، موٹے موٹے قطروں والی بارش ٹپ ٹپ شروع ہوگئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جہاز جل تھل ہونے لگا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے جہاز اور سمندر میں موسلا دھار بارش کے منظر سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ سمندر میں آبگینے پیدا ہورہے تھے۔ بارش کا بھاری قطرہ گرتا تو اس کی ضرب کی شدت سے قطرے کی جگہ ایک بڑا سا بلبلا پیدا ہوجاتا جو چند ثانیے پانی میں تیرتا رہتا گویا سمندر کے صدف لاکھوں کی تعداد میں موتی اگل رہے ہوں۔ آبگینے قدم دو قدم چل کر پھٹ جاتے اور نئے آبگینے پیدا ہونے لگتے۔ شیتل اور سنتوش اتنے خوش تھے کہ ان کے چہروں پر موجود نشاط کی رنگت نمایاں تھی۔ وہ وصال کی لذت سے سرشار تھے۔ انہیں اس حسین موسم کا سب سے زیادہ لطف آنے لگا۔ شارق کی نظریں بھی دریچے کے پار سمندر میں

تیرتے آبگینوں پر مرکوز تھیں۔ اس کے دل میں محبوب کے قرب کی لذت تو تھی، لیکن اس کی مہربانی اور کرم کی سرشاری نہیں تھی۔ وہ مغموم بھی تھا اور مسرور بھی۔ کلاڈینا کے دل کی حالت عجب تھی۔ اسے سمندر میں تیرتے ہوئے آبگینے انسانی سروں جیسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کوئی بحری قزاق انسانوں کے سر کاٹ کاٹ کر انہیں سمندر میں پھینک رہا ہو۔ وہ بار بار دریچے سے نظریں ہٹا رہی تھی۔ کیدارا کھانے میں مگن تھا۔ آرفان اور اس کی بیوی چھوٹے موٹے کاموں میں مشغول تھے جبکہ دانیال کے دل کی حالت سب سے الگ تھی۔ وہ نہ جانے کس گناہ کی سزا میں اپنے محبوب سے بچھڑا ہوا تھا۔ سالوں پر سال بیت گئے تھے۔ لیکن جس کے ساتھ اس نے پیار کیا تھا، وہ اسے کہیں نہ مل سکی تھی۔ دانیال نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور دریچے کے پار بیدار ہوتے آبگینوں کو پھر سے دیکھنے لگا۔ کلاڈینا نے دانیال کا دکھ محسوس کیا۔ ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر کسی قدر جھجکتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں دانیال؟''

دانیال نے بدستور دریچے کے پار دیکھتے ہوئے کلاڈینا کے سوال کا جواب دیا۔ اس نے کہا۔

''ان آبگینوں کو دیکھو!...... انسانی زندگی بھی ان کی طرح ہے، پل بھر کے لیے نمودار ہوتی ہے لیکن نہ جانے کتنے رنگ چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ ان آبگینوں پر نگاہ گاڑھ کر دیکھو!...... ان میں ست رنگی شعاعیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کی عمر اور ان کا تجربہ کتنا انوکھا ہے۔ کیا ہماری زندگی بھی ایسی ہی نہیں؟''

کلاڈینا کو مزا آ گیا۔ دانیال نے بہت ہی خوب مثال دی تھی۔ سچ مچ بارش کے قطروں سے پیدا ہونے والے بلبلوں میں ست رنگی شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔ انعکاس نور اور انعطاف نور کے کرشمے ایک ننھے سے آبگینے میں اس قدر کثرت سے تھے کہ اس کے بدلتے رنگوں کو اس کی زندگی کے تجربات سے تشبیہ دینا نہایت ہی منفرد اور حسین انداز تھا۔ کلاڈینا تو جیسے وجد میں آ گئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''اور کتنی مختصر ہے ان کی زندگی۔ شاید ایک پل کے برابر۔ زیادہ سے زیادہ دو یا چار پل۔ سچ مچ ہم انسان بھی ایسے ہی ہیں اور قدرت کے سامنے اتنے ہی کمزور جتنے کہ یہ بلبلے۔''

کلاڈینا اور دانیال کی باتیں سب سن رہے تھے۔ سنتوش جو وصال کی لذت سے سرشار تھا

کہنے لگا۔

”اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ آبگینے شعاعیں پیدا کر رہے ہیں یا محسوس؟ اگر یہ پیدا کر رہے ہیں تو گویا یہ اس کائنات کی تخلیق و ترکیب میں نئے نئے اضافوں کا باعث بن رہے ہیں اور اس لحاظ سے ہم انہیں قدرت کے سامنے کمزور کہنے کی بجائے قدرت کے کام میں دخل انداز یا اضافہ کرنے والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ لوگ ان کی زندگی کو اس پہلو سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ روشنی کے انعکاس یا انعطاف کو محسوس کرتے ہیں، تخلیق نہیں۔ میرا نقطہ نظر مختلف ہے۔“

کلاڈینا اور دانیال نے پوری طرح گھوم کر سنتوش کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تلی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا تھا۔ جسے بات مکمل کرتے ہی اس نے منہ میں ڈال لیا۔ دانیال اور باقی سب لوگ سنتوش کی فراست پر ششدر رہ گئے۔ دانیال نے بلا تامل تسلیم کیا۔

”بے شک!...... بے شک! تمہارا نقطہ نظر زیادہ خوبصورت ہے۔ ہاں! انسان بھی اسی طرح قدرت کے کاموں میں دخل اندازی یا اضافہ کرتا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ اتنے زیادہ متمدن نہیں تھے جتنے کہ آج ہم ہیں۔ وہ زمین کے جس ٹکڑے پر رہتے تھے اس کو کل کائنات کا تصور کرتے تھے۔ سمندر میں سفر تو ان کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ پھر انسان نے قدرت کے کاموں میں اضافہ کیا۔ کشتیاں بنائیں۔ انہیں سمندروں میں دوڑایا، تب ایک خطے کے لوگ دوسرے خطے کے لوگوں سے ملے۔ اگر انسان یہ کام نہ کرتا تو ہم آج بھی اسی طرح رہ رہے ہوتے جس طرح زمانہ قدیم کے انسان رہتے تھے۔ ان کی زندگیاں ایک آبگینے کی طرح طلوع وغروب ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کائنات کے رنگوں میں اضافہ کرتے رہے۔ بالکل ایک آبگینے کی طرح۔“

شارق کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ داناؤں جیسی باتیں نہیں کر سکتا۔ مینہ بڑے زوروں سے پڑ رہا تھا۔ لیکن آرفان کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ بارش سمندری طوفان کا باعث نہیں بنتی۔ کسی کسی وقت ہوا کے جھونکے سے جہاز کو ہچکولا آتا تو ان کے لطف ونشاط میں اور اضافہ ہو جاتا۔ دانیال نے پھر کہنا شروع کیا۔

”کائنات کی ہر چیز اپنا آپ منواتی ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں ذوق آشکارائی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ نئے رنگ اور نئی ترنگ پیدا کرتا ہے اور اس لحاظ سے ذرے

ذرے کی اپنی جگہ ایک منفرد ہستی اور اہمیت ہے۔ تو پھر ہم انسان خود کو اہم کیوں نہیں سمجھتے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی ایک منفرد شخصیات کا مالک ہے۔ جو خود ہماری اپنی نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذات کی گہرائی میں جھانک سکے یعنی اپنے آپ کو دیکھ سکے تو سمجھ لو کہ اس نے اپنی منفرد ہستی کو پا لیا۔ لیکن ہم سچ مچ خود سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایک جانور تو خود سے بے خبر ہے۔ وہ اس کائنات کے رنگوں میں کون سے اضافے کر گیا خود نہیں جانتا۔ لیکن ہم تو جان سکتے ہیں۔ یہی تو یہواہ کا نور ہے۔ ہم سب انسانوں کا خدا۔ جس نے ایک ذرے سے لے کر ہم انسانوں تک ہر چیز کو بنایا۔ وہ ہر چیز میں ہے۔ لیکن باقی اشیاء اس کے نور کو اپنے اندر دیکھ نہیں سکتیں۔ یہ صرف ہم انسان ہی ہیں جو اس خالق کو اپنے وجود میں خود دیکھ سکتے ہیں۔ جس خالق نے اس پوری کائنات کو بنایا۔ وہ پل پل ہمارے وجود میں اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔ جب ہم کچھ تخلیق کرتے ہیں، کچھ بناتے ہیں یا اس کائنات کے رنگوں میں اور نور میں کچھ اضافہ کرتے ہیں تو وہ ہم نہیں کرتے، ہمارے اندر موجود ہمارا خدا خود کرتا ہے۔ ہم جب تک بے خبر رہیں گے تو جانوروں میں اور ہم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ لیکن جونہی ہم اپنی ذات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پہچان لیں گے تو گویا ہم خدائے واحد کو پہچان لیں گے۔"

دانیال ایک یہودی تھا۔ وہ باقی سب کے مقابلے میں ایک سچے مذہب کا پیروکار تھا۔ ابھی تو عیسائیت یا اسلام کا ظہور ہی نہ ہوا تھا۔ ابھی تو فلسطین میں انبیاء کا سلسلہ جاری تھا اور اس لیے یہودیت ابھی اپنی خالص شکل میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دانیال کی باتوں میں اتنا اثر تھا کہ سب مسحور ہو کر رہ گئے۔ سنتوش نے تو کھانا چھوڑ دیا۔ وہ مہا پجاری کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ اسے مہا پرش بنانا چاہتا تھا۔ اسے دھرم کی باتوں سے قدرتی لگاؤ تھا۔ لیکن ایسی باتیں تو اس نے آج تک نہ سنی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دانیال کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ آرفان کی بیوی نے سنتوش کا چھوڑا ہوا برتن اٹھایا اور بچی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے چھمو کے آگے ڈال دیئے۔ وہ تھا تو سبزی خور بندر لیکن تلی ہوئی مچھلی بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ چھمو اچھل کر مچھلی کے ٹکڑوں کے پاس آ گیا۔ بارش کا زور ابھی تک نہ ٹوٹا تھا۔ کلاڈینا تو آج دل ہی دل میں دانیال کا مذہب قبول کر چکی تھی۔ اس کی تسلی ہو گئی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ دانیال کا مذہب سب سے بہتر ہے۔ بلکہ وہ تو دل میں یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ دانیال خود بھی یہودیوں کا ایک اوتار یا پیغمبر

ہے۔اس نے جذبات سے لبریز لہجے میں دانیال سے سوال کیا۔

"کیا آپ ایک بات بتائیں گے؟"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں!"

"کیا آپ ایک اوتار ہیں؟"

دانیال کا قہقہہ نکل گیا۔

"نہیں نہیں!......میرا نام ایک اوتار کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میں نے تو وہ آسانی صحیفے پڑھے ہیں جو ہمارے اوتاروں پر اترے ہیں۔"

سنتوش کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے سوال کیا۔

"اترے ہیں۔کہاں سے اترے ہیں؟ اور ان صحیفوں میں کیا ہوتا ہے؟"

دانیال نے سنتوش کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے تفصیل کے ساتھ بتایا۔

"ہمارا ماننا ہے کہ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں، جو اپنی ذات کی گہرائی میں پوری طرح جھانک لیتے ہیں۔ یہ باطن کا سفر کہلاتا ہے۔ وہ باطن کے سفر میں اتنے آگے تک چلے جاتے ہیں کہ وہاں ان کی ملاقات اپنے خدا سے ہوتی ہے۔ وہی خدا جو ایک جانور میں بھی تھا اور ایک ذرے میں بھی۔ لیکن نہ جانور اسے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ ذرہ۔ اسی خدا سے جب وہ ملاقات کرتے ہیں تو خدا ان کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور جب وہ خدا سے ملاقات کر کے واپس عام انسانی معاشرے میں لوٹتے ہیں تو خدا کی باتیں لوگوں کو بتاتے ہیں۔ ان باتوں کو ہم یہودی مٹی اور پتھر کی سلوں پر کندہ کر کے محفوظ کر لیتے ہیں۔ انہی کو ہم آسمانی صحیفے کہتے ہیں۔ اور اس انسان کو جس پر صحیفہ نازل ہوتا ہے، ہم خدا کے پیغامبر یا نبی یا رسول کہتے ہیں۔ وہ رسول ہمیں معاشرے کے قوانین بتاتا ہے۔ رہن سہن کے طریقے، بات چیت اور کاروبار زندگی کے سب اصول بتاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو کوئی ان رسولوں کی کہی ہوئی باتوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی فلاح پاتا ہے اور اگلے جہان میں بھی۔"

"اگلا جہان؟ کیا آپ اس جہان کی بات کرتے ہیں جہاں ہمارے پرکھوں کی روحیں چلی گئی ہیں؟ آپ کے مذہب میں کیا ہے؟ کیا ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے؟"

سنتوش نے دوسرا سوال کر دیا تھا۔ چنانچہ دانیال اسے بتانے لگا۔

"ہاں!...... وہی جہان، جہاں ہم سب نے جانا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم اس جہان میں آئے تھے۔ یہ تو زندگی کے طبق ہیں، جو مرحلہ وار بلندی کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ بلندی ظاہری نہیں بلکہ معنوی ہے۔ زندگی ارتقاء کرتی ہے۔ موت تو صرف ایک مرحلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک جو اپنی ذات کو دیکھ لے گا وہ کبھی نہیں مرے گا۔ موت کے وقت صرف اس کا جسم ڈھیر ہوگا جو مادے سے بنا ہے۔ یعنی مٹی، ہوا، آگ اور پانی سے بنا ہے۔ مادہ تو اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی ٹھوس ہو جاتا ہے، کبھی مائع بن جاتا ہے اور کبھی دھوں بن کر اڑنے لگتا ہے۔ ہم دراصل وقت کی پہچان کے لیے مادے کا سنگ میل استعمال کرتے ہیں۔ اور اس لیے ہمارے دنوں کی گنتی کسی نہ کسی مادی واقعہ کے ساتھ منسوب ہوتی ہے۔ مثلاً ہم اپنی عمر کی گنتی یوں کرتے ہیں کہ جس روز ہم پیدا ہوتے تھے اس سے لے کر اب تک اتنے سال گزر گئے۔ اسی طرح جب سورج بنایا گیا ہوگا تو اس واقعہ کے بعد زمین پر دن اور رات کی گردش کی گنتی شروع ہوئی ہوگی۔ کیا سورج کے بنانے سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ اصل میں ہم دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ہم مادے کے حادثات اور واقعات کو وقت کی پیائش کا آلہ سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وقت صرف ایک احساس کا نام ہے، جو ہمیں اشیاء کی تبدیلی کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ اشیاء کا کیا ہے، یہ تو ایک شکل سے دوسری شکل میں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا اشیاء تو سب کی سب خدا نے بنائی ہیں اور اس طرح بنائی ہیں کہ وہ خود ان میں موجود ہے۔ دراصل خدا نے اپنی پہچان کروانے کے لیے اپنی مختلف صورتیں دکھائیں۔ مادے کے مختلف مدارج ٹھوس مٹی پھر پانی، پھر زندگی، پھر انسان...... یہ سب خدا کی صورتیں ہیں۔ جو اس نے دکھائی ہیں۔ اور جو کوئی اپنی آنکھ سے خدا کو دیکھ لیتا ہے وہ بقاء پا جاتا ہے۔ مادہ یہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا کی شان کا جلوہ دیکھنے والا ایک نئے زمانے اور نئے جہان میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ پھر خدا کا جلوہ دیکھے گا۔ خدا کی ہر زمانے میں نئی شان ہے۔ وہ ہر زمانے میں خدا کی شان دیکھتا جائے گا۔ اس کی صورت اور صفات کو پہچانتا چلا جائے گا اور یوں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

سنتوش اور کلاڈینا کی آنکھوں میں شدت جذبات سے آنسو چمک رہے تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے آج ان کے دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔ اب سب

کھانا کھا چکے تھے۔ جہاز کے تختوں پر پڑتی ہوئی بارش عجب موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی یونانی کلاکار اپنے کسی ساز پر مسلسل مضراب مار رہا ہو۔ کچھ ایسی آواز تھی جیسے بہت سے گھوڑے چھت پر ٹپ ٹپ دوڑے رہے ہوں۔ جہاز اپنی مخصوص رفتار سے سیدھا قرطاجنہ کی جانب روانہ تھا۔ شارق نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ اور ان کے ساتھ ضرور قرطاجنہ جائے گا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی قرطاجنہ میں ہی گزارے گا۔ دانیال کی باتیں آج اس کے دل میں بھی اتر گئی تھیں۔ شیتل اپنی جگہ حیران تھی کہ اس نے آج کتنا کچھ جان لیا۔ معاً سب چونک گئے۔ ان کے کانوں سے کسی بھونپو کی آواز ٹکرائی۔ یہ کسی جہاز کے بگل کی آواز تھی۔ وہ سب کے سب یک لخت مستعد ہو گئے۔ انہیں پہلا خیال یہی آیا کہ موسلا دھار بارش میں وہ کمرے کے اندر بے خبر بیٹھے رہے اور بحر روم کے قزاق ان کے سر پر آ پہنچے۔ یکا یک شارق نے شمشیر برہنہ کرلی۔ آرقان اور کیدارا باہر کی طرف لپکے اور بارش کی پرواہ کیے بغیر عرشے پر آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے باقی سب لوگ بارش میں بھیگتے ہوئے عرشے پر آ گئے۔ سامنے سے ایک چھوٹا جہاز آ رہا تھا۔ اس کی رفتار تیز تھی اور اس کے عرشے پر کھڑے کچھ لوگ سفید پرچم ہلا رہے تھے۔ سفید پرچم بارش میں بھیگ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا رنگ برقہ سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ سفید پرچم صلح اور دوستی کی علامت تھا اور یہی وجہ تھی کہ دانیال اور اس کے ساتھی سوچ میں پڑے گئے۔ آخر سامنے سے آنے والا جہاز کس کا تھا؟ وہ کون تھا جو اس موسلا دھار بارش میں ان کے لیے دوستی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ کلاڈینا نے قدرے بلند آواز کے ساتھ کہا۔

"یہ دھوکہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ جہاز قزاقوں کا ہوسکتا ہے۔ جو ہمیں دھوکے سے روکنا چاہتے ہوں۔"

"نہیں!...... یہ قزاقوں کا جہاز نہیں۔ اس کی بناوٹ سرکاری جہازوں جیسی ہے، ہوسکتا ہے یہ لوگ کسی مشکل میں ہوں اور ہم سے مدد چاہتے ہوں۔"

یہ شارق کی آواز تھی۔ وہ ایک ماہر اور بہادر قزاق تھا اور قزاقوں کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کلاڈینا کی بات کا جواب دینے کے بعد دانیال کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔

’’اتنے چھوٹے جہاز میں اگر قزاق ہوئے بھی تو ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں ان کے لیے رکنا چاہیے۔‘‘

بھونپو کی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ اب وہ جہاز اور بھی قریب آ گیا تھا۔ دانیال نے شارق پر بھروسہ کرتے ہوئے آرفان کو ہدایت کی کہ وہ جہاز کو روک دے۔ آرفان نے اثبات میں سر ہلایا اور عرشے سے واپس چلا گیا۔ شیتل، سنتوش، کیدارا، دانیال، کلاڈینا اور شارق عرشے پر کھڑے بھنویں سکیڑتے سامنے سے آتے ہوئے جہاز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ان کا جہاز رک گیا اور سامنے سے آتا ہوا جہاز بالکل نزدیک آ گیا۔ اس کے عرشے پر کھڑے لوگوں کو دیکھتے ہی سنتوش اور دانیال پہچان گئے کہ وہ لوگ قرطاجنی ہیں۔ ان کے لباس اور حلیے سے ان کی قومیت کا پتہ چلتا تھا۔ اب دانیال اور اس کے ساتھی عجیب عجیب خیالات سوچنے لگے۔ یوں کھلے سمندر میں ایک قرطاجنی جہاز کا ان کی طرف بڑھنا اور انہیں روکنا اچنبھے کی بات تھی۔ جہاز بالکل قریب آ گیا۔ سامنے عرشے پر کھڑے لوگوں کو دیکھ کر دانیال کو یقین ہو گیا کہ وہ کسی قیمت پر قزاق نہیں ہو سکتے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر شخص جو حلیے سے کوئی معزز قرطاجنی لگتا تھا مسلسل دانیال کو تکے جا رہا تھا۔ دونوں جہاز ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہوئے تو ایک عرشے سے دوسرے عرشے تک آواز بہ آسانی پہنچنے لگی۔ شارق نے بولنے میں پہل کی۔

’’کون لوگ ہیں آپ؟ اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟‘‘

ادھیڑ عمر کے معزز قرطاجنی نے شارق کی بات کا جواب دیا تو دانیال اور اس کے ساتھی دنگ رہ گئے۔ اس نے کہا۔

’’ہم پچھلے دو ماہ سے سمندر میں ایک جہاز کو ڈھونڈ رہے ہیں جس کا نام برقہ ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ یہی جہاز ہے۔‘‘

شارق نے حیرت سے دانیال کے چہرے کو دیکھا۔ گویا اس سے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ دانیال نے یوں نفی میں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو مجھے کیا معلوم۔ شارق نے پھر اسی شخص سے سوال کیا۔

’’آپ کو برقہ کی کیوں تلاش ہے؟‘‘

"میں قرطاجنی حکومت کا سرکاری اہلکار ہوں۔ مجھے دانیال نامی ایک یہودی سوداگر سے ملنا ہے جو برقہ کا مالک ہے۔"

اب تو دانیال اور اس کے ساتھیوں کے دنگ رہ جانے کی انتہا ہوگئی۔ دانیال نے کیدرا اور شارق کو ہدایت کی کہ وہ دونوں جہاز کے درمیان لکڑی کے تختے بچھائیں تاکہ ایک جہاز سے دوسرے جہاز پر آیا جاسکے۔ چھمبو بھیگے ہوئے بادبان کے ساتھ چپکا مسلسل سامنے والے جہاز کے لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

تختے بچھا دیئے گئے اور متلاشی جہاز کے لوگ نہایت مہذب طریقے سے برقہ میں آگئے۔ ادھیڑ عمر شخص نے دانیال سے ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھیوں کو سلام کیا۔ تب اس نے پوچھا۔

"یقیناً آپ دانیال ہیں۔"

"ہاں! میں ہی دانیال ہوں۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ قرطاجنی حکومت کے سرکاری اہلکار کو میری تلاش کیوں ہے؟"

ادھیڑ عمر آدمی زیرلب مسکرایا اور اس نے کہا۔

"میرا نام "کہرتاب" ہے۔ میں قرطاجنہ کی کنواری کے سرفروشوں کا سپہ سالار ہوں۔ میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے۔"

قرطاجنہ کی کنواری کا لفظ اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ دانیال کی حالت غیر ہوگئی جس لڑکی پر اسے شک ہوا تھا کہ وہ آموسا ہوسکتی ہے، اس نے اس متلاشی جہاز کو بھیجا تھا۔ یہ سوچ کر دانیال کے بدن میں سنسنی کی ایک عجب شیریں لہر دوڑ گئیں۔ وہ گڑبڑا گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ سنتوش اور شینل کے لیے بھی قرطاجنہ کی کنواری کا لفظ چونکا دینے والا تھا۔ وہ بھی ہمہ تن گوش ہوگئے۔ دانیال بڑی مشکل سے اتنا کہہ پایا۔

"کک......کونسی امانت ہے؟"

معزز ادھیڑ عمر شخص نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ رنگ کا رومال نکال کر دانیال کو پیش کردیا۔ دانیال کچھ نہ سمجھا۔ اس نے سرخ کپڑے کا رومال تھام لیا اور اسے

کھول کر دیکھنے لگا۔ رومال پر ایک پرندے کی تصویر بنی تھی اور ایک اونچا مینار دکھایا گیا تھا۔ مینار کی تصویر کو دیکھ کر دانیال کو بے اختیار برج اعظم کا خیال آیا۔ جہاں مہاپرش کی ملاقات کے دوران اس نے پہلی بار قرطاجنہ کی کنواری کو دیکھا۔ البتہ پرندے کی رمز وہ نہ سمجھ پایا تھا اور اپنے آپ کو قرطاجنہ کی کنواری کے سرفرشوں کو سپہ سالار کہا تھا۔ تب گھرتاب نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے مزید کہا۔

"میرے پاس آپ کے لیے ایک پیغام بھی ہے۔"

"پیغام؟"

"جی ہاں! قرطاجنہ کی کنواری محترمہ جافلیکس نے آپ کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ پیغام کے الفاظ یہ ہیں......

"فاختہ برج پر بیٹھے گی۔ اگر کووں کے آنے سے پہلے کبوتر آجائے تو وہ مکمل ہوجائے۔"

سچ تو یہ تھا کہ دانیال کچھ نہ سمجھ پا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک انجانی سی خوشی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ نہ سمجھ کر بھی وہ بہت کچھ سمجھ رہا ہو۔ اس نے پیغام کے الفاظ پر غور شروع کردیا۔ فاختہ برج پر بیٹھے گی، اگر کووں کے آنے سے پہلے کبوتر آجائے تو وہ مکمل ہوجائے گی۔ اگر وہ قرطاجنہ کی کنواری کو فاختہ خود کو کبوتر اور برج اعظم کو برج تصور کرتا تو پھر کوے کون تھے؟ یہی سوال اسے پریشان کررہا تھا۔ اس نے ہیجانی کیفیت میں ایک بار پھر سرخ رومال کو کھول کر دیکھا اور معاً اس کی نگاہ برج کی تصویر کے اندر کھڑے ہوئے ایک نشان پر پڑی۔ یہ تو وہی نشان تھا جو وہ اور آموسا بچپن میں ہر جگہ بنایا کرتے تھے۔ سیب کے پیڑوں کے تنوں پر، پتھروں پر، زمین پر، گھر کی دیواروں اور دروازوں پر۔ یہ ایک مبہم سی علامت تھی۔ دانیال کو یقین ہوگیا کہ جافلیکس ہی آموسا ہے۔ اس کی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ اسے لگا کہ یہیں کھڑا کھڑا بے ہوش ہوجائے گا اور اس کی دھڑکن بند ہوجائے گی۔ پچیس سال سے وہ جس محبوب کو ڈھونڈ رہا تھا، اسی محبوب نے پہلے اسے ڈھونڈ لیا۔ دانیال نے زندگی میں کبھی اس طرح کی خوشی نہ دیکھی تھی۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا اور اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے بغیر کسی سے کچھ کہے چپ چاپ جہاز میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو اس

نے دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھالی اور آموسا کے رومال کو کھول کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور دل کی حالت ابھی تک قابو سے باہر تھی۔ معاً اس نے رومال اپنے منہ پر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ یہ انہونی کیسے واقع ہو گئی تھی۔ وہ چیز جس پر یقین ہوتے ہوئے بھی اسے یقین نہ آیا تھا، وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ دانیال بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس نے کتنا لمبا انتظار کیا تھا۔ اپنے محبوب کو پانے کے لیے۔ نہ جانے وہ کب سے قرطاجنہ کی کنواری جافلیکس کے نام سے واقف تھا۔ شاید کئی سالوں سے۔ لیکن اسے کبھی خیال تک نہ آیا تھا کہ قرطاجنہ کی کنواری اس کی محبوبہ آموسا ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی قسمت پر رو رہا تھا۔ جس نے اس کو جافلیکس سے دور رکھا۔ ورنہ اسے اگر پہلے پتہ چل جاتا تو شاید آج انہیں ملے ہوئے کئی سال ہو چکے ہوتے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت خوش تھا۔ آخر وہ مل تو گئی تھی۔ اب اسے برج اعظم میں زینوں پر ہونے والی ملاقات اور اس وقت کی ہیجانی کیفیت کی بھی اچھی طرح سمجھ آ گئی۔ اس روز اس کے دل کی دھڑکن نے اسے بتا دیا تھا کہ زینوں پر ملنے والی لڑکی اس کی آموسا ہی تھی۔ لیکن اسے اپنی قسمت پر یقین نہ آیا اور وہ کچھ کہے بغیر برج اعظم سے چلا آیا۔ آج اسے سب باتیں سمجھ آ رہی تھیں اور اب تو وہ پیغام کا مطلب بھی جان گیا تھا۔ آموسا کہہ رہی تھی کہ رومی لشکروں کی آمد سے پہلے پہلے تک وہ برج اعظم میں اس کا انتظار کرے گی اور پیغام کا آخری جملہ تو دانیال کے لیے بہت ہی خوش رنگ تھا وہ یہ تھا کہ......

"وہ مکمل ہو جائے گی۔"

اس کا تو صاف مطلب یہ تھا کہ وہ دانیال کو ہمیشہ کے لیے مل جائے گی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ قرطاجنہ کی کنواری تو کبھی شادی نہ کرتی تھی، پھر وہ کیسے مکمل ہو جائے گی۔ بے اختیار اس کا دماغ ماضی کی طرف گھوم گیا۔ وہ سوچنے لگا آخر آموسا کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا، کیا اس کا باپ اسے لے کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ لیکن اب تو جافلیکس کا باپ وزیر اعظم ارفلکر تھا۔ دانیال اپنے ذہن پر زور دے کر ارفلکر کا حلیہ یاد کرنے لگا۔ لیکن اسے یاد نہ آ رہا تھا۔ غالباً اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن اگر کہیں دیکھا بھی تھا تو ان دیکھا سا۔

دونوں باپ بیٹی نے نام کیوں بدل لیے تھے۔ آموسا کے باپ کا نام تو ہسدرو تھا۔ دانیال اسے بچپن میں ہسدرو چاچا کہہ کر پکارتا تھا اور آموسا کو آموسی۔

دانیال کے ساتھی خوش بھی تھے اور متجسس بھی۔ کلاڈینا نے سندینا سے اس کی کہانی سن رکھی تھی۔ باقی تھوڑی تھوڑی سب کو معلوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دانیال جب سفر پر نکلا تھا تو اس کے سامنے دو عزائم تھے، ایک سنتوش کی بازیابی اور دوسرا آموسا کی تلاش۔ اس کا یہ سفر کتنا کامیاب رہا تھا۔ کلاڈینا بے حد خوش ہوگئی۔ وہ دانیال کی بے حد عزت کرتی تھی۔ اس نے اگر کبھی کسی مرد کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا تو وہ دانیال ہی تھا۔ کلاڈینا کو اپنے خون کی گردش کا بھی لطف آ رہا تھا۔ شاید اسی شے کا نام سرشاری تھا۔ وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"زندگی کا یہ رنگ جسے محبت کہتے ہیں...... سب سے انوکھا ہے۔ زندگی نے پھر ایک نیا رنگ دکھا دیا...... انعکاس نور...... انعطاف نور۔"

وہ بلبلوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ شارق دور کھڑا پیار سے کلاڈینا کو خوش ہوتا دیکھ رہا تھا۔ شیتل اور سنتوش مہمانوں کو لے کر اندر بڑے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کیدار ان کی سیوا پر لگ گیا تھا اور بارش اچانک رک گئی تھی۔ دانیال کی حالت سنبھلی تو وہ باہر آیا اور بڑے کمرے میں آ کر مہمانوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وہ اپنے حواس کو بحال کر چکا تھا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع اور کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد دانیال، گہرتاب کو لے کر الگ چلا گیا۔ وہ قرطاجنہ کی کنواری کے سرفروشوں کے سپہ سالار سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ گہرتاب پچھلے بیس سال سے جافلیکس اور ارفلکر کے ساتھ تھا۔ قرطاجنہ کی کنواری کے محافظ دستے کو "سرفروش" کہا جاتا تھا۔ ان کی تعداد ہمیشہ ایک سو ایک ہوتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اعلیٰ درجے کا جنگ باز، شمشیرزن، زورآور، ذہین اور چست و چالاک ہوتا تھا۔ ایک سو ایک کے اس دستے میں پچھلے پندرہ سال سے گہرتاب ہی ایک سو ایک واں تھا۔ وہ جافلیکس کے خاص اعتماد کا آدمی تھا۔ اسے جافلیکس کا باپ ایران سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ دانیال گہرتاب کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں آتے ہی گہرتاب آپ ہی آپ بولنے لگا۔

"وہ آج تک آپ کو نہیں بھولیں۔ میری مالکان نے اپنی ساری زندگی آپ کے نام لگا دی۔ آج سے بیس سال پہلے میں نے اس کے باپ کی ملازمت اختیار کی تھی۔ اس وقت ارفلکر ایران میں تھا۔ تب سے لے کر آج تک شہزادی جافلیکس نے ہمیشہ ایک یہودی نوجوان کو یاد کیا ہے۔ ارفلکر تو اس کا، نام کا باپ ہے۔ اس کا اصل باپ تو میں ہوں۔ اس کا

نوکر بھی ہوں، خدمتگار بھی اور باپ بھی، وہ اپنی ہر بات میرے ساتھ بانٹتی ہے۔ جب جافیکس اور ارفلکر ایران میں تھے......تو“

دانیال نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی وراس پر سوال کر دیا۔

”کیا تم شروع سے اس کا یہی نام جانتے ہو۔ اور اس کے باپ کا بھی؟“

گہرتاب ہنس دیا۔

”مجھے معلوم ہے۔ ان کے قرطاجنی نام ہسدرو اور آموسا ہیں۔ لیکن نئے نام انہوں نے بہت پہلے سے رکھ چھوڑے ہیں۔ جب میں ان کے پاس آیا تو وہ جافیکس اور ارفلکر ہی تھے۔ جافیکس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ اس کے باپ نے تمام عمر یہ کوشش کی ہے کہ جافیکس شادی کر لے، لیکن جافیکس کنواری ہی رہی۔ اور پھر ایک روز اسے مہاپرش نے قرطاجنہ کی کنواری بنا دیا۔ میں ایران کے شہر سوسا کا رہنے والا ہوں، وہ سائرس کا گرمائی دارالحکومت ہے۔ ارفلکر تمہارے ڈر سے اپنی بیٹی کو لے کر ایران چلا آیا۔ کیونکہ اسے مہاپرش نے بتایا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کبھی دھرم نہ بدلے تو وہ دنیا میں سب سے بڑا مرتبہ پا سکتا ہے۔ ارفلکر مرتبے کا لالچی تھا۔ مہاپرش کی بھوشوانی سچ ثابت ہو......اس لیے ارفلکر اپنی بیٹی کو تم سے دور لے کر چلا گیا۔“

دانیال ہکابکا ہو کر یہ عجیب وغریب انکشافات سن رہا تھا۔ اس کا مطلب وہ اصل شخص جس نے دانیال سے اس کی محبت کو جدا کیا، مہاپرش طالوسا ہی تھا۔ مہاپرش نے ہی ارفلکر کو بھوشوانی دی تھی۔ بلکہ یہ بھوشوانی سے بڑھ کر گویا ایک بشارت تھی۔ مہاپرش طالوسا نے پچیس سال پہلے ہسدرو سے کہا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کبھی اپنا دھرم نہ بدلے تو وہ دنیا میں بڑا مرتبہ پا سکتا ہے۔ مہاپرش طالوسا کا ایسا کہنا کوئی اچنبھے یا بڑی درویشی کی بات نہیں تھی۔ وہ ہسدرو کی بیٹی آموسا سے مل چکا تھا اور اسے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے ذہین فطین لڑکی کی آنکھوں میں محبت کا گہرا سمندر موجزن دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ اس کی محبت کو لذت وصال سے محروم رکھ کر اس محبت کی پرورش کرتا تو یقیناً آموسا کی محبت کائنات کے رنگوں میں نہایت ہی انوکھے اضافوں کا باعث بنتی۔ مہاپرش طالوسا کے مشورے پر ہسدرو نے قرطاجنہ چھوڑ دیا۔ وہ فلسطین جانے کی بجائے فینیقیوں کے آبائی شہر صور کے کھنڈرات میں آباؤ واجداد کی روحوں کے سامنے حاضری دینے گیا اور پھر وہاں سے اس نے مغربی ایران کا رخ کیا۔ اور سوسا جیسے پرہنگم شہر میں کئی سال

بتائے۔ وہیں گھرتاب ان کے ہاں ملازم بھرتی ہوا اور وہیں گھرتاب نے آموسی کے دل کی ساری داستان جان لی۔ ہسدرو نے اپنی بیٹی کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ وہ بہت لمبا عرصہ بیمار رہی تھی۔ بہت نازک اور نفیس ہوگئی تھی۔ اس عالم میں گھرتاب ہی تھا جو اس کی ہر بات مانتا، ہر ضد پوری کرتا اور اس سے ہر بار وعدہ کرتا کہ وہ دانیال کو ڈھونڈ لائے گا۔ آموسا' گھرتاب کے اسی وعدے پر جیتی رہی۔ لگ بھگ آٹھ سے دس سال کا عرصہ سوسا میں گزارنے کے بعد جب ہسدرو لوٹا تو مہاپرش طالوسا کے چرن چھونے کے لیے حاضر ہوا۔ مہاپرش کے چرن چھونے کی دیر تھی کہ ہسدرو جواب ارفلکر تھا، قرطاجنہ کی سیاست میں دیکھتے ہی دیکھتے مقام بنانے لگا۔ اس نے اپنی بیٹی کی ضد کا ذکر مہاپرش کے ساتھ کیا اور مہاپرش کو بتایا کہ اس کی بیٹی کبھی شادی نہ کرنے کی قسم اٹھائے ہوئے ہے۔ تو مہاپرش نے جافلیس کو اپنے پاس بلوالیا اور اسے مشورہ دیا۔

"اگر تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شادی سے بچنا چاہتی ہو اور چاہتی ہو کہ تمہارا باپ تمہیں اس موضوع پر نہ ستائے تو یوں کرو کہ قرطاجنہ کی کنواری بن جاؤ۔ قرطاجنہ کو نئی کنواری کی ضرورت ہے اور یہی تمہارے لیے بہترین موقع ہے۔"

جافلیس نے مہاپرش کی نصیحت مان لی اور قرطاجنہ کی کنواری بن گئی۔

مہاپرش کا کردار دانیال کو عجب محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ گھرتاب سے ہسدرو چاچا اور آموسا کی داستان سنتا رہا اور جابجا سوال کرتا رہا۔ دانیال کا جی چاہتا تھا کہ وہ نہ تھکے، نہ وقت گزرے، نہ اس کا مہمان تھکے اور وہ ایک ایک بات پوچھتا رہے۔ ہر وہ بات جو اس کی آموسی سے جڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی تمام عمر جس آموسا کی تلاش میں گزاری تھی، وہ پچھلے پندرہ سولہ سال سے قرطاجنہ میں ہی تھی اور صرف بدلا ہوا نام ہونے کی وجہ سے دانیال آج تک اس کی جدائی کا دکھ سہہ رہا تھا۔

یکا یک دانیال کے دل میں اڑ کر قرطاجنہ پہنچ جانے کی خواہش نے جنم لیا۔ معاً اس نے غور کیا تو اسے یاد آیا کہ جہاز تو ابھی تک رکا ہوا تھا۔ وہ یوں اچھل کر اٹھا جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو اور باہر کی طرف جانے لگا۔ لیکن پھر اسے مہمانوں کا خیال آیا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس نے گھوم کر گھرتاب کی طرف دیکھا اور ادھیڑ عمر سرفروش سے کہا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں جہازوں کے لنگر اٹھا لینے چاہئیں۔ آپ یہیں

ہمارے ساتھ رہیے۔ آپ کے ساتھی دوسرے جہاز میں جانا چاہیں تو چلے جائیں۔"

"ہاں!...... میں اب تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی گڑیا جیسی بچی کے ساتھ سالہا سال سے وعدہ کرتا آ رہا ہوں کہ میں اس کے دانیال کو ڈھونڈ لاؤں گا۔ اب تم مل گئے ہو تو میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

دانیال کی آنکھوں میں اشک چمکنے لگے۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ اس نے آرفان کو جا کر ہدایت کی کہ جہاز کو اپنی پوری رفتار کے ساتھ دوڑایا جائے اور جتنی جلدی ممکن ہو قرطاجنہ پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ آرفان نے نہایت خوشی کے ساتھ اس کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ گہرتاب کے ساتھی دوسرے جہاز میں چلے گئے اور دونوں جہاز بجلی کی رفتار سے قرطاجنہ کی طرف دوڑنے لگے۔

پاکستانی ویب سائٹ ڈاٹ کام

قرطاجنہ کی مجلس عامہ کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سب امراء، وزراء اور عمائدین سلطنت موجود تھے۔ یہ ایک بڑا گول کمرہ تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں ایک ہزار افراد کے بیٹھنے کے لیے زینہ در زینہ نشستیں بنی ہوئی تھی۔ مجلس کے لوگ ہال میں داخل ہونے سے پہلے مخصوص سرخ لباس پہن لیتے تھے جو ان کے فینیقی ہونے کی علامت تھا۔ عام حالات میں وہ ننگے سر رہتے تھے، لیکن مجلس عامہ کے اجلاس میں وہ مخصوص نیلے رنگ کی فینیقی ٹوپی پہن کر آتے تھے جو فارسی ایشیائیوں کی خاص علامت تھی۔ مجلس کا حال کسی بادشاہ کا دربار نہیں تھا۔ یہاں سلطنت کا سب سے بڑا عہدیدار وزیراعظم بھی عام لوگوں کے ساتھ زینوں کی شکل میں بنی ہوئی نشستوں پر بیٹھتا تھا۔ صرف مذہبی نشستیں الگ تھیں۔ وہ بھی اس سائبان کی وجہ سے پہچانی جاتیں جو آرائش کے لیے دھارمک نشستوں کے اوپر تان دیا گیا تھا۔ ان نشستوں پر تین بڑے مندروں کے مہاپجاری اور کبھی کبھار مہاپرش براجمان ہوتے تھے۔ قرطاجنہ کی کنواری کے لیے گول ہال کمرے کی ایک دیوار میں خوبصورت جھروکا بنا ہوا تھا۔ وہ عام لوگوں کے ساتھ عام نشستوں پر نہ بیٹھتی تھی۔ جو کوئی بھی قرطاجنہ کی کنواری ہوتی وہ اسی منقش جھروکے میں بیٹھ کر ہال میں ہونے والی کارروائی دیکھتی جو فینیقی کاریگروں نے نہایت چابکدستی سے بنایا تھا۔ اس جھروکے کے آگے ایک مہین، جالی دار پردہ لٹکتا رہتا، جسے قرطاجنہ کی کنواری چاہتی تو بوقت ضرورت ہٹا کر ایک طرف کر دیتی۔ ہال میں گول دائروں کی صورت میں پختہ زینوں جیسی نشستوں پر گداز قالین بچھے ہوئے تھے۔ عام حالات میں مجلس قرطاجنہ کے اراکین کی تعداد مخصوص تھی لیکن آج کل یہ تعداد بڑھ کر دوگنا ہوگئی تھی۔ مجلس عامہ نے جنگ کے لیے ہونے والے اجلاسوں میں بہت سے ماہرین اور بعض مضافاتی سرداروں کو بھی بٹھانا شروع کر دیا۔ مینو خاندان کے سردار روم سے ناکام و نامراد لوٹے تھے، اس لیے زیادہ برہم تھے۔ وہ

گزشتہ مجالس میں اپنی ضد پر اڑے رہے تھے اور بالآخر رومی حکومت کی طرف سفارت بھیجنے کی قرارداد منظور کروانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وزیراعظم ارفلکر کو مجلس کے سامنے خفت اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن اس وقت وزیراعظم کی خفت دور ہوگئی جب مینو خاندان کا وفد روم سے ناکام لوٹ آیا۔ رومی مجلس نے اس وفد کی خوب بے عزتی کی تھی اور قرطاجنہ پر حملہ روکنے کی درخواست کا بہت زیادہ مذاق اڑایا تھا۔ مینو خاندان کے سردار غم و غصے کی کیفیت میں واپس لوٹے اور اب وہ ارفلکر سے بھی بڑھ کر رومیوں سے لڑنے کے آرزومند تھے۔ گزشتہ دو روز سے مجلس کی گہما گہمی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مشہور بری سالار برتھاس، قرطاجنہ واپس پہنچ چکا تھا اور گزشتہ دو روز سے وہ مجلس میں شامل ہو رہا تھا۔ اہل مجلس نے برتھاس کو اس کی کامیابیوں پر خوب خوب خراج تحسین پیش کیا اور اسے قرطاجنہ کی دفاعی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ رومی لشکر کی آمد کی خبریں دن بدن قرطاجنہ کے گلی کوچوں میں سنسنی کی لہر میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اور شہریوں کا پرتجسس خوف یا خوف تجسس دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ رومیوں کے ساتھ قرطاجنیوں کو یہ پہلا بڑا معرکہ پیش آنے والا تھا۔ اس سے قبل کبھی رومی افواج نے افریقہ کی سرزمین پر قدم نہ رکھا تھا۔ مجلس قرطاجنہ کے عمائدین بحث کرتے کرتے بعض اوقات اتنا اونچا بولتے کہ مجلس میں شوروغل کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کی بحث کا مرکزی نقطہ تو آنے والی جنگ ہی تھی۔ لیکن بحث و تمحیص کے لیے جنگ کے بہتر سے بہتر طریقہ کار کا موضوع تاحد خیال پھیلا ہوا تھا۔ مینو خاندان کے سرداروں کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ قرطاجنہ کی بقا کے لیے ارفلکر اور اس کی بیٹی کی جدوجہد بڑھ نہ جائے۔ اس لیے وہ خود بڑھ چڑھ کر اس جنگ میں حصہ لینا چاہتے تھے اور اس طرح صورتحال اب پہلے جیسی نہ تھی۔ بلکہ اب قرطاجنہ کی سیاست پوری طرح رومیوں کی دشمنی پر مائل تھی۔ آج کی بحث کا آغاز ہوا تو ایک مینو سردار نے اٹھ کر اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا۔

''میں اہل مجلس سے گزارش کروں گا کہ وہ ایک الگ بحری لشکر ترتیب دیں۔ جس کی ذمہ داری صرف یہ ہو کہ وہ بیرونی ممالک کے سوداگروں کو شہر کے قلعہ بند ہونے سے پہلے پہلے تک شہر میں آنے یا شہر سے جانے کے لیے تحفظ فراہم کرے۔ یہی وقت ہے جب ہمیں اپنے دوستوں کی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم دوسرے ممالک کے امراء، کی حفاظت کریں گے تو وہ امراء اپنے ملکوں میں جا کر ہمارے حق میں زمین ہموار کریں گے۔ ہماری حکومت کے

وفود مختلف ملکوں سے امداد لینے کے لیے جا چکے ہیں۔ ایسے عالم میں ان ممالک کے تجارتی جہازوں کی حفاظت کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے۔"

یہ سردار اپنی بات کر کے بیٹھا تو ہنو خاندان کا ایک سردار کھڑا ہو کر مجلس کو اپنے مفید مشورے دینے لگا، اس نے کہا۔

"رومیوں کا لشکر سمندر کی طرف سے آئے گا اور یقیناً افریقہ کے کسی ویران ساحل پر اترے گا۔ اگر ہمارے بری دستے کئی کئی میل تک ساحلوں کی نگرانی کریں تو ہم رومی لشکر کو افریقہ کے ساحل پر اترنے سے روک سکتے ہیں۔ میں تو یہ مشورہ دوں گا کہ ایک ایسا بری لشکر بھی تشکیل دیا جائے جو دور دور تک افریقی ساحل کی نگرانی کرے۔"

اس سردار کے مشورے پر بہت سے لوگوں نے بیک وقت اعتراض کیا۔ کئی آوازیں آئیں۔

"یہ ناممکن ہے۔ یہ بیوقوفی ہے، یہ حماقت ہے۔ براعظم افریقہ کا ساحل ہماری پہنچ سے زیادہ لمبا ہے۔"

کچھ لوگ تو باقاعدہ اس بیوقوفانہ مشورے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ مجلس عامہ کا اجلاس ہر روز اسی طرح شور وغل اور دھینگا مشتی کے عالم میں برپا ہوتا تھا۔ جب شور بڑھ جاتا تو مجلس کا نقیب اٹھ کر سب کو چپ کرواتا۔

"چپ کرو! خاموش ہو جاؤ! یہ بدنظمی بند کرو۔"

نقیب کی آواز پر خاموشی چھا گئی۔ تب وزیر اعظم ارفلکر نے با آواز بلند کہا۔

"تمام عمائدین کے مشورے قابل غور ہیں اور گزشتہ کئی روز سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ ہماری مجلس کی بدنظمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر بدنظمی کا یہی عالم رہا تو یہ بدنظمی جنگ میں نمودار ہوگی۔ کم از کم آج کے روز تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے جو کئی سال تک اکیلا رومیوں سے لڑا۔ جس کے مشوروں سے ہم رومی فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔ جس نے ارمنیدس جیسے سالار کو عبرتناک شکست دی۔ ہمارے درمیان برتھاس موجود ہے۔ سب کی یہی رائے ہے کہ دفاع کے وقت بھی قرطاجنہ کی بری افواج کا سپہ سالار برتھاس ہی ہوگا، اور...... ایک سردار نے وزیر اعظم کی بات کاٹ دی۔

"سب کی رائے نہیں ہے۔ وزیر اعظم درست الفاظ کا استعمال کریں۔ ہماری یہ

رائے ہے کہ برتھاس حملہ کرنے میں ماہر ہے۔ یہ دفاعی فوج کا سالار نہیں ہے۔ ہمیں کسی ایسے آدمی کو چننا چاہیے جو دفاعی جنگ میں مہارت رکھتا ہو۔''

اس سردار کی بات معقول تھی۔ مجلس میں بہت سے لوگ اس کی حمایت کرنے لگے۔ کسی نے کہا۔

''سپہ سالار برتھاس ہی ہو، لیکن دفاعی جنگ کے ماہر نئے سالار بھی تلاش کیے جائیں۔''

اچانک برتھاس اپنی نشست پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ برتھاس کو کھڑا ہوتے دیکھ کر مجلس میں یکدم سناٹا چھا گیا۔ اچانک خاموشی نے جھروکے کے مہین پردے کے پیچھے بیٹھی قرطاجنہ کی کنواری کو بھی چونکا دیا۔ برتھاس کی آواز گونج رہی تھی۔

''اگر تم لوگوں کے نظم و ضبط کا یہی حال رہا تو قرطاجنہ کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ جنگ جیتنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی بے ترتیب صفوں کو ایک ترتیب میں لے آئیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مجلس میں مشاورت کی بجائے دھینگا مشتی کا سماں ہے۔ میں اہل مجلس کے سامنے یہ تجویز پیش کروں گا کہ سب سے پہلے کم سے کم ماہرین پر مشتمل ایک اور مشاورتی مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور اس طرح کے شور شرابے سے بہتر ہے کہ وہ مختصر مجلس آنے والی جنگ سے متعلق تمام فیصلے کرے۔''

برتھاس کی گونج دار آواز کے دوران قرطاجنی امراء کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ جو اپنے وزیراعظم کی بات کاٹ دیتے تھے، ایک سپہ سالار سے مرعوب ہوگئے۔ برتھاس کی بات تھی بھی معقول۔ یہ ہنگامہ آرائی مسئلے کا حل نہ تھی۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور قرطاجنہ کے دفاع کے لیے ابھی تک کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا تھا۔ ساری مجلس برتھاس کے جملوں پر شرمندہ سی ہوگئی۔ جافیکس کے دل میں برتھاس کی قدر بڑھ گئی۔ وہ اپنی جگہ برتھاس کو دل ہی دل میں داد دینے لگی۔ اسی اثنا میں برتھاس کی آواز پھر گونجی۔

''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، بری محاذ پر ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔ سپہ سالار میں ہوں یا کوئی اور، ہماری بری سمت سے رومی ہم پر غالب نہیں آسکتے۔ قرطاجنہ کو اگر تسخیر کیا جاسکتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے سمندر کی طرف سے حملہ۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرطاجنی امیرالبحر موآبریس دور کھلے بحر روم میں کوناڈس کے لشکروں کو آگے بڑھنے سے

روک رہا ہے۔ موآ بریس کو چھوڑ کر ہمارے پاس کوئی بحری سپہ سالار نہیں۔ رومہ کی مجلس شوریٰ نے دو بیڑے تشکیل دیئے۔ ایک شیراٹن کے زیر کمان اور دوسرا کوناڈس کے۔ جبکہ ہماری بحریہ کے پاس صرف ایک بیڑا ہے۔ دشمن کے جہاز قرطاجنہ پر سمندر سے حملہ کریں گے۔ بے شک قرطاجنہ دیوتاؤں کی دیوار کی وجہ سے محفوظ ہے۔ لیکن طویل محاصرہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم سب سے پہلے ایک بحری بیڑا تیار کریں جو دور سمندر میں نہ جائے، بلکہ دیوتاؤں کی دیوار کے ساتھ ساتھ قرطاجنہ کے اپنے پانیوں میں اپنی صفیں ترتیب دے۔ ہمیں اپنی سمندری سمت دیوتاؤں کی دیوار کے بھروسے خالی نہیں چھوڑ دینی چاہیے۔"

برتھاس کو آئے ہوئے ابھی ایک دو دن ہی ہوئے تھے اور اس نے اتنا کچھ محسوس کرلیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے مجلس گویا چوں چوں کا مربہ تھی۔ جافلیس تو ان خرابیوں کو محسوس کر کے بھی کچھ نہ کرسکتی تھی۔ وہ مجلس میں اس وقت تک بولنے کی مجاز نہ تھی جب تک اس سے کچھ پوچھا نہ جاتا۔ وہ اپنے باپ ارفلکر کو ہر روز نئی تقریریں یاد کروا کے مجلس میں بھیجتی۔ لیکن مجلس کا شور شرابا ارفلکر کے دانشمندانہ مشوروں پر بھاری رہتا۔ وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ لیکن مجلس کے ارکان اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پا رہے تھے۔ آج برتھاس نے جب چند جملوں میں انہیں آئینہ دکھایا تو سب خاموش ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ جافلیس برتھاس سے متاثر ہوئی تھی۔ وہ زیر لب مسکراتی ہوئی خوش دلی کے ساتھ مجلس کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ جن خطوط پر وہ سوچتی رہتی تھی برتھاس نے انہی خطوط پر سوچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خوش ہو رہی تھی۔ برتھاس کی نشاندہی پر اہل مجلس سنجیدہ ہوگئے اور جنگی کونسل تجویز دینے لگے۔ آج پہلی بار مجلس میں کوئی ڈھنگ کا کام ہو رہا تھا۔ سنجیدہ اور ماہر سالاروں اور سرداروں کو نئی مجلس کے لیے چنا جا رہا تھا۔ کافی غور وغوض اور تگ ودو کے بعد چھتیس ارکان پر مشتمل نئی مجلس کا قیام عمل میں آیا، جس میں سب کے اتفاق رائے سے ہنو خاندان، مینو خاندان اور باقی خاندانوں کے ماہر اور دانشمند لوگوں کو منتخب کیا گیا تھا۔ اس ہنگامی چھتیس رکنی مجلس شوریٰ کا سربراہ بھی وزیراعظم ارفلکر کو بنایا گیا تھا اور طے یہ پایا تھا کہ مجلس کا ہر اجلاس مہاپرش طالوسا کی موجودگی میں منعقد کیا جائے اور اگر کبھی اپنے معمولات کی وجہ سے مہاپرش قلعہ بیرسا تک نہ آسکیں تو خصوصی مجلس اجلاس کے لیے برج اعظم چلی جائے۔ قرطاجنہ کی کنواری کو بھی ان چھتیس ارکان میں شامل کیا گیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ مجلس عامہ کے اجلاس بدستور ہوتے رہیں گے اور یہاں جس قدر بحث ہوگی، ہونے دی جائے گی۔ جبکہ اصل فیصلے مجلس خصوصی کرے گی۔

جو مجلس عامہ کے مشوروں اور تجاویز کو ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔

آج جافیکس کو امید تھی کہ قرطاجنہ ہلاکت سے بچ جائے گا۔ ورنہ قبل ازیں تو وہ سوچتی تھی کہ قرطاجنہ کے لاغر جسم پر رومی سپاہی چیل کووں کی طرح جھپٹ پڑیں گے اور قرطاجنہ تباہ ہو جائے گا۔ آج روز کے معمول سے بہت پہلے مجلس کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ شہزادی جافیکس اپنے مخصوص رنگین اور منقش رتھ میں سوار ہو کر قلعہ بیرسا کے حاطے سے دوسرے احاطے کی طرف چل دی۔ وہ اجلاس کے گول کمرے سے نکل کر قلعہ بیرسا کے دوسرے احاطے میں موجود اپنے محل میں آئی۔ آج اس کا دل بہت مطمئن تھا۔ وہ جانتی تھی کہ قرطاجنی نوجوان بہت بہادر ہیں۔ اسے ڈر تھا تو صرف قیادت کے فقدان اور تنظیم کی کمی سے۔

رتھ محل کے دروازے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے حسین پیر زمین پر رکھے اور اندرونی محل کی طرف بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں آج اس کے قدموں میں ایک عجب ترنگ تھی۔ وہ پہلی منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل کے زینے طے کرتی ہوئی اپنے کمرۂ خاص تک پہنچی تو اسے خوشگوار حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ کمرے کی کھلی کھڑکی میں ایک کبوتر بیٹھا ہوا تھا۔ جافیکس کی نگاہیں فوراً کبوتر کے پیروں پر پڑیں۔ اس کے پیر میں ایک نیلا ریشمی دھاگہ بندھا ہوا تھا۔ جافیکس فوراً سمجھ گئی کہ کبوتر مہاپرش کا قاصد ہے۔ یہ سچ مچ قاصد کبوتر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مہاپرش نے جافیکس کو فوراً بلایا تھا۔ جافیکس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ ضرور اس کا محبوب واپس لوٹ آیا ہے۔ کیونکہ مہاپرش نے قاصد کبوتر بھیجنے کا خیال اسی صورت بیان کیا تھا جب دانیال برج اعظم پہنچ جاتا۔ تو کیا دانیال مہاپرش کے پاس پہنچ چکا تھا؟ اس خیال نے جافیکس کے تن بدن کو لرزا دیا۔ بچپن کے بچھڑے پچیس سال بعد ملنے والے تھے۔ یہ کیسا انہونا واقعہ ہو رہا تھا۔ وہ دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے دوڑ کر قاصد کو پکڑ لیا اور اسے والہانہ انداز میں اپنے سینے سے چمٹا کر جھومنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے کبوتر کے پیر سے نیلا ریشمی دھاگہ کھولا اور اپنے لباس میں سے نکال کر ایک لال ریشمی دھاگہ باندھ دیا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک آئی۔ اس نے باہر فضا میں جھانکا اور کبوتر کو چھوڑ دیا۔ یہ گویا جواب تھا، خط کا۔ اس نے اپنے پہنچنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ آ رہی ہے۔ کیا سچ مچ دانیال مہاپرش کے پاس تھا؟ ہاں سچ مچ دانیال مہاپرش کے پاس تھا۔

دانیال نے لنگر انداز ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ اور جافیکس کا سرفروش

ادھیڑ عمر گہرتاب برق رفتاری سے برج اعظم کی طرف بڑھے۔ جب سے دانیال کو جافیکس کا پیغام ملا تھا وہ ہواؤں میں اڑ کر کسی کبوتر کی طرح برج اعظم پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے دیرینہ ساتھیوں حتیٰ کہ کلاڈینا کو بھی چھوڑ کر...... بلکہ ان سے اجازت لے کر برج اعظم چلا آیا۔ اس کے دل کی حالت بہت عجیب تھی۔ اب وہ کوئی بچہ یا نوعمر لڑکا نہیں تھا۔ وہ چالیس برس کا ایک مکمل مرد تھا۔ لیکن اس کے جسم کا ایک ایک مسام مچل رہا تھا۔ رونگٹے بار بار کھڑے ہوتے اور آنکھوں میں بار بار نہ جانے کیوں پانی کی بوندیں نمودار ہو جاتیں۔ وہ بعجلت تمام مہاپرش کے سامنے پہنچے تو مہاپرش نے دانیال کو اپنے پاس روک لیا اور جافیکس کے سرفروش گہرتاب کو قلعہ بیرسا کی طرف روانہ کر دیا۔ گہرتاب کے روانہ ہوتے ہی مہاپرش نے اٹھ کر اپنے ایک قاصد کبوتر کے پیر میں نیلا ریشمی دھاگہ باندھا اور اسے کمرے کی کھڑکی سے باہر فضا میں چھوڑ دیا۔

مہاپرش دانیال کو سالوں سے جانتا تھا۔ اور جافیکس کو تو وہ اس وقت سے جانتا تھا جب وہ آموسا تھی، تو پھر کیا مہاپرش ہی ان کے درمیان جدائی ڈالنے والا تھا۔ دانیال مہاپرش کے چہرے کو تکتا ہوا یہی باتیں سوچ رہا تھا۔ مہاپرش نے مسکراتے ہوئے دانیال کی آنکھوں میں جھانکا اور اپنے مخصوص عارفانہ انداز میں اس سے کہنے لگا۔

''خوش نصیب ہو تم کہ اس چھوٹے سے جیون میں ایشور کی سب سے بڑی نعمت...... عشق کو پا لیا۔ اگر تمہیں بچپن سے ہی تمہاری محبت مل جاتی تو شاید اب تک تم اس کی قدر کھو چکے ہوتے۔ کوئی کسی کی محبت میں دیوار نہیں بنتا اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ جذبے صادق ہوں تو جسموں کا وصال ضروری نہیں رہتا۔ تم نے تو تورات اور زبور پڑھی ہے، تمہیں تو اصل حقیقت کی خبر ہوگی۔''

مہاپرش کی باتوں سے دانیال دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے مہاپرش سب کچھ اسی کو سنانے کیلئے کہہ رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا اگر ان کے درمیان جدائی ڈالنے والا مہاپرش تھا تو اب وہ انہیں ملا کیوں رہا تھا؟ اپنے پیار کی کہانی خود اس کی اپنی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر اس نے مہاپرش سے پوچھا۔

''مہاپرش!...... اس میں کچھ شک نہیں کہ اس دنیا کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اس خوش کن نعمت میں تکلیف اور اذیت بھی ہو؟''

''تکلیف اور اذیت!...... تم محبت کو جانتے ہوئے بھی یہ کہتے ہو؟''

"میرا مطلب جدائی اور ہجر و فراق کی اذیت سے ہے۔ اوپر والا اگر اس اذیت کے بغیر ہی محبت کی دولت اپنے بندوں پر نچھاور کر دیتا تو اس کے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی۔"

مہاپرش نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"جوہری تو ہو مگر نہایت نالائق، نگینوں کی پرکھ میں دھوکہ کھا جاتے ہو۔"

اتنا کہہ کر مہاپرش خاموش ہو گیا۔ دانیال ششدر کھڑا مہاپرش کو تکے جا رہا تھا۔ کون جوہری، کیسا جوہری، کون سے نگینے، کیسی پرکھ...... اس کی سمجھ میں تو ایک بات بھی نہ آئی تھی۔ مہاپرش اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے بوڑھے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے کونے میں دھرے پانی کے مٹکے کی طرف بڑھا۔ اس نے مٹکے کا ڈھکن ہٹایا۔ دائیں ہاتھ کی ایک انگلی ڈالی، پانی کی سطح مٹکے کے وسط تک تھی۔ اس نے شہادت کی انگلی کے پورے سے پانی کی سطح کو چھوا اور پھر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ایک ہلکی سی بوند اس کے پورے کے ساتھ چپک گئی۔ تب اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلائی اور دائیں ہاتھ کی انگلی کو انگوٹھے کی چٹکی میں ایک لمحے کے لیے پکڑا اور پھر جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ بوند بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر آ گری۔ مہاپرش نے ہتھیلی دانیال کے سامنے کی اور کہا۔

"یہ دیکھو!...... یہ کیا ہے؟ پانی کا ایک قطرہ، نہیں بلکہ ایک ننھی سی بوند۔ لیکن تم اگر غور کرو تو یہ تمہیں ایک موتی کی طرح شفاف اور انعکاس نور کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ بھی ایک موتی ہے۔ موتی، ہیرا، لعل، یاقوت یا کچھ بھی، جنہیں ہم شہنشاہوں کے تاج میں جڑا ہوا دیکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ انعکاس نور یا رنگوں کی تخلیق میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو یہ ننھی سی بوند کر رہی ہے۔ آنسو بھی ایسی ہی ایک بوند ہے۔ وہ بھی ایک موتی ہے۔ لیکن وہ دل کے صدف سے نکل کر آیا ہے۔ وہ ہیرے جواہرات اور لعل و گہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ کیونکہ وہ دو طرف انعکاس نور کرتا ہے۔ ایک اس دنیا میں، جیسے کہ میرے ہاتھ پر دیکھو اور ایک اس دنیا میں جسے دل کی دنیا کہتے ہیں، یہ بے دل دنیا والے۔

چنانچہ غم، ہجر، فراق، جدائی...... یہ وہ جواہرات ہیں جو دنیا کی ہر قیمتی متاع سے زیادہ قیمتی ہیں۔ تم کہہ رہے تھے کہ اوپر والے کے خزانے میں کیا کمی آ جاتی جو اگر وہ محبت کی دولت کے ساتھ ہجر و فراق کی اذیت نہ دیتا تو اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اوپر والے نے اپنے

خزانوں میں جھانک جھانک کر دیکھا اور جو چیز اسے سب سے قیمتی نظر آئی اس نے وہی انسان کو دے دی۔ یعنی دولتِ غم۔"

مہاپرش نے دانیال کے سوال کا کچھ ایسا لاجواب، جواب دیا تھا کہ دانیال منہ کھولے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ اب کیا کہتا؟ اس کی حالت تو پہلے سے ہی ہیجانی تھی۔ وہ تو یہاں آموسا کے بلاوے پر آیا تھا اور اس کے دل کی آنکھیں کبوتر جانے کے وقت سے اب تک دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ انتظار کی اس اذیت کو سمجھنے کے لیے اس نے مہاپرش سے ایسا سوال کیا تھا۔ لیکن مہاپرش نے تو اسے سب کچھ بھلا دیا۔ غم کا موتی، آنکھ کا آنسو، دل کا جہان، خدا کا خزانہ...... یہ سب کچھ دانیال کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہا تھا۔ وہ سٹپٹا گیا۔ اگر مہاپرش نے انہیں بچپن میں جدا کیا تھا تو بھی دانیال اس سے کہہ نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے ہجر وفراق کو وصال سے زیادہ قیمتی خزانہ ثابت کر دیا تھا۔ دانیال نے سر جھکا لیا۔ مہاپرش پھر بولا۔

"تم جانتے ہو بانسری کیا کہتی ہے؟...... وہ بھی جدائی کے گیت گاتی ہے، جس دن سے اسے بانس کے درخت سے کاٹا گیا، اسی دن سے گویا وہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی۔ اور پھر وہ ہجر وفراق کے غم کا فسانہ سنانے لگی۔ لیکن تم غور کرو تو بانسری کے سروں سے نکلنے والی آواز اس کائنات کے حسن میں جتنا اضافہ کرتی ہے، وہ نہ تو کوئی خزانہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بادشاہ۔ اتنی قیمتی ہے جدائی۔ اگر اس خزانے کی قیمت سے دنیا والے واقف ہو جائیں تو اسے حاصل کرنے کیلئے وہ اپنے سب خزانے لٹا دیں گے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں یہ دولت ملتی ہے۔"

دانیال کو مہاپرش کی بات سنتے ہوئے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اسے جافیکس کے آنے کا بھی پتا نہ چلا۔ جافیکس آخری زینے پر تھی جب دانیال اور مہاپرش دونوں نے دروازے کی طرف چہرہ گھما کر دیکھا۔

قرطاجنہ کی کنواری اپنے مخصوص جالی دار نقاب کے عقب سے اپنی آنسو بھری آنکھوں کو پٹپٹاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ دانیال جیسے سپنے سے بیدار ہو گیا۔ پچیس سال بعد۔ ہاں! پچیس سال بعد۔ آموسا اور دانیال آمنے سامنے تھے۔ اس پل میں دنیا کا ہر پل سما گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ برجِ اعظم کی آخری منزل تھی۔ کھڑکیاں اور جھروکے کھلے تھے اور مہاپرش ایک کھڑکی میں کھڑا دور نیلے سمندر کی بے تاب لہروں کو دیکھ

رہا تھا۔ اس کی بوڑھی پیشانی پر انگنت جھریاں تھیں اور وہ اپنے تن کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بظاہر بحرروم کے پانی کو گھور رہا تھا لیکن من کی کھلی آنکھوں سے درحقیقت وہ دو انسانی ذاتوں کے ملاپ کا وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے اس نے نہ جانے کتنا انتظار کیا تھا۔ معاً اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں۔ بادلوں میں سمندر کا عکس مچل رہا تھا۔ مہاپرش نے یکایک آنکھیں موند لیں۔ سمندر کی نیلگوں لہروں اور آسمان کے ملاپ کو ایک ساتھ دیکھنے کے لیے۔ اور اب وہ دیکھ رہا تھا آسمان اور زمین مل رہے تھے۔ عورت جو دھرتی ماں تھی اور مرد جو آسمان کی علامت تھا۔ عورت جو ممتا تھی اور مرد جو بیٹا تھا...... بیٹا؟ یا باپ؟

مہاپرش زیرلب بڑبڑایا۔

”آسمان دھرتی ماں کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟“

یکایک اس کا دل بے حد بوجھل ہوگیا۔ اس نے خود کو کسی کنویں میں گرتا ہوا محسوس کیا۔ لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ کنویں کی تاریک تہہ سے آواز آئی۔

”طالوسا!...... آسمان کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہاں کچھ نہیں۔ وہ ایک ظلمت ہے، ایک تاریکی، ایک نہ ہونا، ایک عنقا، وہاں سب زمینیں چمک رہی ہیں۔ آسمان کا کوئی وجود نہیں۔ صرف زمین ہی زمین ہے۔ یہ کائنات عورت کی ہے۔ مرد اس کا بیٹا ہے۔“

اس نے حیرت سے کنویں کی تہہ سے آتی ہوئی آواز سنی اور نہ جانے کیوں یکدم اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے ایک نظر پھر نیلگوں سمندر اور اس کے بیٹے بادل کی طرف دیکھا۔ ہاں!...... بادل اس کا بیٹا تھا۔ مہاپرش کو لگا جیسے سمندر کی بطن سے ایک غبار کی صورت بخارات اٹھ رہے ہوں اور آسمان پر جا کر بادل بنتے جا رہے ہوں۔ دھرتی کا بیٹا اپنے شیشے میں اپنی ماں کا عکس لیے ہوئے تھا۔ مہاپرش یکایک کھڑکی میں کھڑے کھڑے گھوم گیا۔ اب وہ ماں بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مل چکے تھے۔

دانیال اور آموسا ایک دوسرے میں یوں پیوست ہوگئے، گویا کبھی الگ نہ ہونے کا تہیہ کر چکے ہوں۔ مہاپرش نے پھر چہرہ گھما لیا۔

وہ دونوں گم صم، چپ چاپ تھے۔ سانسوں کی آواز بھی نہیں تھی۔ سانسیں کہاں سے آتیں۔ وہ ہوتے تو سانسیں ہوتیں۔ اب وہ نہیں تھے تو سانسیں نہیں تھیں۔ نہ آموسا تھی اور نہ دانیال۔ اگر وہاں الگ الگ ہستیاں ہوتیں تو الگ الگ نام لیے جاتے۔ اب وہاں ایک ہی ذات

تھی اور اس کا کیا نام تھا، یہی جاننے کی خواہش مہاپرش کو سالوں سے تڑپا رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑایا۔

''تیری ذات کو کیا نام دوں؟......''

دانیال اور آموسا کے وصال کا لمحہ آیا اور آ کر گزر گیا۔ دونوں کے احساس زمان و مکاں کی کوئی شدید تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ شاید اس پل میں ان کا زمانہ بدل گیا تھا۔ اب ان کے پاس روشنی کی رفتار تھی۔ نہ جانے وہ کتنے آسمانوں کی سیر کر کے لوٹے تھے۔ شاید سالہا سال بعد مہاپرش کی آنکھوں میں اشک دکھائی دیئے۔ جونہی اسے خیال آیا کہ اس کی آنکھ میں آنسو ہیں تو وہ مارے خوشی کے کپکپانے لگا۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں تلے آنسو اٹھانے کے لیے کر لیں۔

دانیال اور آموسا ابھی تک ایک دوسرے سے کچھ نہ بولے تھے۔ انہیں بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جو کچھ وہ چپ چاپ رہ کر کہہ سکتے تھے، وہ الفاظ کی مدد سے کہنا ممکن نہیں تھا۔ الفاظ ان کے دل کا حال بیان کرنے سے قاصر تھے۔ آموسا نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا تھا۔ سب سے پہلے دانیال اس وجدانی کیفیت سے باہر آیا۔ کیونکہ اس کے سامنے آموسا کے رخسار تمتما اٹھے تھے۔ وہ ابھی تک عالم وجد میں تھی۔ لیکن آموسا کے سرخ سیبوں جیسے تمتماتے ہوئے گال اس مرد کی توجہ ہٹانے کا سبب بن گئے۔ وہ عالم وجد سے باہر آ گیا۔ اسے آموسا کا حسن پیارا لگنے لگا۔ سچ مچ اس کے گال سیبوں جیسے لگ رہے تھے۔ دانیال نے بولنے میں پہل کی۔

''آموسی!''

آموسا کے کانوں کی سماعت سے کسی بلکتے ہوئے بچے کی صدا ٹکرائی۔

''ماں!......''

وہ تڑپ اٹھی۔ اس کے پستان مچلنے لگے۔ جو اپنے نومولود کو نور کی غذا دینے کے لیے بے قرار تھے۔ مہاپرش کی سوچوں کا دھارا اس کے محسوسات کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ وہ آج زندگی کے سب سے قیمتی احساس سے روشناس ہو رہا تھا۔ اس کی سماعت سے آموسا کی آواز ٹکرائی۔

''دانیال!!''

وہ دونوں مل چکے تھے۔

نیا امیر البحر

ملکرت کے مندر میں جشن کا سا سماں تھا۔ معبد کے احاطے میں نرتکیاں اور داسیاں پھدکتی پھر رہی تھیں۔ مندر کے ہر باسی نے اجلے اجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کچھ نرتکیاں موتیے کے پھولوں کی مالائیں پرونے میں مصروف تھیں۔ جو مالا مکمل ہو جاتی، ایک افقی بانس کے سروں پر لٹکا دی جاتی۔ بانس ایک کم عمر نرتکی کے ہاتھ میں کسی سیسہ کی طرح جھول جھول جاتا۔ روشوں پر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں اور پورا مندر مہمانوں کی آمد و رفت سے پررونق تھا۔

مہا پجاری کا ہوبال کا بیٹا لوٹ آیا تھا۔ جنگ کے دنوں میں مہا پجاری کے گم شدہ بیٹے کی واپسی اہالیان شہر کے لیے اچھا شگون تھی۔ اسی لیے امراء اور معززین شہر مہا پجاری کو مبارکباد دینے کے لیے آ رہے تھے۔ کلاڈینا اور شارق ابھی تک شیتل اور سنتوش کے ہی مہمان تھے۔ مہا پجاری کے گھر میں خوب رونق تھی۔ اس کے بیٹے کی شادی اور واپسی کا جشن ایک ساتھ منایا جا رہا تھا۔ سب خوش تھے۔ لیکن کلاڈینا اداس تھی۔ بار بار اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ شارق نے اس کی بے تابی کو محسوس کیا اور یہ سوچنے لگا کہ اسے کس کا انتظار ہو سکتا ہے۔ معاً اسے خیال آیا اور وہ سمجھ گیا۔ کلاڈینا کو یقیناً دانیال کا انتظار تھا۔ وہ دانیال کے پاس رہ کر خوش رہتی تھی اور دور رہ کر اداس۔ حالانکہ شارق جانتا تھا کہ دانیال اور کلاڈینا ایک دوسرے کو اس نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو دو دلوں کی گرماہٹ کا اظہار کرتی تھیں۔ کلاڈینا کو دانیال کی محبت سے زیادہ اس کی شفقت پا کر لطف آتا تھا۔ دانیال اس کے لیے ایک شفیق باپ جیسا مہربان تھا۔ ایک طویل عرصہ زندگی کی تگ و دو میں مضطرب رہنے والی یہ ذہین لڑکی دانیال کے پاس رہ کر خود کو محفوظ تصور کرتی تھی۔ معاً

شارق نے کہا۔

”یہ دانیال ابھی تک نہیں پہنچا؟ آج تو اسے آنا تھا؟“

سب نے گھوم کر شارق کی طرف دیکھا اور سب سے پہلے سنتوش بولا۔

”دانیال تو آ ہی جائے گا لیکن افسوس کہ شوزی نہیں آ پائے گی۔ کاش کہ وہ ہمارے ساتھ آ جاتی۔“

سنتوش کی بے اختیار ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ شیتل جو پاس ہی بیٹھی اپنے دلہن کے لباس کے ساتھ کھیل رہی تھی، چونک کر سنتوش کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہ احساس دکھ دینے لگا کہ...... شوزی، سنتوش سے پیار کرتی تھی، لیکن اسے شیتل کی وجہ سے سنتوش کو چھوڑنا پڑا۔

ہاں...... قلطی حسینہ شوزینہ نے ان لوگوں کے ساتھ آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”نہیں!...... میں نے بیس سال بعد اپنے کھوئے ہوئے باپ کو پایا ہے، میں کہیں نہیں جا سکتی۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

شوزی کی بات سن کر کوئی کچھ نہ بولا تھا۔ سنتوش بھی چپ رہا تھا۔ حالانکہ اس کو تو معلوم تھا کہ شوزی، اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار تھی۔ وہ تو اپنے باپ اور گھر بار کو چھوڑ کر ہی آئی تھی۔ اس نے سنتوش کے انتقام میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ سنتوش کو خاموش کھڑا دیکھ کر شوزی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ سنتوش کیا کہتا۔ وہ کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا، لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے مجبور ہو کر اتنا کہا۔

”شوزی!...... تمہیں کہیں یہ لوگ کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ آخر تم نے پولابیس کے قتل میں میرا ساتھ دیا ہے۔“

شوزی بدستور سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ اپنے ہاتھ کے ناخنوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ پولابیس کے قاتل کی کسے کیا خبر؟ وہاں تو اتنا ہنگامہ تھا۔ لیکن اس کے آنسو نہ رک رہے تھے۔

سنتوش کو شوزی کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو یاد آ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔ وہ شوزی کو ساتھ کیوں نہ لایا اور پھر سب کی توجہ ایک دم دروازے کی طرف

مبذول ہوگئی۔ مہمان خانے میں دانیال داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہمراہ دو لوگ اور تھے۔ ایک سندینا اور دوسرا اس کا باپ سموجن۔ انہیں دانیال نے دعوت دی تھی۔ سنتوش نے اٹھ کر مہمانوں کا استقبال کیا اور دانیال سے بغلگیر ہوا۔

''آپ آ گئے۔ شارق بھیا آپ کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔'' شارق بھی دانیال سے گلے ملا۔ اور کلاڈینا بھی کسی ترسے ہوئے بچے کی طرح دانیال کے سینے سے جا لگی۔ دانیال کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے تو کلاڈینا کبھی اس سے یوں نہ ملی تھی۔ باقی لوگ بھی حیران تھے۔ خاص طور پر شارق تو بری طرح گڑبڑا گیا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت کلاڈینا نے کہا۔

''بھیا!...... مجھے سنبھال لو۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

سب نے کلاڈینا کے منہ سے پہلی بار کسی کے لیے کوئی رشتہ سنا تھا۔ شارق کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ کلاڈینا کے بارے میں غلط سوچ رہا تھا۔ اب اسے اپنے آپ سے خفت محسوس ہونے لگی۔ کلاڈینا...... ترسی ہوئی تھی، محروم تھی۔ اس کا کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے مظالم سہے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچتی تو بہت حیران ہوتی۔ جس قرطاجنہ سے پناہ نفرت تھی۔ وہی قرطاجنہ اس کا مستقبل بن گیا تھا۔ اس کے پورے خاندان کو قرطاجنی فوج نے مارا تھا۔ لیکن آج وہ قرطاجنہ میں رہ رہی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ تھی دانیال کی شفقت۔ جب اس معصوم اور مظلوم دوشیزہ کو قربانی کے جانور کی طرح ٹٹول ٹٹول کر نیلامی کے چبوترے پر بولی دینے والوں کو دکھایا جا رہا تھا، اس وقت کلاڈینا کے آنسوؤں کی لاج رکھنے والا دانیال ہی تھا۔ آج اس نے دانیال کو سب کے سامنے بھیا کہہ دیا تھا۔ وہ تو شاید کب کا کہہ دیتی، لیکن اسے جھجک تھی تو اس بات کی کہ دانیال نے اسے خریدا تھا۔ اور اس لحاظ سے وہ دانیال کی لونڈی تھی۔ ایک لونڈی کے لیے کہاں مناسب تھا کہ وہ اپنے مالک کو بھائی کہہ کر پکارے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک جھجکتی رہی۔ لیکن آج اس سے نہ رہا گیا۔

سندینا اور سموجن کے ساتھ دانیال نے اپنے سب ساتھیوں کو متعارف کروایا، پھر وہ سب لوگ صحن میں بیٹھنے کے لیے چلے گئے۔ سنتوش کے گھر کی خادمائیں طشتریوں میں خاطر تواضع کا سامان لے کر آئیں اور وہ سب صحن میں بچھی لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سنتوش کا باپ مہا پجاری کا ہوبال بڑے مہمان خانے میں امرائے شہر کے ساتھ مصروف تھا۔ سب کو دلچسپی تھی کہ دانیال اپنے بچھڑے ہوئے محبوب سے کیسے ملا۔ سب سے پہلے شیتل نے کہا۔

”آپ کو مبارک ہو، آپ جسے چاہتے تھے وہ آپ کو مل گیا۔ لیکن میں سوچتی ہوں آپ دونوں کا ملن کیسے ہوگا۔ قرطاجنہ کی کنواری تو کسی سے شادی کرنے کی مجاز ہی نہیں۔“

شیتل کے سوال پر سب بری طرح چونک گئے۔ انہیں دو قسم کی حیرت ہوئی۔ ایک یہ کہ اتنی نازک بات اس نے یوں اچانک کہہ دی تھی اور دوسری یہ کہ ان سب کو بھی پہلی مرتبہ اس مشکل کا احساس ہوا تھا۔ قرطاجنہ کی کنواری کے ساتھ کوئی بیاہ نہ کرسکتا تھا۔ وہ عمر بھر کنواری رہتی اور کنواری ہی مر جاتی۔ شیتل کے ذہن میں شروع سے یہ سوال تھا۔ اس نے جہاز کے علیحدہ کمرے میں سنتوش کے سامنے اپنے خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن آج اس نے سب کے سامنے دانیال سے سوال کر دیا۔ دانیال ایک بار تو بالکل چپ ہو گیا۔ آج تو سندینا بھی یہاں موجود تھی۔ وہ بھی دانیال کو دل سے چاہتی تھی۔ دانیال کچھ دیر خاموش رہا اور پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ ہم شادی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم شادی کر لیتے ہیں تو ہمارے جسموں کو ملاپ کی لذت ملے گی اور اگر نہیں کرتے تو ایک دوسرے کی محبت میں ہماری روح سرشار رہے گی اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیں گے۔ محبت ہے عبادت اس میں تن کا قرب مت مانگو، کہ جس کو چھو لیا جائے اسے پوجا نہیں کرتے۔“

سب تو حیران تھے ہی لیکن سندینا تو پھٹی پھٹی آنکھوں کو دانیال کا چہرہ تکنے لگی۔ کیسی محبت تھی دانیال کی۔ جس کی کہانی کا ہر موڑ جدائی پر ختم ہوتا تھا اور پھر بھی وہ دونوں یعنی دانیال اور آموسا ایک دوسرے کو چاہتے رہنا چاہتے تھے۔ دانیال نے شیتل کی بات کا جو جواب دیا اسے سن کر سب خاموش ہو گئے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ دانیال سے کچھ اور پوچھتا۔ لیکن دانیال خود بولنے لگا۔

”محبت میں قرب سے زیادہ جدائی کی قیمت ہے۔ اس دنیا یں صرف دو چیزیں ہیں، ایک زندگی اور دوسری جمال۔ زندگی جمال سے ہے اور جمال زندگی سے۔

زندگی ہر سطح پر جمال کا قرب چاہتی ہے۔ اور جمال ہر سطح پر اپنے نئے نئے جلوے زندگی کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ جمال کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً سونا چاندی، عزت شہرت، دولت، گھر بار، کھیت کھلیان، داغے ہوئے گھوڑے، افریقی اونٹ، پانی کی ایک ننھی سی بوند وغیرہ وغیرہ۔ یہ زندگی کی ہر سطح کو لبھاتا ہے۔ حشرات الارض خوشبوؤں کے دیوانے ہیں۔ تو درندے قبیلے

کے۔ ایک بکری کے لیے گھاس کا میدان جمال ہے تو ایک فاختہ کے لیے یا ایک طوطے یا مینا کے لیے اپنی ساتھی کی میٹھی اور سریلی گنگناہٹ۔ یہ سب جمال کی قسمیں ہیں۔ زندگی درجہ بدرجہ بلند ہو کر ایک مقام پر انسان بن جاتی ہے۔ انسان کی آنکھ بھی آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔ انسان زندگی کی سب سے ارفع سطح پر موجود ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کے لیے حقیقی جمال کیا شے ہوسکتی ہے۔ وہ سونے چاندی کی طرف لپکتا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح اشیائے خوردنی کی خوشبوؤں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ درندوں کی طرح گھر قبیلہ اور خاندان کے پیچھے پاگل ہوا رہتا ہے۔ الغرض انسان اس وقت تک بھٹکتا رہتا ہے۔ جب تک وہ جمال کی ان تمام قسموں کو نظر انداز نہیں کر دیتا۔ وہ اس وقت تک گمراہ رہتا ہے۔ جب تک وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ خود بطور انسان......

جمال کے سب سے بلند مقام پر فائز ہے اور وہ اتنا پر جمال ہے کہ کائنات کی ہر شے خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ اسے یہ سوچنا چاہیے کہ جب تمام اشیاء اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں تو پھر ضرور وہ خود سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر کبھی کوئی انسان یہ جان لیتا ہے کہ وہ زندگی کے بھی سب سے ارفع مقام پر ہے اور جمال کے بھی تو اس کے کردار میں موجود دوغلا پن ختم ہو جاتا ہے۔ دوئی ختم ہو جاتی ہے او اس کے عمل میں یکتائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں جو ہمیں جسمانی لذت دیتی ہیں وہ ساری خود جسم رکھتی ہیں اور جسموں کا کیا۔ یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔ انسان مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن محبت نہیں مرتی۔ محبوب کے ملاپ سے ملاپ کی جدائی اس لیے زیادہ ہے کہ اس طرح ان کا اس جہان میں ملاپ نہیں ہو پاتا لیکن مرنے کے بعد وہ ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔"

فی الحقیقت تو وہ ایک مذہبی یہودی تھا۔ لیکن بہت زیادہ عقلمند ہونے کی وجہ سے وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی بھی بہت سی باتوں کیخلاف تھا۔ وہ تو اپنے نبیوں کی بات مانتا تھا۔ عام لوگ مذہبی پیشواؤں پر بھروسہ رکھتے اور نبیوں کو تکلیفیں دیتے۔ لیکن دانیال ان لوگوں میں سے تھا جو صرف نبیوں کی بات مانتے اور مذہبی پیشواؤں کی بات بالکل نہ مانتے تھے۔ مذہبی پیشوا بنی اسرائیل کو افضل سمجھتے تھے اور اس لیے اپنے خون کو کبھی ناخالص نہ ہونے دیتے تھے۔ یہودی ہمیشہ یہودیوں میں ہی شادیاں کرتے تاکہ ان کے خون میں کسی اور قوم کی ملاوٹ نہ ہو۔ لیکن انبیاء اس بات کیخلاف تھے۔ دانیال نے شیتل کی بات سے پیدا ہونے والے ماحول کو بدلنے کے لیے جب عقلی اور عملی بنیاد پر بات کی تو وہاں پر موجود ہر شخص انگشت بدنداں رہ

گیا۔ دانیال نے کچھ ایسا نہیں کہا تھا جو ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ سب سے عجب حالت سندینا کی تھی۔ سرائے کے مالک سموجن کی بیٹی سندینا جو پہلے سے ہی دانیال سے عشق کا سبق سیکھ رہی تھی۔ دانیال کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ ملن پر جدائی کو ترجیح دے گی۔ وہ دل میں دعا کرنے لگی۔ کہ ایشور دانیال اور آموسا کا ملن ہوگا اور سندینا پھر اپنے محبوب سے محروم رہ جائے گی۔ وہ سچے دل سے دعا کرنے لگی کہ اے ایشور! دانیال اور آموسا کو ملوادے۔ یکا یک سب کی نگاہیں مہا پجاری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ صحن کی طرف آرہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی کی کرنیں ابھی تک پھوٹ رہی تھیں۔ سنتوش کا باپ نزدیک آیا تو سب اس کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہا پجاری کا ہوبال نے اپنے بیٹے کے سب دوستوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور مصنوعی غصے سے کہا۔

"ارے! تم لوگ یہاں بیٹھے ہو، چلو! کھانے کے لیے۔ کھانا چن دیا گیا ہے۔ وہاں بڑے بڑے امرائے شہر موجود ہیں۔ سب لوگ تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

مہا پجاری کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ سب بری طرح گھبرا گئے۔

"کہانی! بابا! ہم اہالیان شہر کے سامنے تماشا نہیں بننا چاہتے۔ ہم کسی کو اپنی کہانی نہیں سنائیں گے۔"

یہ سنتوش کی آواز تھی۔ لیکن مہا پجاری نے ایک ادھورا سا قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! میں کون سا چاہتا ہوں کہ تم وہاں تفصیلات بیان کرو۔ بس مختصراً بات کرو۔ کوناڈس کے حملے کی بات، انہیں صرف تمہاری کہانی میں موجود رومی بحریہ کے سپہ سالار کوناڈس کی ذات سے دلچسپی ہے۔ کیونکہ قرطاجنہ کو رومیوں کے ساتھ ایک خطرناک جنگ درپیش ہے اور ان حالات میں وہ یہی جاننا چاہیں گے کہ رومی امیر البحر نے تمہارے اور شیتل کے ساتھ کیا کیا اور روم میں تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ تم جتنی چاہو، بات کہہ دینا۔ آخر لوگوں کو کچھ تو بتانا پڑے گا۔"

سنتوش نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دانیال کی طرف دیکھا، جیسے اس سے پوچھ رہا ہو اب کیا کرے۔ دانیال مسکرادیا۔

"ارے سنتوش! سوچ کیا رہے ہو۔ چلو چل کر سب کو سناتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا پیش آیا۔ ہمیں کچھ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں۔ تم فکر مت کرو۔ وہاں سب ہماری عزت

کریں گے، ہم بالکل بھی تماشا نہیں بنیں گے؟"

اور پھر کچھ دیر بعد وہ بڑے بڑے امراء شہر، وزرا اور اعلیٰ مذہبی، عہدہ داروں کے درمیان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے دوران دانیال کی نگاہیں بار بار ایک بزرگ شخص پر جا ٹکتیں اور بار بار وہ اپنی نظریں ہٹا لیتا۔ دانیال کی اس بے چینی کو کلاڈینا اور سندینا نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ سنتوش بھی کنکھیوں سے اہل مجلس کے چہروں کو دیکھتا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ اہل مجلس بھی بار بار مسکراتی ہوئی نظروں سے پہلے سنتوش اور بعد میں اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے۔ کھانا ختم ہوا تو مہا پجاری کا ہوبال نے کھڑے ہو کر سب سے پہلے اپنے مہمانوں سے اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کو متعارف کروایا۔

"میرا بیٹا سنتوش ہے اور یہ میری بہو شینل۔ ان کی شادی کی باقاعدہ رسم چاند کی چودہ تاریخ کو ہوگی۔ اس تقریب میں بھی آپ سب لوگوں کو دوبارہ زحمت دوں گا۔

یہ کلاڈینا ہے، وہ رومی حسینہ جسے قرطاجنہ کے چوک میں نیلام کیا گیا اور ایک یہودی تاجر نے ایک لاکھ دینار میں خریدا۔ لیکن اب یہ میری بیٹی ہے۔

یہ دانیال ہے، وہ یہودی سوداگر جس نے کلاڈینا کو خریدا۔ یہ قرطاجنہ کا پرانا وفادار اور دوست ہے۔ میں اسے اپنے بڑے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا ہوں۔

یہ شارق ہے۔ مارفیس جزیرے کا ایک خطرناک قزاق۔ وہاں کے ایک خطرناک سردار منگورا کا چھوٹا بھائی۔ اس نے میرے بیٹے کی بازیابی میں بہت زیادہ مدد کی۔ یہ سمندروں کا راجہ ہے اور بحری قزاقی کا ایک مانا ہوا نام۔ لیکن اب اسے اپنا منجھلا بیٹا سمجھتا ہوں۔ یہ کیدارا ہے۔ وہ لیبیائی نوجوان جس نے دیوتاؤں کے جام میں مشروب پینے کی سعادت کا بدلہ چکانے کے لیے اپنی جان کو مشکلات اور مصائب میں ڈالا اور موت کے منہ میں بھی میرے بیٹے کی ہتھیلی کے چھالے کی طرح حفاظت کی۔ یہ سندینا ہے اور یہ سندینا کے والد سموجن۔ یہ دانیال کی توسط سے میرے مہمان ہیں اور میں انہیں بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔"

قرطاجنی امراء اور عمائدین سلطنت پر اشتیاق نظروں سے کہانی کے ایک ایک کردار کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ مہا پجاری نے اپنے بیٹے اور اپنے دوستوں کا تعارف مکمل کروانے کے بعد دانیال اور سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ سب کا تعارف تو ہو گیا لیکن یقیناً آپ سب کی خواہش ہوگی کہ معزز

مہمانوں کا بھی تعارف کروایا جائے۔"

اتنا کہہ کر کاہوبال اسی بزرگ شخص سے شروع ہوا جسے دانیال بار بار دیکھتا اور بار بار نظریں چرالیتا۔ کاہوبال نے کہا۔

"یہ محترم ارفلکر ہیں۔ قرطاجنہ کے وزیراعظم......اور یہ......"

اس سے آگے کاہوبال کیا کہہ رہا تھا، دانیال نہ سن سکا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ ارفلکر کا چہرہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی اس میں آموسا کے باپ اور دانیال کے ہمدرد چاچا کی جھلک تھی۔ کاہوبال باقی مہمانوں کا تعارف کرواتا رہا۔ لیکن دانیال کی نگاہیں مسلسل ہمدرد چاچا پر ٹکی رہیں۔ دانیال کہیں کھو گیا تھا۔ اہل محفل باتیں کرتے رہے۔ سنتوش اور شیتل سے سوال و جواب کرتے رہے، لیکن دانیال ان کے درمیان بیٹھا نہ بیٹھا ایک برابر تھا اور پھر دانیال کے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب اس کے کانوں میں آواز پڑی اور وہ آواز تھی اس کے ہمدرد چاچا کی۔ آج پچیس سال بعد دانیال اپنے باپ کے دوست ہمدرد چاچا کی آواز سن رہا تھا۔ وزیراعظم کہہ رہا تھا۔

"ہم قرطاجنہ کے لیے ایک نیا بحری بیڑا تشکیل دے رہے ہیں۔ جس کی کمان کے لیے ہمارے پاس کوئی بحری سالار نہیں۔ ہمارے تمام ماہر جنگ باز، بحری سالار موآبریس کے ساتھ بڑے بحری بیڑے پر ہیں اور ہمارا بیڑا رومی بیڑے کو ناکام بنانے کے لیے بحر روم میں کامیاب جنگ لڑ رہا ہے۔ محترم مہاپجاری کاہوبال!!...... آپ نے بتایا کہ یہ نوجوان شارق جسے آپ نے منجھلا بیٹا کہہ کر پکارا ہے، اپنی آئندہ زندگی قرطاجنہ کے لیے وقف کرنا چاہتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کے بیٹے کو پیشکش کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نئے بحری بیڑے کی کمان سنبھالے۔ لیکن اس سے میں اتنی عرض کروں گا کہ اس عہدے کے لیے ہماری خصوصی مجلس نے چند اور ناموں کا بھی انتخاب کیا ہے اور اگر خصوصی مجلس نے کوئی امتحان رکھا تو آپ کے منجھلے بیٹے کو بھی اس امتحان میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنا ہوگا۔"

یہ واقعی ایسی بات تھی جو دانیال کے خیالات کی رو کو توڑ دیتی۔ وزیراعظم کی پیشکش کی دیر تھی کہ محفل میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شارق کا خون اس کی رگوں میں اچھلنے لگا۔ اس نے تیزی سے پہلو بدلا۔ اس کی خوبصورت گھنی مونچھیں پھڑکیں۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک بڑھ گئی اور دل قابو سے باہر ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں اس کی نگاہیں کلاڈینا کی طرف اٹھ

گئیں۔ کلاڈینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پہلی بار شارق کو کلاڈینا نے مسکرا کر دیکھا تھا شارق کی تو حالت غیر ہوگئی۔ کلاڈینا کے چہرے پر معصوم اور سچی مسکراہٹ تھی۔ شارق کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کی نظریں کلاڈینا کی نظروں میں پیوست ہوگئیں۔ کلاڈینا بدستور مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں کچھ ایسی بات تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو...... ہاں شارق! یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ شارق بے حد گڑ بڑایا ہوا تھا، اس کی زبان گنگ ہوچکی تھی۔ اچانک اس کی سماعت سے کاہوبال کی آواز ٹکرائی۔

"کیوں بیٹا! تم کیا کہتے ہو؟ کیا تم بحری سپہ سالار کا امتحان دو گے؟"

ٹھیک اسی وقت جب شارق، کلاڈینا کی نگاہوں سے نگاہیں نکال کر کاہوبال کی طرف متوجہ ہونے والا تھا، کلاڈینا نے اپنے سر کو آہستگی کے ساتھ اوپر سے نیچے کی طرف اثبات میں ہلایا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شارق سے کہہ دیا کہ ہاں!...... ہاں! شارق! تم یہی کہنا کہ ہاں۔ شارق کسی مشینی پرزے کی طرح بے اختیار بولا۔

"ہاں!"

محفل میں تالی بجنے لگی۔ شارق کو کلاڈینا کے چہرے پر واضح خوشی دکھائی دے رہی تھی اور یہی شارق کی خوشی کی آخری حد تھی۔ تالی کی آواز بلند ہوئی تو وزیراعظم ارفلکر نے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم پرکشا میں کامیابی حاصل کرو گے۔"

محفل دیر تک جاری رہی۔ سب لوگ سنتوش کی داستان پر کبھی غمزدہ ہوتے، کبھی متجسس اور کبھی خوش ہوتے رہے اور خوشی خوشی یہ ضیافت اختتام پذیر ہوئی۔

اور جب مہمان جانے لگے تو مہا پجاری کے ہمراہ اس کے اہل خانہ بھی مہمانوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ باری باری سب مہمان اجازت لیتے رہے اور جاتے رہے اور پھر وزیراعظم کی باری آئی۔ پچیس سال بعد دانیال ہمسدرو چاچا کو اتنے نزدیک سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل بدل چکا تھا۔ وزیراعظم ارفلکر نے دانیال کے چہرے پر نظریں گاڑیں اور سوچتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا۔ شاید وزیراعظم کو دانیال کا چہرہ بھی جانا پہچانا سا لگا تھا۔ لیکن اس نے ذہن پر زیادہ زور نہ دیا۔ کیونکہ اسے کچھ یاد نہ آرہا تھا۔ اس نے مہا پجاری سے اجازت لی اور اپنی شاہی سواری میں بیٹھ کر قلعہ بیرسا کی طرف چل دیا۔

سب مہمان چلے گئے تو یہ لوگ مہا پجاری کے ہمراہ گھر میں لوٹ آئے۔ ضیافت

دن کے کھانے کی تھی۔ لیکن اس تقریب میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور سورج غروب ہونے کو آ گیا۔ ابھی مشعلیں نہیں جلائی گئی تھیں۔ لیکن جلد ہی ضرور جل اٹھیں۔ وہ سب واپس گھر کے صحن میں پہنچے ہی تھے کہ یکایک کاہوبال رکا گیا۔ سنتوش اور اس کے سارے ساتھی رک گئے، تب کاہوبال نے کہا۔

''سنتوش بیٹا!...... تمہیں دکھانے کی ایک چیز ہے میرے پاس۔ اس خوشی کے موقع پر میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک تحفہ دوں۔ جسے دیکھ کر تمہیں دکھ بھی ہوگا اور خوشی بھی۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا پوری طرح چھا جائے، تم میرے ساتھ آؤ اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارے سب دوست بھی میرے ساتھ ہوں۔''

سب کے چہروں پر حیرت تھی۔ آخر مہاپجاری اپنے بیٹے کو کیا تحفہ دینے والا تھا۔ جس کے لیے ان سب کو ساتھ لے جانا ضروری تھا۔

کاہوبال آگے آگے چل پڑا اور سنتوش اپنے ساتھیوں سمیت اس کے پیچھے پیچھے۔ کاہوبال اپنے محل نما مکان کے پچھواڑے پہنچا۔ دور سے ہی دانیال کو کچھ مسلح لوگ کھڑے نظر آئے۔ دانیال سوچ میں پڑ گیا۔ آخر یہ کیا ماجرا تھا؟ وہ چار پہریدار تھے جو مکان کے پچھواڑے میں موجود ایک چھوٹی سی عمارت کے باہر کھڑے شاید کسی کا پہرا دے رہے تھے۔ کاہوبال نزدیک پہنچا تو پہریداروں نے جھک کر سلام کیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ لیکن اسے غروب ہوئے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے۔ اس لیے عمارت میں خاصی روشنی تھی۔ کاہوبال تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا عمارت میں داخل ہوا۔ ایک چھوٹی سے راہداری عبور کر کے ایک دروازہ تھا جو ہال میں کھلتا تھا۔ وہ ہال کمرے میں داخل ہوئے تو مہاپجاری ایک اور دروازے سے...... ایک اور راہداری میں مڑ گیا۔ اس راہداری کے اختتام پر بھی ایک دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک چھوٹی کوٹھڑی میں کھلتا تھا۔ وہ کوٹھڑی میں داخل ہوئے تو کاہوبال رک گیا، اسے محسوس ہوا جیسے انہیں مشعلوں کی ضرورت پڑے گی کیونکہ کوٹھڑی میں روشنی قدرے کم ہو گئی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک طرف خاصی تعداد میں مشعلیں رکھی تھیں۔ کاہوبال نے سب کو ایک ایک مشعل اٹھانے کے لیے کہا۔ سب نے ایک ایک مشعل اٹھا کر روشنی کر دی۔ اب شاید کاہوبال کسی تہہ خانے میں اترنے والا تھا۔ اور پھر وہی ہوا۔ اس کوٹھڑی میں موجود اندرونی دروازہ ایک تہ خانے میں ہی کھلتا تھا۔ کاہوبال اس دروازے سے اندر داخل ہوا اور تہہ خانے کے زینے اترنے لگا۔ سنتوش، دانیال

اور باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ تہ خانے میں زیادہ اندھیرا تو نہیں تھا کیونکہ کہیں نہ کہیں سے اس میں بیرونی روشنی کے داخل ہونے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی مشعلوں کی روشنی نے پورے تہ خانے کو منور کر دیا۔ تہ خانے میں تین کمرے تھے جو دیکھنے میں قید خانے جیسے تھے۔ کیونکہ ان کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سنتوش کا ماتھا ٹھنکا۔ دانیال اور باقی لوگ بھی ٹھٹکے۔ کاہوبال نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کے آہنی دروازے کے آہنی تالے میں چابی گھما دی۔ دروازہ کھلا تو دانیال اور اس کے ساتھیوں کو چار قیدی دکھائی دیئے۔ چاروں کے چاروں لڑکے تھے۔ سنتوش تو انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ سب بھی اس کے دوست تھے۔ سنتوش ان کے ساتھ بچپن کا ایک حصہ گزار چکا تھا۔ اور پھر وہ اسے کیسے بھول سکتے تھے کیونکہ انہوں نے سنتوش کو زندگی کا سب سے بڑا تحفہ دیا تھا اور وہ تھا دولت غم۔ یہ چاروں وہی لڑکے تھے جنھوں نے سنتوش کے ساتھ جسمانی تشدد اور زیادتی کی انتہا کر دی تھی۔ سنتوش چیختا رہا تھا، چلاتا رہا تھا، منتیں کرتا رہا تھا، گڑگڑاتا رہا تھا، لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ شیتل کو بھی سب کچھ سمجھ آ گیا۔ اسے اچانک وہ واقعہ یاد آیا۔ جب اس نے پہلی بار مہا پجاری کے بیٹے کو پناہ دی تھی۔ اس نے چاروں لڑکوں کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھا اور اس کے جی میں آئی کہ تلوار لے کر ان کے سر قلم کر دے۔ ان کا منہ نوچ لے یا انہیں تھپڑ مارے۔ معا اس کے کانوں میں مہا پجاری کی آواز گونجی۔

''سنتوش بیٹا!...... یہ ہیں تمہارے مجرم۔ تم انہیں جو چاہو سزا دے سکتے ہو۔ انہی کی وجہ سے تم مجھ سے جدا ہوئے اور انہی کی حرکت نے تمہیں زندگی کا سب سے بڑا دکھ دیا۔ جب سے شیتل نے میری آنکھیں کھولیں۔ تب سے ہی میں نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے۔ صرف اس لیے کہ تم آؤ گے تو اپنا انتقام خود لو گے۔''

چاروں لڑکوں نے بھی سنتوش کو دیکھ لیا تھا۔ ان کے رنگ فق ہو گئے۔ پہلے ہی وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ لیکن سنتوش کو دیکھ کر تو انہیں یقین ہو گیا کہ اب ان کی زندگی گئی۔ سنتوش نے اپنی آنکھیں سب سے بڑے لڑکے کی آنکھوں میں ڈال رکھی تھیں۔ اور اسے وہ اس طرح گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو...... ''اب بتاؤ! اب میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟''

میں تمہارے سامنے کتنا رویا تھا۔ کتنا گڑگڑایا تھا، لیکن تم نے میری ایک نہ سنی اور اب دیکھو! وقت پلک جھپکنے کی دیر میں گزر گیا۔ اب تم میرے سامنے مجرم کی حیثیت سے

کھڑے ہو۔

چاروں لڑکوں کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں مارے خوف کے پھٹی ہوئی تھیں۔ چہروں کے رنگ ہلدی جیسے پیلے ہو گئے تھے اور ان کے ہونٹ لکڑی کی طرح خشک۔

اپنے قیدیوں کو دیکھتے دیکھتے اس نے اپنا چہرہ گھمایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنا لگا۔ وہ ہر ایک سے سوال کر رہا تھا۔ سب کے چہروں پر اسے قیدیوں کے لیے نفرت نظر آئی۔ لیکن دانیال کے چہرے پر کچھ اور تھا۔ سنتوش دانیال کے چہرے پر لکھے "کچھ اور" کو سمجھ گیا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف مڑ کر دیکھا اور باپ سے کہا۔

"بابا!...... میں نے ان کو معاف کیا، مجھے ان سے کوئی بدلہ نہیں لینا، بلکہ اگر سچ کہوں تو ان کی وجہ سے مجھے میری محبت ملی، میرے دوست ملے اور وہ سب کچھ ملا جو شاید یہ زیادتی نہ کرتے تو نہ ملتا۔ اس لیے میں نے ان کو معاف کیا۔"

مہا پجاری کا ہوبال کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ چھا گئی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اور خاص طور پر اس خوشی کے دن تو مجھے یقین تھا کہ تم انہیں ضرور معاف کر دو گے اور......"

لیکن اس سے آگے مہا پجاری کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ چاروں لڑکے جنہوں نے کبھی سنتوش کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اب سنتوش کے قدموں میں گرے زور زور سے رو رہے تھے۔ موت کے خوف نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا۔ اچانک معافی کی خبر نے ان کے سختی کے ساتھ تنے ہوئے اعصاب کو یک لخت ڈھیلا کر دیا، وہ مارے ندامت، خوشی اور اظہار تشکر کے سنتوش اور اس کے باپ کے قدموں میں سر رگڑ رگڑ کر رونے لگے۔

شارق قرطاجنہ کی مجلس خصوصی کے تمام پیمانوں اور آزمائشوں سے گزرتا ہوا دفاعی بیڑے کے امیر البحر کے عہدے تک جا پہنچا۔ وہ ابھی تک مہا پجاری کے گھر میں ہی اس کا بیٹا بن کر رہ رہا تھا۔ کلاڈینا اور دانیال شہر قرطاجنہ کے ایک خوبصورت محلے میں اپنا الگ مکان لے کر رہنے لگے تھے۔ کیدارا نے مستقل طور پر مندر میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی اور مہا پجاری نے ایک اچھی سی لڑکی دیکھ کر کیدارا کی شادی بھی کروا دی تھی۔ اب کیدارا ملکرت کے مندر کا ایک ملازم تھا اور مندر کے احاطے میں اس کا بھی اپنا ایک گھر تھا۔ سنتوش اور شیتل کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی جبکہ شارق ابھی تک کلاڈینا سے اظہار محبت نہ کر سکا تھا۔ وہ کرتا بھی کیسے دعوت والے دن سے لے کر آج تک وہ ایسا مصروف ہوا تھا کہ اسے کچھ اور کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ لیکن آج وہ تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے بیڑے پر تھا۔ لیکن آج وہ قرطاجنہ شہر آیا تھا۔ وہ مہا پجاری سے اجازت لے کر قرطاجنہ میں ہی اپنی الگ رہائش خریدنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مکان خریدتے ہی وہ دانیال سے کلاڈینا کا ہاتھ مانگ لے گا۔ یہی باتیں سوچ کر آج وہ مندر آیا تھا۔ اس نے اپنے دل کا خیال سنتوش اور شیتل کے سامنے بیان کیا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے شارق کے خیال کی بھرپور تائید کی اور سنتوش نے کہا کہ...... ”بابا سے کہہ کر ہم کوئی اچھا سے مکان خریدیں گے۔“ ......

غروب آفتاب کے بعد کھانے کے دسترخوان پر شارق اور کاہوبال کی ملاقات ہوئی۔ مہا پجاری بھی شارق کا ارادہ جان کر بہت خوش ہوا اور طے یہ پایا کہ شارق کل ہی اپنے لیے ایک خوبصورت مکان دیکھے اور چند ہی دنوں میں اس کی شادی کی بات بھی آگے بڑھائی جائے۔

اگلے دن شارق نے قرطاجنہ شہر میں اپنا مکان خرید لیا۔ لیکن ابھی وہ اپنے مکان

میں رہ نہیں سکتا تھا۔ اسے شام تک بیڑے پر واپس پہنچنا تھا۔ یہ کام تو اس نے اس لیے کیا تھا کہ وہ خود کو ایک قرطاجنی شہری ہونے کا پورا پورا احساس دلانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب وہ قرطاجنہ کے دفاعی بیڑے کا امیر البحر تھا۔ اگرچہ وہ چاہتا تو حکومت کی طرف سے دی گئی رہائش میں بھی مقیم ہو سکتا تھا۔ ایک سپہ سالار کو حکومت قرطاجنہ قلعہ بیرسا کے احاطے میں ہی اعلیٰ سے اعلیٰ رہائش دے سکتی تھی۔ لیکن اس نے اپنا ذاتی مکان خریدنا پسند کیا۔ وہ دل سے ایک سچا قرطاجنی بننا چاہتا تھا۔ تاکہ جنگ میں بھی وہ اس شہر کے ساتھ اپنی سچی وفاداری کا مظاہرہ کر سکے۔

شارق کا مکان دیکھنے کے لیے سب آئے۔ اور یوں کئی روز بعد وہ سب ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے۔ شاید انہی رشتوں نے ان سب کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا تھا۔ خاص طور پر کلاڈینا' شارق کے مکان کو کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے شام کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ کیدارا کی نو بیاہتا...... بیوی نے ان کے لیے خاص افریقی کباب بنائے تھے۔ شیتل اور کلاڈینا نے بھی مختلف چیزیں پکائیں۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ سب نے خوش ہو کر کھایا اور پھر قہوہ پینے لگے۔ دانیال نے کہا۔

''شارق!...... بہت بہت مبارک ہو۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا جو یہاں چلے آئے۔ مارفیس کے جزیرے پر موجود تناؤ کی کیفیت کسی شہری کو بھی آزاد خیالی کے ساتھ نہ رہنے دیتی ہو گی۔''

شارق نے دانیال کی بات پر سر ہلایا۔

''خیر مبارک!...... آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ مارفیس پر ہر شہری کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔''

اتنی بات کر کے اچانک شارق کے دل میں خیال آیا اور اس نے دانیال سے سوال کیا۔

''آپ کیا کرنے والے ہیں؟ میرا مطلب ہے کیا آپ دوبارہ تجارت کا پیشہ اختیار کریں گے؟''

''نہیں!...... اب میں تھک گیا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ میری کچھ ذمہ داریاں باقی ہیں۔ ایک تو میری بہن کی شادی، یعنی کلاڈینا کی شادی اور دوسرا لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔ بہت سے لوگ بہت سی باتوں سے بے خبر ہیں۔ میں چاہتا ہوں

کوئی ایسا طریقہ ایجاد کروں جو بہت زیادہ مذہبی بھی نہ ہو اور لوگ اسے قبول بھی کریں۔ سوچ رہا ہوں کیا کروں؟ بہر حال ابھی تو آرام کر رہا ہوں۔ لیکن ایک بات طے ہے میں اب قرطاجنہ چھوڑ کر کہیں جانے والا نہیں۔ ایک دن کے لیے بھی نہیں۔"

سب جانتے تھے کہ دانیال ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ لیکن کسی نے دانیال کو نہ ٹوکا۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے فیصلے سے خوش ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے دل میں ایک ارمان تھا اور وہ یہ کہ کاش دانیال کو اس کی محبت مل جاتی۔ باتوں ہی باتوں میں دانیال نے شارق سے دریافت کیا۔

"شارق!...... تمہاری تیاری کہاں تک پہنچی ہے۔ تم دفاعی بیڑا سنوار رہے ہو نا! سنا ہے رومی افواج بہت جلد روانہ ہونے والی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ قرطاجنہ کو دفاعی جنگ لڑنی چاہیے یا باہر نکل کر دشمن کو اس کے حملے کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے؟"

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرطاجنہ رومیوں کے لیے ناقابل تسخیر ہے۔ اس کی صرف ایک سمت کھلی ہے۔ باقی تین سمتوں میں سمندر ہے۔ اگر ہم بحری بیڑا تیار نہ بھی کرتے تو بھی وہ دیوتاؤں کی دیوار پر نہ چڑھ سکتے۔ کیونکہ قرطاجنہ ایک سمندری چٹان کی طرح پانی کی سطح سے بہت اونچا ہے۔ دیوتاؤں کی دیوار گویا قرطاجنہ کی ناقابل تسخیر فصیل ہے۔ جس پر کمند بھی نہیں ڈالی جاسکتی اور نہ ہی کوئی سیڑھی لگائی جاسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ لوگ کوہ پیائی کر سکتے ہیں۔ رخنوں، دراڑوں اور سوراخوں میں ہاتھ پاؤں جما کر اوپر شہر پر چڑھ سکتے ہیں اور ظاہر ہے جب وہ اوپر آئیں گے تو اہل قرطاجنہ ان کا بھرکس نکال دیں گے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں قرطاجنہ کے لیے دفاعی جنگ ہی بہتر رہے گی۔"

دانیال سمیت سب لوگ نہایت توجہ سے "سپہ سالار شارق" کی بات سن رہے تھے۔ سنتوش نے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کمال ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر دفاعی بیڑا کیوں تیار کیا گیا۔ دیوتاؤں کی دیوار کے ہوتے ہوئے دفاعی بیڑا تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"وہ اس لیے کہ دشمن ہمارے پانی کے راستے نہ کاٹ سکے اور قرطاجنہ کی سمندری حدود میں دشمن کا کوئی جہاز داخل نہ ہو سکے۔ کیونکہ اگر دشمن قرطاجنہ کی فصیل تک پہنچ گیا تب وہ رسد و کمک کے ہمارے سمندری راستے کاٹ دے گا۔ ہمارا بیڑا دشمن کے جہازوں کو شہر کے

نزدیک نہ بھٹکنے دے گا۔"

شارق نے سنتوش کو جواب دیا۔ سب دلچسپی سے آنے والی جنگ کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ دانیال نے اپنی طرف سے کہا۔

"اصل جنگ تو شارق کی فوج لڑے گی۔ باقی افواج تو شہر بند ہوکر لڑیں گی۔ لیکن شارق شہر سے باہر ہوگا۔ بالفاظ دیگر میدان جنگ میں۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔"

سب لوگ شارق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ شیتل نے مسکراتے ہوئے شارق سے پوچھا۔

"بھیا!...... قرطاجنہ کی دو افواج ہیں۔ ایک بحری اور دوسری بری۔ آپ بحری فوج کے سپہ سالار ہیں۔ بری یا زمینی فوج کا سپہ سالار کون ہے؟ کیا وہ بھی آپ کی طرح کوئی بہادر آدمی ہے؟"

"ہاں! وہ بہت بہادر آدمی ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔ مجھ پر تو قرطاجنی حکومت کو اتنا بھروسہ نہیں، صرف میری قابلیت کی وجہ سے مجھے لیا گیا ہے اور میرے آس پاس بہت سے وفادار قرطاجنی سالاروں کو میرے کام کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اس پر حکومت کو مکمل بھروسہ ہے۔ وہ رومیوں کے خلاف لڑنے کا طویل تجربہ رکھتا ہے۔"

سب کے منہ سے فوراً نکلا۔

"لیکن اس کا نام کیا ہے؟"

"برتھاس!"

شارق کے منہ سے برتھاس کا لفظ نکلنے کی دیر تھی کہ کلاڈینا کے بدن سے روح نکل گئی۔

برتھاس؟؟...... یہ کیا نام لے دیا تھا شارق نے۔ کلاڈینا کے لیے یہ نام بہت سے معنی رکھتا تھا۔ وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔ اپنی جگہ پہلو بدلنے لگی۔ ان سب دوستوں میں صرف شیتل؛ کلاڈینا کی تفصیلی کہانی سن چکی تھی۔ وہ برتھاس کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے بھی بے پناہ حیرت ہوئی۔ کلاڈینا تو یہ سوچ سوچ کر مری جارہی تھی کہ جس برتھاس کی قید سے وہ جان پر کھیل کر بھاگ نکلی آج وہ اسی برتھاس کے زیر کمان قرطاجنہ میں مقیم تھی۔ شارق

اپنی رو میں بولتا رہا۔

''وہ بہت بڑا فاتح ہے۔ اس نے رومیوں کو ناکوں چنے چبوائے۔اس نے ارمنیدس کے ستر ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی۔ حقیقت میں تو بری ہو یا بحری تمام افواج کا سپہ سالار برتھاس ہی ہے۔ وہ آیا تھا میرے جہازوں پر۔ اس نے میرا کام دیکھا اور بہت خوش ہوا۔ ہم دونوں اچھے دوست بن گئے ہیں۔ وہ خشکی پر دشمن کا صفایا کرے گا اور میں پانی میں۔''

کلاڈینا کے لیے کمرے میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ برتھاس کے ساتھ اس کی انگنت یادیں وابستہ تھیں۔ وہ برتھاس کو کیسے بھول سکتی تھی۔ جس کے ساتھ اسے زندگی کا وہ تجربہ حاصل ہوا تھا جو ایک عورت کو اپنے شوہر کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ وہ پون سال کے قریب برتھاس کے پاس رہی تھی۔ برتھاس کی سب سے پسندیدہ داشتہ کے طور پر۔ اس پر مستزاد برتھاس کا وہ رویہ تھا جو کلاڈینا کے لیے سب سے جدا تھا۔ باقی سب کے لیے وہ ایک سفاک درندہ تھا۔ اور سفاک تو وہ کلاڈینا کے لیے بھی تھا۔ لیکن کلاڈینا کے ساتھ اس کی کچھ اور وابستگی بھی تھی۔ اور وہ بہت ہی انوکھی وابستگی تھی۔ اس نے کلاڈینا کو قید بھی کر رکھا تھا اور یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ اسے جب بھی موقع ملے وہ فرار ہو جائے۔ کیسی عجب بات تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ برتھاس دنیا میں صرف ایک ہی عورت کی عزت کرتا تھا اور وہ تھی کلاڈینا۔ جس دن اس نے محسوس کیا کہ کلاڈینا اپنی خوشی سے اس کے ساتھ ہمبستر نہیں ہوتی، اسی دن سے اس نے اپنی خوابگاہ میں کلاڈینا کو بلانا چھوڑ دیا۔ وہ ہر طرح سے کلاڈینا کا خیال رکھتا تھا۔ کلاڈینا کے دل میں اس کے لیے نفرت بھی تھی اور محبت بھی۔ شارق ابھی باتیں کر رہا تھا کہ کلاڈینا ایک جھٹکے سے اٹھی اور سب کو اپنی طرف دیکھتا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اصل میں اس کی طبیعت میں ہیجان آ گیا تھا۔ اس کے بدن پر زلزلہ طاری تھا اور یہ سوچ سوچ کر ہی اسے کچھ ہو رہا تھا کہ برتھاس قرطاجنہ میں ہی موجود ہے۔

شارق بات کرتے کرتے اچانک رک گیا اور حیرت سے کلاڈینا کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کلاڈینا کے اچانک اٹھ جانے پر سب حیرت زدہ تھے۔ لیکن شارق تو اپنے آپ میں خفیف ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسی نے کچھ ایسا کہہ دیا ہو جس کی وجہ سے کلاڈینا اٹھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں بری طرح ڈر گیا۔ آج کئی دن بعد اس نے کلاڈینا کا ایسا برتاؤ دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ غلط سمجھ رہا تھا۔ کلاڈینا کا اٹھ جانا اس کی وجہ سے نہیں تھا۔ وہ تو برتھاس کا

ذکر سنتے ہی مضطرب ہوگئی تھی۔ جب تک بیٹھی رہی اپنا اضطراب چھپاتی رہی۔ لیکن پھر بالآخر اسے اٹھنا پڑا۔ دانیال نے بات جاری رکھنے کے لیے شارق سے پوچھا۔

''کیا تمہیں مجلس خصوصی کے اجلاسوں میں بھی بلایا جاتا ہے؟''

شارق کا ذہن تو کلاڈینا کی طرف تھا لیکن پھر بھی اس نے دانیال کی بات کا جواب

دیا۔

''نہیں!...... مجھے نہیں بلایا جاتا۔ وہاں خالص قرطاجنیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ البتہ مجلس عامہ کے اجلاسوں میں، میں شریک ہوتا رہتا ہوں۔''

''کیا تم نے کبھی قرطاجنہ کی کنواری کو دیکھا؟''

یہ سوال شیتل نے کیا تھا۔ شارق نے جواب دیا۔

''نہیں دیکھ سکا۔ وہ جس جھروکے میں بیٹھتی ہے اس کے سامنے جالی دار پردہ لٹکتا

رہتا ہے۔''

شارق سوالوں کے جواب تو دے رہا تھا۔ لیکن اس کی توجہ کہیں اور تھی۔ اسے سمجھ نہ آرہی تھی کہ آخر اکی کون سی بات نے کلاڈینا کو مغموم کردیا۔ وہ بے حد پریشان ہوگیا۔ دانیال نے اندازہ لگا لیا کہ شارق اب محفل میں ذہنی طور پر حاضر نہیں رہا۔ چنانچہ دانیال نے چاہا کہ اب محفل برخاست کردی جائے۔

واپس گھر آکر دانیال نے کلاڈینا سے سوال کیا۔

''کلاڈینا تمہیں کیا ہوجاتا ہے؟ تم شارق کو دیکھتے ہی بدک جاتی ہو۔ اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا جس کی وجہ سے تمہیں محفل سے اٹھنا پڑا۔ وہ بے چارا تمہیں دل سے چاہتا ہے اور ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ تم خوش رہو اور یہ بات تم جانتی بھی ہو۔ اس دن کی ضیافت میں تمہارا اشارہ پاکر ہی اس نے بحری سالار بننا قبول کیا۔ لیکن تم ہو کہ اس کی طرف دیکھتی تک نہیں۔''

دانیال نے آج پہلی مرتبہ کلاڈینا سے پوچھا تھا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اس کا یہی رویہ دیکھتا آیا تھا۔ کلاڈینا کا تو رنگ فق ہوگیا۔ وہ دانیال کے سامنے ہمیشہ ایک معصوم اور سعادت مند بچی بن جایا کرتی تھی۔ دانیال نے کبھی اسے ڈانٹا نہ تھا اور اسے حسرت رہتی تھی کہ کبھی دانیال اسے کسی بات پر ڈانٹے۔ آج اس کی یہ حسرت پوری ہوگئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش

ہوئی اور اس نے فوراً کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

دانیال سوچ میں پڑ گیا کہ آخر کلاڈینا کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ معاً اس نے کلاڈینا کے چہرے کو گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اچانک دانیال کی آنکھوں میں سوچ کی گہرائی بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ پھر یک لخت دانیال کی آنکھوں میں ایک ساتھ بے پناہ چمک پیدا ہوئی۔ اس نے بھنویں اچکائیں اور پھر سکیڑ لیں اور پھر یک دم اس کے منہ سے نکلا۔

"او میرے خدا!"

دانیال نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنی کنپٹی پر مارا۔

"میں سمجھ ہی نہیں سکا۔ اچھا!...... تو سپہ سالار برتھاس وہی برتھاس ہے، جسے تم نے اپنی آپ بیتی میں بارتھاس کہہ کر پکارا تھا۔ تم نے تو اپنے لہجے کی وجہ سے بارتھاس کہا ہوگا لیکن میں سمجھ نہ پایا۔"

دانیال کی ذہانت سے کلاڈینا پہلے ہی واقف تھی۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ دانیال برتھاس کا نام سنتے ہی کہانی سمجھ گیا ہوگا لیکن آج دانیال چونک گیا تھا۔ وہ اس وقت نہ سمجھ سکا۔ اس نے بے اختیار ہو کر کلاڈینا کو سینے سے لگا لیا۔

"میری بچی!......"

دانیال کے منہ سے بس اتنا نکلا۔ کلاڈینا کو آج صدیوں بعد کسی نے یوں پناہ دی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شارق اگلے دن بیڑے پر واپس چلا گیا۔ اس بار اس کا دل بہت دکھی تھا۔ کوئی کام کرنے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔ قرطاجنہ کی حفاظت کا جذبہ بھی سرد پڑتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اپنے خاص جہاز کے عرشے پر آ کر تنہا بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں دور کھلے سمندر کے پانی پر گڑی ہوئی تھیں۔ شارق کا بیڑا شہر کی سمندری اطراف میں فصیل کے طور پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس بیڑے میں چھوٹے بڑے دو سو چالیس جہاز تھے۔ شارق کا اپنا جہاز اس قطار میں نہیں رکتا تھا۔ بلکہ وہ سب کی نگہبانی کرتا ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا رہتا۔ شارق کا جہاز فی الحقیقت ایک بڑی کشتی تھا، جسے رفتار کے حوالے سے اتنا تیز بنایا گیا تھا کہ جیسے بجلی کا کوندا۔ اسی طرز کے بارہ جہاز شارق کے دستے میں شامل تھے۔ وہ اپنی مشقوں کے دوران

جب ایک ساتھ لپکتے تو یوں لگتا جیسے جہاز نہیں بلکہ تیر جا رہے ہوں۔ بارہ جہاز اور بیس تیز رفتار کشتیوں کا یہ دستہ شارق نے خصوصی طور پر اپنے لیے الگ کیا تھا۔ یہ شارق کا ہراول دستہ نہیں تھا۔ شارق کا ہراول تو کئی کوس آگے سمندر میں صف بند تھا۔ جس میں تیس بڑے جہاز اور دو سو بہتر لڑاکا کشتیاں شامل تھیں۔ شارق کا یہ سارا نظام دیکھ کر سپہ سالار بر تھاس بہت خوش ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا نظام تھا۔ شارق اس وقت شہر کے قریب نہیں تھا، بلکہ اس کا جہاز اپنے ہراول سے بھی آگے دور سمندر میں گشت کر رہا تھا۔ یہ اس کی روز کی تربیت تھی۔ وہ ہمہ وقت چاق و چوبند رہنے کیلئے پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ ابھی ہراول کے پاس نظر آیا تو تھوڑی دیر بعد دیوتاؤں کی دیوار کے سائے میں وہ اپنے جہاز کے عرشے پر خاموش بیٹھا کلاڈینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے دل کی کیفیت...... مرے تھے جن کے لیے، وہ رہے وضو کرتے..... والی تھی۔ بیزار، تھوڑا سا غصہ، تھوڑی سی رنجش اور بہت سے دکھ کا گھلا ملا تاثر تھی اس کی کیفیت۔ یکایک وہ چونک گیا۔ دور سمندر میں دو کشتیاں اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ شارق کی جاسوس کشتیاں تھیں۔ وہ سمندر میں بہت آگے تک گشت کیا کرتیں۔ ایک بار روانہ ہوتیں تو کئی روز بعد لوٹتیں۔ اس طرح کی کشتیوں کے کئی دستے تھے جو شارق نے دو دو کی تعداد پر مرتب کیے تھے۔ یہ کشتیاں چونکہ جاسوسی کے لیے بھیجی جاتیں، اس لیے ان پر کوئی پرچم نصب نہ ہوتا۔ پرچم نصب کرنے کا حکم صرف اس وقت تھا جب کوئی ہنگامی خبر دینا مقصود ہو۔ شارق نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ دشمن آ رہا ہے۔ یہ تو بڑی حیرت کی بات تھی۔ شارق کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ دشمن تو ابھی رومہ سے روانہ ہی نہ ہوا تھا۔ کم از کم قرطاجنہ کے جاسوسوں نے تو یہی اطلاع دے رکھی تھی اور اب یہ لال جھنڈے؟ شارق کو سب کچھ بھول گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے ماتحتوں کو آوازیں دینے لگا۔

کشتیاں بالکل نزدیک آ گئیں۔ جہاز اور کشتیاں ایک دوسرے کے پاس آنے لگے پھر دونوں کشتیاں اور جہاز رک گئے۔ چھوٹے چھوٹے ڈنڈوں سے بنی رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی۔ کشتیوں کے جاسوس جہاز پر آ گئے۔ سب سے آگے ''ہلوکر'' تھا۔ اس نے شارق کو سلام کیا اور ایک ہی سانس میں کہنے لگا۔

''دشمن آ پہنچا ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ پہلی اطلاع غلط تھی۔ میں نے ایک بڑا لشکر دیکھا ہے۔ سینکڑوں جہاز۔ ہم آسانی سے انہیں نہیں روک پائیں گے۔''

یہ تو بہت بری خبر تھی۔ شارق ایک لمحے کے لیے تو پریشان ہو گیا لیکن بالآخر وہ شارق تھا۔ اس نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر دشمن آ رہا ہے تو اسے آنے دو۔ لیکن وہ کس طرف سے آ رہا ہے؟"

اور اس کی کیا ترتیب ہے؟ یہ جاننا ہمارے لیے پہلے ضروری ہے۔"

"وہ شمال مغرب کی طرف سے سیدھا قرطاجنہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کی رفتار بھی تیز ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اگر وہ اسی رفتار سے بڑھتے رہے تو کل صبح تک وہ ضرور ہماری حدود میں داخل ہو جائیں گے۔"

"ہلوکر" نے اپنا اندازہ بتایا تو شارق کے منہ سے نکلا۔

"ہلوں ں ں!......"

پھر شارق نے کہا۔

"کیا تم نے یہ تسلی کی کہ وہ رومی لشکر ہی ہے۔ تم نے ان کے پرچم دیکھے؟"

"ہاں!...... میں نے پوری تسلی کی۔ وہ رومی لشکر ہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری ہر اطلاع غلط تھی۔ قرطاجنہ کے جاسوسوں کو گمراہ کیا جاتا رہا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی مجھے اپنا جاسوسی نظام رومہ تک پھیلانا چاہیے تھا۔ اچھا! تم فوری طور پر یہ کرو کہ قرطاجنہ اطلاع پہنچاؤ۔ دھیان رکھنا شہر خوف و ہراس کا شکار نہ ہونے پائے۔ تمہیں صرف سپہ سالار برتھاس کو بتانا ہے اور بس۔"

ہلوکر نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ اور جس رفتار سے آیا تھا اسی رفتار سے قرطاجنہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ شارق نے اپنے ماتحتوں کو احکامات دینے شروع کر دیے۔

"جہازوں کو آگے بڑھاؤ، پوری رفتار سے۔ میں خود اس بحری بیڑے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ شارق کا دستہ بحر روم میں آگے بڑھتا، انہیں پھر دور سے دو کشتیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شارق اور اس کے ساتھیوں نے یہی سمجھا کہ ان کا کوئی اور جاسوس دستہ لشکر کی اطلاع لا رہا ہے۔ شارق نے دوبارہ اپنے ملاحوں کو رکنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ دوسرے جاسوس دستے کی خبر بھی سن لے تاکہ دشمن کی طرف سے اچھی طرح تسلی کر لے اور مناسب فیصلہ کر سکے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کی بھنویں حیرت سے سکڑ گئیں۔ سامنے سے آنے

والی کشتیاں جاسوس کشتیاں نہ تھیں۔ بلکہ ظاہری طور پر تو وہ کسی خستہ حال ملاح یا مچھیرے کی کشتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ میلی کچیلی اور ٹوٹی پھوٹی، مچھیروں کی کشتیاں تھیں۔ لیکن ان کی رفتار حیران کن تھی۔ شارق کو کچھ غیر قدرتی سا لگا۔ اس کی زندگی سمندر میں گزری تھی۔ مچھیروں کی کشتیاں اتنی تیز رفتاری سے پانی پر نہ تیر سکتی تھیں۔ اس پر مستزاد ان کشتیوں کے بادبان ہی نہ تھے تو پھر وہ کون سے جادو سے اتنی تیز چل رہی تھیں۔ کیونکہ آٹھ ملاحوں اور سولہ چپوؤں والی ایک عام کشتی کی رفتار اتنی نہ ہوتی تھی، جتنی کہ سامنے سے آنے والی مچھیرا کشتیوں کی رفتار تھی۔ شارق نے شمار کیے۔ ان میں آٹھ کی جگہ چھ چھ ملاح تھے۔ گویا بارہ بارہ چپو۔ لیکن ایک چیز حیران کن تھی۔ کشتی کے بیچوں بیچ ایک گول سا گنبد تھا، جو بالکل بند تھا۔ شارق نے سوچا، ہوسکتا ہے اس گنبد میں جہاز کھینچنے والا کولہو ہو۔ لیکن آخر وہ کیسا کولہو تھا جو اتنے چھوٹے سے گنبد میں تھا۔ جہاں نہ کوئی جانور چل سکتا تھا اور نہ انسان۔ شارق کے جہازوں کے عرشوں پر موجود اس کے سپاہی اور افسران کی حیرت مسلسل بڑھتی جارہی تھی۔ غیر قدرتی رفتار سے چلتی ہوئی وہ عجیب و غریب گنبد والی بدنما کشتیاں سیدھی شارق کے جہاز کی طرف آئیں۔ شارق کا جہاز ابھی کھڑا تھا۔ دونوں مچھیرا کشتیاں جہاز کے ساتھ لگ کر رک گئیں۔ اور پھر اگلے لمحے ان کشتیوں میں موجود ملاحوں میں سے ایک نے اوپر شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیڑھی ڈالیے!...... ہم قرطاجنی جاسوس ہیں۔"

شارق کا شک دور نہ ہورہا تھا۔ بے شک بات کرنے والا خالص کارتھی لہجے میں بول رہا تھا، لیکن اس کا حلیہ مچھیروں جیسا تھا۔ وہ رومی بیڑے کا جاسوس بھی تو ہوسکتا تھا۔ لیکن شارق نے بزدلی کا مظاہرہ نہ کیا۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کو چوکنا رہنے کے لیے کہا اور خود قرطاجنی جاسوسوں کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ اسے سب ملاحوں کے چہروں پر کوئی عجیب چیز نظر آئی۔ سب کی آنکھیں میں زندگی اور حرارت اور شکرے جیسی چمک تھی۔ شارق کے دل سے آواز آئی کہ ضرور یہ کوئی خاص لوگ ہیں۔ ان میں ہر ایک خاص تھا۔ سیڑھی ڈال دی گئی اور دونوں کشتیوں کے قرطاجنی جاسوس جہاز پر آگئے۔ سب سے پہلے ایک ادھیڑ عمر تنومند اور چست و چالاک ملاح اوپر آیا۔ اس کے بعد ایک نہایت خوبصورت نوجوان ملاح، جس نے باقیوں کی نسبت بھاری بھرکم لباس پہن رکھا تھا، جہاز پر چڑھ آیا۔ سب ملاحوں کے سروں پر مخصوص میلی پگڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہی پگڑیاں جو عام طور پر ملاح سمندر میں سر کو دھوپ

سے بچانے کے لیے باندھتے تھے۔ شاید خوبصورت نوجوان ان جاسوسوں کا سربراہ تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی تھیں۔ اس نوجوان نے شارق کے ساتھ براہ راست بات کی۔ لیکن جب وہ بولا تو نہ جانے کیوں شارق کو پھر کچھ غیر قدرتی سا لگا۔ خوبصورت نوجوان نے شارق سے کہا۔

''میں تم سے...... اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

شارق کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کی چھٹی حس نے کچھ نامانوس سی گھنٹیاں بجائیں اور پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ شارق کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا اور پھر اس نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے کہہ رہا ہو دیکھا جائے گا اور نوجوان سے کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔''

شارق آگے آگے چل پڑا اور خوبصورت قرطاجنی جاسوس پیچھے پیچھے۔ کچھ دیر بعد وہ جہاز کے ایک الگ کمرے میں داخل ہوا۔ قرطاجنی جاسوس بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ قرطاجنی جاسوس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے نہایت پھرتی سے دروازے کی کواڑ بند کیے اور کنڈی چڑھا دی۔ شارق کا ہاتھ بے اختیار اپنی شمشیر کے دستے پر چلا گیا اور قرطاجنی جاسوس جونہی کنڈی چڑھا کر مڑا تو شارق کے ہاتھ میں شمشیر دیکھ کر دنگ رہ گیا اگلے لمحے اس کا زوردار قہقہہ نکل گیا۔ شارق نے نوجوان کا قہقہہ سنا تو اس کی دماغی حالت گڑبڑانے لگی۔ کیونکہ قہقہے میں بھی اسے بہت کچھ غیر قدرتی لگ رہا تھا۔ معا اسے قرطاجنی جاسوس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ تم بہت بہادر ہو، لیکن تم تو ڈر گئے۔''

شارق خفیف سا ہو گیا۔ اس کے خفیف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے ہوئے تھا اور سامنے موجود قرطاجنی جاسوس نے ابھی تک تلوار کے دستے پر ہاتھ تک نہ رکھا تھا۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ معا اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ شارق کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل کر پھٹنے کو آ گئیں۔ قرطاجنی جاسوس نے اپنی مونچھ کو پکڑا اور بڑے آرام کے ساتھ اپنے چہرے سے الگ کر لیا۔

''تم مجھے نہیں جانتے۔ لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں تمہارے سامنے ظاہر نہ ہوتی۔ لیکن اچانک حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور اب اگر ہم فوری طور پر دانشمندی کا مظاہرہ نہ کریں تو قرطاجنہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہمیں اپنے بحری سپہ سالار موآبرلیس

نے جو اطلاعات بھیجی تھیں اس کے مطابق رومہ کا بری لشکر ابھی بیڑوں میں سوار ہی نہ ہوا تھا۔ لیکن بوڑھے موآبرلیس کو دشمن نے دھوکہ دیدیا۔ رومہ میں اب بھی بظاہر ایک بری لشکر جہازوں پر سوار ہونے کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ لیکن حقیقی لشکر ہمارے سروں پر آن پہنچا ہے۔ یہ لوگ مغرب کی طرف سے آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رومی لشکر نہایت خفیہ طریقے سے روانہ ہوا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر قرطاجنہ کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے اس لشکر کی مڈبھیڑ پورے سفر میں ہمارے کسی دستے کے ساتھ نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہوتی تو ہمیں ضرور خبر مل گئی ہوتی۔ موآبرلیس' کوناڈس کے ساتھ الجھا رہا اور نوجوان بحری سالار شیراٹن ایک بڑی بری فوج لے کر قرطاجنہ آ پہنچا۔

ہم کچل دیئے جائیں گے سپہ سالار...... ہم کچل دیئے جائیں گے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ان کے سارے جہاز شہر کو گھیر لیں گے اور بری فوج خشکی پر اتر کر شہر کے سامنے کیڑے مکوڑوں کی طرح جمع ہو جائے گی۔

شارق اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور سمندر کے سینے پر موجود ہر شخص کی نسبت تم میرے زیادہ قریب ہو۔ اگر تم ساتھ دو تو میں اب بھی رومی لشکر کو شکست دے سکتی ہوں۔"

شارق ہکا بکا ہو کر اس لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ جو ملاحوں کے لباس میں ملبوس اور مچھیروں کی کشتی میں بیٹھ کر ایک مرد قرطاجنی جاسوس کی حیثیت سے اس کے پاس آئی تھی۔

شارق اب بھی کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ وہ کون ہے، کبھی تو اسے لگتا جیسے آسمان سے کوئی دیوی اتر آئی ہے اور اسی لیے وہ اس کی مبہم باتوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بالآخر شارق نے تنگ آ کر پوچھ لیا۔

"لیکن آپ ہیں کون؟ میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔"

"میں آموسا ہوں...... تم مجھے جافیکس بھی کہہ سکتے ہو اور شاید قرطاجنہ کی کنواری بھی۔"

شارق کے کانوں میں یہ الفاظ پڑنے کی دیر تھی کہ اس کے بدن کا لہو یک لخت الٹی طرف بہنے لگا۔ دل نے کسی ہنڈولے کی طرح ایک لمبا ہچکولا کھایا اور آنکھیں کئی طرح کے رنگوں سے آن واحد میں چمک اٹھیں۔ قرطاجنہ کی کنواری؟ اور اس حلیے میں؟ شارق کے پاس؟...... یہ کیا ماجرا تھا؟ شارق یک لخت مؤدب ہو گیا۔

"مجھے یقین آ گیا کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ دانیال بھیا نے جیسا بتایا تھا آپ بالکل ویسی ہی ہیں اور اب میں یہ بھی سمجھ گیا کہ آپ نے مجھے اس قدر اپنائیت کے ساتھ اپنا کیوں کہا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے آپ کو میرے سامنے ظاہر کرنا پسند کیا۔ حیرت ہے میں اس ادھیڑ عمر سپاہی کو بھی نہیں پہچان سکا جو آپ سے پہلے جہاز میں سوار ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنا حلیہ بدل رکھا تھا۔ وہ گہرتاب ہے نا! آپ کا سرفروش؟"

"ہاں! وہ سارے میرے سرفروش ہیں۔ چیتے کی طرح مستعد اور شاہین کی طرح تیز۔ مجھے ان کی وفاداری پر کوئی شک نہیں۔ کیونکہ وہ سالوں سے میرے ساتھی ہیں۔ لیکن پھر بھی شارق تم میرے اپنے ہو۔"

شارق کے لیے یہ اعزاز اتنا بڑا تھا کہ اس سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی جذباتی کیفیت کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی حالت بگڑ جاتی۔ معاً اس نے ہکلاتے ہوئے آموسا کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے اپنی شمشیر نیام میں ڈالی اور خود بھی پاس رکھی تپائی پر بیٹھ گیا۔

آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔ آپ حکم کیجئے! کیا کرنا ہے؟ میں آپ کے حکم پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔"

آموسا بہت حسین تھی۔ حالانکہ اب وہ لڑکی نہیں ایک عورت کی عمر میں تھی۔ اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ لیکن اس کے شباب اور حسن شباب میں تنکا بھر کمی نہ آئی تھی بلکہ اضافہ ہوا تھا۔ نوجوانی میں وہ دبلی تھی، لیکن اب اس کا جسم سڈول اور صحت مند تھا۔ نکلتا ہوا قد اور حسین چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں اور ان سب پر مستزاد اس کی ذہانت۔ شارق تو مسحور ہو گیا۔ آموسا نے بات کی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں مل کر کچھ ایسی تدبیر کریں جس سے دشمن قرطاجنہ تک نہ پہنچ سکے۔ ابھی دن کا وقت ہے۔ ہمارے دشمن کا بیڑا رات بھر سفر کر کے صبح سورے نکلنے سے پہلے دیوتاؤں کی دیوار کے پاس ہوگا۔ لیکن اگر ہم رات کی تاریکی میں اسے کسی طرح ایک کاری ضرب لگا دیں تو وہ کچھ وقت کے لیے ضرور رک جائے گا اور اس وقت میں ہم نئی حکمت عملی تیار کر چکے ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے ہراول دستے کو برق رفتاری سے اور آگے لے جاؤ اور آدھی رات کے وقت جب تم رومی لشکر کے نزدیک پہنچو تو اس کو ایک شدید ضرب پہنچاؤ۔ جیسے تیسے کر کے یہ کوشش کرو کہ ہمیں کچھ وقت مل جائے۔

ہمارے ساتھ جو دھوکہ ہوا ہے اس کی بھرپائی کا یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس شب خون کے فوراً بعد تمہیں پھر ایک کام کرنا ہے۔ لیکن وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

آموسا کی بات مکمل ہوئی تو شارق نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

"یقین جانیئے! میں آپ کی آمد سے پہلے بالکل یہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں یہی کرنے والا تھا۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ ہمیں اب کچھ وقت چاہیے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ اس مختصر وقت میں ہم کیا کر لیں گے۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک بار وقت تو ملے۔ میں قرطاجنہ کو کسی قیمت نہیں ہارنا چاہتی۔"

"لیکن شب خون کے بعد مجھے کیا کرنا ہے؟ آپ مجھے کب بتائیں گی اور کیسے؟؟"

"میں بس تمہیں مل لوں گی۔ اسی طرح جیسے اب مل لیا۔ تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ لیکن میں نے جو تمہیں کہا ہے تم وہی کرو۔"

اتنا کہہ کر آموسا یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے شارق!...... اب میں چلتی ہوں۔"

شارق ہونقوں کی طرح آموسا کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ آموسا نے کمرے سے نکلنے سے پہلے شارق کی طرف مسکرا کر دیکھا تو شارق نے سوال کر دیا۔

"لیکن آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟ ہم نے آج سے پہلے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔"

"تم کچھ بھول رہے ہو۔ میں نے تو تمہیں نہیں دیکھا ہوا تھا لیکن گہرتاب تو تمہارے ساتھ کئی دن سفر کرتا رہا۔"

شارق کی سمجھ میں آ گیا کہ گہرتاب نے ہی آموسا کو اس کی پہچان کرائی ہو گی۔

آموسا نے دروازے کی کنڈی ہٹائی اور باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد اس کی عجیب و غریب کشتیاں جس طرف سے آئی تھیں اسی طرف کو اڑی چلی جا رہی تھیں۔

قرطاجنہ کی کنواری

قرطاجنہ کی مجلس خصوصی کا اجلاس جاری تھا۔ قلعہ بیرسا کے احاطے میں ہی ایک خوبصورت عمارت کے خوبصورت کمرے میں چھتیں اراکین پر مشتمل مجلس قرطاجنہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا تھا۔ مینو خاندان کے سردار حسب معمول وزیراعظم پر اپنا غصہ اتار رہے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ قرطاجنہ کے جاسوسی نظام کی ذمہ داری وزیراعظم پر عائد ہوتی ہے۔ وہ مسلسل بول رہے تھے۔ بالآخر سپہ سالار برتھاس نے تنگ آ کر ان کو ٹوکا۔

”یہ وقت فضول باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ صبح تک دشمن ہمارے سر پر ہوگا اور کل اس وقت تک شہر کے دروازے بند کیے جا چکے ہوں گے کیونکہ دشمن کی فوج شہر کے سامنے پڑاؤ ڈال دے گی۔ یہ تو شکر ہے کہ ہمارا دفاعی بیڑا ایک فصیل کی طرح شہر کے گرداگرد موجود ہے۔ وہ ضرور رومی فوج کا راستہ روکے گا۔ اور اگر ایشور کو منظور ہوا تو ہمیں کچھ اور وقت مل جائے گا۔ اب ہم سب لوگ ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے کی بجائے یہ سوچیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔“

ایک اور سالار نے برتھاس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہاں! سپہ سالار برتھاس بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں اب یہ طے کرنا ہے کہ ہم ابھی سے قلعہ بند ہو جائیں یا اس کھلے میدان میں اپنی بری فوج بھیجیں جہاں رومی اترنے والے ہیں۔“

”لیکن رومی کہاں اترنے والے ہیں یہ کسے معلوم ہے؟“

یہ وزیراعظم ارفلکر کا سوال تھا۔ معاً شہزادی جافیکس کی بات نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”دشمن جنگ لڑے گا۔ وہ پہلے ہی ہلے میں پوری طاقت لگا کر ہمارا دفاعی بیڑا تباہ

کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس دوران بری فوج سے لدے اس کے جہاز اپنے سپاہیوں کو ہماری بندرگاہ پر اتارنے کی کوشش کریں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ بری فوج کا ایک حصہ بندرگاہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیا جائے اور باقی فوج "سنگ ترانی" کی گھاٹی میں دشمن کا انتظار کرے۔ کیونکہ اگر وہ بندرگاہ پر نہیں اترتے تو پھر بارہ میل آگے جا کر سنگ ترانی کی گھاٹی میں ہی اترنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں غالباً معلوم ہوگا کہ اترتے ہی ان کا سامنا ننگی تلواروں سے ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہمیں ابھی سے قلعہ بند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

برتھاس جب سے آیا تھا قرطاجنہ کی کنواری کے حسن اور فراست سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے کسی سعادت مند بچے کی طرح زور زور سے سر ہلایا اور جافیکس کی بات کے بعد کہا۔

"بالکل! بالکل!...... یہی مناسب ترین حکمت عملی ہے۔ جب تک دشمن ساحل پر اتر نہیں جاتا ہمیں کسی طرف سے دشمن کا کوئی خطرہ نہیں۔ جونہی دشمن ساحل پر اتر جائے گا۔ ہمارے سامنے سمت صاف ہو جائے گی اور جہاں تک قلعہ بند ہونے کی بات ہے تو جب تک ہم باہر لڑ سکتے ہیں ہمیں لڑنا چاہیے۔"

سب سالار اسی مشورے کی تائید کرنے لگے۔ وقت کم تھا۔ اس لیے ہنگامی اجلاس کو مختصر سے مختصر کیا جارہا تھا۔ اور پھر اجلاس برخاست ہونے سے پہلے جافیکس نے کہا۔

"ضروری نہیں کہ جیسا ہم نے سوچا ہے ویسا ہی ہو۔ ہمیں ہر دم مستعد اور چوکس رہنا پڑے گا۔ یہ ہمارا امتحان ہے۔ رومی بیڑے کا سالار شیراٹن اور بری فوج کا سپہ سالار اوریس، دونوں نوجوان ذہین اور تجربہ کار ہیں۔ جو باتیں ہم سوچیں گے ہوسکتا ہے ہم سے پہلے وہ سوچ لیں۔ اس لیے ہمیں اپنے حواس کو بحال رکھنا ہوگا۔"

جافیکس کی باتوں کے ساتھ ہی اجلاس برخاست ہوگیا۔ برتھاس کی بری فوج نے راتوں رات ہی بارہ میل کا سفر طے کیا اور سنگ ترانی کی گھاٹی میں جا چھپی۔ فوج کا ایک حصہ بندرگاہ پر بیٹھ گیا۔ قرطاجنہ کا سارا ساحل دور دور تک چٹانی تھا۔ ان دو جگہوں کے علاوہ رومی بیڑا کہیں بھی زمینی فوج کو نہ اتار سکتا تھا۔

راتوں رات ہی جافیکس اپنے خاص الخاص سرفروشوں کے ہمراہ تیزی سے مارچ کرتی ہوئی ایک اور مقام پر پہنچی۔ یہ "ہیرن بیری" کی دراڑ تھی۔ یہاں پہاڑیاں پھٹی ہوئی

تھیں اور کچھ ایسی سطح تھی کہ ایک آدھ جہاز کو ساحل کے ساتھ لگایا جاسکتا تھا۔ جافلیکس بیرن بیری کی دراڑ پر پہنچی تو یہ دیکھ کر اسے تسلی ہوئی کہ اس کے پچاس سرفروشوں کا دستہ ہر قسم کے اسلحہ سے لیس وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تمام کام جافلیکس کی مرضی کے مطابق ہوئے تھے۔ یہ بھی جافلیکس کی ہی رائے تھی کہ اہالیان شہر کو آج کی رات سکھ سے سونے دیا جائے۔ اس لیے شہر میں یہ خبر نہ پھیلنے دی گئی تھی۔ لیکن اگلی صبح سب لوگ کیا کیا خبریں سننے والے تھے۔ یہ کسے پتا تھا۔

رات گزر گئی۔ طلوع آفتاب تک کوئی نہ آیا۔ دشمن کا کوئی جہاز کسی ساحل پر نہ پہنچا۔ دفاعی بیڑا پوری طرح چوکس کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور کوئی چیز پہنچی تو یہ خبر کہ سپہ سالار شارق نے رومی بیڑے پر آدھی رات کے وقت ایک بھیانک حملہ کر کے اسے کئی کوس تک پیچھے ہٹا دیا۔ جافلیکس خبر سنتے ہی مسکرانے لگی۔ اس کی ترکیب کارگر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ خود شارق سے ملنے گئی تو شارق کے بدن میں پارہ بھر جائے گا اور وہ ایک عجب جذبے کے ساتھ لڑے گا اور وہی ہوا تھا۔ شارق' کلاڈینا سے مل کر جب بیڑے پر لوٹا تھا تو اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ تھا۔ لیکن نہ جانے قرطاجنہ کی کنواری کے لہجے میں کیا بات تھی کہ وہ اس کے سامنے ایک موم کا کھلونا بن گیا۔

جافلیکس نے جس طرح چاہا، شارق نے اس سے بڑھ کر، کر دکھایا۔ شارق اپنے پورے ہراول دستے کو لے کر آندھی اور طوفان کی طرح شمال مغرب کی طرف بڑھا اور آدھی رات کے قریب اسے دور سے انگنت ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آئے۔ شارق نے اپنی رفتار کم نہ کی اور اپنے ہراول کے سینکڑوں تیر اندازوں کو آتشی تیر پھینکنے کے لیے ہر دم تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ بالکل سامنے سے آنے کی بجائے اس نے اپنے بیڑے کو دائیں گھمایا اور نیم دائرے کی شکل میں ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس نے رومی بیڑے کو جالیا۔ شارق بنیادی طور پر ایک قزاق تھا۔ اس لیے اس کا چھاپہ ایک کامیاب قزاق کا چھاپہ تھا۔ اس کے کسی جہاز یا کشتی پر کوئی بھی روشنی نہ تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور تاروں کی مدھم روشنی بھی نہیں تھی جو شارق کے بیڑے کو دکھاتی۔ اس پر مستزاد وہ جاسوس کشتیاں جو رومیوں کی تھیں، شارق نے پکڑ لی تھیں۔ رومی سالار کو وقت سے پہلے پتا نہ چل سکا۔ اس کا مقابلہ ایک ایسے قزاق سے تھا جو مارفیس کے جزیرے پر پلا بڑھا تھا۔ شیراٹن بہت ماہر بحری سالار تھا۔ لیکن ایک قزاق کے داؤ پیچ وہ نہ

سمجھ سکتا تھا۔ رومی سالار شیراٹن کا اصل بیڑا جس نے بری سپاہ کو اٹھایا ہوا تھا، بہت پیچھے تھا۔ شیراٹن کے جنگی دماغ نے بہت کمال کی ترکیب سوچی تھی۔ اس نے اپنی پوری سپاہ کو کم سے کم جہازوں میں سوار کروا کے پیچھے رکھا اسے اندازہ تھا کہ قرطاجنی جاسوس کشتیاں بہت پہلے اہل قرطاجنہ کو بتا دیں گی کہ رومی آ پہنچے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک انوکھا داؤ کھیلا۔ یہ جزیرہ کریٹ والوں کے داؤ پیچ تھے۔ جہاں شیراٹن نے تربیت حاصل کی تھی۔ شارق کی جاسوس کشتیاں جس لشکر کو دیکھ کر الٹے قدموں دوڑی تھی۔ دھوکہ کھا گئی تھی۔ انہوں نے شارق کو بتایا تھا کہ سینکڑوں رومی جہاز آ رہے ہیں۔ یہ تو شیراٹن کی ترتیب کا کمال تھا کہ انہوں نے بیسیوں رومی جہازوں کو سینکڑوں رومی جہاز سمجھا تھا۔ پہلی صف میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ستر رومی جہاز اور پھر ہر دو کے پیچھے ایک، اور پھر ہر دو کے پیچھے ایک...... یہ ایسے تھا جیسے کسی شاہراہ پر آگے درخت جو کم چوڑے علاقے میں بھی دور سے جنگل دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو خالی جگہ کوئی نظر نہ آئی۔ دور دور تک بادبان اور مستول، جیسے سمندر میں کوئی تقریب ہو رہی ہو۔ انسانی سروں کی طرح جہازوں کا ہجوم کسی جلوس، کا سماں تھا۔ اس جلوس میں زیادہ تر جہاز محض ہاتھی کے دکھنے کے دانت تھے۔ وہ صرف آنے اور جانے کے لیے ساتھ لائے گئے تھے۔ ان کی ہر کھڑکی اور ہر دریچے میں مشعل روشن تھی۔ لیکن ان میں ملاحوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اور ملاحوں کو حکم تھا کہ آگے سے حملہ ہوتے ہی وہ الٹے قدموں دوڑ کھڑے ہوں۔ شیراٹن نے یہ کھیل اس لیے کھیلا تھا تاکہ وہ قرطاجنیوں کو ایک دھوکے میں الجھا کر اپنی بری فوج کو اطمینان سے ساحل پر اتار سکے۔

شارق رومی بیڑے کے ایک کنارے پر نمودار ہوا۔ اور اس نے شیراٹن کو یہ سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی کہ اچانک کس نے حملہ کر دیا تھا۔ شیراٹن جو بہت زیادہ ذہانت کا مظاہرہ کر چکا تھا، اس پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکا جو ایک قزاق اور خاص طور پر شارق کی طبیعت میں تھی۔ شیراٹن کے جہاز الٹے قدموں کیا بھاگتے، شارق بجلی کے کسی کوندے کی طرح ایک سرے سے دوسرے تک اس کی صف اول کو کاٹتا چلا گیا۔ آتشیں تیروں کی بارش نے پوری صف کو نظر آتش کر دیا۔ شعلوں کی ایک دیوار تھی جو پانی پر سطح سے لے کر آسمان تک بھڑکتی ہوئی، لپکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جیسے بہت سے اونٹ قطار میں ایک ساتھ دوڑ رہے ہوں۔ شارق نے اس پر ہی بس نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی رومی بیڑے کے پہلو میں گھوم گیا اور اب وہ

بیڑے کی مغربی سمت کا صفایا کرنے لگا۔ شیراٹن جب تک سمجھ پاتا، شارق اس کے جہازوں کا اس کی توقع سے کہیں زیادہ نقصان کر چکا تھا۔ شیراٹن بری طرح بھاگا، لیکن جاتے جاتے بھی اپنے بیسیوں جہاز دشمن کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ اس کی ترکیب اس کے اپنے خلاف الٹ گئی تھی۔ وہ آدھے سے کم جہازوں کو بچا کر خطرے کی حد سے خود کو نکال پایا۔

''جانی کس'' رومی لشکر کی پسپائی کا سن کر اسی لیے مسکرائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رومی بیڑا اہل قرطاجنہ کو ہراساں کرنے کے لیے کوئی چال کھیل رہا ہے۔ اس کے سرفروشوں نے اسے بتا دیا تھا کہ رومی بیڑے کا ایک بڑا حصہ ابھی پچھلے پانیوں میں موجود ہے۔ لیکن اس نے شارق کو پچھلے بیڑے کا از خود نہ بتایا۔ وہ شارق کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اہل قرطاجنہ کو صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ ان کی بحری فوج نے ایک رومی لشکر کو مار بھگایا۔ جانیکس کی ہر تدبیر کارگر رہی تھی۔ اگر کل شام اہل قرطاجنہ کو رومی بیڑے کی آمد کا بتا دیا جاتا تو ہر طرف خوف اور ناامیدی پیدا ہو جاتی لیکن صرف ایک رات کے وقفے سے آج اہل قرطاجنہ خوشیاں منا رہے تھے۔ انکا جوش و خروش اور ولولہ دیکھنے والا تھا۔ جانیکس کے سرفروش بھی عجب لوگ تھے۔ وہ محض نام کے سرفوش نہ تھے بلکہ سچ مچ کے سرفروش تھے۔ گزشتہ ادوار میں قرطاجنہ کی ہر کنواری کے سرفروش ہوتے تھے، جو عمر بھر کنوارے رہتے اور محض قرطاجنہ کی کنواری کی خاطر اپنی زندگیاں قربان کر دیتے۔ وہ اس کنواری سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس کی پوجا کرتے تھے اور اسے زمین پر دیوی کا روپ سمجھتے تھے۔ ان ایک سو ایک کنواروں سے قرطاجنہ کی کنواری، جیسا مشکل سے مشکل کام لینا چاہتی لے سکتی تھی۔

جانیکس گزشتہ ادوار کی تمام کنواریوں سے بڑھ کر حسین اور ذہین تھی۔ اس کے سرفروش تو گویا پروانے تھے۔ جو اپنی شمع پر جلنے اور فدا ہو جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ کوئی عام نوجوان سرفروشوں میں بھرتی نہ ہو سکتا جب تک ایک سو ایک سرفروش پورے رہتے کوئی نیا شامل نہ ہو سکتا۔ اور جب کوئی مرتا تو اس کی جگہ خالی دیکھ کر قرطاجنہ کا ہر نوجوان یہ خواہش کرتا کہ وہ دیوی کا سرفروش بن جائے۔ لیکن کنواری کسی ایسے مرد کا انتخاب کرتی جو سب سے الگ ہوتا۔ وہ ہر طریقے سے اس کا امتحان لیتی تھی۔ اگر کوئی سرفروش بوڑھا ہو جاتا تو جب تک وہ زندہ رہتا، عملی میدان میں سرفروشوں کی تعداد کم ہو جاتی۔ جب تک اس کی وفات نہ ہوتی، نیا سرفروش بھرتی نہ کیا جاتا۔ ایک کنواری کے لیے ایک سو ایک کنوارے، کیسی انوکھی مثال تھی۔

وہ سب اپنی دیوی کے ایک اشارے پر جانیں لٹانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ دیوی انہیں درشن دیتی، ان سے بات کرتی، تو ان کے سینے پھول کر فخر سے تن جاتے۔ وہ خوش ہوتے اور انہیں ایسا وجد ملتا کہ وہ کنواری کی خوشنودی کے لیے پروانوں کی طرح مارے مارے پھرتے کہ کب وقت آئے اور وہ نور کے حسن پر قربان ہو جائیں۔ یہی آرزو انہیں حقیقی سرفروش بناتی تھی۔ قرطاجنہ کی کنواری کو بھی اپنے سرفروشوں پر کم ناز نہ ہوتا تھا۔

شارق رومیوں سے چھینے گئے جہاز لے کر دیوتاؤں کی دیوار تلے لوٹا۔ ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ اور پھر فصیل پر ہزاروں لوگ موجود تھے جو گویا دیوتاؤں کی دیوار کے سرے پر کھڑے نیچے سمندر میں آنے والے مال غنیمت کے جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں جلے اور آدھ جلے جہاز بھی تھے، جنہیں کھینچ کر بندرگاہ پر لگا دیا گیا۔ تاکہ انہیں مرمت کیا جا سکے یا ان کے تختے کسی اور کام میں لائے جا سکیں۔ شارق اپنی فتح سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دشمن کے بیڑے کو خالی دیکھا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اصل دشمن ابھی پہنچا ہی نہیں۔ شارق جاننا چاہتا تھا کہ دشمن اب کس طرف سے آئے گا۔

شیراٹن کی پہلی منصوبہ بندی ناکام رہی تھی۔ وہ قرطاجنی دفاعی بیڑے کو کیا الجھاتا، خود بہت بڑا نقصان اٹھا کر واپس لوٹا۔ لیکن وہ گھبرا جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے پہلا منصوبہ ناکام ہوتے ہی فوراً دوسرے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اور لیس جو بری فوج کا سپہ سالار تھا اور رومی بیڑے میں موجود تھا، ہر مشورے میں شیراٹن کے ساتھ ہوتا۔ شیراٹن سالاروں سے مشورے کے بغیر کم ہی کوئی کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ناکامی پر اس کے سالار شیراٹن سے ناراض نہ ہوئے تھے۔ دوسرا منصوبہ تو سیدھا سیدھا تھا۔ یعنی کسی دور دراز کے ساحل پر اترنا۔ ان کے لیے مجبوری کی بات یہ تھی کہ وہ قرطاجنہ کے کسی پڑوسی ملک کے ساحل پر نہ اتر سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ ملک انہیں اترنے دیتا۔ اس کے سالاروں نے اسے سنگ ترانی کی گھاٹی کا مشورہ دیا۔ لیکن اس نے مسترد کر دیا۔

”سنگ ترانی کا تو نام ہی نہ لو۔ دشمن کی سب سے بڑی فوج وہیں پر ہمارا انتظار کرے گی۔ وہ اپنے ساحل کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کچھ ایسا کریں جو دشمن کی توقع کیخلاف ہو۔ قرطاجنہ شہر کے دیوتاؤں کی دیوار میں ساتویں میل پر ایک قدرتی دراڑ ہے، جسے

وہ ''بیرن بیری'' کی دراڑ کہتے ہیں۔ ہمارے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق دشمن اس دراڑ سے بالکل بے پرواہ ہے کیونکہ وہاں ایک وقت میں صرف ایک جہاز داخل ہوسکتا ہے۔ وہاں دیوتاؤں کی دیوار ستواں نہیں ہے، بلکہ اس دراڑ میں اس کی شکل قدرتی زینے جیسی بن گئی ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس دراڑ میں اپنی فوج اتار سکیں تو ہم نہایت کامیابی کے ساتھ اور کوئی نقصان اٹھائے بغیر قرطاجنہ کے ساحل پر چڑھ سکتے ہیں۔ ہماری بری فوج کے لیے اس سے بہتر کوئی مقام نہیں۔''

شیراٹن اپنے معتمدین کے ساتھ مشاورت کر رہا تھا۔ بری فوج کے سپہ سالار جوان اور بہادر اورلیس نے بات کی۔

''اگر وہ دراڑ دیوتاؤں کی دیوار میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم براہ راست شہر میں داخل ہوگے، ہمیں شہر کے بڑے دروازے کے سامنے پڑاؤ نہیں ڈالنا پڑے گا۔ کیا میں صحیح سمجھا ہوں۔''

''نہیں!...... میں نے کہا نا کہ دیوتاؤں کی دیوار کے ساتویں میل میں ایک جگہ دراڑ ہے۔ شہر قرطاجنہ تو پہلے میل پر واقع ہے۔ یہ بہت دور کی بات ہے۔ ہماری فوج اس دراڑ سے جس جگہ داخل ہوگی، وہاں کھیت ہیں اور دیہاتیوں کے مکان۔ وہاں سے چھ میل واپس سفر کر کے ہماری فوج شہر قرطاجنہ کے ساتھ پڑاؤ ڈالے گی۔''

اورلیس نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، اچھا! اب میں سمجھا۔ اسی دوران ایک اور سالار نے شیراٹن سے کہا۔

''قرطاجنی دفاعی بیڑا جو دیوتاؤں کی دیوار کے گرداگرد فصیل بنا کر کھڑا ہے کیا بیرن بیری کی دراڑ اس بیڑے کی پہنچ سے باہر ہے؟''

''ہاں! یہ اچھا سوال ہے۔ قرطاجنی بیڑے کی قوس جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے تین میل جنوب مشرق کی طرف چل کر بیرن بیری کی دراڑ ہے۔ اس کے علاقے میں قرطاجنی دفاعی بیڑے کے گشتی جہاز تو وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہتے ہیں، لیکن کوئی مستقل سپاہ موجود نہیں۔''

شیراٹن نے مزید وضاحت کی تو سالاروں کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایک سالار نے سوال کیا۔

"حیرت ہے!...... اگر ایسی بات ہے تو یہ ایک انہونی ہے۔ کیا قرطاجنہ کی دفاعی قوت اتنی کم عقل ہو چکی ہے کہ اس نے اس دراڑ کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کیا اور فرض کرو ہم مشرق کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور وہاں سے واپس گھومتے ہیں یا یوں فرض کرلو کہ ہم مشرق سے آنے والا کوئی لشکر ہیں، تو کیا ہم اس دراڑ تک نہ پہنچ جائیں گے؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ دیوتاؤں کی ناقابل تسخیر چٹان میں ایسی کوئی دراڑ ہے۔"

اس سالار کی بات پر سب سالاروں نے چونک کر شیراٹن کی طرف دیکھا۔ شیراٹن زیرلب مسکرایا اور اس نے کہا۔

"اس طرف سے جو کوئی بھی آئے گا زیادہ سے زیادہ وہ ایک بری فوج کو قرطاجنہ کے سامنے محاصرے کے لیے بٹھا سکے گا۔ اگر اپنے بری راستوں سے قرطاجنی اتنے ڈرنے لگیں، تو افریقہ کے تمام ممالک جو خشکی کے راستے قرطاجنہ تک پہنچ رکھتے ہیں...... اس شہر کو آسانی سے فتح کرلیں۔ ہم بھی زیادہ سے زیادہ ایک محاصر فوج بن کر وہاں جائیں گے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ قرطاجنی بری محاصرے سے کیوں نہیں ڈرتے؟ صرف اس لیے کہ ان کے بحری راستے کھلے ہوتے ہیں۔ ان کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ نہ رسد کی نہ کمک کی۔ یہ بڑا عجیب ملک ہے۔ کسی بھی بری فوج کو اپنے سامنے کئی سال تک بٹھا سکتا ہے۔ ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے۔ اس ملک کو نیست و نابود کرنے کیلئے آئے ہیں۔"

امیرالبحر شیراٹن کی بات سب کو سمجھ میں آ گئی۔ تب اورلیس نے ایک اور سوال کیا۔

"اگر بیرن بیری کی دراڑ میں ایک وقت میں صرف ایک جہاز داخل ہو سکتا ہے تو پھر ہم اپنی فوج کیسے اتاریں گے؟ ہم یوں آرام سے تو اتار نہیں سکتے کہ ایک جہاز جائے، وہاں رکے، سپاہیوں کو اتارے اور آرام سے واپس آ جائے اور پھر اس کے بعد دوسرا جہاز چلا جائے۔ وہاں ہر وقت کا گشت موجود ہے۔ ہمارے لشکر کا ایک جہاز بھی اس علاقے میں نظر آیا تو اوپر نیچے سے قرطاجنی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اوپر سے ان کی بری فوج کا سالار برتھاس آ پہنچے گا اور نیچے بحری سالار شارق۔ کیا تمہارے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب ہے، جو ہمارے سپاہیوں کو، میرا مطلب ہے ہماری پوری بری فوج کو اس چھوٹی سے دراڑ کے ذریعے قرطاجنہ کی سرزمین پر اتار سکے۔"

"ہاں ہے!...... لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری بری فوج میں تقریباً کتنے سپاہی پانی

میں تیر سکنے کے اہل ہوں گے؟''

''معلوم نہیں !...... مجھے کبھی یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''تو پھر سب سے پہلے یہ معلوم کرو۔ میرے ذہن میں ایک اچھی ترکیب ہے۔ ہم یہاں سے آگے نہیں بڑھتے کیونکہ ہمیں سیدھا جاتے ہوئے زیادہ نقصان کا سامنا ہے۔ ہم یہاں سے مشرق کی طرف مڑ جاتے ہیں اور ہم اتنا دور نکل جائیں گے کہ دشمن کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور پھر ہم واپس پلٹیں گے۔ ہم اپنا سارا کام رات کی تاریکی میں کریں گے۔ میرا مطلب ہے دراڑ میں اترنے کا کام۔ ممکن ہے وہاں کوئی قرطاجنی دستے موجود ہوں۔ میں چاہتا ہوں فوج کی ایک اچھی خاصی تعداد پانی میں تیر کر دراڑ پر قبضہ کر لے۔ میرا ہراول دشمن کے بیڑے کی طرف بڑھے گا۔ لیکن مشرق کی طرف سے میں دشمن کے دفاعی بیڑے کی فصیل کو توڑتا ہوا مرکز کی طرف دھکیلوں گا۔ فصیل کا مشرقی سرا ناکارہ ہوتے ہی دشمن کے گشتی جہاز وہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ اگر دراڑ پر پہلے ہمارا قبضہ ہو گیا تو ہم آدھے دن سے بھی کم وقت میں اپنی بری فوج کو تمام گھوڑوں اور ساز و سامان کے ساتھ ساحل پر اتارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بری فوج کے ساحل پر پہنچتے ہی ہمارا ہراول پیچھے ہٹے گا اور ہم وقتی طور پر جنگ روک دیں گے۔ تب ہمیں ایک چھوٹی سی دراڑ کی صورت میں قرطاجنی ساحل سے سمندر کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ مل جائے گا۔''

سب سوچ میں پڑ گئے۔ ترکیب بہت اچھی تھی۔ سردست تو شیراٹن کی ذمہ داری تھی۔ بری فوج کو ساحل پر اتارنا۔ یہی مقصد سب سے عظیم تھا۔ قرطاجنی بیڑے کے ساتھ بحری جنگ اس مقصد کو پورا کرنے کے بعد ہی ممکن تھی۔ وہ دیر تک اس حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے اور پھر بالآخر متفقہ طور پر انہوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

قرطاجنہ کی کنواری کی ذہانت قابل داد تھی۔ اس نے تو پہلی رات خود آ کر بیرن بیری کی دراڑ کا پہرہ دیا تھا۔ اگلی صبح اس نے قرطاجنی سپہ سالار برتھاس سے کہہ کر بیرن بیری کی دراڑ پر باقاعدہ فوج بٹھا دی۔ جافیکس نے شارق سے سچ کہا تھا کہ انہیں سنبھلنے کے لیے کچھ موقع چاہیے اور جافیکس کی دانائی سے یہ موقع انہیں مل گیا تھا۔ صرف دراڑ ہی نہیں، اب تو قرطاجنی فوج ہر اس مقام پر پہرہ بٹھا چکی تھی جہاں پر کسی ایک بھی سپاہی کے اترنے کا اندیشہ تھا۔ اب جافیکس مطمئن تھی۔

اہل قرطاجنہ کو پتہ چل چکا تھا کہ رومی سپاہ شہر کے نزدیکی سمندروں میں ہی منڈلا رہی ہے۔ اس لیے لوگوں نے محاصرے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کا تعلق خشک راستوں کے کاروبار زندگی سے تھا، باہر کے دیہاتی اٹھ کر جوق در جوق شہر میں پناہ لے رہے تھے۔ لیکن پہلی کامیابی کی وجہ سے کوئی شہری خوفزدہ نہیں تھا۔

قرطاجنہ کی مجلس عامہ نے خصوصی سفارش پیش کی کہ اس جنگ کی فتح کی خاطر دیوتاؤں کے حضور بڑی قربانی کا اہتمام کیا جائے۔ مجلس عامہ کی یہ سفارش، مجلس خصوصی نے فوراً منظور کر لی۔ کیونکہ اس تقریب سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ایک تو شہریوں میں یکجہتی اور جوش و جذبے کا ماحول پیدا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر فوج کے لیے نذرانوں اور رسد ملنے کی توقع بھی تھی۔ بڑی قربانی کیا تھی ایک قرطاجنی تہوار جو اہالیان شہر کے لیے ایک خوشی کا تہوار تھا۔ چھوٹا بڑا ہر قرطاجنی اشمون دیوتا کے مندر میں بڑی قربان گاہ پر حتی المقدور قربانی دیتا۔ ایک دنبے سے لے کر ایک اونٹ تک ہر قسم کے جانور کو ذبح کیا جاتا اور ان کا گوشت اہلیان شہر میں بانٹ دیا جاتا۔ قربانی کا ہر جانور اشمون دیوتا کے مندر کے بیرونی کھلے میدان میں موجود بڑی قربان گاہ پر لا کر ذبح کیا جاتا۔ ذبح کرنے کا یہ کام جب ایک بار شروع ہوتا تو جتنے دن تک جانور آتے اور ذبح ہوتے رہتے، تہوار جاری رہتا۔ شروع دنوں میں تو بڑے جانور کی قربانی کیے جاتے تھے۔ خاص طور پر اونٹ اور گھوڑے کی قربانی دیکھنے کیلئے تو پورا شہر قربان گاہ کے سامنے جمع ہو جاتا۔ قربان گاہ ایک بہت بڑا چبوترہ تھی۔ جس پر بیس سے زیادہ جلاد ہاتھ میں تیز دھار تلواریں لیے کھڑے ہوتے۔ جونہی قربانی کے جانور کو قربانی کے چبوترے پر چڑھایا جاتا اور جانور چبوترے پر آ کر کھڑا ہوتا تو اس کی رسیاں اس سے الگ کر لی جاتیں۔ جانور اپنے سامنے ہزاروں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھتا تو بری طرح بوکھلا جاتا۔ چبوترے پر چاروں طرف بیس سے زیادہ جلاد ایک دائرے کی صورت ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے کھڑے ہو جاتے۔ بغیر رسیوں کے آزاد جانور کھلے چبوترے پر ادھر ادھر دوڑتا تا کہ کسی طرف سے نکل بھاگے۔ لیکن جلاد اسے باہر نہ نکلنے دیتے۔ وہ جس جلاد کے بھی نزدیک آتا...... وہ جلاد اس پر پوری قوت سے تلوار چلا دیتا۔ بعض اوقات تو پہلے ہی وار میں جسیم سے جسیم اونٹ کی گردن کٹ کر پرے جا گرتی۔ اور اس کا گردن کے بغیر دھڑ کچھ دیر تک کھلے چبوترے پر کسی سربریدہ لاش کی طرح دوڑتا رہتا۔ یہ منظر لوگ بہت شوق سے دیکھتے تھے اور

جاتا تھا کہ اشمون دیوتا کو ایسے جانور کی قربانی زیادہ پسند آتی تھی جس کی سر بریدہ لاش زیادہ دیر تک چبوترے پر دوڑتی رہتی۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، تیسرے کے بعد چوتھا...... جانور قربان ہوتے رہتے، شہر کے لوگ مجمع میں آتے رہتے اور جاتے رہتے۔ ہر کوئی اپنے ساتھ کوئی ایک نہ ایک جانور لاتا جو اشمون دیوتا کی نظر کر دیا جاتا۔ شاہراہوں اور گلیوں میں کھلونے اور مٹھائیں بیچنے والے عارضی دکانیں سجا لیتے۔ بچے اور بڑے سب نئے نئے کپڑے پہنتے اور نفیری بجانے والے قرطاجنہ کی گلیوں میں گھوم گھوم کر نفیری بجاتے۔

حکومت کی طرف سے بڑی قربانی کا اعلان ہونے کی دیر تھی کہ لوگ تیاریوں میں لگ گئے۔ قربانی کے دنوں میں باقی مندروں میں بھی خوب رونق رہتی۔ انہی دنوں میں ملکرت دیوتا کی بڑی پوجا کا اہتمام کیا جاتا جہاں کئی گھنٹے مسلسل مہاپجاری کے زیر قیادت عبادت کا سلسلہ جاری رہتا۔ بڑی قربانی کا مشورہ مجلس خصوصی نے مہاپرش کی منظوری سے فیصلے میں تبدیل کیا تھا۔ قرطاجنی حکومت کے جاسوسوں نے سپہ سالار برتھاس کو یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ رومی بیڑا اکئی کوس مزید پیچھے ہٹنے کے بعد مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خصوصی مجلس کے اجلاس ہر روز منعقد ہوتے تھے۔ خصوصی مجلس نے رومی بیڑے کی نئی حرکت کا بغور جائزہ لیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ رومی دور کسی مشرقی ساحل پر اپنی فوج اتاریں گے اور افریقہ کے مختلف شہروں میں یلغار کرتے ہوئے بالآخر قرطاجنہ پہنچیں گے۔ قرطاجنہ کی کنواری نے بھی ان کے اس خیال کی تردید نہ کی اور خاموش رہی۔ الغرض طے یہ پایا کہ برتھاس اپنی فوجوں کو مشرق کی طرف سے چوکس رکھے اور شہر کا دفاع مزید مضبوط کیا جائے۔

تین روز بعد قربانی کا تہوار شروع ہو گیا۔ ایک ہنگامہ تھا کہ پورے شہر قرطاجنہ کو ہلائے دے رہا تھا۔ سورج طلوع ہوتے ہی لوگ اشمون کے مندر کی طرف چل پڑے تھے۔ گلیاں اور بازار سجنے لگے تھے اور ہر طرف نفیری بجانے والے جھوم جھوم کر نفیریاں بجا رہے تھے۔ غیر ممالک سے آئے ہوئے لوگ جو جنگ کے حالات سے بے خبر تھے، بھی اس جشن میں شامل ہو گئے۔ قرطاجنہ کی حسینائیں زرق برق لباس پہنے اور مختلف زیورات سجائے، ناز نخرے سے ادھر سے ادھر چلتی دکھائی دیتی تھی۔ امیر بوڑھی عورتیں اپنے ہاتھوں میں چاندی کے سکے لیے اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑی تھیں۔ اور ہر آتے جاتے بچے کو ایک ایک سکہ دے کر خوش کر رہی تھیں۔ شہر کے سب سے بڑے چوک کو خوب سجایا گیا تھا۔ یہاں بڑی بڑی

دکانیں تھیں اور ہر دکاندار نے اپنی طرف سے کوئی پکوان پکا کر اپنی دکان کے سامنے سجا رکھا تا۔ یہ پکوان ہر کھانے والے کے لیے مفت تھا اور اس طرح انواع و اقسام کے کھانوں کی وجہ سے شہر کے بڑے چوک میں خوب رش شروع ہو گیا تھا۔ تماشا دکھانے والے مداری سڑک کے کنارے جگہ جگہ اپنے مجمعے لگائے کھڑے تھے۔ جن کی رنگ برنگی آوازیں اور چٹکلے دار گفتگو سن کر تماشائی خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ ان مداریوں میں سپیرے، بندر اور ریچھ نچانے والے اور مختلف قسم کی شعبدہ بازیاں دکھانے والے شامل تھے۔ سورج قدرے اٹھ آیا تو قربان گاہ کے چبوترے کے سامنے ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ چبوترے پر جلادوں سے پہلے پجاریوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی۔ جس کا سربراہ اشمون کے مندر کا پجاری تھا۔ سنتوش کے دوست عفرانس کا باپ...... ٹھاٹھیں مارتے ہجوم کو دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اشمون کے مندر کا پجاری کوئی خطبہ دینا چاہتا ہے تو مجمع یکا یک خاموش ہو گیا۔ اشمون کے پجاری نے سب سے پہلے کچھ منتر اور مناجاتیں پڑھیں اور پھر ایک مختصر خطبہ دینے لگا۔

”قرطاجنہ کے لوگو!...... ہم یہ قربانی دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہم اپنے دشمن پر فتح پائیں۔ اشمون دیوتا قربانی کو بہت پسند کرتا ہے۔ تم میں سے جو کوئی بھی اشمون دیوتا کے مندر میں قربانی کا جانور چڑھاوا دے گا، وہ اس جنگ میں نقصان سے بچا رہے گا۔ اس کے علاوہ جو کوئی قرطاجنہ کی بہادر سپاہ کے لیے رسد کا نذرانہ دے گا وہ دیوتاؤں کے نزدیک اونچا مرتبہ پالے گا۔ اور اسے اگلے جنم میں سورگ ملے گا۔“

اشمون کے پجاری نے مختصر خطبہ دیا اور اپنے پجاریوں کی جماعت کو لے کر واپس چلا گیا۔ تب مجمع کو جلادوں کی جماعت نظر آئی۔ یہ بیس سے زیادہ لوگ تھے۔ جو جسیم، تناور اور لحیم شحیم تھے، جنہوں نے محض لنگوٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ پاؤں سے ننگے تھے اور ان کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں تھیں۔ مجمع میں موجود ہر شخص ان خوفناک قاتلوں کو دیکھ کر دہل گیا۔ سارے جلاد بڑے چبوترے پر ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ایک دائرے کی صورت کھڑے ہو گئے۔ اسی اثنا میں مجمع نے نقارے کی آواز سنی۔ نقارے پر پہلی چوٹ پڑی تو اس کی آواز پورے قرطاجنہ میں سنائی دی۔ وہ بہت بڑا نقارہ تھا، جو چبوترے کے پہلو میں ایک اور چھوٹے سے چبوترے پر رکھا تھا۔ اس کو بجانے والے دو نقارچی تھے۔ نقارے کی مضراب اتنی بھاری تھی کہ ایک مضراب کو ایک نقارچی اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کسی ودان یا

ہتھوڑے کی طرح اپنے سر سے بلند کرتا اور نقارے کے خشک چمڑے پر زوردار چوٹ لگاتا۔ ایک نقارچی چوٹ لگا کر مضراب واپس اٹھا رہا ہوتا تو دوسرے نقارچی کی چوٹ مضراب پر پڑتی۔ اور یوں اس نقارے کی آواز میں ایک لے اور ردھم پیدا ہو جاتا۔ ساتھ ہی باجوں اور نفیریوں کی آواز بلند ہوئی اور پھر ایک صحتمند پلا ہوا نوجوان مست افریقی اونٹ یکا یک چبوترے پر نمودار ہوا۔ چبوترے پر چھوڑنے سے پہلے اونٹ کی نکیل نکال دی گئی تھی۔ وہ جونہی چبوترے پر پہنچا، اپنی لمبی گردن اٹھا کر اپنے سامنے موجود عظیم مجمع کو دیکھنے لگا۔ اونٹ کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس مجمع سے خطاب کرے تو کیا کہے۔ معاً وہ زور سے بلبلایا۔ یہ اس کے نوجوان اور مست ہونے کا ثبوت تھا۔ وہ چبوترے پر نہ بدکا نہ ڈرا، بلکہ ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ قربان گاہ کا چبوترا خاصا بڑا تھا۔ اونٹ کی مستیاں دیکھ کر مجمع کا ذوق تجسس اور بڑھ گیا۔ بادامی رنگ کا یہ صاف ستھرا اونٹ جو شاید افریقہ کا سب سے بہترین اونٹ تھا، جوں جوں ناز و ادا پر فریفتہ ہو کر شور مچانے لگتا، نعرے، غوغا اور ہاؤ ہو...... اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ قربانی کا پہلا اونٹ تھا۔ اس لیے مجمع میں موجود لوگ حد سے زیادہ تجسس کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

اور ملکرت کے مندر میں بڑی پوجا کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ بڑی پوجا کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ جنگی مصروفیات کی وجہ سے اہل حرب کو دن میں ہی بلا لیا گیا اور عامتہ الناس کے لیے شام کا وقت چنا گیا۔ بری اور بحری فوج کے تمام سالار، تمام امرائے سلطنت، وزراء، عمائدین اور مذہبی پیشوا، بڑی پوجا کے لیے ملکرت کے مندر کے ہال میں موجود تھے۔ ملکرت کا مندر سب سے بڑا تھا۔ اور اسی لیے بڑا ہال کمرہ بھی سب سے بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ یہاں پانچ ہزار افراد ایک ساتھ کھڑے ہو سکتے تھے۔ ملکرت کے مندر کے بڑے ہال میں ہمیشہ کھڑے ہو کر پوجا کی جاتی تھی۔ سب پجاری پہلی قطاروں میں اپنے مخصوص لباس پہنے کھڑے ہوتے اور ان کے سامنے پوجا میں شامل ہونے والے لوگ جو ایک مخصوص لباس پہن کر آتے، صف در صف کھڑے ہوتے۔ مرد و زن کی کوئی تمیز نہ ہوتی۔ پوجا کے بھجن سے پہلے ہال میں خوب کھسر پھسر رہتی۔ لیکن جونہی مہا پجاری کی آواز بلند ہوتی یکا یک سناٹا چھا جاتا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اچانک مہا پجاری کی آواز گونجی تو سناٹا چھا گیا۔

"قرطاجنہ!...... تم ایک بار پھر اپنے بیٹوں کو پکار رہی ہو۔ ہم تمہیں ناراض نہیں

کریں گے۔تم ہماری دیوی ہو۔"

یہ وہ جملہ تھا جو مہاپجاری نے خصوصاً آج کے دن کے لیے بولا تھا۔ مہاپجاری کے لہجے کا اثر تھا یا جملے کی بناوٹ کہ ہال میں موجود ہر شخص کے اعصاب تن گئے۔ مہاپجاری نے پھر کہا۔

"ملکرت!......تم ہمارے باپ ہو، ہمارے رکھشک، ہماری ماتا کے محافظ، تم ہی ہمیں بچا سکتے ہو۔ آج ہم تمہارے سامنے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں ایک بار پھر بچالو۔ جیسے کہ ہمارے پرکھوں کو تم نے بچایا۔"

یہ جملے بھی مخصوص تھے۔ اس مختصر فریاد کے بعد مہاپجاری نے یکا یک کوئی بھجن شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک تسلسل، تواتر......توازن اور ردھم تھا جو ملکرت کے ہال میں اک نہایت حسین بازگشت پیدا کرنے لگا۔ وہ قدیم فینیقی زبان کے کچھ الفاظ بول رہے تھے، تمام کے تمام پجاری مل کر۔ بھجن کی استھائی ختم ہوئی تو پجاریوں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ اور پریوں جیسے لباسوں میں ملبوس ملکرت کی نرتکیوں نے انترے کا بول اٹھایا۔ اک شیرینی تھی کہ ملکرت کی فضا میں حلول کر گئی تھی۔ جیسے بہت سی کوئلیں ایک ساتھ گانے لگی ہوں۔ نہ کوئی ساز نہ سازندے......لیکن پجاریوں کے بھاری حلقوم سے نکلتی ہوئی مدھم آواز گویا اونچے سروں کے پیچھے گرام کا پس منظر۔

شارق تو مست ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا قرطاجنہ واقعی محبت کرنے والوں کی سرزمین ہے۔ یہی حال کلاڈینا کا تھا۔ وہ عوام کی قطار میں کھڑی تھی۔ جبکہ شارق سپہ سالاروں کی۔ شارق کے دائیں شانے کے ساتھ شانہ ملائے بری افواج کا سپہ سالار برتھاس کھڑا تھا۔ اس سے پچھلی صف امرائے شہر کی۔ کلاڈینا اسی صف میں موجود تھی اور یہ اتفاق تھا یا حسن اتفاق کہ وہ برتھاس اور شارق کے عین پیچھے کھڑی تھی۔ اسے جس وقت پتا چلا کہ اس کے آگے برتھاس اور شارق موجود ہیں، وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ خاص طور پر برتھاس کو دیکھ کر اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ وہ برتھاس کی قید سے فرار ہوئی تھی۔ اس نے برتھاس کو عین اس وقت چکما دیا تھا جب وہ ارمنیدس کے لشکر پر حملہ کر رہا تھا۔ برتھاس واپس آیا تو اسے بڑی چوٹ پڑی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک اسے قرار نہ آسکا تھا۔ ایک پل کا قرار بھی۔ اور کلاڈینا کی حالت تو اور طریقے سے خراب تھی۔ اب برتھاس سے اسے حقیقت میں تو کوئی خطرہ نہیں تھا اور

نہ ہی کوئی ڈر۔ اب تو وہ قرطاجنہ شہر میں ایک رئیس اور با اثر امیر کی بہن تھی۔ لیکن پھر بھی لاشعوری طور پر اتنی ڈر گئی جیسے برتھاس ابھی پیچھے مڑ کر دیکھے گا اور تلوار کا وار کر کے اس کو دو ٹکڑوں میں تبدیل کر دے گا۔ حالانکہ برتھاس تو کسی پروانے کی طرح کلاڈینا کے فرار کے دن سے لے کر آج تک مارا مارا پھر رہا تھا۔

کلاڈینا کو سب پوجا پاٹ بھول گیا۔ نہ ہی اسے بھجن کا لطف آیا اور نہ ہی آواز کی یکتائی کا کچھ مزا۔ وہ تو بے چین تھی، بے کل تھی، وہاں سے چلے جانا بھی چاہتی تھی اور وہاں رکے رہنا بھی چاہتی تھی۔ دانیال کو اس کا یہ برتاؤ پسند نہیں آتا تھا۔ اور اس لیے وہ اب یوں اچانک یہاں سے نکل کر نہ جانا چاہتی تھی۔ وہ کھڑی رہی، لرزتی، کپکپاتی، تھرتھراتی۔ بھجن چلتا رہا اور پوجا ہوتی رہی۔ اور پھر بجن دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ اب بارہ پروہت مل کر اشلوک پڑھ رہے تھے۔ ملکرت دیوتا کا بڑا بت مشرق دیوار میں اس طرح کھڑا تھا کہ مغربی دیوار کو تک رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا مجمع تھا اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ان کی جانب یوں دیکھ رہا تھا گویا ان کی پرارتھنا کو غور سے سن رہا ہو۔ دانیال اس پوجا کو نہیں مانتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس میں شامل تھا۔ کیونکہ امرائے شہر کے ساتھ اسے بھی دعوت دی گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس تقریب میں پوجا سے زیادہ یکجہتی کا اظہار ہے۔ اس لیے اس نے ملکرت کی پوجا میں شامل ہونے سے انکار نہ کیا۔ ویسے تو کلاڈینا بھی اب بت پرست نہیں رہی تھی۔ وہ بھی دانیال کی وجہ سے ہی شامل ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد دانیال اور کلاڈینا کے لیے مہا پجاری کا وہ پرزور اصرار جو اس نے دعوت دیتے ہوئے کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں ملکرت کی پوجا میں شامل ہوئے۔ لیکن کلاڈینا کو ایک بار بھی یہ سوچ نہ آئی کہ وہاں سپہ سالار برتھاس بھی ہو سکتا تھا۔ پوجا اپنے تسلسل میں جاری تھی۔

بارہ پروہتوں کے اشلوک ختم ہوئے تو مہا پجاری نے اعلان کیا۔

"اور اب جنگ کی آگیا کے لیے ہمیں درشن دے گی، ہماری ماں...... ہماری ماتا۔"

سب کو معلوم تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ ملکرت کے بت کے چبوترے پر یکا یک ہم لباس نوجوان نمودار ہوئے۔ ان کی تعداد بیس تھی۔ عظیم بت کے قدموں میں...... اونچے چبوترے پر ان میں سے آدھے دائیں طرف اور آدھے بائیں طرف ایک قطار کی

صورت کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں کا رخ مجمعے کی طرف تھا اور ان کے لباس نہایت اجلے اور نفیس تھے۔ ان کے لباس میں پھرتی اور چابکدستی کا تاثر چھلکتا تھا۔ یہ قرطاجنہ کی کنواری کے خاص الخاص سرفروش تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے بیچ قرطاجنہ کی ماتا بلکہ...... کنواری ماتا شہزادی جافیکس نمودار ہوئی۔ دانیال کے لیے یہ لمحات پرارتھنا میں موجود تمام پجاریوں کی نسبت زیادہ مقدس ہو گئے۔ وہ پوجا میں شامل ہونے والے ہر شخص سے زیادہ سچے دل کے ساتھ پوجا کے لیے تیار ہو گیا۔ وہی ایک تھا جو پوجا کے لیے یہاں نہیں آیا تھا...... وہی ایک سب سے بڑا پجاری نکلا۔ اس نے دل کی آنکھوں سے دیوی کے حضور سجدہ کیا اور ہمہ تن گوش ہو کر دیوی ماتا کے درشن کرنے لگا۔ اپسراؤں کے لباس میں ملبوس جافیکس کی آواز گونجی!

''ایشور نے سب دیوتاؤں کو ہمارے لیے پیدا کیا ہے۔ سب کے سب دیوتا ہمارے لیے مختلف کام کرتے ہیں۔ جیسے کے اشمون ہمارے لیے جنگ لڑتا ہے اور ملکرت ہمیں نقصان سے بچاتا ہے۔ ایشور کو ہم سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ اس لیے وہ جب بھی کوئی مادی روپ دھارن کرتا ہے تو ہم انسانوں کا روپ اپناتا ہے۔

اے دیوتاؤں کے ماننے والو!...... اپنے دلوں کو سیدھا کر لو، اپنا رخ مشرق کی طرف رکھو، جہاں سے ہمارے پرکھوں کی روحیں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، ہر روز سلامتی، محبت، زندگی اور حرکت کا پیغام لے کر۔ اسی مشرق کی جانب اپنا منہ پھیر لو۔ تم مغرب کی طرف جھکو گے تو کچھ حاصل نہ کر پاؤ گے، کیونکہ وہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ قرطاجنہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی اس کی ایک اینٹ بھی نہیں توڑ پائے گا۔ اگر فرزندان قرطاجنہ اپنے دلوں میں رومیوں سے نفرت کی بجائے ان قاتل حملہ آوروں سے نفرت کا احساس پیدا کر لیں جو کسی کی سرزمین پر محض نقصان پہنچانے کے لیے چڑھ دوڑے ہوں۔

قرطاجنہ کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا اگر...... اہل قرطاجنہ خود کو اپنی جسمانی خواہشات سے بالاتر کر لیں، اپنے مال، اولاد، جائیداد اور عورتوں کو سلامتی پر قربان نہ کر دے۔ لیکن اگر اس سرزمین کے رہنے والوں نے خود کو آزاد نہ کیا، ان زنجیروں سے جن کے ساتھ ان کے ہاتھ پیر اور گردنیں بندھی ہیں، تو اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے۔ ایک معذور قیدی کبھی ازخود چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اگر اس دھرتی کے بیٹوں نے اپنی زنجیریں نہ توڑیں تو انکا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ وہ ایک معذور قیدی کی موت مر جائیں گے۔

ملکرت کی خیر ہو، اشمون کی خیر ہو!!...... تائیت کی خیر ہو!...... ایشور کے سب بیٹوں کی خیر ہو، ہر قوت ایشور کی قوت ہے، ہر دیوتا ایشور کا بیٹا ہے، لیکن ایشور خود کہاں رہتا ہے؟

اے انسانو!...... جان لو کہ ایشور تمہارے دلوں میں رہتا ہے۔ وہ تمہیں بدن کی آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا۔ تم اپنے بدن کی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں صرف اس کے بیٹے دکھائی دیں گے۔ تمہیں ایشور سے ملنا ہے، اسے دیکھنا ہے، تو اپنے من میں جھانکو۔ جہاں ایشور کا گھر ہے۔ وہ تمہیں محبت میں ملے گا، تم محبت کرو ایک دوسرے سے، جوں جوں تم ایک ہوتے جاؤ گے، ایشور کا زیادہ واضح روپ تمہارے سامنے آتا جائے گا اور جب تم سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہو جاؤ گے، تو گویا ایشور کا ظہور ہو جائے گا۔ ایشور محبت ہے...... ایشور محبت ہے۔"

سامعین گم صم کھڑے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ قرطاجنہ کی کنواری کا بھاشن سن رہے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ کھڑا یوں محسوس کرنے لگے تھا جیسے خود ایشور کا روپ ہو۔ جافیکس کے لہجے میں اتنی صداقت تھی کہ پوجا کے تمام شرکاء اسے سچ مچ کی دیوی ماننے لگے۔

قرطاجنہ کی کنواری کا بھاشن ختم ہوا تو مجمعے میں موجود ہر شخص ایک عجب یکسانیت کے ساتھ کنواری کے سامنے رکوع کے بل جھکا۔ کنواری نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر گویا سب کی پوجا کو سویکار کیا۔ اور پھر وہ جس طرف سے آئی تھی، اسی طرف کو مڑ گئی۔ اب پھر مہا پجاری بول رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"پوجا کی تقریب کے اختتام پر مشترکہ مناجات پڑھی جائیں گی اور اس کے بعد ہم سب اشمون کے مندر میں قربانی دیکھنے جائیں گے۔"

مہا پجاری کے اعلان کے بعد ہی اختتامیہ مناجات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بھنبھناہٹ تھی جو پورے ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ ہر کسی کی زبان پر کوئی ورد جاری تھا۔ یہ مشترکہ مناجات پڑھی جا رہی تھیں۔ مہا پجاری نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ سینے پر پھیرے، یہ گویا مناجات کے اختتام کا اعلان تھا۔ اور لوگ دھیرے دھیرے مندر کے دروازے سے باہر جانے لگے۔ ہجوم ایک جلوس کی صورت معبد کے ہال کمرے سے نکل گیا اور خراماں خراماں اشمون دیوتا کے مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن کچھ لوگ تھے جو ابھی معبد میں ہی رک گئے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ جونہی تقریب کا سلسلہ ختم ہوا اور برتھاس نے واپس پلٹنا چاہا تو چہرہ گھماتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر کلاڈینا پر پڑی۔ اسے یقین نہ آیا کہ جو دعا ابھی ایک لمحہ قبل اس نے مانگی تھی، وہ اتنی جلدی قبول ہوجائے گی؟ وہ کلاڈینا کی موجودگی کو اپنا واہمہ سمجھا اور اپنی ذہنی حالت کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کلاڈینا کی آنکھوں میں پیوست تھیں اور کلاڈینا کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں۔ لوگ دھیرے دھیرے معبد کو خالی کرنے لگے، لیکن جو کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے...... وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہوا تھا کہ شارق بھی عین اسی لمحے گھوما تھا۔ اس وقت شارق اور برتھاس ایک ساتھ کلاڈینا کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک بری فوج کا سپہ سالار تھا تو دوسرا بحری فوج کا۔ گویا قرطاجنہ کی پوری دفاعی اور عسکری قوت ایک ساتھ کلاڈینا کے حضور حاضر تھی۔ برتھاس کو تو اپنی آنکھوں پر اس وقت یقین آیا جب پورا ہال خالی ہو چکا تھا، تب بھی کلاڈینا ابھی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے یقین ہوگیا...... وہ اچانک سپنے سے بیدار ہوگیا۔ تب اس نے اپنے دائیں بائیں سر گھمایا، پہلے شارق کو غور سے دیکھا، پھر دانیال کو اور پھر قدرے فاصلے پر کھڑے مہا پجاری کو۔ کلاڈینا کے لیے یہ بڑی پریشان کن صورتحال تھی۔ اس کے سامنے اس کے دو چاہنے والے کھڑے تھے۔ برتھاس کو تو شارق اور کلاڈینا کے آپس میں شناسا ہونے کا پتہ نہ چلا۔ لیکن شارق کو اچھی طرح پتہ چل گیا کہ کلاڈینا اور برتھاس آپس میں شناسا ہیں۔ تب اسے ایک بات سوچ کر اپنے آپ پر بے پناہ غصہ آیا کہ اسے پہلے ایسا خیال کیوں نہیں آیا؟ کلاڈینا کی کہانی تو اس نے بھی سن رکھی تھی۔ شارق اپنی اس کیفیت پر دل ہی دل میں سر پیٹ کر رہ گیا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس دن کلاڈینا کمرے سے اٹھ کر کیوں چلی گئی تھی۔ اسے اپنی کند ذہنی پر افسوس ہوا۔ یہ سب کیفیتیں تو شارق کی اس حالت کے سامنے معمولی تھیں جو اصل میں واقع ہو رہی تھیں۔

دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی ورنہ مہا پجاری نے سن لیا ہوتا۔ لیکن وہاں ایک شخص ایسا بھی کھڑا تھا جو دل کی ساری آوازوں سے واقف تھا اور وہ تھا دانیال۔ دانیال نے فوراً محسوس کرلیا کہ شارق...... اعصابی طور پر بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ وہ شارق کی جذباتی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ کلاڈینا نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکا، دونوں کی آنکھوں میں التجا بھی تھی اور شکوہ بھی۔ ماحول یکا یک تناؤ سے پر ہوگیا۔ کلاڈینا کو یوں لگا جیسے آج ہی فیصلے کا وقت

تھا۔ ایک طرف وہ انسان تھا جس نے سب سے پہلے اس کے ساتھ بدن کا رشتہ قائم کیا تھا او دوسری طرف وہ تھا جس نے اپنا سب کچھ کلاڈینا کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کسی کنواری لڑکی کے لیے بدن کے رشتے میں بندھنے والا پہلا مرد کس قدر اہم ہوتا ہے، یہ اس وقت صرف کلاڈینا کو ہی معلوم تھا۔ اس پر مستزاد برتھاس کی وہ سنجیدہ محبت تھی جو اس نے اپنی ہی ایک قیدی کے لیے اپنے دل میں محسوس کی تھی۔ کلاڈینا کی نظر برتھاس کے چہرے پر پڑی تو اس کو اپنی دوشیزگی ٹوٹنے کی پہلی رات یاد آ جاتی۔ اس کا ایمان ڈولنے لگتا اور شارق پر اس کی نظر پڑتی تو اسے محبت کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی محسوس ہوتی۔ دانیال نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس نے دل میں کہا کہ یہی وقت ہے جب کلاڈینا خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ دانیال تو دونوں کو جانتا تھا۔ لیکن اس کی ذاتی ہمدردیاں شارق کے ساتھ تھیں۔ معاً کلاڈینا چونک گئی اسے کسی نے پکارا تھا۔

”کلاڈینا!......تم کہاں چلی گئی تھیں۔“

کلاڈینا کو یوں لگا جیسے اس کے سر کا تاج، اس کا بادشاہ، اس کا مالک...... یک لخت اس پر مہربان ہو گیا ہو۔ یہ برتھاس کا لہجہ تھا؟ وہی برتھاس جس کی آواز اطالیہ کے شمالی پہاڑوں پر گونجتی تو ہر سننے والے کا دل دہل جاتا۔ وہی آواز آج اتنی نرم کیسے ہو گئی تھی۔ برتھاس نے پھر پوچھا۔

”کلاڈینا!......تم کہاں چلی گئی تھی؟“

کلاڈینا پگھلتی جا رہی تھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک ریشہ اسے پانی کی طرح بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجب مخمصہ تھا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن...... نیم دروں نیم بروں کی اس کیفیت میں اچانک اس کے دماغ میں روشنی کا ایک دھماکہ ہوا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیئے۔ بھڑکتی ہوئی آگ۔ وہ اپنے گھر کو جلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے بہن بھائی، ماں باپ، چچا، پھپھو سب مار دیئے گئے تھے۔ اس کا گھر جل رہا تھا۔ شعلے بھڑکتے رہے لیکن منظر بدل گیا۔ اب وہ دوسری قسم کے شعلے دیکھ رہی تھی۔ جن میں ایک زندہ غلام دھڑا دھڑا جل رہا تھا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا، شور کرتا ہوا، منتیں کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس کی جلی ہوئی لاش کوئلے کی طرح۔

یکا یک کلاڈینا کو شدید چکر آ گیا۔ وہ کھڑی کھڑی اپنے پیروں پر لہرائی اور کسی

جھولے کی طرح جھولتی ہوئی زمین پر آنے لگی۔ برتھاس اور شارق دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ عجلت اور اضطراب کے عالم میں دونوں کے کندھے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اسی اثنا میں دانیال نے آگے بڑھ کر کلاڈینا کو سہارا دے دیا۔ کلاڈینا بے ہوش ہو چکی تھی، بے ہوشی کے عالم میں دانیال نے اس کے خوبصورت چہرے کو تکا، وہ پیلا پڑ گیا تھا۔ شارق اور...... برتھاس بے تابی سے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دانیال کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔

''شکریہ!...... آپ لوگ اشمون دیوتا کے مندر جائیں۔ میں کلاڈینا کو گھر لے جاتا ہوں۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

دراصل کلاڈینا کے ذہن میں مرد ذات سے خوف، نفرت اور محبت کے ملے جلے جذبات کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے مہینوں کے ساتھ میں بھی وہ شارق پر کبھی مہربان نہ ہو سکی۔ وہ جب بھی شارق کے بارے میں غور کرتی اسے مارفیس کے جزیرے پر شارق کا زندہ جلتا ہوا غلام یاد آ جاتا تھا، جسے محض کھیل تماشے کے لیے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ دانیال اسے گھر لے آیا۔ شیتل اور سنتوش بھی ساتھ آئے۔ ہوش میں تو وہ جلد ہی آ گئی تھی۔ اپنے پیروں پر چل کر گھر آئی تھی۔ لیکن وہ بہت نحیف اور لاغر ہو چکی تھی۔ شیتل نے اسے آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ اور خود کھانے پکانے کے ضروری کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

شارق اور برتھاس دونوں کی کیفیت مختلف تھی۔ حالانکہ اس کا سبب ایک ہی تھا۔ برتھاس اب زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اور شارق مر جانا چاہتا تھا۔ ایک دوسرے کے بالکل الٹ۔ ایشور کی کیفیتوں کا جہان، کائنات سے یکسر مختلف تھا۔ دونوں سپہ سالار اپنی کیفیتوں کو لئے واپس اپنے محاذوں کو چلے گئے۔ برتھاس نے محاذ پر جانے سے پہلے صرف اتنا کیا کہ کلاڈینا کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اس کے سلسلے میں مہا پجاری کاہوبال سے ملاقات کی۔ سنتوش کا باپ شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ شارق اور کلاڈینا ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ وہ برتھاس کو بتانا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے اس نے کیوں نہ بتایا۔ شاید وہ قرطاجنہ کی سلامتی کے لیے شہر کے سب سے بڑے سپہ سالار کو عین جنگ سے پہلے دکھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ برتھاس نے اس کی خاموشی کو خوش گمانی کی نظر سے دیکھا، پہلے سے قدرے زیادہ جرأت کرتے ہوئے یہ کہا۔

''میں کلاڈینا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں دانیال کو ایک لاکھ

ٹیلنٹ چاندی دینے کو تیار ہوں۔"

مہا پجاری کو برتھاس کی یہ بات بری لگی۔ چنانچہ کاہوبال نے کہا۔

"دیکھو برتھاس!!...... یہ فیصلہ تو کلاڈینا خود کرے گی۔ ہم تو نہیں کر سکتے۔ تم مطمئن ہو کر جنگ پر جاؤ اور وجیتا بن کر لوٹو۔ تو تب اس موضوع پر بات کریں گے۔"

برتھاس کو لگا جیسے مہا پجاری نے کلاڈینا کی یہی شرط رکھی تھی کہ برتھاس پر فتح پا کر دکھائے اس کے سینے میں عزم کی اک لہر اٹھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آ کر ایک روشن دھماکے سے پھٹی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھا کر اور سینہ تان کر مہا پجاری سے کہا۔

"وجیتا میں ہی ہوں۔ میں رومی لشکر کی تعداد کو ایک ہی دن میں دگنا کر دوں گا۔"

مہا پجاری خوب سمجھتا تھا کہ دگنا کرنے سے کیا مراد تھی۔ یہ عام قرطاجنی محاورہ تھا۔ گویا اس نے کہا تھا کہ وہ رومی لشکر کے ہر سپاہی کو دو حصوں میں کاٹ کر لشکر کی تعداد کو دگنا کر دے گا۔ برتھاس نے اتنا کہا اور واپس چل دیا۔ اسی رات اپنے بیڑے پر روانگی سے پہلے شارق بھی مہا پجاری سے ملنے آیا تھا۔ اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں اور دل کا درد چہرے پر پلٹ آیا تھا۔ مہا پجاری نے اسے سینے سے لگایا اور کھلے الفاظ میں تسلی دی۔

"تم فکر مت کرو شارق! میں نے کلاڈینا کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔"

شارق کے چہرے پر یکدم تبدیلی آئی۔ اس کی مایوسی امید میں بدلنے لگی۔ مہا پجاری نے اس کی کیفیت بدلتے دیکھی تو مزید کہا۔

"دیکھو شارق!!...... تم جنگ پر جا رہے ہو، اگر تم ناامید اور مایوس دل کے ساتھ گئے تو تمہیں ناکامی ہوگی اور محاذ پر ناکامی زندگی کے محاذ پر بھی تمہیں ہرا دے گی۔ تم اگر کلاڈینا کو جیتنا چاہتے ہو تو جان توڑ کر لڑو۔ محاذ پر تمہاری فتح زندگی میں بھی فتح کا باعث ہوگی۔"

مہا پجاری کاہوبال نے دونوں پروانوں کو ایک ہی چنوتی دے دی تھی اور وہ چنوتی تھی قرطاجنہ کا بچاؤ۔ شارق کو بہت حوصلہ ملا۔ اس کی امید پھر سے جوان ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے جانے سے پہلے مہا پجاری کو دیکھا اور پھر ان سے کہا۔

"آپ میرے لیے پرارتھنا کیجئے گا کہ میری زندگی کسی مقصد پر قربان ہو جائے۔"

شارق بھی روانہ ہو گیا۔ مہا پجاری پیچھے سے اسے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

قرطاجنہ کا جشن یا جانوروں کی قربانی کا میلہ تین دن تک جاری رہا۔ مندر آباد رہے۔ گلیاں کوچے اور بازار سب جگہ خوب رونق رہی۔ یہ تہوار ابھی کچھ دن اور بھی چلنے والا تھا۔ یکا یک ایک خبر نے اہلیان شہر کے ہوش اڑا دیئے۔

رومی فوج نے مشرق کی طرف سے اچانک نمودار ہوکر بیرن بیری کی دراڑ پر حملہ کردیا تھا۔ اگر کنواری کے سرفروش اپنی جانوں کا نذرانہ نہ دیتے تو ضرور دراڑ فتح کرلی جاتی۔ بیرن بیری کی دراڑ پر برتھاس کی فوج کے بھاری دستے بھی موجود تھے۔ لیکن ان تک کوئی رومی سپاہی نہ پہنچ سکا تھا۔ دراڑ کے عین اوپر ابھی تک کنواری کے سرفروشوں کا قبضہ تھا۔

رومی فوج کو ناکامی ہوئی۔ اوریس کے جتنے سپاہی تیر کر دراڑ تک پہنچے تھے، ان میں سے اکثر مارے گئے۔ شیراٹن دوسری ناکامی کا سامنا کر رہا تھا۔ یہ رومی فوج کے لیے ایک بڑی بدشگونی کی بات تھی۔ وہ فوج جو ابھی صرف جہازوں میں لدی ہوئی تھی اور ابھی خشک زمین پر پاؤں بھی نہ رکھ پائی تھی۔ اس طرح کی قبل از وقت شکستوں سے وہ دلبرداشتہ ہونے لگی۔ اوریس کے سالاروں نے اپنے سپہ سالار کے ساتھ جھگڑا کھڑا کردیا۔

''ہم اس طرح بغیر لڑے نہیں مر سکتے۔''

اوریس بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے شیراٹن کو اپنا فیصلہ سنایا۔

''ہم کسی بھی قریبی ملک کی سرحد پر اتر رہے ہیں۔ پھر ہمیں چاہے سات ملکوں میں سے لشکر گزارنا پڑے، ہم یلغار کرتے ہوئے آئیں گے۔ شیراٹن تم جہازوں کو مشرق کی طرف دوڑانے کا حکم دو۔ تم ہمیں قریبی ملک کے ساحل پر اتار دو۔ بس پھر اس کے بعد تمہارا کام ختم۔ اس کے بعد تم سب سے پہلے منصوبے کے تحت عمل کرو گے۔ یعنی دیوتاؤں کی دیوار پر قبضہ کرنا۔''

اوریس نے کچھ ایسے لہجے میں بات کی جیسے وہ اپنے کسی ماتحت کو حکم دے رہا ہو، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ سمندر میں شیراٹن کا حکم حتمی اور خشکی پر اوریس کا فیصلہ آخری تھا۔ لیکن شیراٹن غصے میں نہ آیا۔ وہ ایک سمجھدار انسان تھا اور حالات پر اس کی بخوبی نظر تھی۔ اوریس کہہ بھی تو ٹھیک رہا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ شیراٹن نے اوریس کی بات پر سر ہلایا اور سوچتی ہوئی نگاہوں سے وہ مشرقی سمندر میں تکنے لگا۔

اب ان کے جہاز ایک بار پھر مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ اہل قرطاجنہ کو اس

بات پر حیرت ہوئی کہ آخر رومی پھر کیوں مشرق کی طرف چل دیئے۔ برتھاس نے مجلس خصوصی میں پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ رومی نزدیکی ملک کے ساحل پر اتریں گے اور یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر کئی ملک آباد تھے۔ جن میں مصر، لیبیا، قرطاجنہ اور مراکش مشہور تھے۔ لیکن چھوٹے ممالک بھی اپنی اپنی سطح پر کم زور آور نہ تھے۔ برتھاس نے اپنے تجربے اور علم کی روشنی میں مجلس خصوصی کو ٹھیک اندازے لگا کر بتایا کہ اوریس کا لشکر کن کن راستوں پر یلغار کرتا ہوا آگے بڑھے گا اور پھر اپنی بات کے اختتام پر اس نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں رومی لشکر کو قرطاجنہ پہنچنے سے پہلے ہی تہ تیغ کر دوں۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ ہمارا لشکر بھی یلغار کرتا ہوا مشرق کی طرف بڑھے۔"

برتھاس کی بات سن کر بعض ارکان تو جوش میں آگئے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ لیکن بعض ارکان مخالفت کرنے لگے۔

یہ مجلس خصوصی تھی۔ پہلے روز ہی یہ طے پایا تھا کہ مجلس خصوصی کا ہر اجلاس مہاپرش طالوسا کی زیر سربراہی ہو۔ اگرچہ مہاپرش ہر اجلاس میں شریک تو نہ ہوتا رہا تھا، لیکن کبھی کبھار ضرور ہوتا تھا۔ آج بھی مہاپرش مجلس خصوصی کے اجلاس میں موجود تھا۔ بحث زور پکڑنے لگی تو مہاپرش طالوسا کے ایک اشارے پر سب کے سب یک لخت خاموش ہوگئے۔ مہاپرش طالوسا نے برتھاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کسی کی زمین چھیننے کا شوق نہیں۔ قرطاجنہ کے لشکر کو پڑوسی ملکوں پر یلغار کرنے کا کوئی حق نہیں۔ خاص طور پر وہ ممالک جن کے ساتھ ہماری دوستی ہے۔ اگر تمہارا لشکر رومیوں کو روکنے کے لیے مشرق کی طرف بڑھے گا تو اس کے راستے میں بھی آبادیاں آئیں گی اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی لشکر کسی آبادی میں سے یلغار کیے بغیر گزر جائے۔ اگر تم دشمن کے ساتھ باہر نکل کر لڑنا چاہتے ہو تو بے شک جاؤ۔ لیکن سلطنت قرطاجنہ کی حدود سے باہر جانے کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔"

مہاپرش کی تادیب تو گویا آخری حکم ہوتی تھی۔ برتھاس نے فوراً سعادت مندی سے سر جھکا لیا۔

شیراٹن نے سچ مچ لیبیا کے ایک ویران ساحل پر اوریس کے لشکر کو اپنے جہازوں

سے اتار دیا۔ ایک لاکھ بیس ہزار فوج پر مشتمل یہ عظیم لشکر پڑاؤ ڈالتے ہی گویا اپنے آپ کو محفوظ تصور کرنے لگا۔ ورنہ اب سے پہلے تو ہر سپاہی کو یوں لگتا تھا جیسے وہ اب زندگی بھر خشکی پر قدم نہیں رکھ پائے گا۔ لشکر کے ساتھ مکمل ساز و سامان تھا۔ جن میں سب سے زیادہ تعداد گھوڑوں کی تھی جو ساٹھ ہزار کی پیدل فوج کو چھوڑ کر باقی ہر شہسوار کو مہیا کیے گئے تھے۔ گھوڑوں کے علاوہ لدو جانور، خوراک کے جانور اور باقی اجناس بھی بہت بڑی مقدار میں لشکر کے پاس موجود تھیں۔ اوریس کے لشکر نے پہلا پڑاؤ ساحل پر ہی کیا۔ شیراٹن بھی دو دن ساحل پر رکا رہا اور پھر جب زمینی لشکر نے اچھی طرح اپنے قدم جما لیے تو شیراٹن کے بے شمار جہاز واپس پلٹے۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ اب وہ قرطاجنی دفاعی بیڑے کو چٹکیوں میں مسل سکتا تھا۔ کیونکہ شیراٹن کے عظیم بیڑے کے مقابلے میں شارق کا دفاعی بیڑا بہت مختصر تھا۔ اب شیراٹن بے خوف و خطر قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رومی فوج کے پڑاؤ ڈالنے کی خبر حسب معمول سب سے پہلے شہزادی جافیکس کو ملی۔ قرطاجنہ کی کنواری کو تازہ حالات کے مطابق نئے فیصلے کرنا تھے۔ اسے پتہ چلا کہ اوریس کا لشکر لیبیا کے ایک ویران ساحل پر اتر چکا ہے اور شیراٹن کا طاقتور بحری بیڑا طوفانی رفتار سے قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جافیکس نے وقت کا اندازہ لگایا تو چونک گئی۔ شیراٹن کا بیڑا بہت جلد قرطاجنہ پہنچنے والا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ جافیکس نے فوراً گہرتاب کو بلوایا۔ گہرتاب، سرفروشوں کا سالار کوہ قاف کے کسی جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ جافیکس نے کہا۔

"میں دانیال کو فوری طور پر شارق کے پاس بھیجنا چاہتی ہوں۔ ہمارے جہاز شیراٹن کو دیوتاؤں کی دیوار تک پہنچنے سے نہیں روک سکتے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم شارق کی مدد حاصل کریں۔"

"لیکن وہ کیسے جافیکس؟ شارق قرطاجنہ کی کیسے مدد کر سکتا ہے؟"

"وہ کر سکتا ہے۔ وہ مارفیس کا ایک سردار ہے۔ میں نے پہلی ملاقات میں اسے اشارہ دیا تھا، اسے کہا تھا کہ میں جلد ہی اس سے دوبارہ ملوں گی اور اسے ایک نیا کام کرنے کو کہوں گی۔ وہ یہ بات بھولا نہیں ہوگا۔ لیکن ان حالات میں، میں شارق تک نہیں جا سکتی۔ اسی لیے چاہتی ہوں کہ دانیال اس کے پاس جائے۔ دراصل ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میرے اندازے سے بھی کم۔ پہلے میرا خیال تھا کہ خود شارق کو تیز رفتاری کے ساتھ مارفیس

روانہ کروں گی۔ لیکن اب وقت کی کمی کی وجہ سے میرا خیال بدل گیا ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ مارفیس پر شارق کی بجائے دانیال کو بھیجا جائے۔"

گہرتاب ابھی تک کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔ اس نے کس قدر اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

"لیکن مارفیس پر جانے سے قرطاجنہ کو کیا فائدہ ہوگا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"جافیکس نے ہلکی سی حیرت کے سات گہرتاب کی طرف دیکھا اور پھر اس سے کہا۔

"کمال ہے گہرتاب!...... تم بوڑھے تو نہیں ہوگئے۔ سامنے کی بات ہے شارق مارفیس کا ایک سردار ہے۔ مارفیس قزاقوں کا جزیرہ ہے۔ وہاں کا ہر جہاز بہترین لڑاکا جہاز ہوگا۔ اگر شارق چاہے تو مارفیس سے ایک پورا بحری بڑا برق رفتاری کے ساتھ قرطاجنہ پہنچ آئے۔"

گہرتاب کی سمجھ میں بات تو آ گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اس نے اپنی بے یقینی کا اظہار بھی کر دیا۔

"لیکن مارفیس جزیرے کے قزاق ہماری مدد کیوں کریں گے؟ کس فائدہ کے پیش نظر؟ بے شک شارق وہاں کا سردار ہوگا۔ لیکن سینکڑوں جہازوں کا ایک جنگی بیڑا آخر کیونکر قرطاجنہ آنے کا خطرہ مول لے گا؟"

شہزادی جافیکس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے گہرتاب کی طرف دیکھا اور پھر اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"میرے خیال میں تو قزاقوں کو شوق سے آنا چاہیے۔ یہاں انہیں مال غنیمت ملے گا، ہم انہیں انعامات سے نوازیں گے اور سب سے بڑھ کر ہم انہیں اس کام کے لی اجرت دیں گے۔ میرے خیال میں تو شارق سے بات کرتے ہی ہمیں پتہ چل جائے گا کہ وہاں سے کوئی بیڑا ہماری مدد کے لیے آ سکتا ہے یا نہیں۔"

سرفروشوں کا سالار گہرتاب اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔ اس نے سعادت مندی کے ساتھ سر ہلایا اور مؤدبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے شہزادی جافیکس؟ میں دانیال سے کیا کہوں؟"

"میں نے یہ تمام تفصیل تمہارے ساتھ اس لیے دہرائی ہے تاکہ تم دانیال کو میرا مدعا

سمجھا سکو۔ لیکن ٹھہرو! تم میرا رتھ تیار کرو، میں خود دانیال کے پاس چلتی ہوں۔"

جافیکس کے دل میں اچانک کوئی عجب سی ترنگ پیدا ہوئی اور اس نے یکا یک اپنا فیصلہ بدل لیا۔ کچھ دیر بعد اس کا رتھ دانیال کے گھر کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

کلاڈینا اور دانیال گھر پر ہی تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور قرطاجنہ میں گرمی قدرے زیادہ ہی تھی۔ کلاڈینا گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھی تھی اور دانیال اندرونی کمرے میں روشندان سے آنے والی روشنی میں بیٹھا تورات پڑھ رہا تھا۔ دانیال کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ جافیکس ان حالات میں اس کے گھر آ سکتی ہے۔ قرطاجنہ کی کنواری کا یوں کسی کے گھر آنا ویسے بھی اچنبھے کی بات تھی۔ اس پر مستزاد وزیراعظم ارفلکر کا وہ خوف تھا جو بچپن سے جافیکس کے ذہن پر ہمیشہ سوار رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مخصوص منقش رتھ میں نہ آئی تھی اور نہ ہی اس نے کنواری کا مخصوص لبادہ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک سادہ سے ڈھیلے ڈھالے عام قرطاجنی لباس میں ملبوس تھی۔ جافیکس کے رتھ کی کوچوانی کے فرائض ہمیشہ گھرتاب خود ادا کیا کرتا تھا۔ اس کا رتھ دانیال کے دروازے پر رکا۔ یہ ایک متمول تاجر کی حویلی تھی۔ جافیکس نے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر گھر میں قدم رکھا۔ گھرتاب باہر ہی رک گیا۔ جافیکس نیم تاریک ڈیوڑھی میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے نرم ملائم پیر ایک پروقار نرمی اور ملائمت سے زمین پر پڑ رہے تھے۔ لیکن اس کا دل اس کے قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ آج وہ اپنے محبوب سے ملنے آئی تھی۔ اس کے گھر۔ وہ محبوب جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔

قدم قدم کا ساتھی۔ جس کے ساتھ اس نے خوب خوب قلقاریاں ماری تھیں۔ اس وقت وہ کسی اور جذبے سے واقف نہ تھے۔ وہ خود محبت کو محبت کے طور پر بھی نہ جانتے تھے۔ انہیں تو بس ایک دوسرے سے لگاؤ تھا۔ بہت زیادہ لگاؤ۔ فراغت اور بے فکری نے دونوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے کا وافر موقع دیا۔ ان کا سارا وقت کھیل کود اور باتیں کرنے میں گزر جاتا تھا۔ جافیکس کو ڈیوڑھی میں چلتے ہوئے اپنے ہر ہر قدم کے ساتھ نہ جانے کیوں بچپن کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ جافیکس کو اچھی طرح یاد تھا کہ دانیال اس کی ہر فرمائش کیسے چٹکی بجاتے میں پوری کر دیتا تھا۔ وہ جافیکس کے لیے پرندوں کے رنگین پر اکٹھے کرتا اور ڈھیروں کی تعداد میں پروں کو جافیکس ایک پنکھ کی طرح پرو دیتی۔ وہ بے پناہ ذہین تھی۔ پروں سے طرح طرح کی آرائش کرتی اور جب دانیال اس کی بنائی ہوئی چیزوں پر خوش ہوتا، ان کی تعریف کرتا وہ

دیوانی ہو جاتی۔ کبھی کبھی دانیال اسے تنگ کرنے کے لیے اس کی بنائی ہوئی کسی چیز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا اور منہ بنا کر کہتا۔

"اچھی نہیں ہے۔"

لیکن جافیکس کے آنسو نکلنے سے پہلے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ وہ زیادہ صبر نہ کرسکتا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں آموسا رو ہی نہ پڑے۔ تب آموسا ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز اسے دے مارتی اور اس کے پیچھے دوڑنے لگتی۔

جافیکس صحن میں نمودار ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر ایک نہایت خوبصورت رومی لڑکی پر پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کلاڈینا ہے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور اسی شان سے چلتی ہوئی کلاڈینا کی طرف بڑھی۔ کلاڈینا بڑے تحمل کے ساتھ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جافیکس کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ وہ قرطاجنہ کی کنواری سے پہلی بار مل رہی تھی۔ اس لیے وہ جافیکس کو نہ پہچان سکی۔ اس کے لیے تو جافیکس ایک عام سی مہمان خاتون تھی۔ لیکن ذہین کلاڈینا نے رتھ رکنے کی آواز اور آنے والی لڑکی کی پروقار چال دیکھ کر یہی سوچا کہ یہ آموسا ہے۔ اس کے باپ جیسے بھائی دانیال کی محبت۔ کلاڈینا کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک کو دیکھتے ہوئے جافیکس نے اندازہ کرلیا کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہوئیں تو ان کے چہروں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے وہ صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں اور کمال کی بات تو یہ ہوئی کہ دونوں نے ایک دوسرے کا نام لیے بغیر ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیا۔ وہ بغلگیر ہوئیں تو جیسے مدتوں کے بچھڑے مل رہے ہوں۔ کافی دیر تک وہ ایک دوسرے کے سینہ سے سینہ ٹکائے کھڑی رہیں۔ کلاڈینا کی آنکھوں میں اشک تھے۔ پھر وہ الگ ہوئیں تو کلاڈینا نے جافیکس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ تو دیوی ہیں۔ آپ کی تو پوجا کی جاتی ہے۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔"

جافیکس کے چہرے پر بے پناہ پیار تھا۔ اس کی آنکھوں میں رحمت ہی رحمت تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کلاڈینا کا ہاتھ دبایا اور اسے پھر کھینچ کر دوبارہ سینے سے لگا لیا۔

"تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا کلاڈینا! میرا دل تمہارے لیے دکھی ہے۔"

صحن میں چھتوں کا سایہ تھا۔ ورنہ قرطاجنہ کی گرمی سہ پہر کے وقت صحن میں چارپائی

ڈالنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ وہ سائے میں کھڑی تھیں۔ کچھ ہی دیر پہلے کلاڈینا نے صحن کے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کیا اور چارپائیاں ڈالوائی تھیں۔ گیلے اور ٹھنڈے فرش پر کھڑی جافیکس کی نگاہ اٹھی تو اس نے دیکھا سامنے کمرے کے دروازے میں دانیال کھڑا تھا۔ دانیال کے چہرے پر مقدس سی ایک مسکراہٹ تھی۔ اور وہ کلاڈینا اور جافیکس کی اس انوکھی واقفیت پر خداوند کو داد دے رہا تھا۔ جافیکس اور دانیال کی نگاہیں چار ہوئیں تو جافیکس بھی مسکرا دی۔ دانیال چل پڑا۔ اب وہ انہی کی طرف آ رہا تھا۔

"تسلیمات!"

اس نے جافیکس کے سامنے آ کر قدرے جھک کر سلام کیا تو جافیکس ہنس پڑی۔

"دانیال!...... مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے ایک ساتھ کنول کے پھول چنے ہیں، ایک ساتھ درختوں سے پرندوں کے گھونسلے اتارے ہیں، ہم ایک دوسرے کے پیچھے کتنا دوڑتے تھے اور آج تم بھی......"

جافیکس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دانیال اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"اب تو آپ دیوی ہیں۔ اہل قرطاجنہ کی دیوی۔ شہزادی جافیکس۔ بچپن میں تو آپ آموسی تھیں۔"

"کیا تم مجھ پر طنز کر رہے ہو دانیال؟"

"ارے نہیں!...... میں دل سے کہہ رہا ہوں۔ آپ دیوی ہین اور میں بھی آپ کا ایک پجاری ہوں۔"

"لیکن تم تو دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے، تم تو خدائے واحد کی پوجا کرتے ہو، تم تو یہودی ہو دانیال؟...... پھر تم نے ایک دیوی کی پوجا کیسے شروع کر دی؟"

دانیال کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر میں آپ کو آموسی کہنا شروع کر دوں اور تو تڑاخ سے بات کروں تو ہم دونوں کے دلوں میں ملاپ کی امنگ جنم لے گی۔ آپ جس مقام پر بیٹھی ہیں وہاں تو آپ صرف ایک دیوی کے روپ میں ہی رہ سکتی ہیں۔ میں آپ کو مادر قرطاجنہ سے آموسی نہیں بنانا چاہتا۔ کیونکہ آموسی مجھے مل گئی تو میں اسے ساتھ لے جاؤں گا اور پچیس سال میں مجھ پر بیتنے

والی ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اسے بتا دوں گا۔ وہ تو میری رفیق زندگی ہے، پل پل میرے ساتھ رہی ہے اور ایک آپ ہیں آپ کو تو میں چھو بھی نہیں سکتا۔ ایک دیوی کو بھلا ایک انسان کیسے چھو سکتا ہے؟" دانیال کی بات پر جافیکس کے آنسو آ گئے۔ کلاڈینا کی آنکھیں تو پہلے ہی اشکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جافیکس آنسوؤں کے باوجود ہنس رہی تھی۔ یہ عجب کیفیت تھی۔ ان دونوں کو کیسا غم ہجر ملا تھا۔ ایک دوسرے کو پا کر بھی نہ پا سکے تھے۔ درد کی ٹیس نے جافیکس کو رلا دیا۔ لیکن دلدار سے ملاقات کی خوشی نے اسے ہنسا دیا۔ وہ دو متضاد کیفیتوں کا شکار تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے قدرے شرارت بھرے لہجے میں دانیال سے پوچھا۔

"کہاں لے جاؤ گے اسے؟"

"کسے؟؟"

"ارے!...... ابھی تو تم نے کہا کہ اگر آموسی تمہیں کہیں مل گئی تو تم اسے لے جاؤ گے۔"

دانیال کی آنکھوں میں عجب سی چمک پیدا ہوئی۔ جسے دل کی دنیا میں امید کی کرن کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ایک شعلہ سا تھا جو دانیال کی آنکھوں میں پل بھر کے لیے چمکا تھا۔ اس نے بے خودی کے عالم میں جواب دیا۔

"پربت کے اس پار
جہاں پریوں کے گھر ہیں
اس وادی میں
جس میں سپنے
پریاں بن کر رہتے ہیں
اس وادی میں
جس میں جھرنے
جھاگ اڑاتے بہتے ہیں۔"

جافیکس اور کلاڈینا دونوں ششدر رہ گئیں۔ جافیکس نے ایک کھنکھناتے ہوئے قہقہے کے ساتھ کہا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری عظیم ڈاٹ کام

”ارے دانیال!......تم نے تو کویتا کہہ ڈالی......ارے ہاں! تم لوگ مجھے بیٹھنے کیلئے نہیں کہو گے؟“

”بیٹھنے کیلئے تو مہمانوں سے کہا جاتا ہے۔“

جافیکس خفیف سی ہو گئی۔

”بہت باتیں کرنے لگے ہو۔“

اس نے اتنا کہا اور ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اور پھر کچھ دیر بعد وہ انکے ساتھ قرطاجنہ کے دفاع کی بات کر رہی تھی۔ بظاہر جس مقصد کے لیے وہ آئی تھی وہ یہی تھا۔ اور پھر جب شارق یا اس کے جزیرے کا ذکر آیا تو جافیکس نے مسکرا کر کلاڈینا کی طرف دیکھتے ہوئے دانیال سے کہا۔

”صرف مارفیس ہی ہے جہاں سے ہم تک کمک پہنچ سکتی ہے۔ باقی کہیں سے بھی نہیں اور مارفیس سے کمک لانا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ ڈاکوؤں کا جزیرہ ہے۔ کوئی سلطنت یا ریاست نہیں۔ میں تو چاہتی تھی کہ شارق خود وہاں جائے۔ لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔“

کلاڈینا نے بھی حیا سے نظریں جھکا لیں۔ قرطاجنہ کی کنواری کا مدعا سمجھ رہا تھا۔ قرطاجنہ کو سچ مچ خوفناک مشکلات کا سامنا تھا۔ وہ دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور طے یہی پایا کہ دانیال آج ہی روانہ ہو جائے گا اور سمندر میں شارق سے ملتے ہوئے مارفیس کی طرف چلا جائے گا۔ ان کی گفتگو ختم ہوئی تو کلاڈینا نے کافی دیر خاموشی کے بعد دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے پھر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”بھیا!......میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

”نہیں کلاڈینا!......تم اتنے دنوں کے لیے شینتل کے گھر چلی جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

اسی اثنا میں جافیکس نے ایک شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کلاڈینا کو دیکھا اور پھر کہنے لگی۔

”تم کیوں ساتھ جانا چاہتی ہو؟“

کلاڈینا سٹپٹا گئی۔ تب جافیکس نے چہرہ گھمایا اور دانیال کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"کلاڈینا ساتھ چلی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر کلاڈینا شارق سے کہے تو میرا خیال ہے وہ مارفیس سے ہر جہاز اور ہر کشتی یہاں بلوا لے گا۔"

جافیکس کے چہرے پر اب شرارت کی بجائے ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ دانیال نے بھی جافیکس کی بات کا وزن محسوس کیا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے جافیکس کے چہرے پر تکتا رہا اور پھر اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ کہا۔

"لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کلاڈینا ابھی اپنے مستقبل کا کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ شارق اس سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ہم شارق کی محبت کا فائدہ اٹھائیں۔ اگر کلاڈینا بھی اسے پسند کرتی تب بات اور تھی۔"

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔ یہ بڑی پوجا کے دن بھی تردد کا شکار ہو کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ تم نے ٹھیک کہا دانیال! ہمیں کلاڈیا کے لیے کسی کی محبت کا استحصال یا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن دانیال میں ایک عورت ہوں اور میں نے پیار کیا ہے۔ اس لیے میں جانتی ہوں کہ ایک عورت کا پیار کیسا ہوتا ہے۔ آج اگر شارق، قرطاجنہ کا امیر البحر ہے تو کیا یہ تب بھی اس نے کلاڈینا کے اشارے پر قبول نہیں کیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم آج بھی اس کی محبت کا استحصال کر رہے ہیں۔ کلاڈینا بھی اس سے پیار کرتی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ یہ بات تم بھی جانتے ہوں۔"

اس بات کے ساتھ ہی دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ کلاڈینا پر پڑیں۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخنوں کو کھرچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ حیا سے لال تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یکایک اسے جافیکس کی آواز سنائی دی۔

"کلاڈینا!...... کیا تم اب بھی دانیال کے ساتھ جانا چاہتی ہو۔"

کلاڈینا نے صرف سر ہلا کر جواب دیا، منہ سے کچھ نہ بولی۔ کلاڈینا کے سر ہلانے کی دیر تھی کہ دانیال کے چہرے پر اطمینان کی لہر پھیل گئی۔ وہ جانتا تو تھا کہ کلاڈینا بھی شارق کو چاہتی ہے لیکن کلاڈینا جب تک خود نہ واضح کر دیتی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا اور آج کلاڈینا نے خود واضح کر دیا تھا۔

جانفیکس ایک تسلی بخش ملاقات کے بعد دانیال کے گھر سے لوٹی۔ گھرتاب رتھ میں موجود اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سہ پہر کے وقت آئی تھی لیکن اب شام ہو چکی تھی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے چند لمحے ہی گزارے ہوں۔ اس کو بہت اچھا لگا۔ دانیال کے قریب رہ کر وہ خود کو لذت وصال کے دائرے میں محسوس کرتی تھی۔ دانیال کے سپرد ایک مشکل کام کر کے لوٹی تو اسے یوں لگا جیسے اس نے اپنے محبوب کو خطرے میں جھونک دیا ہو۔ لیکن پھر ایک لحاظ سے وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی ذریعے سے وہ دانیال کے ساتھ جڑی رہے گی۔ اس کا رتھ تیزی سے قلعہ بیرسا کی طرف دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس کا دل پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ غروب آفتاب کے بعد قلعہ بیرسا پہنچی تو جاسوس سرفروش اس کے منتظر تھے۔ اسے اطلاع ملی کہ اوریس کا لشکر تیز ترین یلغار کرتا ہوا قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برتھاس بھی اوریس کے استقبال کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ پریشان نہ تھی۔ اس نے سرفروشوں کو واپس جانے کے لیے کہا اور خود اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آج وہ بہت مسرور تھی۔ آج وہ دوسری بار دانیال سے ملی۔

اہل قرطاجنہ آنے والی جنگ سے خوفزدہ نہیں تھے۔ لیکن متجسس ضرور تھے۔ شہر کا ماحول یکسر بدل چکا تھا۔ نئے سوداگروں کی آمد تقریباً رک گئی تھی، جو سوداگر پہلے واپس چلے گئے وہ تو چلے گئے لیکن جو قرطاجنہ میں رہ گئے تھے انہیں قرطاجنہ میں ہی ڈیرے ڈالنے پڑے۔ سمندری راستے اب بند ہو چکے تھے۔ اس لیے اب بیرونی ممالک سے آئے ہوئے سوداگر واپس نہ جا سکتے تھے۔ مضافات کے دیہاتی اٹھ اٹھ کر قرطاجنہ شہر میں پناہ لینے کے لیے آ رہے تھے۔ مداریوں، شعبدہ بازوں، نوٹنکی والوں، داستانیں سنانے والوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ ہر نوٹنکی اور ہر داستان جنگی کہانیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ پورے شہر میں سنسنی کی ایک لہر تھی۔ لوگ اشیائے ضرورت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے اور آہنگر دھڑا دھڑ لڑائی کے ہتھیار بنانے میں مصروف تھے۔ قرطاجنہ محبت کا شہر تھا اور اہل قرطاجنہ نے اپنے آپ کو ہمیشہ جنگوں سے دور ہی رکھا تھا۔ اسی محبت نے انہیں یکجہتی عطا کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ کوئی بیرونی حملہ آور اہل قرطاجنہ پر کبھی غالب نہ آ سکا تھا۔ قرطاجنہ فنکاروں کا شہر تھا۔ زمانہ قدیم کی زیادہ تر ایجادات کا سہرا فینیقی قوم کے ہی سر تھا۔ یہاں تک کہ رومی فوج کے پاس بھی فینیقیوں کی بنائی ہوئی

منجنیقیں تھیں۔ فینیقیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء اور مشینیں اس وقت کی دنیا میں دور دور تک مشہور تھیں۔ یہاں تک کہ بابل کے باغات معلقہ میں پانی چڑھانے کی جز ثقیل تک ایک فینیقی سائنسدان نے بنائی تھی۔

اہل قرطاجنہ اپنی حکومت کا بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ فصیل شہر کی مرمت سے لے کر چندہ اور رسد جمع کروانے تک وہ ہر بات میں حکومت کے ساتھ تھے۔ بڑے بوڑھے اپنا زیادہ تر وقت پوجا پاٹ میں گزارتے اور نوجوان فوج میں بھرتی ہونے کے سپنے دیکھتے تھے۔ چھوٹے بچوں میں بھی جوش و خروش تھا۔ وہ گلی کوچوں میں ''جنگ جنگ'' کھیلتے اور سارا دن لکڑی کی تلواروں سے بچوں کا ایک لشکر دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتا۔ مندروں میں پجاریوں اور کاہنوں کی بھی چاندی ہوگئی تھی۔ دیوتاؤں کے حضور نذرانے اور چڑھاوے پہلے کی نسبت کئی گناہ بڑھ گئے تھے۔ نئی نئی خبریں اور نئی نئی افواہیں آئے روز پھیلتی اور ختم ہوتی رہتی تھیں۔ جنگ سے پہلے ہی اہل قرطاجنہ متعدد بار جنگ شروع ہوجانے کی خبریں سن چکے تھے۔ برتھاس اور اورلیس دونوں سالاروں کی خوب خوب باتیں ہوتیں۔ کوئی اورلیس کی بہادری، بیباکی اور جرأت کی داستانیں سناتا تو کوئی برتھاس کو دیوتاؤں کا یودھا بتاتا۔

انہی دنوں میں ایک روز سنتوش قرطاجنہ کے بڑے بازار میں سے گزر رہا تھا۔ وہ جب بڑے چوراہے میں پہنچا تو اس کی نظر ایک مجمعے پر پڑی۔ یہ ایک نوٹنکی تھی۔ کوئی یونانی کلاکار یونانی دیوتاؤں کی کہانی پر مشتمل نوٹنکی پیش کر رہا تھا۔ ناٹک میں اس کے ساتھ اور اداکار بھی تھے۔ معاً سنتوش کے کانوں میں نوٹنکی والے کی آواز پڑی۔

''تھیوٹ! تم انسانوں کو لکھنے کا فن سکھاؤ گے تو ان کی یادداشتیں کمزور پڑ جائیں گی۔ پری میتھوس نے انسان کو آگ کا راز بتایا تھا تو میں نے اسے پہاڑوں پر قید کر دیا۔ اب ہر روز ایک گدھ آتا ہے اور سارا دن اس کا کلیجہ نوچ نوچ کر کھاتا ہے اور جب رات ہوتی ہے تو اس کا کلیجہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

تھیوٹ! لیکن میں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔ تم اگر لکھنے کا فن انسانوں کو سکھانا چاہتے ہو تو جاؤ سکھاؤ۔ لیکن یاد رکھو!...... چیزوں کو لکھتے لکھتے بالآخر یہ انسان اپنا نام تک یاد رکھنا بھول جائیں گے۔ کیونکہ یہ یاد رکھنے کی ہر بات کو لکھ لیا کریں گے۔''

سنتوش کو نوٹنکی والے کی بات میں دلچسپی محسوس ہوئی تو وہ بھی مجمعے میں شامل ہوگیا۔ اس نے دیکھا۔ یونانی ناٹک میں دیوتاؤں کا دیوتا زیوس عجیب وغریب الوہیاتی لباس پہنے کھڑا گرج رہا تھا۔ اس کے سامنے تھویث دیوتا مٹی کی ایک لوح ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ جس پر ہیروغلفی خط میں کچھ آڑی ترچھی لکیریں کندہ تھیں۔ سنتوش نے یونانی دیومالا کبھی نہ سنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس میں دلچسپی لینے لگا۔ ناٹک میں بتایا جارہا تھا کہ تھیوٹ دیوتا نے انسانوں کو لکھنے کا فن سکھایا۔ معاً سنتوش کی نگاہ ایک اور دیوتا پر پڑی جو زیوس کے عقب میں نمودار ہوا اور عجب رنگ برنگا لباس پہنے مجمع کے سامنے آ گیا۔ اس نے زیوس کے حضور جھک کر سلام پیش کیا اور پھر دیوتاؤں کے دیوتا زیوس سے کہنے لگا۔

''میں ہومر ہوں۔ آپ کا بنایا ہوا ایک انسان۔ جسے آپ نے اب ایک دیوتا بنا دیا ہے۔ میں تھیوٹ کی مخالفت کرتا ہوں۔ میں نے یونانیوں کو پوری دیومالا ازبر کروائی۔ ہزاروں سال کی کہانی سینہ بہ سینہ آج تک سب تک منتقل ہوتی چلی آئی۔ کہیں بھی کبھی بھی کسی کو کوئی یادداشت محفوظ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تھیوٹ اگر لوگوں کو لکھنے پڑھنے کا فن سکھا دے گا تو وہ ہر نئی بات سن کر اسے محفوظ کرلیں گے اور ان کا دماغ اس بات کو یاد کرنے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس سے بڑے بڑے نقصان ہوں گے۔ کسی ایک انسان کی لکھی ہوئی چیز دوسرے انسان کے ہاتھ لگے گی تو وہ اپنی مرضی سے اس میں تبدیلی کردے گا۔ سچ اور جھوٹ کی پہچان ختم ہوجائے گی۔ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اس لیے میں درخواست کرتا ہوں کہ انسانوں کو قلم نہ عطا کی جائے تاکہ زمین پر انسان محفوظ رہ سکیں۔''

یہ ہومر تھا۔ زمانہ قدیم میں اہل یونان محض ایک جنگلی آبادی تھے۔ جو قبائلی بستیوں کے انداز میں پورے یونان میں جگہ جگہ آباد تھے۔ ان کا کوئی مذہب تھا اور نہ کوئی دیوملا۔ ان کی طبیعت میں فطری طور پر جو مذہبی میلان موجود تھا، اسی کے سبب وہ ہر اس چیز کے آگے سر جھکا دیتے تھے جو ان کی سمجھ سے باہر ہوتی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مصر اور ہندوستان میں ایک مکمل دیومالا موجود تھی۔ مصر کی اپنی دیومالا تھی اور ہندوستان کی اپنی۔ لگ بھگ بارہ سو سال قبل مسیح ہومر نامی ایک شخص یونان میں پیدا ہوا۔ جس نے تماشا دکھانے اور ناٹک کرنے کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ یونانی بستیوں میں جاتا اور وہاں ناٹک پیش کرتا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور

ذہین فطین بھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ہندوستانی، مصری اور بابلی خداؤں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں ہندوستانی دیوتاؤں کی کہانیوں کو منظوم کرنا شروع کر دیا۔ یونانی یا مصری دیوتاؤں کے لیے اس نے اپنی زبان میں الگ نام تجویز کر لیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یونان کی وحشی قوموں میں ہومر کی شاعری زبان زد عام ہونے لگی۔ تب یونانی دیو مالا بھی وجود میں آنے لگی۔ آج ناٹک میں دوسرا دیوتا وہی ہومر تھا۔ سنتوش دلچسپی سے پلکیں پٹپٹاتا نوٹنکی دیکھنے میں مصروف تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ یک لخت سر گھما کر دیکھنے لگا اور اگلے لمحے یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جس نے کبھی سنتوش کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ یہ وہی لڑکا تھا جو باقی لڑکوں کا بھی سرغنہ تھا۔ سنتوش جب اپنی گمشدگی کے بعد واپس آیا تھا تو اس کے باپ مہا پجاری نے اسے شادی کے تحفے میں چار قیدی دیئے تھے۔ یہ چاروں وہی لڑکے تھے، جنہوں نے کبھی سنتوش کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا۔ یہ لڑکا تو ان سب کا سردار تھا۔ سنتوش نے اسے دیکھا تو بے اختیار کہا۔

"کارن!......تم؟"

کارن نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

"سنتوش! مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کتنی بڑی غلطی کر رہا ہوں۔ تم نے ہمیں معاف تو کر دیا۔ لیکن میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکا۔ آج تمہیں یہاں دیکھا تو تمہیں بلانے کو جی چاہا۔"

سنتوش کو معاً اپنے ساتھ بیتا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔ لیکن آج اس کے چہرے پر غصے کی کوئی لہر نہیں تھی۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا اور کارن کے کندھے پر رکھ دیا۔

"گزری ہوئی کو بھول جاؤ کارن!...... میں بھی اسے بھلا چکا ہوں۔"

کارن جو کبھی سنتوش کا دوست تھا، شرمندگی کی شدت کی وجہ سے جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے سنتوش کو بتایا۔

"میں نئی بحری فوج میں بھرتی ہو چکا ہوں۔ تم تو جانتے ہو میرا باپ بھی ایک ملاح تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنے باپ کا پرائشچت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے

پرارتھنا کرنا سنتوش کہ میں قرطاجنہ پر قربان ہو جاؤں۔ شاید اسی طرح میری ندامت کم ہوگی۔"

سنتوش کو دھچکا لگا اور خوشی بھی ہوئی۔ اس نے جھٹ سے آگے بڑھ کر کارن کو سینے سے لگا لیا۔

"بہت خوب کارن! تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ کاش! میری عمر بھی بھرتی کی ہوتی۔ میں تمہارے لیے پرارتھنا کروں گا۔ تم نے اگر کوئی بڑا کام کر دکھایا تو ندامت کا بوجھ تمہارے سر سے اتر جائے گا۔ مجھے سچ مچ خوشی ہوئی۔"

کارن قرطاجنہ کے دفاع کے لیے بھرتی ہونے والے نئے بحری سپاہیوں میں شامل ہو چکا تھا۔ اب وہ شارق کے ماتحت رومیوں سے جنگ لڑنے جا رہا تھا۔ سنتوش کو یہ سن کر سچ مچ مسرت ہوئی تھی۔

پاکستان ورچوئل لائبریری

اور جب لاشیں گریں

بحرروم کے پانیوں پر قیامت برپا تھی۔ سمندر کے نیلگوں سینے پر بھڑکتی آگ کے لال اور پیلے شعلے آسمان کو چھونے کی مسلسل ناکام کوشش کررہے تھے۔ انسانوں سے انسانوں کی لڑائی کا المناک منظر دیکھ کر سمندر کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ منجنیقوں سے نکلنے والے آگ کے گولے ایک جہاز سے دوسرے جہاز کی طرف لپکتے اور لکڑی کے تختوں سے ٹکرا کر انہیں آگ کے شعلوں میں بدل دیتے۔ انسان تخریب پر تل گیا تھا۔ تخریب ہی تخریب تھی، دن دہاڑے۔

بحرروم کے صاف اور شفاف پانی پر دو ہیبت ناک بحری بیڑے دن دہاڑے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی بحری جنگ تھی۔ اوپر بھی کھلا آسمان تھا اور نیچے بھی کھلا آسمان۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں طرف کے یودھا فضاؤں میں لڑ رہے ہیں۔ تاحد نگاہ کہیں کوئی خشکی کا ٹکرا نہیں تھا۔ سمندر کی سطح پر ہچکولے کھاتے جہاز اور ان سے نکلنے والے آتشیں گولے اور تیر۔ آخر یہ انسان کیا کرنے والا تھا۔ دونوں بڑے پہلے ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہوئے اور پھر پوری قوت سے آپس میں ٹکرا گئے۔ یہ ایک بھیانک سمندری جنگ تھی۔ اونچے جھنڈے والے قرطاجنی کے عرشے پر موآبریلش کھڑا تھا اور اونچے جھنڈے والے رومی جہاز کے عرشے پر کوناڈس۔

دونوں سلطنتیں سمندر کے بیچوں بیچ برسرپیکار تھیں۔ ایشیا کی فینقی قوم جواب افریقہ کے ساحل پر آباد تھی اور اس کے مدمقابل یورپ کی ایک جنوبی قوم۔ بحرروم انسان کی اس نااتفاقی پر شرم سے پانی پانی ہورہا تھا۔ لاشیں گر رہی تھیں۔ سر کٹ رہا تھے۔ بازو اچھل رہے تھے۔ تیر کھب رہے تھے۔ گھاؤ لگ رہے تھے۔ آہیں، کراہیں، سسکیاں، چیخیں بلند ہورہی تھیں

اور خون بہہ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے نیلے سمندر پر لال لہو کے پھول کھلنے لگے۔ لکڑی کے جہاز آپس میں ٹکراتے تو اتنی زور سے چرچراتے کہ کانوں میں پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ قوت اور رفتار کی وجہ سے وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ لیکن ان پر سوار سپاہی ٹوٹ پھوٹ کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے۔ اندھا دھند۔

ایک جہاز کے سپاہی دوسرے کی طرف دوڑتے اور دوسرے کے اس کی طرف۔ اچھلتے کودتے، پھلانگتے کچھ سپاہی پانی میں گر جاتے اور کچھ ایک دوسرے پر تلواروں سے حملہ کر دیتے۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز سمندر کو سنائی دیتی تو وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگتا۔ یہ جنگ تھی۔ روم کا بحری بیڑا قرطاجنہ کے بڑے بحری بیڑے سے ٹکرا چکا تھا۔ آج کوناڈس نے موآبریس سے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ پچھلی بار کی حسرت تو اس کے دل میں ادھوری تھی۔ پچھلی بار تو وہ خود جنگ بھی نہ لڑ سکا تھا۔ وہ تو اپنی داشتاؤں کے ہاتوں زخمی ہو کر پہلے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا اور آج تو یہ جنگ ہو ہی کوناڈس کی فرمائش پر رہی تھی۔ وہ کئی دن سے موآبریس کے پاس اپنے ایلچی بھیج رہا تھا اور موآبریس کو کھلی جنگ میں طاقت آزمانے کی دعوت دے رہا تھا۔ جہاندیدہ موآبریس زیادہ قتل عام پسند نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہا تھا۔ آخر ایک دن کوناڈس کے ایلچی نے موآبریس کو اس کے سالاروں کی موجودگی میں کوناڈکس کا یہ پیغام پہنچایا۔

”ارے عورت کے پجاریو!...... اے عورت کے غلامو!...... تم بھی قرطاجنہ کی کنواری کی طرح چوڑیاں پہن لو۔ اگر تم میں ہمت ہے تو کھلے سمندر میں ہمارے آمنے سامنے آ کر ہم سے پنجہ آزمائی کرو۔ ہمارے ساتھ باقاعدہ جنگ لڑو۔“

قرطاجنی سالار طیش میں آ گئے۔ ایک سالار نے اٹھ کر اپنی شمشیر نکالی اور بیچارے ایلچی کا سر قلم کر دیا۔ اس نے ایلچی کے باقی ساتھیوں سے کہا۔

”جاؤ! کوناڈس سے کہو کہ جہاں وہ لڑنا چاہتا ہے وہاں ہم آ رہے ہیں۔ ہم اس سے باقاعدہ جنگ کرنا چاہتے ہیں۔“

موآبریس بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ تمام سالاروں نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ دونوں سلطنتوں کے مابین اب ایک باقاعدہ جنگ لڑی جا رہی تھی۔

دونوں طرف کے آتشیں تیروں نے سمندر کی فضا پر ایک چھت سی تان دی تھی۔

ہزاروں جہاز اور کشتیاں متحرک دکھائی دے رہی تھیں، ہر جہاز کے تہہ خانے میں چپو چلانے والے غلام، جہاز کی رفتار کو حیران کن حد تک قابو میں کیے ہوئے تھے۔ قدرے فاصلے سے دیکھنے پر جہاز کا رویہ کسی لڑتے ہوئے انسان جیسا دکھائی دے رہا تھا وہ آگے لپکتے۔ ٹکر سے خود کو بچاتے، داؤ کھیلتے، پینترا بدلتے، آگے بڑھتے یا پیچھے ہٹتے تو یوں لگتا تھا جیسے لکڑی کے ان جہازوں میں بھی انسانوں کی طرح عقل بھری ہو۔ جنگ سے پہلے دونوں فوجوں نے باقاعدہ صف بندی کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے ایک بالکل سیدھے خط میں صف آراء ہوئے تھے۔ قرطاجنی فوج کا دایاں بازو رومیوں کے بائیں بازو کے مقابل تھا اور رومیوں کا دایاں بازو قرطاجنیوں کے بائیں بازو کے مقابل تھا۔ دونوں کے قلب آمنے سامنے تھے۔ جنگ کے بگل بجنے سے پہلے دونوں جہازوں کے سالار اپنے اونچے عرشوں پر کھڑے مدمقابل لشکر کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں سپہ سالاروں کے جہاز اونچے مستولوں اور بڑے پرچموں کی مدد سے پہچانے جاتے تھے۔ بحری جنگ میں مبارزت کا دستور نہیں تھا۔ چنانچہ بگل بجتے ہی دونوں فوجیں بری طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا گئیں اور اس وقت یہ جنگ زوروں پر تھی۔

پہلے پہل قرطاجنی دایاں بازو رومیوں کے بائیں بازو پر بھاری پڑ گیا اور رومیوں کا دایاں بازو قرطاجنیوں کے بائیں بازو پر بھاری پڑ گیا۔ جبکہ دونوں کے قلب برابر رہے۔ یہ عجب صورتحال تھی۔ وہ کسی ایسے لٹو کی طرح گھوم گئے تھے جس کی درمیانی نوک ایک جگہ ٹکی رہے اور اس کے پر گھوم جائیں۔ سمندری جنگ بھی عجیب چیز تھی۔ اس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دیر بعد جنوبی سمت میں رومی اور شمالی سمت میں قرطاجنی فوج کھڑی تھی۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور دونوں طرف کے جہاز دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ سمندر کے پانی پر تیرتے ہوئے سپاہی جو ٹوٹے ہوئے جہازوں سے کود پڑتے اور دوسرے جہازوں کی طرف تیرنے لگتے، کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں طرف کی تیرتی ہوئی لاشیں پانی پر مسلسل پھول کھلائے جا رہی تھیں۔ قرطاجنی منجنیقوں نے اندھا دھند آگ کے جو گولے پھینکے تھے، انہوں نے کوناڈس کے ہراول دستوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ کوناڈس نے اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑے کھڑے ہراول کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ آن کی آن میں کوناڈس کا حکم ایک جہاز کے عرشے سے دوسرے جہاز کے عرشے تک پھیلتا چلا گیا۔ ہراول پسپا ہونے لگا۔ کوناڈس نے ہراول کو پیچھے ہٹنے کے لیے جگہ دینی چاہی اور قلب کو بھی پیچھے ہٹانے لگا۔ بھونپوؤں، نقاروں،

آہوں، کراہوں اور پکاروں کے علاوہ جہازوں کی چیخ چنگھاڑ اور تلواروں کی ٹناٹن۔ یہ سب آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل کر عجب سماں پیدا کررہی تھیں۔ سمندر کے کھلے سینے پر آہ و بکا اور چیخ و پکار گویا قیامت برپا تھی۔ اس پر مستزاد سورماؤں کی وہ للکاریں اور نعرے تھے جو وہ ایک دوسرے کو بگھانے کے لیے بلند کررہے تھے۔ پانی کی سطح پر کہیں کہیں بلبلے پیدا ہورہے تھے۔ کٹ کٹ کر گرتی ہوئی لاشیں اپنی آخری سانسیں پانی میں ڈوبتے ہوئے لے رہی تھیں۔ وہ غرق ہوتے ہوئے سانسیں لیتے تو بڑ بڑ کر آواز نکلتی اور سطح آب پر بلبلے نمودار ہوکر آبگینوں میں بدل جاتے۔

کوناڈس نے اپنے دائیں اور بائیں بازو کو حکم دیا کہ دشمن کو اندر کی طرف دھکیلے۔ اس نے اپنے خصوصی لڑاکا جہاز ابھی تک جنگ میں نہیں جھونکے تھے۔ یہ تیز رفتار جہاز قلب کے عقب میں حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ کوناڈس اپنے ہراول کی پسپائی پر ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس کے چہرے پر بدستور ایک سنجیدہ سی مسکان تھی اور وہ دور قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ معاً کوناڈس نے اپنے ایک ماتحت افسر کو آواز دی۔ افسر اس کے نزدیک آیا تو کوناڈس نے اس سے کہا۔

''وہ دیکھو!...... دشمن کے عقب میں حفاظتی دیوار نہیں۔ اگر ہمارے کچھ جہاز اس وقت کسی طرح دشمن کے عقب پر حملہ کردیں تو ہم دشمن کو بوکھلا سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کسی طرح قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز کو گھیر لیا جائے۔ اگر اس کا پرچم گر گیا تو قرطاجنیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔''

ماتحت افسر نے غور سے کوناڈس کی آواز سنی اور پھر اسے مشورہ دیا۔

''ہم نے اپنا دستہ قلب کے عقب میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اس میں سے کچھ جہازوں کو اس مہم پر روانہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا ایک سو چالیس جہازوں کا برق رفتار دستہ منتظر ہے۔ اگر ہم چالیس جہاز بھیج دیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔''

''لیکن چالیس جہاز تھوڑے ہیں۔ دشمن کے عقب میں پہنچ کر تو وہ دشمن کے علاقے میں ہوں گے۔ اگر دشمن ان پر جھپٹا تو سب کو مار گرائے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم صرف ایک جاسوس جہاز کو روانہ کرو۔ اس پر قرطاجنی پرچم نصب کرادو اور اس کو دشمن کی صفوں میں داخل کردو۔ مجھے امید ہے ہمارے جاں فروش جاسوس اپنی جان کا نذرانہ دے کر بھی

قرطاجنی سپہ سالار کو قتل کر دیں گے۔ اگر ایک جہاز ناکام ہو جائے تو دوسرا جاسوس جہاز روانہ کرو۔ یہ کوشش بار بار جاری رہنی چاہیے۔"

ماتحت افسر کوناڈس سے احکامات لے کر نیچے کی طرف چلا گیا۔ کوناڈس بدستور عرشے پر کھڑا جنگ کا نظارہ کر رہا تھا۔

رومی لشکر کے دائیں اور بائیں بازوؤں نے قرطاجنیوں پر ایک ساتھ بیباکانہ حملہ کیا۔ ان کے حملے کی شدت اس قدر تھی کہ انہوں نے قرطاجنیوں کو کئی سو قدم پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن قرطاجنی ہراول ابھی تک ڈٹا کھڑا تھا۔ بوڑھا قرطاجنی سپہ سالار موآبریس اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا جنگ کا نظارہ کر رہا تھا۔ وہ عرشے کے جنگلے پر دونوں ہاتھ رکھے بحر روم کے سینے پر برپا قیامت کو نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی اس کا ایک ماتحت افسر کھڑا تھا۔ موآبریس نے اپنے ماتحت افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بحری عقاب کس وقت روانہ ہوئے تھے۔ میرے اندازے سے تو انہیں اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

ماتحت افسر نے موآبریس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"وہ جلد ہی پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے تیرہ میل کا چکر کاٹنا تھا۔ ایک بار وہ پہنچ گئے تو دشمن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔"

بحری عقاب ستر جہازوں کا ایک دستہ تھا۔ جو کل نصف شب سے ہی اپنی مہم پر روانہ ہو چکا تھا۔ موآبریس نے قبل از وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا، کہ انہیں دشمن کے عقب کو توڑنے کے لیے ایک برق رفتار دستے کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ عین جنگ کے دوران اس طرح کا کوئی دستہ بھیجنا محال ہوگا۔ وہ ایک جہاندیدہ انسان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گزشتہ شب ہی اپنا ایک برق رفتار دستہ مغرب کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ جو تیرہ میل کا لمبا چکر کاٹ کر رومی لشکر کے عقب میں نمودار ہونے والا تھا۔

یکا یک رومی لشکر کے ہر سپاہی کی...... سانسیں رکنے لگیں۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے عقب سے قرطاجنی پرچم لہراتا ایک بحری بیڑا، اڑا چلا آ رہا تھا۔ ان کے حوصلے یکلخت ٹوٹ گئے۔ سپہ سالار کوناڈس تو جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھ چوپٹ کھلی تھیں اور وہ اپنے لشکر کے عقب میں اچانک نمودار ہونے والے قرطاجنی جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی موت

صاف دکھائی دینے لگی۔ کوناڈس نے آناً فاناً اپنے عقبی محافظ دستے کو حکم دیا کہ وہ نئی مہم پر روانہ نہ ہوں بلکہ عقب کا دفاع کریں۔ اس نے کچھ ہی دیر پہلے فیصلہ کیا تھا کہ وہ موآبرلیس کے غیر محفوظ عقب پر حملہ کرنے کیلئے خصوصی جہاز روانہ کرے گا۔ لیکن اب تو اسے خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ایک تو اس کا لشکر قرطاجنیوں سے کم تھا، اوپر سے قرطاجنیوں کی ہر حکمت عملی اس کی جنگی تدبیروں سے بہتر ثابت ہو رہی تھی۔ اسے شدت کے ساتھ اپنی کم مائیگی کا خیال آیا اور وہ غصے میں آنے لگا۔

اب قرطاجنی بیڑے نے کوناڈس کے عقب پر بھی حملہ کر دیا تھا۔ منجنیقیں، آگ میں لپٹے پتھر پھینکنے لگیں اور تیر اندازوں نے سمندر کے پانی پر چھاؤں کر دی۔ رومیوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے نالائق سردار نے آج انہیں مروا دیا۔

کوناڈس کو ماسوائے پسپائی کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اس نے مزید کوئی حماقت کرنے کی بجائے فرار میں ہی عافیت جانی اور اپنے پورے لشکر کو پہلوؤں سے پسپا ہونے کا حکم دیا۔ پہلوؤں سے پسپا ہونے کا مطلب تھا، رومی لشکر کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا۔ ظاہر ہے پہلو تو دو ہی تھے، عقب اور پیش منظر پر تو قرطاجنی چھائے ہوئے تھے۔ کوناڈس کا آدھا لشکر مغربی اور آدھا مشرقی پہلو کی طرف سرکنے لگا۔ اور یہ تو تقدیر کا اٹل قانون تھا کہ پسپا ہونے والوں کو بے دردی سے کچل دیا جاتا تھا۔ بزدل بن کر بھاگنے سے تو بہتر تھا کہ وہ بہادر بن کر ٹکرا جاتے اور مر جاتے۔ شاید اس طرح رومیوں کی کچھ بچت ہو جاتی، لیکن وہ تو دم دبا کر بھاگ رہے تھے۔ قرطاجنیوں نے رومیوں کو یوں فرار ہوتے دیکھا تو اور بھی شیر ہو گئے۔ اب قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ رومی جنگی بیڑے کے جہاز اور سپاہی بے طرح موت کے منہ میں دھکیلے یا گرفتار کیے جا رہے تھے۔

کوناڈس نے ایسی جنگ کا تو نہ سوچا تھا۔ اس کا غم و غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اپنے بیڑے کو چوہوں کی طرح بھاگتے دیکھا تو اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ ایسی ذلت اور رسوائی کا تو اس نے کبھی سپنا بھی نہیں دیکھا تھا۔ معاً اس کی نگاہ دور قرطاجنی سپہ سالار کے پرچم پر پڑی۔ کوناڈس کا غصہ سوا ہو گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چلا چلا کر اپنے ماتحت افسروں کو حکم دینے لگا۔

''میرے جہاز کو...... ادھر لے چلو!...... فوراً، جتنی تیزی کے ساتھ ممکن ہے جہاز کو

دوڑاؤ۔ میں اس رسوائی کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کوناڈس کے ماتحت افسروں نے سوچا ان کے سپہ سالار کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل میں لیت ولعل سے کام لیا تو کوناڈس نے تلوار نکال لی اور نہایت برہم لہجے میں گرجا۔

"میں کہتا ہوں حکم کی تعمیل کرو۔ اگر کسی کو انکار ہے تو میری اس کے ساتھ جنگ ہے۔ آؤ! میری شمشیر کے ساتھ شمشیر ٹکراؤ۔ اور یقین حاصل کرلو کہ مجھے مجلس رومہ نے خواہ مخواہ سپہ سالار نہیں بنا دیا۔"

وہ سچ مچ پاگل ہو چکا تھا۔ اس کی حالت ہذیانی تھی۔ کوناڈس کے ماتحت ڈر گئے۔ جہاز کو قرطاجنی لشکر کی طرف موڑ دیا گیا۔ کوناڈس کا مضبوط، تیز رفتار جہاز...... موآ برلیس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے تیرانداز ترکش پہ ترکش خالی کر رہے تھے۔ اور اس کے جہازوں کی منجنیقیں چلتے ہوئے پتھروں کا فوارہ بن چکی تھی۔ اس کے سامنے جو آتا، کوناڈس اسے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ اب تک وہ سات قرطاجنی جہازوں کو توڑتا ہوا سپہ سالار موآ برلیس کے جہاز کی طرف بڑھ چکا تھا۔

رومی بحری سالاروں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سپہ سالار کو یہ احمقانہ حرکت کرتے دیکھا تو ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے اپنے جہازوں کو رکنے کا حکم دیا اور پسپا ہوتے ہوئے جہازوں کو رکنے کے احکامات جاری کرنے لگے۔

کوناڈس پاگل ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند موآ برلیس کے جہاز کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ پوری کی پوری رومی سپاہ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ رک کر اپنے سب سے بلند پرچم والے جہاز کو دور سے دیکھنے لگے۔ کوناڈس کا جہاز قرطاجنی بیڑے کو چیرتا ہوا سیدھا موآ برلیس کے جہاز کے ساتھ آ ٹکرایا۔

موآ برلیس چاہتا تو میدان سے فرار ہو سکتا تھا۔ اس کا جہاز بھی کم تیز نہیں تھا۔ لیکن وہ رکا رہا۔ وہ جیتی ہوئی جنگ کا سپہ سالار تھا۔ کوناڈس کے آس پاس ہر جہاز موآ برلیس کا تھا۔ کوناڈس کو چہار اطراف سے سنگ باری کا سامنا تھا۔ ایسی صورت میں اگر موآ برلیس ایک قدم بھی پیچھے ہٹتا تو یہ اس کے اور اس کی فوج کیلئے بزدلی کی بات تھی۔

کوناڈس نے جان دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ عظیم رسوائی سے بچنے کے لیے خودکشی پر

اتر آیا تھا۔ جونہی اس کا جہاز قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز سے ٹکرایا۔ سب سے پہلے...... خود کوناڈس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اڑتا ہوا قرطاجنی جہاز پر آرہا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے اس کے ہمراہ، جوشیلے رومی افسر بھی چھلانگیں مارتے ہوئے قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز پر سوار ہونے لگے۔

اپنے سپہ سالار کو یوں دیوانہ وار موآبریس پر جھپٹتا دیکھ کر رومیوں کے بھاگتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ چلا چلا کر ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ رومی لشکر محض کوناڈس کی دلیری کی بدولت یکا یک واپس پلٹنے لگا۔ ہر رومی سپاہی کے دل میں تقریباً وہی جذبات تھے جو ان کے سپہ سالار کوناڈس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہی غم وغصہ، وہی نفرت، وہی ذلت اور رسوائی کا شوق شکن احساس۔

رومی لشکر کا دایاں اور بایاں بازو تو پہلے بھی باقی لشکر کی نسبت کم مرعوبیت کا شکار تھے۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک بہادری سے لڑے تھے۔ کبھی قرطاجنی لشکر کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیتے اور کبھی خود پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان بازوؤں کو تو اس وقت حیرت ہوئی تھی جب رومی سپہ سالار نے پسپائی کا حکم دیا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو کے سالاروں نے کوناڈس کا حکم سنا لیکن فوری طور پر پسپا نہ ہوئے کیونکہ وہ ابھی تک برابری کی سطح پر لڑ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی کوناڈس کی بے باکانہ یلغار کا آغاز ہوا، دائیں اور بائیں بازو کے سالار پھر ڈٹ گئے۔

کوناڈس بنفس نفیس...... موآبریس کے جہاز پر سوار ہو چکا تھا اور اب قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز میں عجب وحشیانہ پیکار جاری تھی۔ دونوں طرف کے سالار اور سپاہی نہلے پر دہلا تھے۔ کوناڈس کی شمشیر بجلی کا کوندا بن چکی تھی۔ وہ جس قرطاجنی پر برستی اس کے چودہ طبق روشن کر دیتی۔ وہ آج جان ہار کر لڑ رہا تھا۔ قرطاجنی سالار اور سپاہی اس کی بے پرواہی سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اکیلا رومی سپہ سالار ان سب کو کاٹ ڈالے گا۔ کوناڈس کی تلوار ایک کے بعد ایک قرطاجنی افسر کا سر کاٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بوڑھا موآبریس اور کوناڈس آمنے سامنے آ گئے۔ کوناڈس کا خوفناک حملہ بہت بھاری رہا تھا۔ اس نے آن کی آن میں بہت سے قرطاجنی جنگجوؤں کو مار گرایا تھا۔ لیکن پھر بھی قرطاجنیوں کی تعداد کم نہ پڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جتنے قرطاجنی مر رہے تھے، ان سے زیادہ دوبارہ جہاز پر سوار ہو رہے

تھے۔ یہ نئے سوار ہونے والے وہ قرطاجنی سپاہی تھے، جو سمندر کے پانی میں تیر کر اپنے سپہ سالار کی مدد کیلئے پہنچ رہے تھے۔ لیکن کوناڈس تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسے اپنی جان کی پرواہ کب تھی؟ وہ تو قرطاجنی سپہ سالار کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ ایک نہایت بہادر اور نڈر سپاہی ہے۔

موآبریس اور کوناڈس کی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو آس پاس کھڑے دونوں طرف کے سپاہیوں نے چونک کر اپنے اپنے سپہ سالاروں کو دیکھا۔ موآبریس کے مددگاروں نے آگے بڑھ کر بوڑھے سالار کی مدد کرنا چاہی لیکن موآبریس نے انہیں بہ آواز بلند حکم دے کر روک دیا۔

"خبردار کوئی آگے نہیں بڑھے گا۔"

اور اب دونوں لشکروں کے سپہ سالار دوبدو تھے۔ موآبریس بوڑھا تھا اور کوناڈس پختہ عمر کا آزمودہ کار جرنیل۔ سب مددگار رک گئے۔ قرطاجنی تو پہلے ہی آگے نہ بڑھے تھے۔ دونوں لشکروں کے سپہ سالار...... ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ موآبریس کا قد کوناڈس سے قدرے نکلتا ہوا تھا اور کوناڈس کی جسمانی صحت...... بوڑھے موآبریس سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں شمشیریں تھیں، ڈھالیں نہیں تھیں۔ بحری سپاہیوں کو عام طور پر ڈھالوں کے بغیر ہی لڑنا پڑتا تھا۔ بوڑھے موآبریس کے حملوں میں تیزی اور شدت کی بجائے حکمت تھی۔ اس کے برعکس کوناڈس تیزی اور شدت کے ساتھ حملہ کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں قرطاجنی سپہ سالار کا جہاز کھیل کا میدان بن گیا۔ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی چھوڑ کر اس عظیم مبارزت کا نظارہ کرنے لگے۔ آس پاس کے جہازوں پر بھی بہت سے سپاہی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ البتہ کچھ فاصلے پر گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ کوناڈس کے پسپا ہوتے ہوئے سپاہی اپنے سالار کی دلیری دیکھ کر واپس پلٹ آئے تھے اور پلٹے بھی ایسے تھے کہ ان کے رگ و ریشے میں بجلیاں بھر چکی تھی۔ وہ اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ لینے کیلئے جان ہار کر لڑ رہے تھے۔ "جیسا سالار ویسی فوج" کے مصداق ہر رومی...... کوناڈس جیسی ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جنگ کا پانسہ پلٹتا جا رہا تھا۔

ٹن کی آواز سے کوناڈس کی شمشیر...... موآبریس کے سر پر پڑی۔ اگر موآبریس نے

لوہے کا خود نہ پہن رکھا ہوتا تو کوناڈس کی تلوار اسے دو حصوں میں کاٹ کر پھینک دیتی۔ قرطاجنی سپاہیوں کے دل دہل گئے۔ یہ پہلا وار تھا جو موآبریس روک نہ پایا تھا۔ ٹھیک اسی وقت موآبریس نے بدلہ لے لیا۔ ہو بہو اسی طرح...... اب موآبریس کی شمشیر کوناڈس کے سر پر ٹن کی آواز کے ساتھ پڑی۔ یکا یک قرطجانیوں کے چہرے کھل اٹھے اور فضا تالیوں کی آواز سے گونجنے لگی۔

جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ لیکن دونوں پرانے جہاز ران اور قزاق لڑ رہے تھے۔

موآبریس بوڑھا تھا لیکن اس کے بازوؤں میں نوجوانوں سے زیادہ قوت تھی۔ اس کی تلوار کوناڈس کے سر پر پڑی تو کوناڈس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ لیکن اس نے فوراً اپنے سر کو جھٹکا اور اگلے لمحے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ حملہ آور ہو گیا۔ ابھی تک دونوں سالار...... برابر تھے۔ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ بعض سپاہی اپنے جہازوں پر سے پانی میں کود گئے تھے اور تیرتے ہوئے موآبریس کے جہاز پر چلے آئے تھے۔ اس دوڑ دھوپ میں صرف قرطاجنی ہی شامل نہ تھے، رومی بھی متواتر اسی جہاز کی جانب لپک رہے تھے۔ آن کی آن میں دونوں سالاروں کی مبارزت کی خبر دونوں لشکروں میں پھیل گئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ جہاں جہاں لڑائی جاری تھی دونوں طرف کے سپاہی خود کو بھی سالار تصور کرنے لگے۔

قرطاجنیوں نے محسوس کیا کہ انکا بوڑھا سالار اب دھیرے دھیرے تھکتا جارہا تھا۔ بعض قرطاجنی اس پریشانی کا اندازہ کر کے یہ سوچنے لگے کہ وہ اس مبارزت میں داخل ہو جائیں۔ لیکن انہیں ان کے سپہ سالار نے سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔ وہ رک گئے۔ ایک قرطاجنی سالار نے اپنے ساتھیوں کی دل جوئی کے لیے کہا۔

''موآبریس تھکنے والوں میں سے نہیں۔ تھکاوٹ کا مظاہرہ کرنا اس کی چال ہے۔ تم دیکھنا وہ اچانک بجلی کے کوندے کی طرح لپکے گا اور کوناڈس کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دے گا۔''

قرطاجنی سالار کی بات سن کر باقی قرطاجنیوں کے چہروں پر کھوئی ہوئی رونق لوٹ آئی اور پھر وہی سچ ثابت ہوا۔ تھکاوٹ کی اداکاری...... موآبریس کی چال تھی۔ کوناڈس نے سمجھا کہ بڈھا سالار اب تھک چکا ہے۔ چنانچہ اس کے حملوں میں تھوڑی سی بے پروائی در آئی۔ اور اسی بے پروائی کا فائدہ اٹھا کر موآبریس نے کوناڈس پر اپنا داؤ آزمایا۔ موآبریس

بدستور تھکنے کی اداکاری کرتا کرتا...... ایک بار نیچے جھکا اور ایک تھکے، ٹوٹے ہوئے انسان کی طرح اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی فرش پر ٹکا دی۔ جیسے خود کو گرنے سے بچانے کیلئے سہارا لے رہا ہو۔

کوناڈس نے اسے اپنی جیت سمجھا اور آخری وار سمجھ کر پوری قوت سے اپنی تلوار بلند کی اور پھر موآبریس پر گرا دی۔ لیکن موآبریس کسی چھلاوے کی طرح اچانک نیچے سے پھسل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کی پھرتی دیکھنے کے لائق تھی۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڈھا بجلی کی طرح حرکت میں آیا تھا۔ کوناڈس کا وار جہاز کے فرش کے تختے پر اتنی زور سے پڑا کہ اس کی تلوار لکڑی کے تختے میں بری طرح کھب گئی۔ بالکل ایسے، جیسے کوئی کلہاڑے کی زور دار ضرب سے کلہاڑے کے پھل کو لکڑی میں گھسیڑ دے۔ ظاہر ہے اب تلوار واپس نکالنے کے لیے کوناڈس کو بے پناہ زور لگانا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب پھرتیلے بڈھے نے ایک اور کام دکھایا۔ موآبریس نے اپنے پیر کے بھاری جوتے کی ایک زوردار ضرب کوناڈس کی تلوار کے دستے پر لگائی۔ تلوار کوناڈس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اب وہ نہتا تھا۔ کوناڈس کو جونہی اندازہ ہوا کہ وہ فوری طور پر تلوار نہیں نکال سکتا تو اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اس نے خود کو موآبریس کے داؤ سے بچاتے ہوئے روایت کے مطابق ''سینہ ٹھونکنا'' شروع کر دیا۔ یہ دعوت تھی، دست بدست لڑائی کی۔ اس عہد میں جب کوئی ایک پہلوان کسی دوسرے پہلوان کو کشتی کی دعوت دیتا تھا تو اسی طرح سینہ بجا بجا کر اسے شہہ دیتا تھا۔ کوناڈس نے سینہ بجایا تو جہاز پر موجود سب رومی بھی زور زور سے اپنے سینے بجانے لگے۔ ہر طرف دھپ دھپ کی آوازیں ایک خاص لے کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ موآبریس نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا اور سب کا مدعا سمجھ گیا۔ اس نے اپنی شمشیر ایک طرف پھینکی اور کوناڈس سے کہا۔

''میں تمہارے دل کا کوئی ارمان ادھورا نہیں رہنے دوں گا۔ اگر تم میرے ساتھ کشتی کرنا چاہتے ہو تو مجھے اس سے بھی کوئی انکار نہیں۔''

اور اب کوناڈس اور موآبریس دو پہلوانوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ جونہی ایک دوسرے کے نزدیک پہنچے، کوناڈس نے ہوا میں اچھل کر اپنی لات گھمائی اور بوڑھے موآبریس کے پہلو میں دے ماری۔

اگر موآبریس عین وقت پر ایک قدم پیچھے نہ ہٹ گیا ہوتا تو وہ اب فرش پر پڑا تڑپ رہا ہوتا۔ لیکن وہ بھی آخر موآبریس تھا اس نے اپنی تمام زندگی لڑائی، بھڑائی میں گزاری تھی۔ کوناڈس نے ایک لات پر بس نہ کی۔ اگلے لمحے وہ اپنی دوسری لات گھما چکا تھا۔ اس بار بھی موآبریس نے خود کو بچالیا اور اس بار تو بڈھے سالار نے کوناڈس کی لات کو اپنی کہنی پر روکا۔ کوناڈس کو یوں لگا جیسے لوہے کے ڈنڈے سے ٹکرا گئی ہو اس کی لات۔ اب موآبریس کا ایک پنا تلا مکہ...... رومی سالار کی طرف لپکا لیکن کوناڈس نے فوراً اپنا چہرہ ایک طرف ہٹالیا۔

دونوں سالاروں میں غضب کی دستہ بدست جنگ شروع ہو چکی تھی۔ قرطاجنی تو قرطاجنی، رومی سپاہی بھی بڈھے موآبریس کی پھرتی دیکھ کر عش عش کر اٹھے تھے۔ بحر روم کے سینے پر برپا قیامت کے بیچوں بیچ ایک ایسا علاقہ بھی تھا جہاں خاموشی تھی، سناٹا تھا، سب تماشائی سانسیں روکے کھڑے تھے۔ دونوں لڑاکا سردار...... کشتی لڑ رہے تھے۔ عجب سماں تھا۔ دور جنگ ہو رہی تھی۔ رومی پاگلوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ اپنے سالار کے اونچے پرچم والے جہاز کو قرطاجنیوں کے بیچوں بیچ دیکھتے تو ان کا جذبہ اور بھی سوا ہو جاتا۔

یکا یک کوناڈس کا دایاں گھٹنا، موآبریس کی ناف کے نیچے پڑا۔ بڈھے سردار کے ضرب پڑی تو وہ یکلخت دہرا ہو گیا۔ درد کی شدید لہر نے اسے آن واحد میں سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زمین کی طرف جھکا۔ کوناڈس کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے جھکے ہوئے موآبریس کے چہرے پر اپنے پیر کی ٹھوکر سے ایک اور شدید ضرب لگائی۔ موآبریس ایک طرف کو لڑھک گیا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پیٹ پر تھے۔ اب وہ معطل ہو چکا تھا۔ آس پاس کھڑے قرطاجنی تماشبین سپاہیوں کو آنے والے خطرے کا اندازہ ہوا تو وہ یکلخت آگے بڑھے۔ وہ موآبریس کو کوناڈس کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ لیکن......

لیکن ابھی قرطاجنی افسروں نے ایک دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ کوناڈس نے لکڑی کے تختے میں کھبی اپنی شمشیر پوری قوت سے واپس کھینچ لی۔ کوناڈس بے ایمانی کر رہا تھا۔ کشتی میں تلوار کا استعمال جائز نہیں تھا۔ موآبریس نے کوناڈس کو نہتا دیکھ کر اپنی شمشیر پھینک دی تھی۔ لیکن کوناڈس نے بڈھے سالار کو زیر کرنے کے بعد اس کے نہتے پن کی پرواہ نہ کی۔ کوناڈس نے اپنی شمشیر ہوا میں لہرائی اور اس سے پہلے کہ قرطاجنی افسر اپنے سپہ سالار کی مدد کو پہنچتے کوناڈس نے درد سے کراہتے موآبریس پر وار کر دیا۔ موآبریس نے بے اختیارانہ انداز

میں اپنے ہاتھ آگے کر دیئے۔ جیسے وہ خود کو اس طرح تیز دھار تلوار کی کاٹ سے بچا لیتا۔ بوڑھے موآبرلیس کے ہاتھ کلائیوں سے کٹ کر دور جا گرے۔

تماشائیوں میں یکا یک کھلبلی مچ گئی۔ ایک زوردار چیخ کی آواز فضا میں گونجی اور ہر طرف شور و غوغا بلند ہونے لگا۔ جتنے قرطاجنی اور رومی ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے وہ آپس میں بھڑ گئے۔ وہ قرطاجنی افسر جو موآبرلیس کی جان بچانے کی غرض سے آگے بڑھے تھے، کوناڈس پر پل پڑے۔ کوناڈس اپنے بوڑھے مدمقابل پر دوسرا وار نہ کر سکا۔ اسے فوری طور پر نئے حملہ آوروں کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا۔ ہاتھ کٹنے کے بعد بوڑھے موآبرلیس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس کی کلائیوں سے لہو کسی فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوناڈس بیک وقت پانچ قرطاجنی افسروں کی تلواروں کا سامنا کر رہا تھا۔ معاً کوناڈس ایک تلوار کے وار کو نہ بچا سکا اور تلوار اس کے سینے پر موجود بھاری بھرکم زرہ پر پڑی۔ لوہے کی زنجیروں والی زرہ کی کڑیاں اندر کی طرف دھنسیں اور کوناڈس کی ایک پسلی کو توڑتی ہوئی اس کے سینے میں گھس گئیں۔ کوناڈس درد سے کراہا۔ لیکن اس نے دشمن کے واروں سے خود کو بچانا ترک نہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک اور وار اس کے بازو پر پڑا اور کوناڈس کا دایاں بازو بری طرح زخمی ہو گیا۔ معاً کوناڈس کو محسوس ہوا جیسے وہ خود کو بچا نہیں پائے گا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... ایک جست بھری اور مقابلے کے میدان سے نکل بھاگا۔ قرطاجنی افسر اس کے پیچھے لپکے...... لیکن کوناڈس کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ اگلے لمحے وہ چھپاک کی آواز کے ساتھ سمندر میں کود چکا تھا۔

موآبرلیس کی کلائیوں سے زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ وہ اپنے تئیں کلائیوں کو اپنے ہی بدن کے ساتھ دبا کر خون روکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ لیکن اس کے دونوں ٹنڈ منڈ ہاتھ کسی ندی کی طرح لہو کو ابل رہے تھے۔ موآبرلیس کا بوڑھا بدن لہو سے خالی ہونے لگا، اسے چکر آ گیا اور وہ دوبارہ فرش پر گر پڑا۔

ہر طرف گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ قرطاجنی سپہ سالار موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے ماتحت افسران اسے بچانے کی ہر ممکنہ کوشش میں مصروف تھے۔ کوناڈس تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن قرطاجنی سپہ سالار کے جہاز پر موجود باقی رومی جنگ بازوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ اس وقت قرطاجنی سپہ سالار کا جہاز محفوظ تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی

کہ موآبریس کے قتل کی خبر سمندر کی سطح پر پر لگا کر اڑی اور دونوں لشکروں میں پھیل گئی۔ رومیوں کے حوصلے آسمان کو چھونے لگے۔ اور قرطاجنیوں کی امیدیں...... مایوسی میں بدلنے لگیں۔

جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ کوناڈس گرتا پڑتا اپنے جہازوں تک تو پہنچ گیا تھا لیکن اسے خود بھی اپنے بچنے کی امید نہیں تھی۔ اس کی پسلی ٹوٹ چکی تھی اور زرہ کی کڑیاں اس کے دل کو چھو رہی تھیں۔

آسمان کی آنکھیں سمندر کی سطح پر انسانوں کے قتل عام کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ عظیم سمندر کے سینے پر آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔ لیکن سمندر پھر بھی پرسکون تھا۔ جہازوں سے جہاز ٹکرا رہے تھے۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور انسانوں کو انسان قتل کرتے جا رہے تھے۔ رومیوں نے ایک ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ اس فتح کا تمام تر سہرا کوناڈس کے سر تھا۔ کوناڈس نے غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس ایک شخص کی جرأت نے ہزاروں جہازوں پر سوار لوگوں کی قسمت کے فیصلے بدل دیئے تھے۔

غروب آفتاب تک قتل عام جاری رہا۔ کوناڈس اور موآبریس دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے قرطاجنی افسروں نے نکل بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ان کے بازوؤں میں اب مزید سکت نہ تھی کہ رومیوں کو وحشیانہ یلغار سے روک پاتے۔ موآبریس کی موت کئی گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پوری قرطاجنی فوج کے دل ٹوٹ چکے تھے۔ انہوں نے اب انتقام لینے والے جذبے کے تحت رومیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

اس جنگ میں دونوں طرف کی فوجوں کا بھاری نقصان ہوا تھا۔ سمندر میں ہر طرف انسانی اعضاء اور لاشیں تیر رہی تھیں۔ قرطاجنیوں کو پسپا ہوتا دیکھ کر بھی رومی افسروں نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ وہ تھک چکے تھے۔ ان کا سالار بھی ہلاک ہو چکا تھا اور ان کے پاس فوری طور پر کوئی نئی حکمت عملی نہیں تھی۔

لیکن زیادہ نقصان قرطاجنیوں نے اٹھایا۔ ان کی آدمی سے زیادہ فوج اس وقت سمندر کی سطح پر لاشوں کی صورت تیر رہی تھی۔ جو بچ گئے تھے ان میں زیادہ تر زخمی تھے۔ ان کے بیشتر جہاز تباہ ہو چکے تھے یا دشمن نے اسیر کر لیے تھے۔ کوناڈس اور موآبریس کی دیرینہ

دشمنی نے بالآخر وہ رنگ دکھایا تھا کہ سمندر کی روح بھی کانپ اٹھی تھی۔ وثوق سے نہ کہا جاسکتا تھا کہ آخر فتح کس فریق کی ہوئی۔ یہ جنگ نہ تھی ایک قتل عام تھا۔ اعداد وشمار کے تناسب سے یہ جنگ قرطاجنی ہار گئے تھے۔ لیکن وہ ہار کر بھی اپنے آدھے، زخمی لشکر کو بچا لائے تھے۔ اس عظیم معرکے نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ کوئی جہاز ایسا نہ تھا جو سلامت ہوتا یا آئندہ کسی جنگ کے لیے بحر روم میں روک لیا جاتا۔ قرطاجنی افسروں کے پاس ماسوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے وطن قرطاجنہ کی طرف لوٹ جاتے۔ چنانچہ انہوں نے یہی فیصلہ کیا۔

پاکستانی وقار عظیم ڈاٹ کام پوائنٹ

شارق کو جب سے کلاڈینا مل کر گئی تھی۔ وہ یکسر بدل چکا تھا۔ کلاڈینا اور دانیال مارفیس جزیرہ کی طرف چلے گئے تھے۔ اور شارق پوری تندہی سے قرطاجنہ کے دفاع میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس کے بیڑے میں جہازوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن پھر بھی وہ ابھی تک شیراٹن جیسے عظیم سپہ سالار کو روکے کھڑا تھا۔ رومیوں کے پاس ہزاروں جہاز تھے اور وہ دیوتاؤں کی دیوار تلے فصیل بنائے کھڑے...... شارق کے جہازوں کو کچل کر دیوتاؤں کی دیوار تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن شارق کی حکمت عملی لاجواب تھی۔ شیراٹن کا ہر حملہ ابھی تک ناکام ہوا تھا۔ یہ بحری جنگ عجیب تھی، جو قرطاجنہ کے سائے میں لڑی جارہی تھی۔ شیراٹن کے جہازوں نے تینوں اطراف سے قرطاجنہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کے تمام راستے مسدود ہوچکے تھے۔ اور ہر آنے والے دن کے ساتھ اہل قرطاجنہ کی امیدوں پر پانی پھرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شیراٹن کے جہاز دن بھر قرطاجنی دفاعی بیڑے پر گولہ بارود برساتے اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ شارق کے تیز رفتار جہاز پل میں ادھر اور پل میں ادھر بھاگتے، دوڑتے نظر آتے۔ اوپر دیوتاؤں کی دیوار پر دن بھر اہل قرطاجنہ کھڑے رہتے اور اپنے دفاعی بیڑے کے حیران کن دفاع کو ملاحظہ کرکے پریشان اور خوش ہوتے رہتے۔

شارق مایوس نہیں تھا حالانکہ مایوس کن حالات میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ قرطاجنہ اپنی بناوٹ اور محل وقوع کے اعتبار سے سطح سمندر سے بہت بلند تھا۔ یہ شہر تین اطراف سے پانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ شارق نے کمال مہارت سے شہر کے دفاع کو کامیاب بنا رکھا تھا، لیکن وہ...... تجارتی راستوں کو مسدود ہونے سے نہ روک سکا۔

شیراٹن کے جہازوں کی تعداد ہی اتنی زیادہ تھی کہ شارق کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ آخری سانس تک قرطاجنہ کے تحفظ کی جنگ لڑے گا۔ کیونکہ

اس کے محبوب کی بھی آرزو تھی۔ شارق کا جہاز، سب جہازوں سے مختلف تھا۔ یہ ایک بڑی کشتی جیسا تھا۔ جس کی رفتار بے حد تیز تھی۔

اوپر فصیل پر بھی جانیکس کے حکم سے منجنیقیں نصب کروائی گئی تھیں جو برے وقت کے لیے تھیں۔ یہ فصیل نہیں تھی۔ یہ دیوتاؤں کی دیوار تھی۔ قرطاجنہ کی کنواری نے اس خیال کے تحت کہ اگر دفاعی بیڑا ایشور نہ کرے توڑ دیا جائے تو دشمن پر پتھر برسائے جاسکیں تاکہ وہ دیوتاؤں کی دیوار پر کمندیں نہ ڈال سکے، فصیل پر منجنیقیں نصب کروائی تھیں۔

شارق نے پہلے روز، شیراٹن کے ہراول دستے کو جہاں روکا تھا، وہاں سے آج تک رومی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ شارق کا ہراول دستہ اپنی ساخت اور ماہیت کے اعتبار سے تو منفرد تھا ہی اس کا طرزِ عمل بھی عام جنگجوؤں جیسا نہیں تھا دن میں شارق اپنے ہراول کو بکھر جانے کا حکم دیتا تو پتہ ہی نہ چلتا کہ کونسا جہاز کس طرف نکل گیا۔ شیراٹن دھوکا کھا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو شارق کا ہراول اچانک نمودار ہو جاتا اور کچھ ایسی تیزی سے دشمن پر وار کرتا کہ دن دہاڑے کی لڑائی بھی شب خون محسوس ہونے لگتی۔

شیراٹن بے شک ایک ماہر بحری کپتان تھا، لیکن مارفیس کے قزاق کے ساتھ اس کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑ رہا تھا۔ آتش گیر تیل سے بھری ہوئی مٹی کی ہانڈیاں، جو صرف اور صرف اسی مقصد کے تحت بنائی گئی تھیں۔ شیراٹن کے جہازوں پر آ کر پھوٹتیں تو لکڑی کے تختے آن واحد میں آگ پکڑ لیتے۔ اس کے برعکس رومیوں کے پاس تیل بھری ہانڈیاں نہیں تھیں۔ ان کے پاس تو منجنیقوں کے ذریعے برسائے جانے والے پتھر ہی تھے۔ وہ دن بھر گولہ باری کرتے، لیکن شارق کے چھلاوہ جہازوں کا زیادہ نقصان نہ ہوتا۔ شارق کے بیڑے میں موجود وہ بحری جہاز جو مستقل طور پر دیوتاؤں کی دیوار کے گرداگرد حفاظتی گھیرا ڈالے ہوئے...... شیراٹن کے بیڑے کی گولہ باری سے دور تھے۔ ابھی تک تو شیراٹن شارق کے ہراول کو ہی مات نہ دے سکا تھا۔ شیراٹن کے ماتحت افسران اس صورتحال سے پریشان تھے، لیکن شیراٹن خود پریشان نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ جان بوجھ کر اپنے فیصلہ کن حملے کو طول دے رہا ہے۔ وہ واقعی جان بوجھ کر طول دے رہا تھا۔ اسے اورلیس کے محاصرے کا انتظار تھا۔ خشکی کی طرف سے قرطاجنہ پر حملہ کرنے والا رومی سالار اورلیس جب تک شیراٹن کو آخری اشارہ نہ دیتا تب تک وہ دیوتاؤں کی دیوار پر چڑھائی نہ کرنا چاہتا تھا۔ تب تک وہ وقت گزاری اور شارق کو چھوٹی چھوٹی جنگوں

میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ چھوٹی چھوٹی جنگیں بھی شارق لڑ رہا تھا اس لیے ہر بار شیراٹن کو دانتوں پسینہ آ جاتا۔

شارق...... نادان نہیں تھا، وہ شیراٹن کے فیصلہ کن حملہ نہ کرنے کی وجہ جانتا تھا۔ اور یہی اس کی خوش بختی بھی تھی۔ کیونکہ اس طرح وقت گزارنا صرف شیراٹن کے لیے مفید ثابت نہ ہوسکتا تھا۔ خود قرطاجنہ اور شارق کو بھی اس تاخیر کا فائدہ تھا۔ قرطاجنہ کی کنواری کی خصوصی درخواست پر مارفیس جزیرہ سے کمک طلب کی گئی تھی اور شارق چاہتا تھا کہ دانیال اور کلاڈینا کی واپسی تک وہ کسی بڑی جنگ میں نہ الجھے۔

خشکی کی صورتحال سب سے زیادہ دلچسپ تھی۔ وہاں تو جنگ کی بجائے کھیل جاری تھا۔ مجلس قرطاجنہ کے حکم کی پاسداری کرتے ہوئے برتھاس زیادہ آگے تک نہ گیا تھا۔ وہ قرطاجنہ کی حدود میں رک کر اورلیس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اور پھر جب اورلیس پہنچا تو دونوں لشکر ایک وسیع و عریض وادی میں آمنے سامنے پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گئے۔ اورلیس جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔ وہ قرطاجنی سپاہ کی زیادہ سے زیادہ قوت قبل از وقت ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کھلے میدان میں دوبدو...... برتھاس کے لشکر کو کمزور کر دے۔ اس کی یہ حکمت عملی جنگ لڑ کر پوری نہ ہوسکتی تھی، وہ جانتا تھا کہ قرطاجنی اپنی سرزمین پر کھل کر لڑیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قرطاجنیوں کے دلوں پر رومیوں کی دہشت بٹھانے کے لیے آئے روز مبارزت کے ذریعے قرطاجنہ کے بڑے بڑے سورماؤں کو چن چن کر مار دینا چاہتا تھا۔ اورلیس نے ازخود برتھاس کی طرف سفارت بھیجی تھی کہ مبارزت کی جنگ لڑی جائے۔

برتھاس کو معلوم تھا کہ اس طرح کی جنگ میں قسمت کی دیوی ساتھ نہ دے تو پوری فوج کا حوصلہ خاک میں مل جاتا ہے۔ لیکن اس نے اورلیس کی فرمائش سے انکار نہ کیا۔ اس نے بھی جواباً مبارزت کی جنگ لڑنے کا طریقہ پسند کیا۔ اور اب گزشتہ کئی دنوں سے دونوں طرف کے سورما اپنے اپنے قوت بازو کو آما رہے تھے۔ ہر روز صبح نقارے اور بگل بجتے...... دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے اپنی صفیں آراستہ کرتیں اور دونوں طرف کے مبارزین باری باری داد شجاعت دیتے۔ دن بھر درمیانی میدان میں دھول اڑتی رہتی اور کبڈی کے مقابلوں کی طرح چاروں طرف جمع تماشائی زندگی اور موت کے اس کھیل کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتے رہتے۔

اوریس' قرطاجنہ کا محاصرہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برتھاس کیساتھ لڑے بغیر وہ قرطاجنہ کے دروازے تک نہیں پہنچ پائے گا۔ چنانچہ وہ برتھاس جیسے جرنیل کے ساتھ بے سوچے سمجھے کوئی جنگ نہ لڑنا چاہتا تھا۔ حالانکہ ہر روز دونوں طرف کی صفیں آراستہ ہوتی تھیں اور جنگ کسی بھی لمحے شروع ہو جانے کی صورتحال پیدا ہو جاتی۔ لیکن جنگ نہ ہوتی۔ دونوں طرف کے یودھا اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے اور ہر روز غروب آفتاب سے پہلے بغیر جنگ لڑے ہی دونوں طرف سے واپسی کے بگل بجا دیئے جاتے۔

اگر اوریس یا شیراٹن کو خبر ہوتی کہ اہل قرطاجنہ کے لیے مارفیس سے کمک آنے والی ہے تو وہ یقیناً یہ فالتو کی تاخیر نہ کرتے۔ آخر ایک دن اوریس کے سالاروں نے اس سے کہا۔

''سپہ سالار!..... مبارزت کی جنگ میں ہمارے قیمتی جنگ باز ضائع ہو رہے ہیں۔ قرطاجنہ دشمن کا گھر ہے، وہ ایک سے ایک جنگ باز لا سکتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے بہترین سپاہیوں کو کھو دیا تو ہم قرطاجنہ کو فتح کیسے کریں گے۔''

اوریس کو اندازہ تھا کہ اس کے سردار اس طرح کا سوال کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنے سرداروں کو مختصر جواب دیا۔

''میں ایک کھیل کھیل رہا ہوں۔ اگر اس میں ہمیں کامیابی ہوگئی تو سمجھو قرطاجنہ ہمارا ہے۔ تم لوگ بے فکر رہو۔ اوریس رومہ کی آن پر حرف نہیں آنے دے گا۔''

لیکن رومی سالار اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ موجرائس نامی ایک رومی سالار نے قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں اوریس سے کہا۔

''یہ جنگ ہے کوئی کھیل نہیں، جسے آپ کھیل رہے ہیں۔ اگر دشمن کی کمک کہیں سے آ پہنچی تو ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم قرطاجنہ کی فصیل تک بھی نہ پہنچ پائیں گے۔''

اوریس کو اپنے ماتحت سالار موجرائس کا لہجہ بہت برا لگا۔ لیکن اس نے بظاہر محسوس نہ ہونے دیا اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو مجھ پر اعتماد نہیں تو ہم کل ہی عام جنگ کا اعلان کر دیتے

ہیں۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم برتھاس کو الٹے قدموں پر بھگانے میں کامیاب ہوجائیں گے اور وہ پسپا ہوکر بھاگتا ہوا قرطاجنہ شہر میں داخل ہوجائے گا اور دروازے بند کرکے شہر میں چھپ جائے گا تو ہم آرام سے قرطاجنہ شہر کو اپنے محاصرے میں لے لیں گے۔"

اوریس کے لہجے میں شدید طنز تھا۔ سب سالار جانتے تھے کہ برتھاس جیسے سالار کو شکست دے کر قرطاجنہ کی طرف بڑھنا خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ انہوں نے اوریس کو لاجواب نظروں کے ساتھ دیکھا اور اپنے سر جھکا لیے۔ لیکن موجرائس خاموش نہ رہا، اس نے پھر کہا۔

"سپہ سالار!...... ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ ادھر شیراٹن محاصرے کا منتظر ہے۔ ہم جتنی جلد محاصرہ کرلیں گے، اتنی جلدی وہ دیوتاؤں کی دیوار پر حملہ کرسکے گا۔ ہم سامنے سے شہر میں بھلے داخل نہ ہوسکیں، وہ سمندر کی طرف سے ضرور کامیاب ہوگا۔ قرطاجنیوں کے پاس کمزور دفاعی بیڑا ہے، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

سب سالاروں نے موجرائس کی بات توجہ سے سنی۔ اوریس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"برتھاس جیسے جرنیل کو راستے سے ہٹانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بات یہاں آتے ہی میں نے محسوس کرلی تھی۔ میں برتھاس کے آس پاس وہی وحشی سپاہی دیکھتا ہوں جنہوں نے اب تک رومہ کو تاراج کیا۔ مجھے ڈر نہیں خدشہ ہے کہ ہم کھلی جنگ میں اتنا فائدہ نہیں اٹھاسکیں گے، جتنا کہ نقصان۔ میں اس لیے جنگ کو ٹال رہا ہوں کہ...... قرطاجنی فوج کے مانے ہوئے جنگ باز چن چن کر ماردوں۔ اگر وہ اپنے دست وبازو کھو بیٹھا تو اس کی فوج اس کے لیے بیکار مسالہ ثابت ہوگی۔"

وہ برتھاس کی بات کررہا تھا۔ رومی سالاروں نے اوریس کی بات پر سر ہلایا۔ موجرائس نے پھر کہا۔

"سپہ سالار! اگر اس کی فوج کے بہترین جنگ باز مارے جارہے ہیں تو ہمارے بھی مارے جارہے ہیں۔ طاقت تو دونوں طرف کی برابر کم ہورہی ہے اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑرہا ہے۔"

اوریس نے پہلی بار کسی قدر غصیلی آواز نکالتے ہوئے موجرائس کو مخاطب کیا۔

"موجرائس...... مجھے افسوس ہے کہ تم اپنی فوج سے ہی باخبر نہیں۔ مجھے بتاؤ کہ ہمار

کون سا سورما آج تک مارا گیا۔ ہماری فوج کے عام سپاہی بھیجے جا رہے ہیں، جن کے پاس زہر میں بجھے ہتھیار ہوتے ہیں۔ ہمارے سپاہیوں کو یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ دشمن کو کہیں نہ کہیں معمولی چرکا لگا دیں۔ اگر وہ مدمقابل کو ایک خراش بھی لگا دیتے ہیں تو وہ مر جاتا ہے۔
یہ وہ راز تھا جو میں تم لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آج کرنا پڑا۔
اس لیے کل سے مبارزت ختم۔ کیونکہ اگر دشمن کو پتہ چل گیا کہ ہم نے اس طرح کی چالاکی کی ہے تو وہ بھڑک اٹھے گا اور خود کھلی جنگ شروع کر دے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم خود کل دشمن کو بے خبری کے عالم میں پکڑ لیں۔ ہم کل عام جنگ کرنے والے ہیں۔"
اورلیس نے اتنا کہا اور مجلس برخاست کر دی۔ تمام رومی سالاروں کے تن بدن میں تجسس کی لہر دوڑ گئی۔ کل وہ کھلی جنگ لڑنے والے تھے۔ موجرائس اب پشیمان تھا۔ اس نے اورلیس کا طریقۂ واردات جانا تو اسے اپنے سپہ سالار کی عقلمندی کا احساس ہوا۔ بے شک آج تک قرطاجنی فوج کے کئی مشہور سورما مارے گئے تھے، لیکن ان کے مقابل رومی فوج کے عام درجہ کے زیادہ تر سپاہی مارے گئے تھے۔ اپنے کھیل کو حقیقت کا رنگ دینے کیلئے اورلیس کبھی کبھی رومی فوج کے بہترین سورما اور یودھا بھی بھیج دیا کرتا تھا اور رومی سورماؤں میں سے بھی اب تک اکا دکا قتل ہوئے تھے، لیکن زوداثر زہر کے اثر سے مرنے والے قرطاجنی جنگ بازوں کی تعداد زیادہ تھی۔ برتھاس کو تو پہلے روز ہی یہ خیال آیا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ شہید سورماؤں کی لاشیں پھول کر پھٹ گئی تھیں اور ان کے ہونٹوں سے سفید جھاگ نکل آتی تھی۔
اسے شک تھا کہ رومی مبارزین زہر میں بجھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں لیکن اس نے اس بے ایمانی کا سدباب کرنے کیلئے کوئی سبیل نہ کی تھی۔ وہ اپنے مبارزین سے بس اتنا کہا کرتا تھا کہ وہ دشمن کے زہر میں بجھے ہتھیار کی ضرب سے خود کو بچا کر رکھیں۔ وہ اپنے یودھاؤں کو زیادہ سے زیادہ بھاری لباسوں میں مبارزت کے لیے بھیجنے لگا تھا۔ اسے خود وقت چاہیے تھا۔
قرطاجنہ کی کنواری کے خصوصی نمائندے نے برتھاس کو آ کر بتایا تھا کہ "زمینی جنگ کو جتنی دیر تک ٹالا جا سکتا ہے ٹالا جائے۔" اورلیس کی طرح برتھاس کے سالاروں نے بھی برتھاس کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن برتھاس نے انہیں یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ...... "بس!...... آج مبارزت کی جنگ کا آخری دن تھا۔ کل ہم رومیوں کو سبق سکھائیں گے۔ وہ پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔
انہوں نے اگلے دن کیلئے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اگلی صبح دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہوئیں تو ان میں نئی طرح کی ہلچل تھی۔ دونوں سالاروں نے مد مقابل فوجوں کا دور سے معائنہ کیا اور دل میں سوچا کہ آج کا معرکہ فیصلہ کن ہوگا۔

قرطاجنی فوج تعداد میں زیادہ تھی۔ لیکن رومیوں کا جذبہ زیادہ تھا۔ وہ ایک ایک قرطاجنی سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ تلواریں، نیزے، بھالے، تیر اور قتل و غارت قائم کرنے کے دیگر اوزار، سورج کی روشنی میں چمک چمک کر آنکھیں چندھیا رہے تھے۔ رومی سپاہ سالار اورلیس اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار اپنی پہلی صفوں کا جائزہ لیتا پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کے چہروں پر غیض و غضب محسوس کیا تو دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کی جنگ میں ہی اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ مزید کتنی جنگیں پیش آنے والی ہیں۔

نہ جانے کیوں دونوں سالاروں کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ آج کی تیاری سے دونوں فوجیں عام جنگ کا اندازہ لگا چکی ہیں۔ برتھاس اورلیس کے مقابلے میں زیادہ فائدے میں تھا۔ اس کی فوج زیادہ تھی۔ اس کی سرزمین اپنی تھی۔ وہ غریب الدیار نہیں تھا۔ اس کا تجربہ زیادہ اور سب سے بڑھ کر وہ چالبازی کی جنگ میں تاک تھا۔

اس کے برعکس اورلیس کی ہر چیز برتھاس سے کم تھی۔ یہی سوچ کر وہ با آواز بلند کہنے لگا۔

"روما کے سپوتو!

تم دیکھ رہے ہو، دشمن کی تعداد کتنی ہے اور ہم کھڑے بھی اسی کی زمین پر ہیں۔ ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ بزدلی کی موت یا بہادری کی فتح۔ اگر آج ہم نے اس مقام پر دشمن سے مات کھالی تو ایشور کی قسم...... پھر ہمیں افریقہ کے ساحل پر تو کیا اپنے گھروں میں بھی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔ میں کہتا ہوں ہمارے پاس صرف آج کا دن ہے۔ آج کے بعد یا ہم وجیتا ہوں گے یا پھر...... یا پھر نہیں ہوں گے۔ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ ہم زندہ رہیں اور قرطاجنہ سے اپنے مقتولوں، اپنے شہیدوں کا بدلہ لیں تو ہمیں جان ہار کر لڑنا ہوگا۔ آخری سانس تک، ہمیں یہ جنگ جیتنی ہوگی، ہر قیمت پر۔"

اورلیس کی فوج نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور تمام سپاہیوں کے دل بے خوفی سے لبریز ہو گئے۔

دوسری طرف برتھاس کو تسلی تھی کہ اس کے سپاہی رومی لشکر کو ایک قدم بھی قرطاجنہ کی طرف آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ برتھاس گھوڑے پر سوار اپنی اگلی صفوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

دونوں طرف جنگ کے نقارے اور بگل بجنے لگے۔ پیدل سپاہی اپنے نیزوں کے دستے بار بار زمین پر مار کر ایک جیسی آوازیں پیدا کرنے لگے۔ یکا یک دونوں طرف کی اگلی صفیں...... دو منہ زور سیلابی ریلوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف لپکیں۔ قلب کی طرف قلب، میمنہ کی طرف میمنہ اور میسرہ کی میسرہ۔ دونوں طرف کے ہراول، شہسواروں کے دستے تھے۔ جو ہر لشکر کی پیدل سپاہ سے کئی قدم آگے کھڑے کیے گئے تھے۔ سیلابی ریلے ایک دوسرے کی طرف لپک رہے تھے۔ تلواریں، نیزے، بھالے...... اور تیر، وہ دونوں لشکر ایک دوسرے کو کچا چبا جانا چاہتے تھے۔

اور پھر ایک آسمان شکن شور کے ساتھ دونوں لشکر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ انسانوں سے انسان ٹکرا گئے۔ بلاوجہ، بغیر کسی حقیقی مسئلے کے۔ رومیوں کو گلہ تھا کہ قرطاجنی ان کے ملک میں آ کر یلغار کرتے اور ان کے مضافاتی باشندوں کو قتل کرتے تھے۔ اور قرطاجنیوں کا یہ شکوہ تھا کہ برتھاس کا لشکر روانہ کرنے سے پہلے بحر روم میں رومی قزاق ان کے تاجروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ یہ سب بہانے بس دکھاوا تھے۔ سچائی تو یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی روز افزوں طاقت سے خوفزدہ ہو کر لڑ رہے تھے۔

مگر کیوں؟ ایک دوسرے کی ترقی کو طاقت سمجھنا یہی نادانی کی بات تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ترقی کو دیکھ کر خوش کیوں نہ ہوتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتے تھے۔ فینیقی کے بنائے ہوئے جہازوں پر سوار ہو کر آنے والے رومی حملہ آوروں کو کون بتاتا کہ جنگ انسانیت کی بھلائی نہیں' بلکہ تباہی ہے۔ وہ اب غاروں کے باشندے یا جنات نہیں تھے۔ وہ انسان تھے اور سب آپس میں بھائی بھائی تھے۔ جب سے خالق نے انہیں بنایا تھا۔ وہ آپس میں لڑتے آ رہے تھے۔ حالانکہ زمین کا کوئی اور باشندہ جو انسان نہیں تھا۔ آپس میں جنگ نہ کرتا تھا۔ بھیڑیوں کے غول بھی جنگل میں ایک ساتھ امن اور شانتی سے رہنے کے عادی تھے۔

دونوں فوجیں ٹکرائیں تو...... مخلوقات نے ایک بار پھر ایشور کی طرف دیکھا اور کہا: '' اسی انسان کو تو نے اشرف المخلوقات بنایا؟ اسی انسان کے لئے تو نے ہم سے کہا کہ اسے سجدہ

کرو؟......کیا یہی وہ انسان ہے جو تیرا مقرب خاص ہے؟"

وطن نے انسان کو جنم دیا۔ وطن میں آباد ہونے سے پہلے انسان خانہ بدوش تھا۔ خانہ بدوشی کے زمانہ میں وہ ابھی محض ایک جن کی طرح تھا۔ نظر آ جانے والا...... غائب ہو جانے والا۔

پھر وہ مٹی کے ٹکڑوں پر آباد ہو گیا۔ اس نے مٹی سے دل لگا لیا اور انسان بن گیا۔ جس کے حصے میں جس قسم کی مٹی آئی۔ وہ اس سے جڑ گیا۔ کھاری مٹی' چکنی مٹی' کھڑکھڑاتی ہوئی' سوکھ کر بجنے والی' کیچڑ اور دلدل جیسی یا پتھریلی مٹی' مٹی کے موسم نے اس کی رسمیں الگ کر دیں۔ فصلوں اور کھیتوں نے اس کی روایات کو جنم دیا۔ وہ مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ مٹی سے پیار کرنے لگا۔ وطن الگ الگ تقسیم کر لئے گئے اور ایک مٹی کے رہنے والے' دوسرے علاقے کی مٹی سے نفرت کا سبق سیکھنے لگے۔ یہ سبق سکھانے والا کون تھا؟ کس نے کہا تھا کہ مٹی کی تاثیر سے نفرت کی جائے۔ ہر کسی کی اپنی زندگی تھی لیکن مٹی سے محبت نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔

اورلیس کے سپاہی سچ مچ جان توڑ محنت کر رہے تھے۔ انہیں اپنے سپہ سالار کے الفاظ بھولے نہیں تھے۔ قرطاجنیوں کو توقع نہیں تھی کہ رومی سپاہی یوں وحشیوں کی طرح وار کریں گے۔ وہ جس قدر اس جنگ کو آسان سمجھ رہے تھے۔ یہ اتنی آسان نہیں تھی۔ برتھاس کھلی جنگ کا سالار نہیں تھا۔ اس نے ساری عمر گوریلا جنگ لڑی تھی۔ اس کے برعکس اورلیس صرف آمنے سامنے کی جنگ کا تجربہ رکھتا تھا۔ قرطاجنی سپاہیوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود خوفزدہ ہو گئے۔ ان کے دلوں پر رومیوں کا دبدبہ چھانے لگا۔ اورلیس کے سپاہیوں نے قرطاجنیوں کو اپنے گھر کے سامنے ہچکچاتے دیکھا تو ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ اور بھی زیادہ تیزی اور شدومد کے ساتھ حملے کرنے لگے۔

دوپہر تک قتل عام ہوتا رہا۔ برتھاس کے سپاہی رومیوں کے ہاتھوں کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ لیکن انہوں نے رومیوں کے سامنے میدان نہ چھوڑا' نہ جانے کیوں ہچکچاہٹ کے باوجود بھی وہ اپنے گھروں کی طرف رومیوں کو نہ بڑھنے دینا چاہتے تھے۔ رومیوں نے مرنے یا مارنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ایک رومی کے مقابلے میں پانچ قرطاجنی مر رہے تھے۔ برتھاس اس صورتحال سے پریشان ہو گیا۔ آخر کیوں؟ اس نے سوچا' اس کی فوج کا جذبہ

رومیوں جیسا کیوں نہیں تھا۔ اسی فوج کے ذریعے وہ رومہ کو تاراج کرتا پھرتا رہا تھا اور آج یہی فوج رومیوں کے مقابلے میں کمزور پڑ رہی تھی۔ برتھاس کے ذہن میں اس کی دو وجوہات آئیں۔ ایک یہ کہ اس کی فوج ضرورت سے زیادہ خوداعتمادی کا شکار تھی کیونکہ وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ برتھاس نے آج سے پہلے کبھی اس طرح کا معرکہ نہیں لڑا تھا۔

غروب آفتاب تک جنگ کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ قرطاجنی اپنی تعداد کے بل پر رومیوں کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اب ان کی تعداد پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ قرطاجنی لشکر آدھے سے بھی کم رہ گیا تھا۔ برتھاس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر اس طرح ایک جنگ بھی مزید ہوگئی تو قرطاجنہ کو دشمن کی درندگی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ برتھاس سچ مچ پریشان ہو گیا۔ اسے ملکرت کے مندر میں کہا ہوا اپنا جملہ یاد آنے لگا۔

"میں رومیوں کے لشکر کو دگنا کردوں گا۔"

برتھاس اب مزید کسی حماقت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔ آج کسی کی ہار جیت کا فیصلہ نہ ہوا تھا۔ دونوں طرف کے لشکری اپنے مقتولوں اور زخمیوں کو اٹھانے لگے۔ برتھاس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ آج ہی واپس چلا جائے گا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کھلی جنگ کر کے اپنی آدھی فوج گنوا دی۔ اگر وہ قلعہ بند رہتا تو قرطاجنی نوجوانوں کی ایک پوری کھیپ ضائع نہ ہوتی۔ وہ پشیمان ہو کر واپسی کے احکامات جاری کرنے لگا۔

سمندر میں بھی صورتحال نہایت نازک تھی۔ شیراٹن کا بیڑا اتنا بڑا تھا کہ اگر وہ بغیر سوچے سمجھے قرطاجنہ کی طرف دوڑ پڑتا تو شارق کے معمولی جہازوں کو کچلتا ہوا دیوتاؤں کی دیوار تک جا پہنچتا۔ لیکن سمجھدار شیراٹن کو محاصرے کی اطلاع کا انتظار تھا۔ وہ اپنا ہر دن بے چینی کے ساتھ گزار رہا تھا کہ کب اوریس کی طرف سے محاصرہ مکمل کرنے کی خبر آئے اور کب وہ قرطاجنہ کی طرف اپنے جہازوں کو لے دوڑے۔

قرطاجنہ بری طرح جنگ کی زد میں تھا۔ بری فوج کی نیم شکست نے اہلیان شہر کے حوصلے توڑ دیئے۔ سمندر کی طرف سے بھی دشمن کے جہاز کالی گھٹاؤں کی طرح چھا رہے تھے۔

قرطاجنہ کی کنواری کے لئے بھی یہ خبریں دل دہلا دینے والی تھیں۔شہزادی جافی کس جو برتھاس کی شکست سے پہلے تک کسی قدر مطمئن تھی۔ اب بے سکون ہوگئی۔ اہل قرطاجنہ کے چہروں پر ڈر اور خوف کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔لوگ پہلے سے بڑھ کر مذہبی سرگرمیاں انجام دینے لگے۔شکست کی خبر سے اگلے روز برتھاس کا ادھ کٹا لشکر بھی شہر آ پہنچا۔رہی سہی کسر بھی جاتی رہی۔ برتھاس کے لشکر کے سپاہی رومیوں کی وحشت اور غیض وغضب کے قصے سنانے لگے۔ایک دن میں شہر ماتم کدہ بن گیا۔خشکی کی طرف موجود فصیل کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ برتھاس نے اپنے ان سپاہیوں کو جو ابھی بالکل تازہ دم تھے۔ فصیل سے باہر ہی پڑاؤ ڈالنے کو کہا۔ وہ اب بھی فصیل کے باہر جنگ لڑنا چاہتا تھا۔شہر کا صدر دروازہ اب اپنے ہی سپاہیوں سے آباد تھا۔ برتھاس کے حکم پر شہر کی دیوار کے پاس قرطاجنی لشکر مقیم ہو گیا۔ برتھاس خود مجلس خصوصی کے سامنے جواب دینے پہنچ گیا۔

وہی برتھاس جو کبھی مجلس کی آنکھ کا تارا تھا۔آج سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ایک مینو سردار نے اٹھ کر کہا۔

”ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ رومہ کے چھوٹے چھوٹے گاؤں برباد کرنے والا برتھاس اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں۔ حیرت ہے کہ اس وقت کسی نے ہماری بات پر کان نہ دھرے اور اب جب دشمن نے قرطاجنہ کے آدھے سے زیادہ لشکر کو کاٹ کر پھینک دیا ہے۔آپ لوگوں کو ہوش آیا ہے؟......اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

ایک مینو سردار کی بات ختم ہوئی تو دوسرا اٹھ کھڑا ہوا اور برتھاس کی بے عزتی کا یہ سلسلہ ایک کے بعد ایک سردار کی تقریر کی صورت چل نکلا۔ وہ سب برتھاس کی تحقیر کر رہے تھے۔لیکن قرطاجنہ کی کنواری شہزادی جافی کس کی بات نے سب کو خاموش کرا دیا۔

”یہ وقت اس بے فائدہ جھگڑے کا نہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔جنگوں میں سپاہی تو شہید ہوتے ہی رہتے ہیں۔ برتھاس کے لشکر نے شکست نہیں کھائی۔صرف نقصان اٹھایا ہے اور اس قسم کے نقصانات اٹھانے کے لئے تو ہم پہلے سے تیار تھے۔اب بھی ہم قرطاجنہ کو بچا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم آپس کا اختلاف ترک کر دیں۔ہمیں دشمن کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔جو نفع یا نقصان پہنچاتا ہے ہم نے خود کو خود پہنچاتا ہے۔اب بہتر یہی ہے کہ ہم قلعہ بند ہو کر دشمن کو زیادہ سے زیادہ وقت دیں۔وہ ہمارے علاقے میں اجنبی ہے۔زیادہ دیر

تک نہیں ٹک سکے گا۔ ہم بہت جلد اسے عاجز کر دیں گے اور وہ یہاں سے نکلنے کے راستے ڈھونڈتا پھرے گا۔“

جانی کس کی تقریر پر پہلی بار برتھاس نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ممنونیت کے تاثرات تھے۔ لیکن وہ اب بھی خاموش تھا۔ اسے اپنی کم مائیگی کے احساس نے مار دیا تھا۔ کھلی جنگ کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے برتھاس' اورلیس سے مات کھا گیا تھا۔ مجلس خصوصی نے پھر سے نئی حکمت عملی تجویز دی اور شہر کو بچانے کے لئے آخری سانس تک لڑنے کے وعدے کرنے کے بعد مجلس برخاست کر دی۔

چند ہی دن بعد اورلیس کا لشکر بھی قرطاجنہ کے سامنے پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ لیکن ان کا پڑاؤ ابھی تک محاصرہ نہیں تھا کیونکہ فصیل شہر کے پاس تو پوری قرطاجنی سپاہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ رومی لشکر شہر کے سامنے نمودار ہوا تو فصیل شہر عوام سے بھر گئی۔ لوگ دشمن کا پڑاؤ دیکھنے آئے تھے۔ اہل قرطاجنہ کے پاس رسد کی کمی نہیں تھی۔ وہ کئی ماہ تک محصور رہ کر جنگ لڑ سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی ہر شہری کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اہل قرطاجنہ بنیادی طور پر جنگجو قوم نہیں تھے۔ یہ صنعتکاروں' فنکاروں اور معماروں کی دھرتی تھی۔ قدیم صور کے فینیقی باشندے اہل قرطاجنہ' جنگ کی بجائے محبت کے حوالے سے زیادہ مشہور تھے۔

قرطاجنہ کی کنواری جانی کس' برتھاس کی واپسی کے بعد سے بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ پہلے تو وہ شہر میں رہتے ہوئے فعال تھی۔ لیکن اب نہ جانے وہ کہاں کہاں چلی جاتی۔ اس کے چند سرفروش خصوصاً گہرتاب اس کے ہمراہ ہوتا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح کبھی کہیں اور کبھی کہیں نمودار ہوتی۔ وہ کیا کرتی رہتی تھی اور کہاں چلی جاتی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن وہ دن بھر اور بعض اوقات رات رات بھر واپس نہ لوٹتی۔ وہ محاصرہ شروع ہونے سے پہلے تک قرطاجنہ کے بچاؤ کے لئے خاطر خواہ انتظام کرنا چاہتی تھی۔ محاصرہ کسی بھی وقت شروع ہو سکتا تھا۔ ابھی تک تو دونوں لشکر آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن اگر قرطاجنی لشکر کسی وقت شہر میں آ جاتا تو رومیوں کو قرطاجنہ کی فصیل تک پہنچنے سے روکنا ممکن نہیں تھا۔

دشمن سر پر چڑھ آیا تھا۔ عام لوگوں حتیٰ کہ عمائدین سلطنت تک پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ سب کی نظریں اپنے مندروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ملکرت' ایشمون اور تائیت کے چڑھاوے اور نذرانے اتارے جا رہے تھے۔

آدھا بری لشکر کٹ جانے کی وجہ سے نئے سپاہیوں کی بھرتی کا عمل تیز تر ہو چکا تھا۔ اس بار تو کیدارا اور سنتوش بھی فوج میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے بھی شارق کی وجہ سے بحری فوج کا انتخاب کیا تھا۔ قرطاجنہ کے تیز رفتار بڑھیوں نے چند دنوں میں بیسیوں نئے جنگی جہاز بنا ڈالے تھے۔ نئی بری اور بحری فوجیں بھرتی ہوتی گئیں۔ دھرتی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے۔ جس راہ سے لوٹ کے آ نہ سکیں اس راہ پہ راہی جانے لگے۔ نئے نویلے جہاز...... نئے نویلے سپاہیوں کو لے کر بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ بندرگاہ سے ہر روز نئے نئے جہاز روانہ ہو رہے تھے۔ جنہیں شارق وصول کرتا اور احکامات جاری کر دیتا۔

شارق کا اپنا جہاز بحر روم کے پانیوں کا لاڈلا بیٹا بن چکا تھا۔ وہ رات کو سوتا نہ دن کو دو گھڑی آرام کرتا۔ ہمہ وقت شارق اپنے فرض کو خوب سے خوب نبھانے میں مشغول تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کام اپنے ہراول سے لے رہا تھا۔ اس کی ہر کامیابی کی اصل وجہ اس کا جاسوسی نظام تھا۔ اسے شیراٹن کے کسی بھی حملے کی بروقت اطلاع مل جاتی تھی۔ ایک روز اسے خبر ملی کہ ایک بڑا رومی بیڑا مغرب کی جانب سے شہر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شارق نے پل بھر میں اندازہ لگایا کہ یہ خبر صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ شیراٹن کا پورا لشکر شمال میں لنگر انداز تھا۔ پھر مغرب سے کسی بڑے رومی بیڑے کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اس اطلاع کو نظر انداز بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ یہ دشمن کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ وہ شارق کو مغربی سمندر کی طرف مصروف کر کے قرطاجنہ پر حملہ بھی کر سکتا تھا۔ وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے۔ ابھی دن کا وقت تھا اور شام بہت دور تھی۔ وہ جہاز کے عرشے پر بے چینی کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ اس کی نظریں بار بار مغربی سمندروں کو تک رہی تھیں۔ لیکن ابھی تک اس نے مغرب کی طرف کوچ کا حکم جاری نہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رومی بیڑا حد سے بڑا ہے اور بہت ممکن ہے کہ رومی بیڑے کا کوئی حصہ مغرب کی طرف سے پیش قدمی کرنے لگا ہو۔ اس کی بے چینی وقت کے ساتھ ساتھ سوا ہوتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ عرشے پر ٹہل ہی رہا تھا کہ اس کی نگاہیں مشرقی سمندر کی طرف اٹھ گئیں۔ شارق نے آنے والی جاسوس کشتیوں کو پریشان نظروں سے دیکھا اور کسی نئی خبر کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ اس کے جاسوس اس کے پاس پہنچے تو شارق کو ایک اور دل دہلا دینے والی خبر سننے کو ملی۔ مشرق کی طرف سے بھی ایک بڑے بحری بیڑے کے آنے کی خبر دی گئی تھی۔ اسے

اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ کیونکر ممکن تھا۔ بیک وقت مشرق اور مغرب سے دو الگ الگ بحری بیڑے قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جبکہ اصل رومی بیڑا سامنے کی طرف یعنی شمال کی سمت میں موجود تھا۔ اچانک شارق کے ذہن میں دھماکہ ہوا۔ ”دشمن نے بڑا حملہ کر دیا۔“ مشرق اور مغرب سے آنے والے بیڑے رومی بحری لشکر کا دایاں اور بایاں بازو تھے اور سامنے سے ان کا قلب حملہ کرنے والا تھا۔ تو گویا وہ پل آ پہنچا۔ جس کا خدشہ شارق کو ہمہ وقت لاحق رہتا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے ہراول کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ اب اسے اپنے دائرہ کار کو اتنا محدود کرنا تھا کہ گویا صف بندی کی حالت' دو الگ الگ سمتوں سے آنے والے بحری بیڑوں کو ان کے راستے میں جا کر روکنا ممکن نہیں تھا۔ شارق نے اسی میں عافیت سمجھی کہ شہر کے نزدیک آ جائے۔ اس نے اپنے جاسوسوں کو ادھر ادھر دوڑایا۔ پیغام بردار کشتیاں دفاعی حصار کی طرف دوڑیں ہر طرف بھونپو بجنے لگے۔

شیراٹن کی حکمت عملی پر قابو پانا شارق جیسے عام قزاق کے بس کی بات نہ تھی۔ ایک لحاظ سے اب تک شیراٹن' شارق کو ایک بچہ سمجھ کر اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یا اب تک وہ اس کی صلاحیتوں کو پرکھ اور طریقہ جنگ کو سیکھ رہا تھا۔ لیکن اب' جب شیراٹن کی باری آئی تو اس نے شارق کے چھکے چھڑا دیئے۔ اس نے عظیم رومی لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور دو روز قبل لشکر کے دو بڑے حصوں کو دو مخالف سمتوں میں روانہ کر دیا۔ ایک مشرق اور دوسرا مغرب' اور خود شیراٹن اپنی جگہ رکا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ شارق کو ابھی تک قلب لشکر کے آنے کی اطلاع نہ ملی تھی۔ لیکن جنگجو شارق فوراً بھانپ گیا کہ اب تیسری حرکت قلب لشکر کی ہو گی۔ جو شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا ایک ہی ہلے میں اس کے مکمل دفاعی بیڑے کو کچلنے کی کوشش کرے گا۔ شارق کے پاس اپنے جہازوں کو بچانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے لڑ جانا ہی مناسب جانا۔ لیکن ابھی تک وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ دونوں بیڑوں کے ساتھ بیک وقت کیسے ٹکرائے۔ ماسوائے اس کے اور کیا صورت ہو سکتی تھی کہ وہ دیوتاؤں کی دیوار تک پیچھے ہٹ جاتا اور ایک جگہ رک کر دونوں بیڑوں کے پہنچنے کا انتظار کرتا۔ وہ اپنے حصار کو دشمن سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کوئی ترکیب نہ آ رہی تھی اور نہ ہی آ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ہراول کو حصار تک پہنچنے اور اپنے ہی جہازوں کے قلب میں ایک صف بند جنگ میں شامل ہونے کے لئے پہنچنے کا حکم دیا۔

آج شارق کو محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے قرطاجنہ کے خلاف اصل جنگ چھڑ چکی ہے۔
وہی اصل جنگ، جو آخری اور فیصلہ کن تھی۔ شارق نے اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے تن بدن میں بجلی بھر چکی تھی۔ شیراٹن سچ مچ کا امیر البحر تھا۔ اس کی جنگی تدبیر سب پر بھاری تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے بڑے ملکوں کے امراء البحر عموماً بحری قزاق ہوا کرتے تھے لیکن شیراٹن شروع سے ایک سپاہی تھا۔ اس نے اپنی تربیتی زندگی کریٹ کے جزیرہ پر گزاری تھی۔ اس نے اتنی خاموشی کے ساتھ اپنے بڑے بحری بیڑے کو تین حصوں میں تقسیم کیا کہ شارق کے جاسوسوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شیراٹن کے دو بیڑے اس کے لشکر کا دایاں اور بایاں بازو بن کر دائیں اور بائیں پہلو سے نہایت چابکدستی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ شارق کو اندازہ تھا کہ وہ ضرور دیوتاؤں کی دیوار تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شہر کے قریب سے قریب تر ہو رہا تھا۔ اب وہ دور دور کے سمندروں میں پارے کی طرح جھپٹ پلٹ کر شیراٹن کو چھوٹے چھوٹے نقصانات نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اسے شہر کا دفاع کرنا تھا اور دشمن کے دو لشکر مخالف سمتوں سے شہر کی جانب بڑھ رہے تھے۔

شارق نے شہر کے قریب پہنچ کر نہایت تیزی سے اپنے بحری بیڑے کو ترتیب دینا شروع کر دی۔ اس نے اپنے جہاز کو حسب سابق ہراول میں رکھا اور باقی تمام حصوں کو دیوتاؤں کی دیوار کے عین نیچے ایک مضبوط حصار کی صورت متعین کر دیا۔ دیوتاؤں کی دیوار پر موجود شہر کے عوام...... چپ چاپ کھڑے قرطاجنہ کے سمندر میں اپنی فوج کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ اہلیان شہر کے چہروں پر مایوسی کے بادل تھے۔ وہ اپنے بری سالار کی شکست اور زخمی سپاہیوں کی حالت دیکھ چکے تھے۔ سمندر کی طرف سے تو انہیں ذرہ بھر امید نہ تھی کہ ان کی فوج دشمن کو مات دے دے گی۔ انہیں معلوم تھا کہ دشمن کے مقابلے میں ان کا بیڑہ نہایت کمزور تھا۔

دوپہر تک دشمن کے بیڑے آ پہنچے۔ پہلے تو دائیں بائیں پہلوؤں کے بیڑے پہنچے اور پھر شیراٹن نے خود سامنے کی طرف سے حرکت کی اور قرطاجنہ کے عین سامنے آ پہنچا۔ شارق ہر طرف سے کالی گھٹاؤں کی طرح دشمن کو آتا ہوا دیکھتا رہا۔ قرطاجنہ کی شمالی پہلو کا پورا منظر دیدنی تھا۔ بڑے بڑے جہاز جن پر رومی پرچم لہرا رہے تھے۔ چاروں طرف سے اُمڈ اُمڈ کر

شہر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ شارق کا حصار دیوتاؤں کی دیوار تلے دشمن کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ سب سے اگلی صف ہراول کی تھی جس میں شارق خود بھی شامل تھا۔ دشمن سر چڑھ آیا تھا۔ ہر قرطاجنی شہری کے دل پر زلزلہ طاری تھا۔ خوف و ہراس اور آنے والی موت نے محبت کے شہر کے باسیوں کو بے حال کر دیا تھا۔ سمندر میں چاروں طرف جہاز ہی جہاز تھے۔ دیوتاؤں کی دیوار پر اہل قرطاجنہ اپنے پہلے چہرے لئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے رومی جہازوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل گواہی دیتے تھے کہ وہ بچ نہیں پائیں گے۔ رومی جہازوں کی تعداد کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس مرتبہ رومی قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ صورتحال نہایت دگرگوں تھی۔ شیراٹن کی حکمت عملی ہی اتنی زوردار تھی کہ اس نے پہلے ہلے میں ہی اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اور وہ مقصد تھا۔ اہل قرطاجنہ کے دلوں پر دہشت طاری کرنا' شیراٹن جانتا تھا کہ دشمن کو لڑنے سے زیادہ خوفزدہ کر کے ہرایا جا سکتا ہے اور اپنے اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ دھیرے دھیرے رومی جہاز صف بندی کرنے لگے۔ شارق تو پہلے ہی صف بند تھا۔ رومیوں کی صفوں کو ترتیب پاتا دیکھ کر شارق بڑے ملکوں کی عظیم جنگ تھی۔ لیکن اس نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے خیالات کو جھٹک دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ لڑے گا۔ اس وقت تک لڑے گا جب تک لڑتے لڑتے اس کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ وہ کلاڈینا کو چاہتا تھا اور کلاڈینا یہ چاہتی تھی کہ وہ مردانہ وار لڑے۔ معاً شارق کا خیال مارفیس جزیرے کی طرف بھٹک گیا۔ دانیال اور کلاڈینا کو گئے آج کئی دن ہو گئے تھے۔ شارق دل ہی دل میں دیوتاؤں سے دعائیں مانگنے لگا کہ کاش مارفیس کی کمک بروقت آ پہنچے۔ لیکن ابھی تک تو اس کی کمک کی ذرہ بھر امید نہیں تھی۔ شارق کے جاسوسوں کو دور دور تک مارفیس سے آنے والا کوئی جہاز دکھائی نہیں دیا تھا۔

شام تک شیراٹن کے پورے لشکر نے اپنی صفیں درست کر لیں۔ لیکن ابھی تک رومیوں نے حملہ نہ کیا تھا۔ شارق کو حیرت تھی کہ آخر رومیوں نے ابھی تک حملہ کیوں نہ کیا۔ کیا وہ رات کے وقت حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ معاً شارق کو رات کا خیال آیا۔ لیکن پھر اس نے اپنا خیال جھٹک دیا اتنے بڑے لشکر کو رات کے وقت حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اپنے آدھے جہاز ضائع کر کے بھی قرطاجنہ کو فتح کر سکتے تھے۔ شارق سوچ میں پڑ گیا۔

یکا یک رومیوں کے بیڑے پر شور بلند ہوا۔ پہلے پہلے وہ شور کم تھا۔ پھر بڑھتا گیا

ور بڑھتے بڑھتے بے پناہ بڑھ گیا۔ رومی شاید کسی بات پر خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ وہ اچھل اچھل کر اور چلا چلا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ دیوتاؤں کی دیوار پر موجود قرطاجنی اور شارق کچھ نہ سمجھ پائے کہ آخر رومیوں کے ہاتھ اچانک کون سی ایسی نوید مسرت لگ گئی جس کی بدولت وہ اس قدر اچھل رہے تھے۔ شارق کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا مسلسل رومیوں کے شوروغل اور ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ کسی قرطاجنی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یوں سنجیدگی کے ساتھ آ کر صف بند ہونے کے بعد رومیوں کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ یکلخت مارے خوشی کے پاگل ہونے لگے تھے۔ شارق عرشے پر کھڑا نہایت متجس نظروں سے رومی جہازوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ معاً اس کی نگاہ ایک عام سی کشتی پر پڑی جو تیزی کے ساتھ اسی طرف آ رہی تھی۔ شارق یکا یک چونک گیا۔ یہ تو وہی کشتی تھی...... ہاں بالکل وہی کشتی تھی جس میں چند دن قبل قرطاجنہ کی کنواری شہزادی جانی کس شارق سے ملنے کے لئے آئی تھی تو کیا اب بھی شہزادی جانی کس ہی اس کشتی میں سوار تھی؟ وہ بے حد متعجب ہوا۔ اتنے خطرناک حالات میں قرطاجنہ کی کنواری کا شہر سے نکلنا ٹھیک نہیں تھا۔ سامنے رومیوں کے ہزاروں جہاز لنگر انداز ہو چکے تھے اور شہزادی جانی کس ان کی پرواہ کئے بغیر نہایت تیزی سے شارق کے جہاز کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ شارق بے چین ہو گیا۔ مچھیروں کی مخصوص خستہ حال کشتی شارق کے جہاز کے ساتھ آ کر لگی۔ شہزادی کے سب سے متحرک سرفروش گہرتاب نے شارق کو دیکھتے ہی اشارہ کیا۔ شارق آن واحد میں عرشے سے نیچے اتر آیا ہے۔ وہ دوڑ کر کنارے پر آیا اور جھک کر گہرتاب کی بات سننے لگا۔ گہرتاب نے کہا۔

''محترم سالار! آپ کچھ دیر کے لئے اسی ناؤ میں تشریف لے آئیں۔''

شارق فوراً سمجھ گیا کہ قرطاجنہ کی کنواری سب کے سامنے ظاہر نہیں ہونا چاہتی۔ شارق نے جہاز سے اترنے میں دیر نہ لگائی اور کچھ دیر بعد وہ مچھیروں کی کشتی میں ایک سادہ سی چھولداری کے اندر شہزادی جانی کس کے پہلو میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ شہزادی کہہ رہی تھی۔

'' کھلے سمندر میں ہمارے بڑے لشکر کو شکست ہوئی ہے۔ ہمارا بحری سپہ سالار موآبریس مارا گیا ہے۔ مشہور رومی امیر البحر کوناوس بھی مارا گیا ہے۔ دونوں طرف کا بھاری

نقصان ہوا ہے اور دونوں بحری بیڑے فوری طور پر منظم ہو کر کسی نئی جنگ میں شریک ہونے کے متحمل نہیں۔ رومی بحری بیڑہ...... جو ہماری سپاہ کے ہاتھوں تباہ ہوا بظاہر فاتح ہے لیکن خوش قسمتی سے وہ قرطاجنہ کی طرف نہیں مڑا بلکہ واپس روم کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ہمارے کٹے پھٹے جہاز قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیکن یہاں رومی سالار شیراٹن کا گھیرا مضبوط ہے۔ ہمیں اپنے خستہ حال جہازوں اور سپاہیوں کو شیراٹن کا گھیرا توڑ کر یہاں لانا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس سے ہماری دفاعی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ ہمارے شکست خوردہ بحری سپاہی اپنے محبوب سپہ سالار موآبریس کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب ہوں گے۔ اگر ہم اپنے خستہ حال بیڑے کو اس دفاعی حصار تک لانے میں کامیاب ہو سکیں تو سمجھو ہم جنگ جیت گئے۔"

شارق کو بیک وقت غم اور خوشی کے دھچکے نے ہلا کر رکھ دیا۔ غم تو ظاہر ہے اپنے بیڑے کی شکست کا تھا لیکن خوشی؟ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ موآبریس کے آزمودہ کار بحری سپاہی اور بے شمار جہاز عین وقت پر اس کے بیڑے میں شامل ہونے کے لئے آ پہنچے تھے۔ معاً اس کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے قرطاجنہ کی کنواری سے سوال کیا۔

"محترمہ شہزادی صاحبہ! آپ کو تو ہر خبر معلوم ہوتی ہے۔ کیا مارفیس جزیرہ سے ہم نے جو کمک طلب کی تھی وہ آ رہی ہے؟"

شارق اپنے سوال پر خود ہی خفیف ہو گیا۔ مارفیس اس کا اپنا جزیرہ تھا۔ یہ بات تو اسے خود معلوم ہونی چاہیے تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ شارق بھی قرطاجنہ کی کنواری کو ایک دیوی ہی سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یہ مبہم سا سوال بھی شہزادی جافی کس سے کر دیا۔ شہزادی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خفت کو محسوس کیا اور کسی قدر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی تک تو کوئی خبر نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں سے کمک ضرور آئے گی۔ تم پر امید رہو۔" شارق کی خفت جاتی رہی۔ اب وہ پھر پہلے والے موضوع پر بات کر رہا تھا۔ اس نے جافی کس سے سوال کیا:۔

"ہمارا خستہ حال بیڑا کس طرف سے آ رہا ہے اور ہم اسے یہاں تک صحیح سلامت لانے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کریں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

شہزادی جافی کس نے بلاتوقف کہا۔

"آج رات کے کسی پہر تک ہمارا بیڑہ قرطاجنہ کے پانیوں میں نمودار ہوگا۔ یقیناً ہمارے بیڑے کی آمد کی خبر دشمن کو بھی معلوم ہو چکی ہوگی اور شیراٹن پوری کوشش کرے گا کہ ہمارے دونوں بیڑے کسی قیمت پر ایک نہ ہونے پائیں۔ شیراٹن آج ہی قرطاجنہ پر حملہ کرنے والا تھا۔ لیکن ہمارے بیڑے کی خبر سن کر وہ رک گیا۔ تم نے ان کے لشکر کو خوشیاں مناتے ہوئے دیکھا وہ اپنی جیت کی خوشیاں منا رہے ہیں۔ انہوں نے موآبریس جیسے سالار کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اب ہمارے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ ہمارا خستہ حال بحری بیڑہ ہمارے اپنے ساحل کے ساتھ آ لگے۔ یہ کام آسان نہیں۔ خستہ حال بیڑے پر ایک نوجوان سالار "گروزن" اس وقت کمال کر رہا ہے۔ میں نے گروزن کو پیغام بھیج دیا ہے کہ وہ مغربی سمندر میں سے ہو کر آئے۔ اس طرح ان کا مقابلہ شیراٹن سے نہیں ہوگا۔ بلکہ رومیوں کے مغربی لشکر کے ساتھ ہوگا۔ میرے ذاتی اندازے کے مطابق رومیوں کا مغربی لشکر کسی قدر کمزور ہے۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اپنے بیڑے کو بچانے کی خاطر شہر کو دشمن کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اس لئے تم شیراٹن کے سامنے سے اپنا ہراول ہٹائے بغیر مغربی رومی بیڑے پر حملے کی حکمت عملی بناؤ۔"

شہزادی جافی کس کی سمجھداری اور دانائی قابل داد تھی۔ وہ ایک عورت تھی لیکن ہزار مردوں سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار تھی۔ شارق دل ہی دل میں قائل ہو گیا کہ وہ ضرور کوئی آسمان سے اتری ہوئی دیوی ہے۔ اس نے شہزادی کے سامنے سعادت مندی کے ساتھ سر ہلایا اور پھر ایک پرعزم لہجے کے ساتھ کہا۔

"میں سب سمجھ گیا شہزادی صاحبہ! مجھے امید ہے کہ میں اس مہم میں کامیاب رہوں گا اور آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

شہزادی جافی کس اور شارق کے مابین گفتگو ختم ہوئی تو شارق واپس اپنے جہاز پر آ گیا اور شہزادی کی عام مچھیروں والی گندی سی کشتی نامعلوم راستوں کی طرف پھر سے چل دی۔

الوداع قرطاجنہ

برقہ اپنی پوری رفتار سے قرطاجنہ کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ آرفان نے اپنی پوری زندگی میں اپنے جہاز کو کبھی اتنا تیز نہ دوڑایا تھا۔ آج جھمو برقہ کی رفتار کی وجہ سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اسے ایک پل کسی جگہ قرار نہ آ رہا تھا۔ وہ کبھی تیز ترین جہاز کو دیکھتا اور کبھی جہاز کے عقب میں تیزی سے دوڑتے ہوئے پانی کو، جھمو برقہ کا مخصوص پالتو بندر تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر آرفان کے ساتھ گزاری تھی لیکن اس نے کسی جہاز کو کبھی اتنا تیز سفر کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر برقہ کی تیز رفتاری پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

دانیال اہل جزیرہ کے جہازوں سے پہلے ہی چل پڑا تھا۔ اسے قرطاجنہ تک خبر پہنچانی تھی کہ مارفیس کے قزاقوں نے ایک بھاری کمک بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مارفیس کے چاروں بڑے سرداروں میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ جنہیں شارق کے بڑے بھائی منگورہ اور دانیال نے بڑی مشکل سے ختم کرایا تھا اور اب مارفیس کے جزیرہ سے سات سو تیز رفتار جہازوں کا ایک خونخوار بیڑا سردار جیدان کی قیادت میں قرطاجنہ کی حفاظت کے لئے بڑھ رہا تھا۔ مارفیس کے سرداروں نے دانیال سے اپنے تحفظات مانگے تھے۔ دانیال نے انہیں مالا مال کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فتح کی صورت میں قرطاجنہ کی کنواری مارفیس کے قزاقوں کو خالی ہاتھ نہ لوٹائے گی اور جب دانیال نے دیکھا کہ قزاقوں کا مہیب جنگی بیڑا قرطاجنیوں کی مدد کے لئے چل پڑا تو دانیال نے مناسب سمجھا کہ خود سب سے پہلے آگے جائے اور اہل قرطاجنہ کے ساتھ ساتھ شارق اور جانی کس کو کمک کی خوشخبری سنائے۔ یہ فی الحقیقت ایک بہت بڑی خوشخبری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دانیال کو بھی امید تھی کہ قرطاجنہ رومیوں کے حملہ سے بچ نکلے گا۔ لیکن اسے قرطاجنہ کے تازہ حالات معلوم نہ تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا

کہ شیراٹن نے بغیر کسی لڑائی کے قرطاجنہ کے پانیوں کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اس وقت شہر کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ دانیال تو اس امید پر قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ابھی تک راستے کھلے ہوں گے لیکن وہاں صورتحال بدل چکی تھی۔

تیز رفتار جہاز کے عرشے پر کلاڈینا اور دانیال دونوں ہی موجود تھے۔ ان کی نگاہیں دور قرطاجنہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ہی خاموش کھڑے تھے۔ جہاز کی رفتار کی وجہ سے ہوا کے جھونکے ان کے چہروں پر زور سے پڑ رہے تھے۔ برقہ اپنی برق رفتاری کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ قزاقوں کے بیڑے سے ایک دن قبل قرطاجنہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن......

لیکن بدقسمتی آڑے آ گئی۔ غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر پہلے دانیال کو دور سمندر میں چند سیاہ دھبے دکھائی دیئے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ یہ رومی جہاز ہو سکتے ہیں۔ حالات حاضرہ کی روشنی میں اسے ایسا ہی سوچنا چاہیے تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی رومی جہازوں سے مڈبھیڑ ہو۔ اس نے بتدریج بڑے ہوتے ہوئے سیاہ دھبوں کو دیکھ کر آرفان کو حکم دیا کہ وہ برقہ کا رخ موڑ دے۔ وہ کسی قیمت پر رومیوں سے نہ ٹکرانا چاہتا تھا۔ وہ قرطاجنہ کی کنواری تک پہنچنا چاہتا تھا اور اسے آنے والے لشکر کی خوشخبری سنانا چاہتا تھا تاکہ اس کے چہرے پر مسکان دیکھ سکے اور خوش ہو سکے۔ بچپن میں بھی وہ اسی طرح کیا کرتا تھا۔ ہر وہ چیز آموسی کو لا کر دیتا تھا جو وہ طلب کرتی اور جب وہ اپنی مطلوبہ چیز حاصل کر لیتی تو خوش ہو جاتی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی طرح کھل جاتے اور دانیال اسے دیکھ کر بے پناہ خوش ہوتا۔ آج بھی دانیال کے دل میں وہی جذبات تھے۔ وہ ہر حال میں جانی کس تک پہنچنا چاہتا تھا اور یہ کیا مصیبت تھی جو اس کی طرف کشاں کشاں کھنچی چلی آ رہی تھی۔

لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ رومی جہاز کہاں کہاں تک پھیلے ہیں۔ اس نے برقہ کا رخ موڑ دیا لیکن مصیبت نہ ٹلی۔ اب سامنے سے آنے والے جہازوں کے خال وخد واضح ہو چکے تھے۔ وہ رومی لشکر کے گشتی جہاز تھے جو آس پاس کے سمندروں میں گھومتے رہتے تھے۔ انہوں نے برقہ کو دیکھ لیا تھا۔ معاً دانیال کو کلاڈینا کی آواز سنائی دی۔

"بھیا!...... رومی بیڑے نے قرطاجنہ کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ شاید وہ دیکھئے! وہ دوسری طرف سے اسی طرح کے جہاز ہمارے طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ رومیوں سے

مڈبھیڑ ہوئے بغیر ہم قرطاجنہ تک پہنچ سکیں۔"

دانیال بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پھنس چکا ہے۔ وہ شہر قرطاجنہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن قرطاجنہ کو چاروں طرف سے رومی جہازوں نے گھیر لیا تھا۔ اس نے آرفان سے جہاز کی رفتار کم کرنے کے لئے کہا۔ وہ سوچنے کے لئے موقع چاہتا تھا۔ لیکن آج اسے موقع ملنے والا نہیں تھا۔ ایک طرف اکیلا برقہ تھا اور دوسری طرف رومیوں کے کئی گشتی جہاز جو ایک ساتھ برقہ کو حراست میں لینے کے لئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دانیال کے پاس سوچنے کے لئے بہت مختصر وقت تھا۔ اس نے مشورہ لینے والی نگاہوں سے کلاڈینا کی طرف دیکھا۔ کلاڈینا بھی ہراساں تھی۔ اسے بھی قرطاجنہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ لیکن اب آنے والی مصیبت کو دیکھ کر اسے لگ رہا تھا کہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ معاً کلاڈینا نے دانیال کو مشورہ دیا۔

"یہ لوگ رومی ہیں۔ میں بھی رومی ہوں۔ آپ بھی قرطاجنی نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے جہاز پر قرطاجنہ کا کوئی مخصوص نشان ہے۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ ہم خود کو قرطاجنیوں کا مخالف اور رومیوں کا حمایتی ظاہر کریں۔ ہم فوری طور پر ان کے چنگل سے تو نہیں نکل سکتے۔ لیکن اگر ہم ان کی ہمدردیاں حاصل کر لیں تو مجھے امید ہے کہ نکلنے کی کوئی سبیل مل جائے گی۔"

دانیال نے چونک کر کلاڈینا کی طرف دیکھا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ کلاڈینا رومی زبان بول سکتی تھی۔ یکایک دانیال کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ نہ صرف یہاں سے چھٹکارا پانے کے لئے کلاڈینا کی تجویز کو اختیار کر سکتے ہیں بلکہ قرطاجنہ کے لئے مزید کئی اہم کام بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ اگرچہ ایک بڑے خطرے کی بات تھی۔ لیکن اس پر عمل کرنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ دانیال نے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا جیسے کہہ رہا ہو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

رومی جہازوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ برقہ درمیان میں محصور ہو کر رہ گیا۔ تب ایک رومی جہاز برقہ کے بالکل نزدیک آ کر رکا۔ اس کے عرشے پر کچھ رومی سپاہی کھڑے تھے۔ ان سپاہیوں میں سے ایک جو غالباً جہاز کا کپتان تھا۔ کلاڈینا اور دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولا:

"کون ہو تم لوگ؟؟...... کہاں سے آ رہے ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟"

دانیال اور کلاڈینا نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ وہ ان رومیوں سے کیا کہیں گے۔
چنانچہ کلاڈینا نے رومی زبان میں بات کی۔
"ہم جو کوئی بھی ہیں پہلے تم لوگ بتاؤ! تم کون ہو؟ اور ہم سے یوں پوچھ گچھ کیوں کر رہے ہو؟"
کلاڈینا کے لہجے میں کرختگی تھی۔ ایک رومی حسینہ کے منہ سے رومی زبان میں اس طرح کا سوال سن کر استفسار کرنے والا دنگ رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ آنے والا جہاز رومیوں کا ہوگا۔ اس نے شکوک وشبہات بھری نظروں سے کلاڈینا کی طرف دیکھا اور اپنے لہجے کو پہلے سے قدرے نرم کرتے ہوئے پھر سوال کیا۔
"پہلے تم بتاؤ؟ تم لوگ کون ہو؟...... کیوں کہ تم ہماری حراست میں ہو' ہم نہیں۔ اس لئے تمہیں ہمارے سوال کا جواب پہلے دینا ہوگا۔"
دانیال اور کلاڈینا دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ کہیں ان کا پول ہی نہ کھل جائے۔
کلاڈینا نے اپنے لہجے اور آواز کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔
"ہم رومی امیر البحر کوناڈس کے خاص الخاص ساتھی ہیں اور یہاں موجود رومی سپہ سالار شیراٹن سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے لئے ایک نہایت اہم پیغام ہے۔"
کلاڈینا نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ کوناڈس کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس کا نام ہی کافی تھا۔ لیکن اب تو وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوناڈس کا نام سنتے ہی سوال پوچھنے والا رومی کپتان ششدر رہ گیا۔ اس نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے کہا۔
"کو کوناڈس؟؟...... تم نے کوناڈس ہی کہا ناں!...... نوجوان حسینہ!"
"ہاں...... میں نے رومی امیر البحر کوناڈس کا ہی نام لیا۔"
گھیرا ڈالنے والے جہاز کا کپتان شش وپنج میں پڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کوناڈس اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ لیکن کلاڈینا اور دانیال کو معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے اندھیرے میں تیر پھینکا تھا۔ کپتان کچھ دیر اسی طرح سوچوں میں گم کھڑا رہا اور پھر اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے اگر تم مرحوم کوناڈس کے ساتھی ہو تو پھر ہمارے سپہ سالار کے معزز مہمان ہو۔ تم لوگ ہمارے ساتھ آؤ۔"

مرحوم کوناڈس ؟؟؟ ...... کلاڈینا اور دانیال کے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ کپتان نے کوناڈس کو مرحوم کہا تھا تو گویا کوناڈس ہلاک ہو چکا تھا۔ دانیال اور کلاڈینا اس خبر کو سن کر خاموش تو ہو گئے لیکن وہ بری طرح خوفزدہ بھی ہو گئے' کیونکہ نئے حالات سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ان کی کہانی میں جھول ہو سکتے تھے۔ ان کا پول کھل سکتا تھا۔ کپتان نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کا کہہ کر جہازوں کو رخ موڑنے کا اشارہ کیا۔ کوناڈس کا نام اس کے لئے اتنی بڑی سند تھا کہ اس نے کلاڈینا کے جہاز کی تلاشی لینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ برقہ گھیرا ڈالنے والے جہازوں کے پیچھے پیچھے رومی لشکر کی طرف چل پڑا۔ اب وہ مزید گہرے خطرے کا سامنا کرنے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد انہیں عظیم رومی بحری بیڑہ دکھائی دیا۔ دانیال اور کلاڈینا کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ وہ اتنے بڑے بیڑے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اب دانیال کو دور سے قرطاجنہ شہر بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ گھیرا ڈالنے والے جہازوں کا کپتان برقہ کو اپنے پیچھے پیچھے لئے رومی بحری بیڑے کے مغربی پہلو کے وسط میں آیا۔ یہاں بیسیوں جہاز لنگر انداز تھے۔ جن پر رومی پرچم لہرا رہے تھے۔ ایک بڑے سہ منزلہ جہاز کے نزدیک پہنچ کر برقہ کو رکنے کا اشارہ دیا گیا۔ اب وہی کپتان چند سپاہیوں کے ہمراہ برقہ کی طرف آ رہا تھا۔ ایک جہاز سے دوسرے جہاز پر آنے کے لئے فوری طور پر چوبی تختے بچھائے جاتے تھے۔ تختے بچھا دیئے گئے تو کپتان اپنے سپاہیوں کے ہمراہ برقہ میں داخل ہوا۔ وہ جہاز کے فرش پر چلتا ہوا کلاڈینا اور دانیال کے پاس آیا۔ اب بھی گفتگو کے فرائض کلاڈینا ہی انجام دینے والی تھی۔ کلاڈینا نے آنے والے کپتان کو خوش آمدید کہا اور بولی:

"ہم ہسپانوی سمندروں کے جانب سے اس طرف آئے ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم سپہ سالار شیراٹن تک مغربی قزاقوں کی نقل و حرکت کی خبر پہنچائیں۔ کیونکہ سپہ سالار کوناڈس کو مارفیس کے سرداروں پر شبہ تھا اور ان کا شبہ درست نکلا۔ باقی تفصیل ہم سپہ سالار شیراٹن کو ہی بتا سکتے ہیں"۔

طے شدہ منصوبہ کے مطابق کلاڈینا نے رومی کپتان سے رومی زبان میں بات کی۔ وہ کلاڈینا کی بات سے مطمئن ہو گیا۔ وہ کوئی سراغ رساں تو تھا نہیں۔ ایک جنگجو سپاہی تھا۔ اس نے کلاڈینا کی بات سن کر اس سے کہا:

''سپہ سالار شیراٹن تو لشکر کے قلب میں ہیں۔ یہاں ہمارے لشکر کا مغربی بازو لنگر انداز ہے۔ میں اسی بازو کے گشتی دستوں کا سالار ہوں۔ ہمارے بیڑے کے مغربی حصے کے سالار محترم ''نوٹاراس'' ہیں۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو میں ابھی ملوا سکتا ہوں۔ سپہ سالار شیراٹن کو ملنے سے پہلے آپ کو سپہ سالار نوٹاراس سے مل لینا چاہیے۔ وہی آپ کو بڑے سپہ سالار تک بھیج سکتے ہیں''۔

دانیال اور کلاڈینا کو نہ تو شیراٹن سے کچھ دلچسپی تھی اور نہ ہی نوٹاراس سے' وہ تو جلد از جلد اس جھمیلے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ کلاڈینا کی ذہین آنکھوں نے بھانپ لیا کہ گشتی دستے کا کپتان اس کی باتوں پر یقین کرنے لگا ہے۔ یکا یک کلاڈینا کے دل میں معلومات لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے کچھ دیر تک کچھ سوچا اور پھر کپتان سے سوال کیا۔

''سپہ سالار کوناڈس کی موت...... کی خبر...... آپ لوگوں تک کب پہنچی؟''

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں وہ کچھ ایسا نہ کہہ دے جو مناسب نہ ہو اور ان کا بھانڈا پھوٹ جائے لیکن خوش قسمتی سے کپتان نے بڑے شوق کے ساتھ جواب دیا۔

''کل ہی!...... کل ہی جب ہمارا بیڑا قرطاجنہ پر بڑا حملہ کرنے والا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی کہ کھلے سمندر میں ہماری فوج نے قرطاجنی امیر البحر موآبریس کو شکست دے دی۔ موآبریس بھی مارا گیا اور ہمارا سپہ سالار کوناڈس بھی۔ آپ کو اس جنگ کا آنکھوں دیکھا حال معلوم ہو گا...... ہیں ناں؟''

''نہیں ہم لوگ اپنی مہم پر نکلے ہوئے تھے۔ جہاں سے ہمیں سیدھا' سپہ سالار شیراٹن کی طرف لوٹنا تھا۔ ہم اس واقعہ کی تفصیل تم سے سننا پسند کریں گے۔ اگر تم چاہو تو......''

کلاڈینا نے کچھ ایسی دلفریب مسکراہٹ سے کپتان سے فرمائش کی کہ وہ کھل اٹھا۔

اور پھر وہ کلاڈینا اور دانیال کو بڑی سمندری جنگ کی تفصیلات بتانے لگا۔ کلاڈینا اور دانیال کی دال گل گئی تھی۔ ان پر کسی کو شک نہ ہوا۔ کپتان سے انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کل صبح' وہ قرطاجنہ پر فیصلہ کن حملہ کرنے والے ہیں۔ ایک ایسا حملہ جو قرطاجنہ کی مکمل شکست پر ختم ہو گا۔ یہ حملہ ہر طرف سے بیک وقت کیا جائے گا۔ خشکی کی طرف سے سپہ سالار اوریس قرطاجنہ کی فصیل کو توڑنے کی کوشش کرے گا اور سمندر کی طرف سے تینوں رومی بیڑے قرطاجنی دفاعی بیڑے کو کچلتے ہوئے دیوتاؤں کی دیوار پر قبضہ کر لیں گے۔

کلاڈینا اور دانیال نے گشتی کپتان سے ہر بات معلوم کر لی اور آخر میں گشتی کپتان نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ نوٹاراس سے ملنے کے لئے اس کے ہمراہ چلنا چاہتے ہیں تو دانیال اور کلاڈینا شش و پنج میں پڑ گئے۔ اب رات ہو چکی تھی۔ بحر روم پر دور دور تک رومی جہازوں کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ یہ مغربی بیڑا تھا جس کا سپہ سالار نوٹاراس تھا۔ گشتی کپتان کلاڈینا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دانیال چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ وہ رومیوں کے حملے سے قبل ہی شہزادی جانی کس کو تمام حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ دونوں مخمصے کا شکار تھے۔ ایسے عالم میں وہ کیا کرتے۔ لیکن پھر قدرت کی کرنی ایسی ہوئی کہ اچانک ان کے سامنے خود بخود وقتی بچاؤ کی ایک سبیل پیدا ہو گئی۔

ہوا یوں کہ گشتی کپتان ابھی کلاڈینا کے جواب کا منتظر ہی کھڑا تھا کہ اس کا ماتحت سپاہی نزدیک آیا اور مؤدب لہجے میں اپنے سالار سے کہنے لگا۔

"سالار! ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ قرطاجنی دفاعی بیڑے کا کچھ حصہ ہمارے مغربی حصے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قرطاجنیوں نے ہمارے بیڑے کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں ہم سے ٹکرانا چاہتے ہیں۔ سپہ سالار نوٹاراس کا حکم ہے کہ ہر سپاہی خود کو مستعد کر لے۔ جنگ رات بھر بھی جاری رہ سکتی ہے۔"

گشتی کپتان اس خبر سے بری طرح اچھلا اور اپنے سر پر ایک چپت رسید کرتے ہوئے نہایت پریشان کن لہجے میں گویا خود کلامی کرنے لگا۔

"اوہ! میرے ذمہ تو ایک نہایت اہم کام لگایا گیا تھا۔ ہائے ایشور! ہم تو مارے گئے۔"

اتنا کہہ کر اس نے کلاڈینا اور دانیال کو کسی قدر ناراض نظروں کے ساتھ دیکھا اور کہنے لگا۔

"آپ لوگوں کی وجہ سے میں ایک بہت بڑی غفلت کر بیٹھا ہوں جس کا ازالہ شاید ممکن ہی نہ ہو۔ میں مغربی سمندروں میں گشتی دستے کا سالار ہوں۔ خبر ملی تھی کہ موآبرلیس کا بچا کھچا اور ٹوٹا پھوٹا بیڑا اس جانب سے قرطاجنہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمارے ذمہ تھا اسے روکنا، اب تک تو وہ بہت نزدیک آچکا ہوگا۔ اوہ میرے ایشور! میرے تمام گشتی جہاز تو یہاں

ہیں۔

قرطاجنی بیڑے کا کچھ حصہ بھی یقیناً اسی غرض سے اس طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ موآبرلیس کے ٹوٹے پھوٹے اور شکستہ بیڑے کو ہمارے حصار سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یقیناً یہی بات ہے۔ گویا ہماری طرف دونوں طرف سے دشمن کے جہاز لپک رہے ہیں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت مغربی سمندر میں پہنچنا ہوگا۔ آپ لوگ ایک جنگ میں پھنس چکے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ لوگ قلب لشکر کی طرف نکل جائیں۔ وہاں آپ شیراٹن سے مل لیں۔ کیونکہ ہمارا سالار نوٹاراس تو اس وقت بے پناہ مصروف ہو چکا ہوگا۔''

اندھا کیا مانگے؟...... دو آنکھیں!...... دانیال اور کلاڈینا کی خدا نے سن لی تھی۔ وہ خود نوٹاراس سے نہیں ملنا چاہتے تھے۔ وہ خود یہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔ موآبرلیس کا شکستہ بیڑا جس کی کمان اب گروزن کے ہاتھ میں تھی۔ اتنا شکستہ بھی نہیں تھا۔ وہ اب مغربی سمندر میں نمودار ہو چکے تھے۔ رومیوں کے گشتی جہاز موجود نہ ہونے کی وجہ سے گروزن کا بیڑا کافی آگے تک بڑھ آیا۔ اب ان کے سامنے رومیوں کا مغربی بازو موجود تھا۔ ادھر شارق خود ایک برق رفتار بیڑا لے کر رومیوں کے مغربی بازو کو کاٹنے کے لئے رات کی تاریکی میں آگے بڑھا تھا۔

دونوں طرف سے قرطاجنی بیڑے تھے اور درمیان میں رومیوں کے مغربی بازو کے سالار نوٹاراس کا بیڑا موجود تھا۔ اگر نوٹاراس درمیان سے اپنے جہاز ہٹا لیتا تو گروزن کا قرطاجنی بیڑا اپنے دفاعی بیڑے کے ساتھ آملتا۔

جلد ہی جنگ شروع ہوگئی۔ نوٹاراس کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ آخر قرطاجنی بیڑہ بیک وقت آگے پیچھے سے اتنی جلد حملہ آور کیسے ہو گیا؟ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے گشتی دستوں کا سالار کلاڈینا کی میٹھی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے فرض سے غافل ہو چکا تھا۔ ایک کپتان کی غفلت نے رومیوں کا معاملہ خراب کر دیا تھا۔

شارق نہایت برق رفتار تھا۔ اس کی یہی خاصیت اور صلاحیت ہمیشہ نمایاں رہی تھی۔ آج بھی اس نے اپنی برق رفتاری اور شدید حملے کی بدولت رومیوں کے مغربی بازو کو چیر کر رکھ دیا۔

جلد ہی دونوں قرطاجنی لشکر ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ رات کی تاریکی میں

آگ کے شعلے اور جہازوں کی گڑگڑاہٹ نے ایسا سماں پیدا کر دیا۔ جیسے دیوتاؤں کی جنگ چھڑ چکی ہو۔ ایسے افراتفری کے عالم میں دانیال کے جہاز کو کون پوچھتا تھا۔ دانیال چالاکی سے اس قیامت خیز جنگ سے نکلا اور اس کے جہاز برقہ نے قرطاجنہ کی طرف دوڑ لگا دی۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اگلی صبح فیصلے کی صبح تھی۔ اہل قرطاجنہ کو رات کی کارروائی کی خبر مل چکی تھی۔ ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اب ان کا دفاعی بیڑا تعداد میں اتنا کم نہیں رہا تھا' جتنا قبل ازیں تھا۔ گروزن کا پورا بیڑا اپنے شہر کی حفاظت کے لئے شارق کے ساتھ آ ملا تھا۔ اوپر دیوتاؤں کی دیوار پر جتنے قرطاجنی شہری' سمندری جنگ دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ اتنے ہی خشکی کی طرف فصیل شہر پر بھی موجود تھے۔

آج برتھاس نے ایک عجیب فیصلہ کیا تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جو آج تک کسی سپہ سالار نے نہ کیا تھا۔ وہ رومی سپہ سالار اورلیس کے ساتھ وہی کھیل کھیلنے جا رہا تھا جو اورلیس نے برتھاس کے ساتھ کھیلا تھا۔ لیکن برتھاس نے تو اس سے بھی بڑھ کر یہ کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ علی الصبح ہی جب دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئیں۔ اوپر فصیل پر جنگ دیکھنے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ نقارے بجنے لگے۔ بگل شور مچانے لگے۔ گھوڑے ہنہنانے لگے اور سورج کی دھوپ میں تیز تلواریں چمکنے لگیں تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ برتھاس' جو قرطاجنی بری لشکر کا سپہ سالار تھا۔ تن تنہا اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر میدان میں نکلا۔ وہ دونوں صف آراء پیدل لشکروں کے بیچوں بیچ آ کر رک گیا اور اس نے اپنے ایلچیوں کو رومی لشکر کے سپہ سالار اورلیس کی طرف روانہ کر دیا۔ اس نے اورلیس کو بذات خود ...... دوبدو مبارزت کی دعوت دے دی۔ یہ ایک نہایت انوکھا اقدام تھا۔ اورلیس کی توقعات میں بھی ایسی بات نہیں تھی۔ وہ خود مبارزت کی جنگ کا طریقہ شوق سے اختیار کیا کرتا تھا۔ لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ قرطاجنی سپہ سالار برتھاس خود بنفس نفیس اسے مبارزت کے لئے للکارے گا۔ اب اگر وہ برتھاس کو انکار کرتا تو اپنی ہی فوج کے سامنے اس کی کیا عزت رہ جاتی۔ اس کے سپاہی کہتے جب وہ دوسرے سورماؤں کو دوبدو مبارزت کے لئے روانہ کر سکتا

ہے تو خود کیوں نہیں جا سکتا۔ اورلیس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ دور سے دیکھ رہا تھا کہ میدان میں برتھاس اپنے اکیلے گھوڑے پر سوار مسلسل اورلیس کو للکار رہا تھا۔ قرطاجنی سپاہیوں نے اپنے سپہ سالار کی جرأت دیکھی تو جوش جذبات سے پاگل ہو گئے۔ وہ اپنے نیزے زمین پر مار مار کر اور اپنے حلقوں سے پرشور آوازیں نکال نکال کر اپنے سردار کو داد دے رہے تھے اور اس کے مدمقابل رومی سپہ سالار اورلیس کو بزدلی کے طعنے دے رہے تھے۔ رومی سپاہیوں کے لئے یہ نہایت بے عزتی کا مقام تھا۔ وہ ابھی تک گم صم کھڑے اپنے سپہ سالار کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اورلیس کی حالت غیر تھی۔ یہ کھیل اس نے خود شروع کیا تھا اور اسی کھیل کی بدولت اس نے گزشتہ جنگ میں برتھاس جیسے بہادر سپہ سالار کو دھوکے سے شکست دی تھی۔ برتھاس اپنی شکست کی ذلت برداشت نہیں کر پایا تھا۔ وہ قرطاجنہ کی مجلس خصوصی کے سامنے بھی شرمندہ اور شرمسار تھا اور اپنی عوام کے سامنے بھی۔ آج وہ اپنی تمام شرمندگیوں کو دھونے کے لئے جنگ سے پہلے خود میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ مسلسل اپنی شمشیر لہرا رہا تھا۔ بالآخر رومی سپاہیوں نے بھی اپنے سپہ سالار کو اس مبارزت کے لئے اکسانا اور ابھارنا شروع کر دیا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اورلیس کو طوعاً و کرھاً اپنے لشکر سے نکلنا پڑا اور جونہی وہ میدان کی طرف بڑھا۔ دونوں لشکروں میں اتنا زیادہ شور بلند ہوا کہ آسمان نے بھی اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ یہ عجیب واقعہ ہو رہا تھا۔ ایک بڑے لشکر کا بہادر سپہ سالار دوسرے بڑے لشکر کے بہادر سپہ سالار کے ساتھ دوبدو مبارزت کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ ظاہر ہے جنگ کا فیصلہ تو چند لمحوں میں ہی ہونے والا تھا۔ ایک سالار کے مرتے ہی دوسری فوج کا حوصلہ بے حد پست ہو جاتا اور بعد کی جنگ تو محض ایک بلوہ بن کر رہ جاتی۔ جب سالار مر جاتے ہیں تو فوجیں جنگیں لڑنے کے قابل نہیں رہتیں۔ یہ برتھاس ہی تھا جس نے اورلیس سے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ورنہ لشکروں کے سالار خود میدان مبارزت میں نہیں اترا کرتے۔ اور کسی کی نگاہوں میں نہ سہی لیکن اپنی محبوبہ کلاڈینا کی نگاہوں میں وہ ضرور سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد دونوں بڑی فوجوں کے سپہ سالار آمنے سامنے تھے اور ان کے نزدیک کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ وہ خود ایک دوسرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی باتیں کوئی تیسرا نہیں سن سکتا تھا۔ سب سے پہلے برتھاس نے بات کی:

"اوریس!...... یہ کھیل تم نے خود شروع کیا تھا۔تم نے جنگ کے اصولوں کی خلاف ورزی کی۔تم نے زہر میں بجھے ہتھیاروں کے ذریعے میرے سورماؤں کو موت کے گھاٹ اتارا۔میرے وہ بہادر سپاہی بھی شہید ہو گئے جو مبارزت میں مدمقابل کو ختم کر کے لوٹتے تھے۔لیکن لشکر میں واپس آ کر وہ شہید ہو جاتے۔کیونکہ اگر ان کے جسم پر کوئی معمولی سا زخم بھی لگ جاتا تو زہر کی وجہ سے وہ زندہ نہ رہ پاتے۔ یقیناً آج تم بھی زہر میں بجھے ہوئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئے ہو گے۔لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں آج تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مبارزت کسے کہتے ہیں۔آج جب تمہارے لشکر کے سامنے تمہاری موت ہو گی تو پورے رومی لشکر کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ پھر چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں لیکن رومی لشکر ضرور دگنا ہو جائے گا۔"

برتھاس کے لہجے کا ٹھہراؤ دیکھ کر رومی سپہ سالار اوریس دل ہی دل میں کانپ گیا۔

لیکن بظاہر اس نے برتھاس کے سامنے سینہ تانتے ہوئے اس کی بات کا یوں جواب دیا۔

"سپہ سالار برتھاس!...... یہ جنگ ہے۔ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔تم نے آج تک کسی بہادر کا سامنا کیا ہی نہیں۔تم ہماری سرزمین پر آ کر ہمارے کمزور لوگوں کو قتل کرتے رہے۔آج تم نے بہت اچھا کیا جو خود کو قتل ہونے کے لئے میرے سپرد کر دیا۔ مجھے امید ہے تمہاری موت کے بعد تمہاری فوج جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہے گی۔"

اوریس نے اتنا کہا اور خود بڑھ کر برتھاس پر حملہ کیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور ان کی ڈھالیں ان کی پشتوں پر بندھی ہوئی تھیں۔ جنہیں وہ بوقت ضرورت آن واحد میں پشت سے الگ کر سکتے تھے۔ برتھاس نے اوریس کے پہلے وار کو ایک طرف ہٹ کر خالی جانے دیا اور اب ان دونوں عظیم سالاروں کے درمیان ایک خوفناک لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ دونوں طرف کے عظیم بری لشکر دم سادھے کھڑے تھے۔اوپر فصیل پر اہل قرطاجنہ اس انوکھی لڑائی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دیوار پر موجود لوگوں میں عمائدین سلطنت کے علاوہ وزیر اعظم ارفلکر بھی خود موجود تھا۔ برتھاس نے اوریس کے ہر وار کو اپنی مہارت کی وجہ سے ہوا میں خالی جانے دیا۔اس کے برعکس برتھاس کے واروں کو روکنے کے لئے اوریس کو اپنی ڈھال استعمال کرنا پڑی۔ اوریس بھی کوئی کم سورما نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ ان کے ہر وار میں بلا کی شدت تھی۔ اتنی شدت کہ دیکھنے والی نظریں

ششدر تھیں۔ اوریس کی تلوار برتھاس پر پڑتی تو یوں لگتا جیسے وہ برتھاس کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دے گی اور برتھاس کا وار اوریس پر پڑتا تو محسوس ہوتا کسی جلاد نے پوری قوت سے گرز دے مارا ہو۔ کبھی کبھی دونوں تلواریں آپس میں ٹکرائیں تو زوردار ''ٹن'' کی آواز پیدا ہوتی جو لشکر تو لشکر دور فصیل پر کھڑے تماشائیوں کو بھی سنائی دیتی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں لڑ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔ ایک کی ذرا سی غفلت اس کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔

معاً برتھاس پوری قوت سے فضا میں اچھلا۔ وہ اوریس کے مقابلے میں چند فٹ بلند ہو گیا اور جب واپس زمین پر آیا تو اس کی شمشیر کا بھاری اور کاری وار اوریس کے بائیں پہلو پر پڑا۔ اگر اوریس کے بدن پر بھاری بھرکم زرہ نہ ہوتی تو وہ اب تک دو حصوں میں کٹ چکا ہوتا۔ لیکن زرہ پر اتنی زوردار تلوار کا وار بھی اوریس کے لئے کم تکلیف دہ نہ تھا۔ اس کے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی اور وہ چند قدم لڑکھڑا گیا۔ برتھاس رک گیا اور اسے سانسیں درست کرنے کا موقع دینے لگا۔ جونہی اوریس بحال ہوا۔ اس نے برتھاس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ تلوار کا وار کیا۔ اس کا نشانہ براہ راست برتھاس کا سر تھا۔ برتھاس نے اس مرتبہ ڈھال استعمال کی اور آن واحد میں اسے اپنے سر پر کر لیا۔ ڈھال پر اوریس کا زوردار وار پڑا تو برتھاس کی ڈھال درمیان سے چیخ گئی۔ برتھاس کو رومی سپہ سالار کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ دور رومی لشکر میں داد و تحسین کا شور بلند ہوا۔ برتھاس نے بے کار ڈھال کا بوجھ اٹھانا بے وقوفی جانا اور پلک جھپکنے کی دیر میں اپنی ڈھال ایک طرف پھینک دی۔ اب اس کے پاس صرف شمشیر تھی۔ وہ دونوں پھر ہانپتے' کانپتے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ برتھاس کو معلوم تھا کہ اوریس کی تلوار زہر میں بجھی ہوئی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ڈھال کے چلے جانے کے بعد وہ اور بھی محتاط ہو گیا۔ اوریس نے برتھاس کو محتاط ہوتے دیکھا تو شیر ہو گیا اور برتھاس پر تابڑ توڑ وار کرنے شروع کر دیئے۔ وہ ہر وار پر برتھاس کو ایک قدم پیچھے دھکیلتا جا رہا تھا۔ برتھاس قدم بہ قدم پیچھے ہٹتا رہا اور اوریس کے ہر وار کو اپنی شمشیر پر روکتا رہا۔ اب ٹن ٹن کی آواز پہلے کی نسبت بہت زیادہ پیدا ہو رہی تھی۔ یکایک برتھاس نیچے زمین پر بیٹھ گیا اور اس کی شمشیر ایک دائرے میں گھوم کر اوریس کی ٹانگوں پر پڑی۔ لیکن اوریس نے ہوا میں اچھل کر برتھاس کا وار خالی

جانے دیا۔ بلکہ اوپر سے اس نے اپنی شمشیر کا ایک زوردار وار برتھاس کے کندھے پر کیا۔ برتھاس آن واحد میں ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو تو اس کا کندھا کٹ کر الگ ہو جاتا۔ اگلے لمحے برتھاس نے نہ صرف اٹھنے میں برق رفتاری کا مظاہرہ کیا بلکہ پہلے کی طرح فضا میں اچھلا اور خود کو ہوا میں ہی نیم دائرے کی صورت گھما کر اوریس کے پہلو پر ایک کاری ضرب لگائی۔ ضرب پھر لوہے کی زرہ پر پڑی۔ دراصل جب سے برتھاس کی ڈھال ٹوٹی تھی۔ وہ اوریس کی شمشیر سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کوئی معمولی سا زخم بھی اس کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ زرہ پر پہلے کی طرح دوبارہ زوردار ضرب کھا کر اوریس کے سینے میں پہلے سے بھی زوردار درد کی ٹیس اٹھی۔ لیکن اس نے پرواہ نہ کی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے داہنے ہاتھ میں تھمی شمشیر کو سیدھا کر لیا۔ بالکل آمنے سامنے اگلے لمحے اس کی شمشیر کی نوک برتھاس کے پیٹ کی طرف لپکی۔ برتھاس نے خود کو آن واحد میں ایک طرف جھکا لیا۔ اوریس کی شمشیر ہوا میں خالی چلی گئی۔

وہ دونوں جنگ کے شروع میں ہی اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر چکے تھے اور ساری لڑائی زمین پر لڑ رہے تھے۔ ان کے گھوڑے نزدیک ہی کھڑے تھے۔ دونوں لشکر اپنی اپنی سانسیں روکے اس ہیبت ناک جنگ کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف ان دونوں سپہ سالاروں کی شمشیریں ٹکرانے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ معاً اوریس نے برتھاس پر تلوار کا ایک وار کیا جو محض دکھلاوا تھا کیونکہ جونہی برتھاس ایک طرف کو جھکا اوریس نے اپنی ڈھال پوری قوت سے برتھاس کے چہرے پر دے ماری۔ برتھاس کو چہرے پر چوٹ لگی اور اس کے چہرے کی جلد پھٹ گئی۔ اگلے لمحے اوریس نے برتھاس والا داؤ استعمال کیا۔ وہ نہایت پھرتی سے زمین پر بیٹھا اور اپنی تلوار کو نیم دائرے کی صورت میں گھما کر برتھاس کی ٹانگوں کو کاٹنا چاہا۔ لیکن ایسے عام داؤ کی زد میں برتھاس جیسا جنگجو کہاں آنے والا تھا۔ وہ فضا میں اچھلا اور اوریس کی شمشیر ہوا میں خالی گھوم گئی۔ لیکن برتھاس کی تلوار کا وار خالی نہ گیا۔ برتھاس نے اوپر سے اپنی تلوار کسی جلاد کے گرز کی طرح اوریس کے سر پر دے ماری۔ اوریس کے سر پر لوہے کا خود چڑھا ہوا تھا۔ جو تلوار کی ضرب سے پچک گیا اور اوریس کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر پوری چٹان دے ماری ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یکلخت اندھیرا

چھا گیا اور اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اسی موقع نے برتھاس کو اس جنگ کا فاتح بنا دیا۔ کیونکہ اگلے لمحے برتھاس کی شمشیر اورلیس کے بائیں شانے کو کاٹ چکی تھی۔ برتھاس کا وار اتنا زور دار تھا کہ زرہ کی مضبوط کڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ جونہی اورلیس کا بایاں کندھا کٹ کر الگ ہوا ...... بے ہوش ہوتے ہوئے اورلیس کی آنکھیں ایک بار پوری طرح کھل گئیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ برتھاس اب اس کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا اور نہایت اطمینان سے اس کا سر کاٹنے کے لئے اپنی شمشیر کو دائیں ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ لیکن اسی لمحے ایک انہونی ہوگئی۔ اورلیس نے مرتے مرتے بھی اپنی شمشیر گھما دی۔ برتھاس ایک چھلانگ لگا کر پیچھے ہٹنے اور شمشیر کے وار سے بچنے میں تو کامیاب ہوگیا لیکن اورلیس کی تلوار کی نوک برتھاس کی بائیں پنڈلی کو زخمی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب تک تو برتھاس نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے آپ کو اس موذی تلوار سے بچائے رکھا تھا۔ لیکن آخر وقت میں جب وہ اس مبارزت کو جیت چکا تھا۔ زہر میں بجھی تلوار کا ایک معمولی سا زخم اپنے بدن پر ''کھا'' بیٹھا۔ برتھاس کو یقین ہوگیا کہ اب وہ بھی زندہ بچ نہیں پائے گا۔ اس کے تن بدن میں غصے کی شدید لہر دوڑ گئی۔ دور سے دیکھنے والوں کے لئے وہ مکمل طور پر جنگ جیت چکا تھا۔ رومیوں کی حالت غیر تھی جبکہ قرطاجنی اچھل اچھل کر اور شور مچا مچا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ برتھاس نے شدید غصے کے عالم میں اپنی شمشیر پوری قوت سے گھمائی اور اورلیس کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا۔ رومی سپہ سالار کا سر لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ برتھاس نے دوڑ کر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ اٹکا اپنا نیزہ تھاما اور رومی سپہ سالار کا سر اپنے نیزے کی انی پر کھبا کر خود اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ فصیل شہر پر بلند بانگ نعرے گونج رہے تھے۔ رومی فوج بری طرح مایوس ہو چکی تھی۔ ان کا سپہ سالار جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی مارا گیا تھا۔ برتھاس جونہی اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس اپنے لشکر کے پاس پہنچا۔ اس نے بغیر ایک لمحے کی دیر کئے عام حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن اب قرطاجنیوں کو یقین تھا کہ وہ ہر قیمت پر رومیوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔

عین اسی وقت سمندر میں بھی زوروں کی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ یہ لڑائی تو نہ تھی کوئی قیامت تھی۔ ہزاروں بحری جہازوں کے ساتھ ہزاروں بحری جہاز ٹکرا گئے تھے۔ قرطاجنی لشکر کی کمان شارق کے ہاتھ میں تھی اور دوسری طرف شیراٹن جیسا منجھا ہوا اور قابل بحری سالار

برسرپیکار تھا۔ ہر جہاز آگ کے گولے اگل رہا تھا۔قرطاجنہ کے تین اطراف موجود سمندر میں مصنوعی طوفان آ چکا تھا۔ شارق کا دفاعی بیڑا اپنے حصار کو قائم رکھے ہوئے تھا اور اس کے جہاز رومی جہازوں کو دیوتاؤں کی دیوار کے نزدیک نہ آنے دے رہے تھے۔ گروزن کے لشکر کی شمولیت کا جو غم وغصہ تھا وہ اسے پوری شدت کے ساتھ نکال رہے تھے۔لیکن پھر بھی شیراٹن کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ شیراٹن کا بحری بیڑہ تین حصوں میں تقسیم ہو کر بھی اتنا بڑا تھا کہ شارق اور گروزن کے لئے اس کو روکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔شارق کے ایک ایک جہاز کو تباہ کرنے کے لئے شیراٹن کے تین تین جہاز آگے بڑھ آتے۔ اوپر دیوتاؤں کی دیوار پر موجود قرطاجنیوں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ کبھی اپنے خشکی پر لڑنے والے سپاہیوں کی جانب سے خوشخبریاں سنتے تو کبھی سمندر میں ہونے والی لڑائی دیکھ کر مایوس ہونے لگتے۔انہیں اپنے سمندری سپاہیوں پر فخر ہو رہا تھا۔لیکن دشمن کی تعداد کے مقابلے میں قرطاجنی جہازوں کی تعداد بہت کم تھی اور یہی وجہ تھی اصل پریشانی کی۔اس پر مستزاد شیراٹن کی ذہانت تھی۔ وہ جنگ کو ایک کھیل کی طرح کھیلتا تھا۔ وہ کبھی ہمت نہ ہارتا تھا اور نہ ہی تھکتا تھا۔اس نے شارق کی کمان میں لڑنے والے ایک ایک جہاز کو تاک تاک کر نشانے مارنے شروع کر دیئے۔ سورج طلوع ہونے کے ساتھ چھڑنے والی جنگ دوپہر تک بے پناہ بھڑک چکی تھی۔ رومی نہایت چابکدستی سے اپنے جہاز آگے لاتے اور شارق کے جہازوں کو گولہ باری کے ذریعے نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹ جاتے۔تعداد کی کمی کی وجہ سے قرطاجنیوں کا بہت نقصان ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سہ پہر سے پہلے ہی قرطاجنی جنگ ہار جائیں گے۔شارق نے اچانک ایک انوکھا اقدام کیا۔اس نے تیزی کے ساتھ ختم ہوتے ہوئے اپنے جہازوں کو دیکھا تو اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ جہازوں سے سمندر میں کود جائیں اور تیر تیر کر دشمن کے جہازوں پر سوار ہونے کی کوشش کریں اور جب رومیوں کے جہازوں پر سوار ہو جائیں تو دوبدو جنگ کریں۔شارق کو معلوم تھا کہ قرطاجنی باشندے اپنے شہر کو بچانے کے لئے جانوں پر کھیل جائیں گے۔شارق کے حکم کی دیر تھی کہ ہزاروں قرطاجنی پانی میں کود گئے اور تیرتے ہوئے رومیوں کے جہازوں کی طرف بڑھنے لگے۔لگ بھگ نصف گھنٹے کے اندر اندر شارق کے اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ رومی جہاز ایک ایک کر کے قرطاجنیوں کے قبضے میں آنے لگے۔

شیراٹن کو نئی صورتحال کا علم ہوا تو اس نے بھی اپنے تیراکوں کو کودنے کا حکم دیا اور کہا کہ کسی قرطاجنی کو رومی جہازوں تک نہ پہنچنے دیا جائے بلکہ انہیں سمندر میں ہی قتل کرنے کی کوشش کی جائے۔ نہایت گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں ایک اڑتی ہوئی خبر پہنچی اور اس خبر نے سمندر کی جنگ پر نہایت واضح اثرات مرتب کئے۔ اڑتی ہوئی خبر یہ پہنچی کہ۔

"بری لڑائی میں رومیوں کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا سپہ سالار قرطاجنی سپہ سالار کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور یہ کہ قرطاجنی بری فوج نے رومیوں کے پورے بری لشکر کو تہس نہس کر دیا۔ شہر کے سامنے اب کوئی رومی سپاہی موجود نہیں۔"

اس خبر نے شیراٹن کی فوج کے دلوں کو دہلا دیا۔ قریب تھا کہ رومیوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ فرار ہونے کی سوچتے کہ اسی اثناء میں شیراٹن نے آخری اور زوردار حملے کا حکم دے دیا۔ اس نے اپنے پانچ سو سے زائد جہازوں کو محاذ جنگ سے دور رکھا ہوا تھا۔ لیکن تازہ صورتحال کی وجہ سے اس نے اپنے اس مخصوص بیڑے کو بھی جنگ میں جھونک دیا۔ قرطاجنی جن کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ نئے رومی جہازوں کو آتا دیکھ کر گھبرا گئے۔ اتنا بڑا لشکر اچانک نمودار ہوا تو قرطاجنیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ صبح سے لڑ لڑ کر پہلے ہی بہت تھک چکے تھے۔ اب جب انہوں نے رومیوں کے تازہ دم بیڑے کو نمودار ہوتے دیکھا تو ان کی رہی سہی کسر بھی جاتی رہی۔ ان کے چہروں پر مایوسی نمودار ہونے لگی۔ شارق اور گروزن دوڑ دوڑ کر اپنے سپاہیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ لیکن تازہ دم رومی لشکر کو دیکھ کر قرطاجنی سپاہیوں کے دل دہشت زدہ ہونے لگے۔

سہ پہر سے کچھ دیر پہلے تک رومہ اور قرطاجنہ کی یہ سمندری جنگ اپنے عروج کی آخری انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ رومی قریب قریب غالب آنے والے تھے۔ ان کے کئی جہاز دیوتاؤں کی دیوار تک پہنچ چکے تھے اور انہوں نے شارق کا دفاعی حصار کامیابی کے ساتھ توڑ لیا تھا۔ بہت جلد قرطاجنہ رومیوں کے ہاتھ آنے والا تھا۔ دیوتاؤں کی دیوار پر موجود قرطاجنی شہریوں کے چہروں پر آج صبح جو خوشی نمودار ہوئی تھی وہ اب کافور ہو چکی تھی۔ بیشتر قرطاجنی جہاز غرق ہو چکے تھے اور آدھی سے زیادہ فوج لقمہ اجل بن چکی تھی۔ شیراٹن کے لشکر کا دباؤ تھا کہ مسلسل بڑھتا جاتا تھا۔ معاً ایک عجیب واقعہ ہوا لوگوں نے دیکھا۔ سب نے دیکھا ہر سپاہی

اور ہر شہری نے دیکھا۔ وہ بڑے بڑے مٹکے تھے...... مٹی کے مٹکے ...... جو سمندر پر تیرتے ہوئے رومی لشکر کے قلب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ چند مٹکے نہیں تھے۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ مٹی کے یہ مٹکے کہاں سے آئے تھے۔ یہ اچانک کیسے نمودار ہو گئے تھے اور ان میں کیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

دیوتاؤں کی دیوار پر موجود تمام قرطاجنی شہری نہایت تجسس اور خوف کے عالم میں تیر کر آتے ہوئے مٹی کے ان مٹکوں کو دیکھ رہے تھے اور پھر جب وہ مٹکے رومی لشکر کے عین عقب میں پہنچے تو دیکھنے والی ہر آنکھ دنگ رہ گئی۔ ہر مٹکے کے ساتھ ایک سر نمودار ہوا۔ وہ ایک انسانی سر تھا۔ مٹی کے مٹکے کھینچ کر رومی لشکر کے عقب میں لانے والے کون تھے۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ جونہی مٹی کے مٹکے کھینچ کر لانے والے تیراک سپاہی رومی لشکر کے ٹھیک عقب میں پہنچے' انہوں نے مٹکے پھوڑنے شروع کر دیئے۔ جونہی مٹکے پھوٹے' ان میں سے سیاہ رنگ کا سیال مادہ سمندر کی سطح پر بہنے لگا۔ وہ کالا تیل تھا۔ ایسا آتش گیر تیل جسے آگ دکھانے کی دیر تھی اور وہ بھڑک اٹھتا۔ مٹکے پھوڑنے والے سپاہی کس کے تھے؟ یہ کون لوگ تھے؟ اور اس گوریلا کارروائی کا اہتمام کس نے کیا تھا۔ یکایک شارق کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ یہ ضرور قرطاجنہ کی کنواری کا اقدام تھا۔ یقیناً قرطاجنہ کی کنواری کے سرفروشوں نے یہ انوکھا کھیل کھیلا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد کالے رنگ کا گاڑھا تیل رومی لشکر کے عقب میں سطح سمندر کو سیاہ کرنے لگا۔ مٹکے پھوڑنے والے جس طرح چپکے سے آئے تھے اسی طرح چپکے سے تیرتے ہوئے واپس نکل گئے۔ لیکن اپنے پیچھے چھوڑ گئے وہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ۔

شیراٹن نے اپنے قلب کے عقب میں پانی کے سمندر کو آگ کے سمندر میں تبدیل ہوتے دیکھا تو اسے صحیح معنوں میں دانتوں پسینہ آ گیا۔ اس کے فرار کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ آگے دشمن تھا اور پیچھے خوفناک آگ' شیراٹن ایک بار تو گڑبڑا گیا لیکن معاً اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جیتی ہوئی جنگ کسی قیمت پر نہیں ہارے گا۔ چنانچہ اس نے خود آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔ مر جاؤ یا مار دو کے مصداق شیراٹن نے اپنے جہاز کو ایڑھ لگائی اور سب سے آگے نکل آیا۔ شیراٹن کے جتنے افسروں نے اپنے سپہ سالار کو خود جنگ میں

سب سے آگے جاتے دیکھا۔ سب کے سب اپنے ڈوبتے ہوئے دلوں کو سہارا دے کر ایک بار پھر قرطاجنہ پر ٹوٹ پڑے۔ شیراٹن کا یہ آخری حملہ اتنا زوردار تھا کہ تھکے ہوئے قرطاجنی شیراٹن کو نہ روک سکے۔ رومی جہاز آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھے اور اپنے سپہ سالار کی قیادت میں بچے کھچے قرطاجنیوں کا صفایا کرنے لگے۔ شارق کو یقین ہو گیا کہ وہ یا اس کے جہاز شیراٹن کے اس حملے کا کسی قیمت پر سامنا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ خوب مقابلہ کرتا رہا' لیکن اس کی پیش نہ گئی۔ اس بار شیراٹن نے سچ مچ آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے دیوتاؤں کی دیوار تلے پہنچ گیا۔ قرطاجنی جہاز جو بچ گئے تھے۔ تتر بتر ہونے لگے۔ صرف شارق کا ہراول تھا جو ابھی تک شیراٹن کے جہازوں پر بدستور گولہ باری کر رہا تھا۔ شیراٹن کے سپاہیوں نے میدان خالی دیکھا تو شیر ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ جنگ جیت چکے ہیں۔ اچانک شیراٹن نے حکم دیا کہ بندرگاہ پر قبضہ کر لو۔ شیراٹن کا اپنا جہاز بھی بندرگاہ کی طرف لپکا' لیکن بندرگاہ کی نگرانی قرطاجنی شہزادی جانی کس کے جانثار کر رہے تھے۔ شیراٹن کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دیوتاؤں کی دیوار پر موجود شہریوں کے منہ لٹک گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ چند سپاہی آخر کب تک اتنے بڑے رومی لشکر کو بندرگاہ تک پہنچنے سے روک پائیں گے۔ جونہی بندرگاہ رومیوں کے قبضے میں آتی' قرطاجنہ رومیوں کے ہاتھ آ جاتا۔ یہ جنگ کا آخری مرحلہ تھا۔ رومیوں نے حقیقت میں قرطاجنہ کو فتح کر لیا تھا۔ شیراٹن کے سپاہی اب آخری زور لگا رہے تھے کہ اچانک مغرب سے سینکڑوں کالے کالے جہازوں کے بادبان نمودار ہوئے۔ دیوتاؤں کی دیوار پر موجود شہریوں نے یہی سمجھا کہ رومیوں کے مزید جہاز بھی آ پہنچے ہیں لیکن شیراٹن کو حیرت تھی کہ آخر یہ کون سے جہاز ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں کہاں سے آ نکلے ہیں۔

وہ سردار جیران کی سرکردگی میں آنے والے مارفیس کے قزاق تھے۔ جو اگر ذرا سی بھی دیر مزید کر دیتے تو آج قرطاجنہ برباد ہو جاتا۔ مارفیس کی کمک آ پہنچی تھی۔ شارق نے دور سے ہی اپنے مخصوص جہازوں کو پہچان لیا۔ وہ انہیں جہازوں میں پلا بڑھا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے اپنے ماتحتوں کو پکارا۔

''کمک آ پہنچی' کمک آ پہنچی ...... مارفیس جزیرہ کی کمک آ پہنچی۔ اب ہم نہیں ہار

سکتے۔ شکر ہے ایشور تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

شارق کے منہ سے کمک کے الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ یہ خبر جنگل کی آگ بن کر پورے میدان جنگ میں گونج گئی۔ شیراٹن کے لئے یہ ایک بالکل نئی اطلاع تھی۔ وہ سچ مچ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ آخر قرطاجنہ والوں کے پاس مارفیس جزیرہ سے کمک کیونکر آ پہنچی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہتھیلی کا چھجا بنایا اور آنے والی کمک کا جائزہ لینے لگا۔ آنے والے جہاز سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ شیراٹن کا تمام تر حوصلہ آن واحد میں کافور ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ جیتی ہوئی جنگ ہار چکا ہے۔ وہ سچ مچ ایک جیتی ہوئی جنگ ہار چکا تھا۔ اس نے اپنے جہازوں کو بندرگاہ سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ لیکن پیچھے بھی' آخر وہ کہاں تک ہٹ سکتا تھا۔ پیچھے تو آگ تھی۔ شیراٹن کو یقین ہو گیا کہ اب رومی لشکر کسی قیمت پر فتح یاب نہیں ہو سکتا۔ اب اچھے سپہ سالار کی طرح اس کا فرض تھا کہ اپنے سپاہیوں کی جانیں بچاتا اور جتنے سپاہیوں کو دشمن کے شکنجے سے نکال سکتا' نکالتا۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ سردار جیدان کا بیڑا سر پر چڑھ آیا تھا۔ سردار جیدان کے قزاق سپاہیوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے تو نہایت تر نوالہ دھرا ہے۔ وہ اپنے مخصوص قزاقانہ انداز پر رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ شیراٹن کو محسوس ہوا کہ بزدلوں کی طرح بھاگنے کی صورت میں وہ زیادہ نقصان اٹھائے گا۔ چنانچہ اس نے بھی قزاقوں کے ساتھ ٹکرا جانے میں عافیت سمجھی اور ایک بار پھر خونریز جنگ برپا ہو گئی۔ شیراٹن کے سپاہیوں نے ایک بڑی جنگ لڑی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی تھی لیکن معرکہ کارزار ابھی تک گرم تھا اور اب کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آخر کون کس کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ بس ایک خونریز جنگ تھی۔ شعلے تھے' چیخ و پکار' قتل و غارت اور مار دھاڑ کا بازار گرم تھا۔ غروب آفتاب تک رومیوں نے قزاقوں کو خوب بتایا کہ وہ آسانی سے ہاتھ آنے والے نہیں۔ لیکن جونہی اندھیرا چھانے لگا۔ رومیوں نے فرار کی راہ اختیار کی اور شیراٹن' خوفناک شکست کے بعد کھلے سمندر کی طرف لوٹ گیا۔ اس کا لشکر تباہ ہو چکا تھا اور وہ خود بھی بری طرح زخمی تھا۔

جنگ ختم ہوئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ قرطاجنہ بچ گیا۔ دشمن ناکام ہو گیا۔ رومیوں کے سارے خوابوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن قرطاجنیوں کا بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا تھا۔ قرطاجنیوں کی آدھی نسل اس جنگ کی نذر ہو گئی تھی۔ اتنے بڑے جانی نقصان کے باوجود بھی

قرطاجنہ کے عوام خوشی سے اچھلتے اور ایک دوسرے کو گلے لگاتے پھر رہے تھے۔ مارفیس کے قزاقوں نے اگرچہ اس جنگ میں کوئی خاص بڑا کارنامہ سرانجام تو نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی ان کی آمد نے قرطاجنہ کو برباد ہونے سے بال بال بچالیا تھا۔ محبت کا شہر ایک بڑے نقصان کے بعد اب محفوظ تھا۔ شہر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے اور رات کی تاریکی کے باوجود لوگ زخمیوں کو اٹھانے اور مال غنیمت کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک قیامت تھی جو قرطاجنہ پر آ کر گزری تھی۔ ایک عذاب تھا جس نے اہل قرطاجنہ کو آ لیا تھا اور انہوں نے بالآخر اس مشکل سے چھٹکارا پالیا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن دکھ درد کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ زخمیوں اور مقتولوں کے وارث رو رہے تھے۔ عام عوام جوش و جذبے سے مغلوب ہو کر کام کر رہے تھے۔ رومیوں کے ڈوبتے ہوئے جہازوں میں سے سامان نکالا جا رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے جہازوں کو کھینچ کر بندرگاہ اور کناروں پر لگایا جا رہا تھا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اسی ادھیڑ بن میں رات گزرنے لگی۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

محبت کے شہر کا سب سے بڑا میدان اہل جشن سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دور دراز سے لوگ اس جشن کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ آج اہل قرطاجنہ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ یہ ایک بہت ہی بڑا میدان تھا۔ جہاں لاکھوں لوگ جمع ہو سکتے تھے۔ ہر شہری کے چہرے پر خوشی ہی خوشی تھی۔ چند روز قبل انہوں نے ایک نہایت ہی خوفناک اور بڑے دشمن کو شکست دی تھی۔ گزشتہ چند روز وہ جنگ سے پیدا ہونے والے حالات کو سنبھالتے رہے تھے۔ زخمیوں کو شفا خانوں میں بھرتی کیا گیا تھا۔ مقتولوں کو نذر آتش کیا گیا تھا۔ جہازوں کو کارخانوں میں بھرتی کروایا گیا تھا اور مال غنیمت سپاہیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ آج کا جشن ان تمام مشکلات سے فراغت کے بعد برپا کیا جا رہا تھا۔ اس جشن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آج مارفیس جزیرہ کے سرداروں کو بروقت مدد کرنے پر اعزازات اور انعامات سے نوازا جانا تھا۔ اس کے علاوہ بھی آج کے جشن میں ایک بڑی دلچسپی کی بات تھی۔ آج قرطاجنہ کی کنواری عام شہریوں کو درشن دینے والی تھی۔ اہل شہر قرطاجنہ کی کنواری کے آج کے درشن سے اس لئے بھی لطف اندوز ہونا چاہتے تھے کہ انہوں نے اپنی محبوب شہزادی کو اس جنگ کا اصل فاتح تسلیم کیا تھا۔ ہر شہری کے دل میں یہی ایک بات تھی کہ انہیں اس خطرناک جنگ سے بچانے والی قرطاجنہ کی کنواری شہزادی جانی کس ہی تھی۔ پورے مجمع میں بچہ بچہ آج قرطاجنہ کی کنواری، شہر کی ماتا اور اپنی محبوب رہبر کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔

ہر زبان پر ایک ہی ذکر تھا کہ قرطاجنہ کو دیوی ماں نے بچایا' نہ جانے کیسے عوام میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ یہ پوری جنگ قرطاجنہ کی کنواری نے لڑی اور اس نے ملک کو فتح سے ہمکنار کیا۔ آج ہر آنکھ بے تاب تھی۔ ہر دل دھڑک رہا تھا۔ سب کو انتظار تھا کہ کب قرطاجنہ

کی کنواری' دیوی ماں شہزادی جانی کس سٹیج پر نمودار ہو اور کب اہل قرطاجنہ اپنی محسنہ کا دیدار کریں۔ لوگوں کو شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ حالانکہ آج جشن کا دن تھا اور قدم قدم رونق و دلچسپی کا کوئی نہ کوئی سامان موجود تھا۔ لیکن آج قرطاجنہ کی تمام تر آبادی کی دلچسپی اپنی دیوی ماں کے ساتھ تھی۔ بڑے میدان میں مشرق کی طرف ایک بہت بڑا چبوترہ' سٹیج کے طور پر سجایا گیا تھا۔ جہاں آج عظیم الشان جلسہ ہونے والا تھا۔ آج اس سٹیج پر نہ صرف قرطاجنہ کی کنواری عوام کے سامنے آنے والی تھی بلکہ مدتوں بعد آج لوگوں کو مہا پرش طالوسا کی زیارت بھی نصیب ہونے والی تھی۔

آج کے جشن میں صرف اہل قرطاجنہ ہی شامل نہ تھے۔ بلکہ آس پاس کی تمام آبادیاں بھی آج شہر قرطاجنہ میں امڈ آئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو اشتیاق تھا کہ وہ مارفیس کے قزاقوں کو دیکھیں۔ جنہوں نے آخر وقت میں پہنچ کر قرطاجنہ کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ ہر طرف شوروغل کا عالم تھا اور پھر جب چبوترے کی طرف سے نقارہ بجنے کی آواز سنائی دی تو میدان میں موجود عوام چبوترے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایسی دھکم پیل تھی کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ چبوترے پر منقش نشستیں بچھی ہوئی تھیں اور ابھی تک نشستوں پر خواص میں سے کوئی بھی نہ بلایا گیا تھا۔ چبوترے کے ایک کونے میں ایک نقارچی مسلسل نقارہ پیٹ رہا تھا اور نقارے کی آواز لوگوں کو کھینچ کھینچ کر چبوترے کی طرف لا رہی تھی۔ ہزاروں لوگ جوق در جوق چبوترے کے سامنے جمع ہونے لگے۔ ہر چہرے سے خوشی اور سرشاری ٹپک ٹپک جاتی تھی۔

دھیرے دھیرے سب لوگ چبوترے کے سامنے جمع ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔ سب لوگوں کی نگاہیں چبوترے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد نقارچی نے نقارہ پیٹنا بند کر دیا۔ اب یکلخت ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ عوام کی نگاہیں عقبی پردے پر اٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں ہر گھڑی انتظار تھا' انتظار تھا۔ ان مہمانوں کا جنہوں نے قرطاجنہ کو بچایا تھا۔ انتظار تھا مہاپرش کا اور انتظار تھا۔ دیوی ماں کا جس کے درشن لینے کے لئے آج اہل قرطاجنہ پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

پردے میں سرسراہٹ ہوئی تو لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیکن

پردے کے پیچھے سے قرطاجنہ کا خصوصی نقیب برآمد ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جس کی آواز شہر میں سب سے زیادہ بلند تھی۔ اسی آواز کی بدولت وہ شاہی نقیب کے عہدے تک پہنچا تھا۔ شاہی نقیب نے لوگوں کے سامنے آتے ہی سب سے پہلے لوگوں کو سلام کیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں یوں مخاطب ہوا:

"مشرق کے عظیم فرزندو! فنیقیہ کے عظیم سپوتو! قرطاجنہ کے غیور باسیو! تمہیں مبارک ہو! کہ تم نے ایک بڑے دشمن کے خلاف فتح پائی۔ تمہیں مبارک ہو کہ تم نے مشرق کے شہر صور کا نام زندہ رکھا۔ اے قرطاجنہ کے سپوتو!...... آج کا جشن مسرت، ہماری فتح کا جشن ہے اور آج کے اس جشن میں ہمارے ساتھ شریک ہیں ہمارے خاص مہمان، جزیرہ مارفیس کے بہادر سردار اور ان کے بہادر سپاہی، ہم نے رومیوں پر فتح پائی۔ ہم نے یورپ کے رومیوں کو شرمناک شکست دی اور اپنے شہر کو برباد ہونے سے بچالیا۔

اے ملکرت کے ماننے والو! اب میں تمہارے سامنے بلانے لگا ہوں۔ اپنے خاص مہمانوں کو جو مغربی سمندر کے جزیرہ مارفیس سے چل کر ہمارے پاس آئے اور ٹھیک اس وقت انہوں نے ہماری مدد کی جب ہم شکست کے قریب تھے۔ میں دعوت دیتا ہوں۔ سردار جیدان، سردار منگورہ اور ان کے ساتھیوں کو کہ وہ چبوترے پر آئیں اور شاہی مسندوں پر ہمارے عمائدین کے ہمراہ جلوہ افروز ہوں۔"

پردہ سرسرایا اور مارفیس جزیرہ کے قزاق سردار، قرطاجنہ کی عوام کے سامنے نمودار ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ سردار جیدان اور سردار منگورہ کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے تو کبھی زندگی میں ایسا رتبہ پانے کا نہ سوچا ہوگا۔ مارفیس کے سرداروں کے ہمراہ سلطنت قرطاجنہ کے عمائدین اور وزراء، چبوترے پر نمودار ہوئے اور آخر میں وزیر اعظم ارفلکر بھی نہایت شان کے ساتھ چلتے ہوئے سٹیج پر بچھی نشستوں پر آ کر متمکن ہوگیا۔ سٹیج کی تمام مسندیں پر ہوگئیں۔ صرف دو خاص الخاص نشستیں باقی رہ گئیں۔ جو چبوترے کے عین درمیان میں بچھائی گئی تھیں۔ تب نقیب نے دوبارہ اعلان کیا۔

"قرطاجنہ کے خوش نصیب باسیو!...... اب میں تم لوگوں کے سامنے بلانے لگا ہوں۔ اس ہستی کو جسے اہل قرطاجنہ اپنے لئے باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ تشریف لاتے ہیں

قرطاجنہ کے روحانی پیشوا' مقدس مہا پرش طالوسا!......"

اب تو لوگ سر اٹھا اٹھا کر آنے والے بوڑھے مہا پرش کو دیکھنے لگے۔ مجمع میں استقبالیہ آوازوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ بوڑھا مہا پرش عوام کے سامنے نمودار ہوا۔ چبوترے کی تمام نشستیں بھر گئیں۔ لیکن ایک نشست ابھی خالی تھی۔ تب نقیب نے پھر پکارا۔

"اور اب دلوں کو سنبھال لیجئے! کیوں کہ آپ اور ہم سب کی روحانی ماں ...... قرطاجنہ کی دیوی ماتا! دوشیزہ شہر' شہزادی جانی کس کے درشن کا وقت ہوا چاہتا ہے اور چبوترے پر تشریف لاتی ہیں۔ قرطاجنہ کی کنواری شہزادی جانی کس۔"

دیکھنے والوں کی نگاہیں بے تابی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھیں۔ ہر شخص پاگل ہوا جا رہا تھا۔ پورا مجمع یکدم خاموش ہو گیا۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی کے باوجود...... اس قدر سناٹا چھا گیا کہ زمین پر سوئی گرنے کی آواز میں سنی جا سکتی تھی۔ عوام کی نگاہیں مسلسل پردے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن پردہ نہ ہلا نہ سرسرایا۔ نقیب نے چونک کر عقبی پردے کی طرف دیکھا لیکن پردہ نہ ہلا۔ قرطاجنہ کی کنواری نمودار نہ ہوئی۔ لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ چبوترے پر موجود مہمانوں اور میزبانوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن نہ جانے شہزادی جانی کس ...... کیوں نہ ظاہر ہو رہی تھی۔ مجمع کا سناٹا اور بھی بڑھ گیا۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ آخر دیوی ماتا' درشن کیوں نہ دے رہی تھی۔ نقیب نے بوکھلاہٹ کے عالم میں پردے کے پیچھے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ وہ پردے کے عقب سے دیکھ کر واپس سٹیج پر لوٹا تو اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کی مایوسی تھی۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وزیراعظم ارفلکر جو شہزادی جانی کس کا باپ تھا۔ خود اٹھ کر پردے کے عقب میں پہنچا اور پھر کچھ دیر بعد نہایت اضطراب اور پریشانی کے عالم میں واپس لوٹ آیا۔ شہزادی جانی کس سچ مچ نہیں تھی۔ یکا یک مجمع میں چہ میگوئیاں ہونے لگی۔ ہر طرف مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جو دھیرے دھیرے بلند آواز میں تبدیل ہونے لگی۔ چبوترے پر موجود تمام شرکاء بھی آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ صرف ایک شخص تھا جو اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا اور وہ تھا مہا پرش طالوسا' مہا پرش طالوسا کا اطمینان دیکھ کر سب کی

نگاہیں مہاپرش کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ آخر مہاپرش اس قدر خاموش کیوں تھا۔ بالآخر وزیراعظم ارفلکر سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی مسند سے اٹھ کر مہاپرش کے پاس آیا۔ اس نے کمر تک جھک کر مہاپرش کو سلام کیا اور ادب کے ساتھ عرض کی۔

''مہاپرش!...... کیا آپ جانتے ہیں کہ جانی کس کہاں ہے؟''

لیکن مہاپرش خاموش رہا۔ چبوترے پر موجود تمام لوگ ہکا بکا ہو کر مہاپرش کے چہرے کو تک رہے تھے۔ مجمع میں موجود ہر شخص کی سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ ہر کسی کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ ان کی محسنہ کہاں گئی۔ حیرت ہی حیرت تھی۔ استعجاب ہی استعجاب تھا۔ وزیراعظم جو جانی کس کا باپ تھا۔ اپنے تمام تر مرتبے کو بھلا کر پاگلوں کی طرح بار بار مہاپرش سے ایک ہی سوال کر رہا تھا۔ لیکن مہاپرش طالوسا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہو رہا تھا۔ عجیب صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ نقیب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ کبھی ہزاروں کے مجمع کی طرف منہ کر کے کچھ کہنے کا ارادہ کرتا اور کبھی مہاپرش کی طرف پرامید نظروں سے دیکھنے لگتا۔ اہل قرطاجنہ کو اپنی تمام تر خوشی کافور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سب لوگ ششدر کھڑے ہونقوں کی طرح بار بار عقبی پردے کو دیکھ رہے تھے کہ ایشور کرے کہیں عقب سے ان کی محسنہ' ان کی محبوب دیوی' قرطاجنہ کی کنواری نمودار ہو جائے۔

یکا یک اوپر فضا میں پھڑ پھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ عظیم میدان میں موجود ہر شخص کی نگاہیں فضا میں اٹھ گئیں۔ سب نے دیکھا۔ ہاں سب نے دیکھا فضا میں کبوتروں کی ایک ڈار نمودار ہوئی۔ وہ سب کے سب سفید کبوتر تھے' بالکل سفید' کبوتروں کی ڈار ہوا میں اڑتے اڑتے اچانک سٹیج کی طرف جھکی اور سٹیج کے گرداگرد گول گول چکری میں گھومنے لگی۔ لوگ حیران تھے کہ کبوتر اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر بھی نہ گھبرائے۔ وہ بدستور نیچے سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہر دیکھنے والی آنکھ حیرت سے پھٹی جا رہی تھی۔ کبوتروں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ بالآخر سفید کبوتروں کی ڈار چبوترے پر اترنے لگی۔ تب لوگوں نے دیکھا کہ ایک کبوتر کے پیر کے ساتھ سرخ ریشمی کپڑے کا ایک چھوٹا سا رومال بندھا ہوا تھا۔ سفید کبوتروں کی ڈار چبوترے پر اتر گئی اور وہ مخصوص کبوتر' جس کے داہنے پیر کے ساتھ سرخ ریشمی رومال بندھا تھا۔ بلا جھجک جلسہ کے نقیب کی طرف بڑھا۔ وہ کچھ دیر تک نقیب کے سر کے نزدیک پھڑ پھڑاتا رہا۔ پھر اس

نقیب کے گرد ایک چکر لگایا اور بالآخر نقیب جلسہ کے بائیں شانے پر نہایت سکون سے بیٹھ گیا۔ نقیب' رومال والے کبوتر کا مدعا فوراً سمجھ گیا۔ اس نے کبوتر کو ڈرتے ڈرتے پکڑا اور اس کے پیر پر بندھا ریشمی رومال کھولنے لگا۔ اس نے رومال کھول لیا اور پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے رومال کو پھیلا کر دیکھا۔ مجمع اور چبوترہ کے ہر نفس کی سانسیں کچھ دیر کے لئے تھم چکی تھیں۔ نقیب نے رومال پھیلا کر دیکھا تو اس پر ہیروغلفی خط میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ نقیب رومال پر لکھی تحریر کو پہلے زیرلب اور پھر بہ آواز بلند پڑھنے لگا۔

''اے میرے قرطاجنہ کے فرزندو!

میں تمہاری دیوی ماتا ...... جانی کس تم سے مخاطب ہوں۔ اس سرزمین پر میری آمد کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اب قرطاجنہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں پربت کے اس پار جا رہی ہوں۔ جہاں دیویاں رہتی ہیں۔ میرا وقت پورا ہوا۔ اب تمہیں نئی کنواری کی ضرورت ہے اور قرطاجنہ کی نئی کنواری ہوگی۔ سموجن کی بیٹی سندینہ...... اے قرطاجنہ الوداع!''

نقیب نے رومال پر لکھی تحریر کے آخری الفاظ ادا کئے اور چبوترے پر موجود مہمانوں اور میزبانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ہر زبان خاموش تھی۔ ہر نگاہ ششدر تھی۔ ہر دل کی دھڑکن تھم چکی تھی۔ ہر کوئی ہکا بکا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا اور کیوں ہو گیا۔ قرطاجنہ کی کنواری اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ وزیراعظم ارفلکر کو تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ وہ دوڑ کر نقیب کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ میں تھما سرخ ریشمی رومال چھین لیا۔ اب وہ خود اس پر لکھی تحریر پڑھ رہا تھا۔ یہ کیا ماجرا تھا۔ آج تک ایسا نہ ہوا تھا۔ یہ عجیب کہانی تھی۔ آج تک قرطاجنہ کی کوئی کنواری موت سے پہلے قرطاجنہ کو چھوڑ کر کبھی کہیں نہ گئی تھی۔ یہ ایک اچنبھا تھا۔ وزیراعظم کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ خود کو اس بھری دنیا میں یکدم اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اس کی بیٹی اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔ یہ کبوتر کہاں سے آئے تھے۔ مجمع میں موجود ہر شخص کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ جس دیوی کے درشن لینے کے لئے آئے تھے۔ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ بعض لوگ تو اونچی آواز سے رونے لگے۔ ان رونے والوں میں زیادہ تعداد کنواری کے سرفروشوں کی تھی۔ وزیراعظم نے متلاشی نگاہوں سے سرفروشوں کی طرف دیکھا۔ کنواری کے سب سرفروش چبوترے کی ایک طرف قطار بنائے کھڑے تھے۔ لیکن ان میں ایک نہیں تھا۔

ہاں وہ ایرانی سرفروش گہرتاب ان میں نہیں تھا اور وہ ہوتا بھی کیسے؟ وہ اس وقت برقہ پر سوار قرطاجنہ سے نہ جانے کتنی دور جا چکا تھا۔

معاً وزیراعظم کی نگاہ قرطاجنی جنگی سالاروں پر پڑی تو اسے یہ جان کر بھی حیرت ہوئی کہ امیرالبحر شارق بھی اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ وزیراعظم کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے کہیں نہ کہیں گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ نشست تو بری سپہ سالار مرحوم برتھاس کی بھی خالی تھی لیکن برتھاس کی مسند پر پھول سجے ہوئے تھے۔ برتھاس شہید ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر جنگ جیتی تھی۔ رومی سپہ سالار اورلیس کے گھاؤ نے اس کی جان لے لی تھی۔ گھاؤ بظاہر بہت معمولی تھا۔ لیکن خطرناک زہر میں بجھی ہوئی تلوار کا گھاؤ کسی کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہنے دیتا تھا۔ برتھاس کی آنکھوں میں مرتے وقت بے پناہ مسرت تھی۔ وہ کلاڈینا سے ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ لیکن کلاڈینا نہ آئی۔ موت کے بعد بھی کافی دیر تک برتھاس کی آنکھیں کلاڈینا کے انتظار میں کھلی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مندر کے کاہن نے ہاتھ رکھ کر برتھاس کی آنکھیں بند کر دیں۔

مہاپرش کی خاموشی نے ارفلکر پر بہت کچھ واضح کر دیا۔ اب وہ دیو مالائیت کے طلسمات سے ہٹ کر سوچ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی بیٹی نے اپنا کھویا ہوا پیار پا لیا۔ لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے؟ ابھی تک پورا مجمع گومگو کے عالم میں پتھر کی طرح ساکت تھا۔ وزیراعظم ارفلکر آخری بار مہاپرش کے نزدیک آیا اور کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مہاپرش! آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ میری بچی نے اپنا بچھڑا ہوا پیار پا لیا۔"

اتنا کہہ کر وزیراعظم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مہاپرش نے پہلی بار سر گھما کر وزیراعظم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔ اس نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ارفلکر سے کہا۔

"ہر کسی کو ایک نہ ایک دن تو اپنے محبوب کے پاس جانا ہے۔ ہمسدرو! تم نے جو کھویا وہ اس سے کہیں کم ہے جو آموسا نے بچپن میں کھو دیا تھا۔"

وزیراعظم کی آنکھوں میں جیسے چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ کیا تھا حیرت یا اطمینان۔ وہ

سمجھ گیا کہ اس کی بیٹی نے اپنا بچھڑا ہوا پیار پالیا۔ اسے مہا پجاری کے گھر ملنے والے دانیال کی شناخت ہوگئی۔ جو اس دن نہ ہوسکی تھی۔ اس کے آنسو نکل آئے لیکن اب وہ مطمئن تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی نشست پر واپس آیا اور نقیب کو اجازت دے دی کہ وہ نئی کنواری کے نام کا دوبارہ اعلان کرے اور سندینہ بنت سموجن کو...... چبوترے پر بلوایا جائے۔ سموجن کی بیٹی سندینہ، قرطاجنہ کی کنواری کے مکمل لباس میں ملبوس، پردے کے عقب سے اچانک نمودار ہو گئی۔ اس کی شان اور بے نیازی جانی کس سے کم نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی بچھڑے محبوب کا غم تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چل کر مجمع کے سامنے آئی اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی نشست پر براجمان ہوگئی۔ مجمع میں نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے اور جلسے کا رکا ہوا سلسلہ پھر سے چل پڑا۔ نقیب بول رہا تھا۔ نعرے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن ارفلکر اور سندینہ اپنے اپنے دکھ سینوں سے لگائے چپکے چپکے آنسو پی رہے تھے۔ جدائی کا دکھ بھی کتنا سنگین تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جانی کس نے اپنے ساتھیوں میں سے صرف گھرتاب کو اپنے ہمراہ لیا تھا۔ برقہ اپنی پوری رفتار سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چھمو حسب معمول قلقاریاں مارتا کبھی ایک بادبان سے دوسرے پر اور کبھی عرشے سے مستول اور مستول سے عرشے پر پھدکتا پھر رہا تھا۔ برقہ کے عرشے پر اس وقت...... پانچ افراد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

آسمان پر بادل گھر کر آئے تھے۔ تیز بارش کی توقع تھی۔ آرفان کی بیوی مچھلی تلنے کے لئے آگ جلا رہی تھی۔ کالی کالی گھٹائیں پورے آسمان پر ادھر سے ادھر شور مچاتی پھر رہی تھیں۔ معاً کلاڈینا نے دانیال کو مخاطب کیا۔

"بھیا! میرے دل میں ایک خلش باقی ہے۔ کاش ہم نے سنتوش اور شیتل کو بھی ساتھ لے لیا ہوتا۔ آخر وہ بھی تو ہم میں سے تھے۔"

لیکن دانیال سے پہلے قرطاجنہ کی سابقہ کنواری' سابقہ شہزادی جانی کس اور موجودہ آموسا نے جواب دیا۔

"نہیں! مہاپرش نے ان دونوں کے لئے منع کر دیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ ہماری روانگی کا بھی ان کو پتہ نہ چلے۔"

بادل زور سے گرجے تو سب کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ سب کے دل میں خوشی تھی۔ سب کو اپنا اپنا مقصد مل گیا تھا۔ سب سے زیادہ خوش تھا' شارق اور کلاڈینا...... بالآخر طویل جدائی کے بعد ایک ہو ہی گئے تھے۔ اب سمندر میں کسی کو رومی قزاقوں سے خطرہ نہیں رہا تھا۔

دانیال کا مشورہ تھا کہ وہ لوگ اپنی نئی زندگی ایشیاء میں شروع کریں۔ یہی وجہ تھی کہ

برقہ مشرق کی طرف رواں دواں تھا۔ ان کے پاس رقم کی کمی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی ایشیائی ملک میں نہایت اطمینان سے باقی زندگی گزار سکتے تھے۔

یکا یک آموسا نے دانیال کو شرارت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"دانیال! تم نے تو مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں پربت کے اس پار لے جاؤ گے جہاں پریوں کے گھر ہیں؟"

دانیال نے آموسا کی بات سنی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس دنیا کی زندگی میں ہم پربت کے پار جا کر بھی کیا حاصل کریں گے۔ ہم اپنے لئے جنت نظیر رہائش تو حاصل کر لیں گے' لیکن ان لوگوں کا کیا ہو گا جن کو ہماری ضرورت ہے؟"

"کون سے لوگ؟"

"وہی لوگ جو ابھی تک بے گانگی ذات کا شکار ہیں۔ محبت کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اس دنیا کی اشیاء کو حقیقی جانتے ہیں۔ سچائی سے بے خبر ہیں۔ مال متاع' گھر بار' کھیت کھلیان اور جاگیر کے لئے ایک دوسرے کا قتل کرتے ہیں' خون بہاتے ہیں' انسانی قدروں کو بھول چکے ہیں۔ زمین کی عارضی زندگی کو دائمی سمجھتے ہیں۔ عارفی لذتوں اور جسمانی تقاضوں کے لئے عمر بھر لڑتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے سب سے بڑی کامیابی دولت کا حصول ہے' جو بے خبر ہیں کہ سچائی کیا ہے؟ آموسی کیا ہم پر لازم نہیں کہ ہم انسانوں میں رہیں اور انہیں سمجھائیں کہ محبت کیا شے ہے۔ نفرت کتنی بری ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم جان گئے ہیں حقیقت کیا ہے۔"

آموسا نے دانیال کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ طویل ترین ہجر و فراق نے ان دونوں کو کیا کیا سکھا دیا تھا۔ وہ سچ مچ معرفت نفس حاصل کر چکے تھے اور بے گانگی ذات کے دلدل سے نکل آئے تھے۔

بادل پھر زور سے گرجے۔ ٹھیک اسی وقت چھمو نے ایک لمبی جست بھری اور عرشے کی طرف آتے ہوئے آرفان کے شانے پر جا بیٹھا۔ آرفان ہنس دیا۔ وہ چھمو کے بدن کو سہلاتا ان لوگوں کے نزدیک آیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"لگتا ہے آج زوروں کا مینہ پڑے گا۔ کالی گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی ہیں۔ ہر چیز جل تھل ہو جائے گی۔ میرے خیال میں آپ لوگ نیچے چلئے کھانا تیار ہے۔ مچھلی کے تلے ہوئے قتلے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سب کو بھوک لگی تھی۔ آرفان کے انداز گفتگو پر سب مسکرا دیئے اور آسمان پر جمع ہوتی ہوئی کالی گھٹاؤں کو دیکھتے نیچے جانے لگے۔

آج سب کے سب سرشار تھے۔ چھمو بھی اور بارش کے موٹے موٹے قطروں کا منتظر برقہ بھی۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

اجنبی دیس کی نرتکی

”سنتوش! تم نے کچھ سنا؟...... ہمارے مندر میں کسی اجنبی دیس کی نرتکی بھرتی ہوئی ہے۔“

شیتل نے ننھے دانیال کے ہاتھ سے اون کا گولہ لیتے ہوئے سنتوش سے پوچھا!

انہوں نے اپنے بیٹے کا نام دانیال رکھا تھا۔ وہ اب ایک سال اور تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ سنتوش اور شیتل بہت ہی خوش رنگ زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ان کے دل میں ایک دکھ تھا اور وہ تھا اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ' دانیال' کلاڈینا' شارق اور آموسا...... جو سچ مچ ان کے اپنے تھے۔ وہ ہمیشہ اٹھتے' بیٹھتے' سوتے' جاگتے انہیں یاد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے پہلے بیٹے کا نام دانیال رکھا تھا۔ سنتوش نے شیتل کی بات سنی تو حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ اجنبی دیس کی نرتکی؟...... اور ہمارے مندر میں؟ کیا وہ قرطاجنی دھرم کو سوئیکار کر چکی ہے؟“

”ہاں! سب ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں بہت حسین ہے۔ میرا تو دل کر رہا ہے اس سے جا کر ملوں۔“

”ہاں تو مل آؤ ناں!...... خوبصورت ہے تو کیا ہوا' تم سے زیادہ حسین تو نہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔“

سنتوش نے شیتل کی تعریف کی تو وہ شرما گئی۔

”سنتوش تم بھی ناں بس!......“

”تم بھی ناں بس کیا؟ تم ہو ہی اتنی حسین کہ تم سے بڑھ کر تو کوئی لڑکی خوبصورت ہو ہی نہیں سکتی۔“ شیتل مسلسل شرما رہی تھی۔ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''بس بس اب زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ ایک بیٹے کے باپ بن چکے ہو' لیکن اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ فرض کرو وہ سچ مچ مجھ سے زیادہ حسین ہوئی تو؟''

''ہو ہی نہیں سکتا۔''

سنتوش بدستور اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شیتل بھی اپنی ضد پر اڑی رہی۔

''سنتوش! تم فرض کرلو کہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے...... تو پھر؟''

''تو پھر میں اس کے ساتھ بھی شادی کرلوں گا۔''

سنتوش آج شیتل کو ستانے پر تل گیا تھا۔ شیتل نے مصنوعی غصے سے آنکھیں دکھائیں اور کہنے لگی۔

''توبہ توبہ! تم مندر کی نرتکی سے شادی کرو گے؟ دیوتاؤں کو ناراض کرو گے؟''

''تو کیا ہوا تم بھی تو ایک نرتکی تھیں۔ میں نے تم سے شادی کی۔ کیا دیوتا ناراض ہوئے؟''

اب شیتل لاجواب ہو چکی تھی۔ اس نے ننھے دانیال کو گود میں اٹھا لیا اور جاتے جاتے کہنے لگی۔

''میں تو اس نرتکی سے ملنے جا رہی ہوں۔ میرے دل میں اس سے ملنے کا اشتیاق بڑھ رہا ہے۔ کیا تم نہیں آؤ گے؟''

اب سنتوش سنجیدہ ہو گیا۔

''میں کیا کروں گا؟ تم جانتی ہو میں مندر کی طرف زیادہ نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور اس حسینہ سے مل آؤ۔'' شیتل...... ننھے دانیال کو لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ وہ دانیال کو سلا کر مندر کی طرف جانا چاہتی تھی۔ آج ملکرت کے مندر میں ایک نئی نرتکی کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ کسی اجنبی دیس سے آئی تھی اور یہی بات شیتل کے تجسس کا باعث تھی۔

شیتل نے ننھے دانیال کو کمرے میں سلایا اور پھر مندر کی طرف چل دی۔ اب وہ جب بھی مندر جاتی' سب کی سب نرتکیاں اس کے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ مہا پجاری کی بہو تھی اور سب نرتکیاں اس کے ساتھ دوستی کو اپنے لئے فخر تصور کرتی تھیں۔ وہ جونہی مندر کے

دروازے پر پہنچی' باتونی' راکھشی سب سے پہلے اس کے ساتھ ٹکرائی۔

"ارے شیتل!......تم نے سنا' آج ہمارے مندر میں ایک حور کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ وہ اپنے لمبے لمبے بال کھولتی ہیں تو کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ سنا ہے لاطینی قوم کی ہے۔ اکیلی آئی ہے۔ دور دراز کا سفر کر کے میں تو حیران ہوں وہ اتنی دور سے اکیلی کیسے آ گئی۔ عجیب بات ہے شیتل وہ بہت کم بولتی ہے۔ بس یوں سمجھو! بولتی ہی نہیں......"

"اور تم بہت زیادہ بولتی ہو!......راکھشی!......کبھی تو چپ رہا کرو۔"

راکھشی حسب معمول خفیف ہو گئی۔ لیکن چند ہی لمحوں میں دوبارہ ٹھیک ہو گئی اور شیتل سے پوچھنے لگی۔

"کیا تم' اسی نرتکی سے ملنے آئی ہو؟ وہ اپنے کمرے میں ہے اور ہاں پتہ ہے؟ اسے مندر کے منتظم نے کون سا کمرہ دیا ہے؟......وہی!......وہی کمرہ جس میں تم رہتی تھیں۔ تمہیں یاد ہے ناں؟ ایک روز تم مہا پجاری کے بیٹے......"

راکھشی کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر زور سے دبا کر رکھ لیا' جیسے الفاظ کو باہر نکلنے سے روک رہی ہو۔ شیتل نے غصیلی نظروں سے راکھشی کی طرف دیکھا۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اسے یہ جان کر عجب سا لگا کہ منتظم نے نئی نرتکی کو وہی کمرہ دیا تھا جو کبھی شیتل کا تھا۔ وہ سیدھی اپنے سابقہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ شیتل نے آہستگی کے ساتھ دستک دی اور پھر رک کر انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو اس کے سامنے ایک نیلی آنکھوں والی حسینہ کھڑی تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں' نہ جانے کیوں شیتل کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس چہرے والی لڑکی سے مل چکی ہے۔ اس نے فوراً نئی نرتکی کو سلام کیا اور ساتھ ہی سوال کیا۔

"تمہارا نام؟......تمہارا نام کیا ہے......میری دوست!"

نئی نرتکی بھی شیتل کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک تو شیتل کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"اشترہ!......میرا نام اشترہ ہے۔"

شیتل الجھ گئی۔ اشترہ نام کی کسی لڑکی کو وہ نہ جانتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ آخر

اسے ایسا کیوں لگ رہا ہے' جیسے وہ اس حسین لڑکی کو پہلے سے جانتی ہے۔ اس نے پھر اشترہ سے سوال کیا:

"تم کون سے دیس سے آئی ہو؟"

"جی! میں سپین کی رہنے والی ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ سپین میں بہت فینیقی آباد ہیں۔ وہاں بھی' ملکرت' اشمون اور تائیت کے مندر ہیں۔ میں پہلے اسپین میں ملکرت کے مندر کی نرتکی تھی۔ پھر وہاں کے مہاپجاری نے مجھے قرطاجنہ آنے کا حکم دیا اس لیے میں یہاں آ گئی"۔

لیکن شیتل بدستور الجھن کا شکار تھی۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش کھڑی رہیں پھر شیتل نے اندر کمرے میں قدم رکھتے ہوئے اشترہ کو ازخود بتانا شروع کیا۔

"معلوم ہے؟ یہ کمرہ کبھی میرا ہوا کرتا تھا۔ میں بھی پہلے نرتکی تھی۔ میرا نام شیتل ہے۔ کیا تم مجھے جانتی ہو؟"

اشترہ نے شیتل کا نام سنا تو بری طرح چونکی اور پھر حد سے زیادہ سٹپٹا گئی۔ شیتل نے واضح طور پر محسوس کیا کہ نئی نرتکی کسی نہ کسی طرح اس سے واقف تھی۔ اشترہ کی زبان گنگ ہو گئی اور وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ شیتل کو اب یقین ہو گیا کہ وہ دونوں پہلے بھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں مل چکے ہیں۔ وہ بہت ذہن پر زور دیتی' لیکن اسے کچھ یاد نہ آتا۔ بالآخر اس نے براہ راست اشترہ سے پوچھا۔

"اشترہ!...... سچ سچ بتاؤ!...... تم کون ہو؟ ہم کہاں مل چکے ہیں۔ دیکھو! تم چھپانے کی کوشش مت کرو! کیونکہ ایک نہ ایک دن تو مجھے پتہ چل ہی جائے گا۔ تم مجھے آج ہی بتا دو! آخر چھپانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

اشترہ کی حالت غیر تھی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہاتھوں کے ناخن اپنے دانتوں سے چھیل رہی تھی۔ شیتل نے پھر پوچھا۔

"اشترہ! آخر چھپانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ بہن! مجھے تجسس کی وجہ سے سخت پریشانی ہورہی ہے۔ ایشور کے لئے تم بتا دو نا! تم کون ہو؟"

"میں شوزینہ ہوں۔"

نئی نرتکی جس نے چند لمحے پہلے اپنا نام اشترہ بتایا تھا کے منہ سے شوزینہ کا لفظ نکلنے

کی دیر تھی کہ شیتل اپنی جگہ یکلخت ساکت و جامد ہو گئی۔ اب اسے یاد آیا کہ وہ شوزینہ کو پہچان کیوں نہ رہی تھی۔ اس نے شوزینہ کو رات کی تاریکی میں دیکھا تھا اور اتنی مدت بعد اس کے لئے سنتوش سے پیار کرنے والی اس پہاڑی حسینہ کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سکتے میں آ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شوزینہ کو تکنے لگی۔ اسے نہ کوئی بات آ رہی تھی اور نہ جا رہی تھی۔ وہ بالکل گنگ ہو گئی۔ شوزینہ کی حالت پہلے سے بھی غیر ہونے لگی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی اور قریب تھا کہ وہ معافی مانگنے کے لئے شیتل کے آگے ہاتھ جوڑ دیتی کہ شیتل یکلخت سکتے کے عالم سے باہر آ گئی۔ اس نے نہایت والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر شوزینہ کو اپنے گلے سے لگا لیا اور تقریباً چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"تم کہاں رہ گئی تھیں؟ شوزی! اوہ میرے ایشور! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تم نے میرے دل پر پڑا کئی من کا بوجھ ہٹا دیا...... اوہ میرے ایشور!"

شیتل پاگلوں کی طرح کبھی شوزینہ کا ماتھا چومتی اور کبھی اس کی آنکھوں کے بوسے لینے لگتی۔ وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔

"اوہ میرے ایشور! تم نے میرے من کا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

وہ جذبات کی شدت سے پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی تھیں۔ شوزینہ کی حالت بھی اب تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ جس قدر ڈر گئی تھی اب اسی قدر خوش ہو رہی تھی۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ سنتوش کی بیوی شیتل کو اس کا آنا سخت ناگوار گزرے گا۔ لیکن شیتل تو شوزینہ کی آمد پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ معاً شیتل نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"ارے شوزی! یہ کیا؟؟ یہ نرتکی! ...... ورتکی کا کیا تک ہے۔ خبردار! تم کوئی نرتکی ورتکی نہیں ہو۔ تم میری بہن ہو۔ میری جان ہو۔ میرا دل ہو۔ ارے پگلی! تمہیں کیا معلوم ہم دونوں کتنی باتیں کرتے ہیں تمہاری۔ سنتوش تمہیں ایک پل کے لئے بھی نہیں بھولا' چلو! چلو! چلو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ "اپنے" گھر چلو! شاباش میں انکار نہیں سنوں گی۔ چلو! مجھے ایک لمحے کی دیر بھی گوارا نہیں۔ سنتوش تو تمہیں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ وہ روز بلاناغہ کتنی کتنی دیر تمہاری باتیں کرتا ہے۔"

"نہیں شیتل! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں ایک عرصے سے نرتکی ہوں۔ تم لوگوں

کے چلے جانے کے بعد میں جب اپنے گھر گئی تو سردار پولا بیس کے قتل کا راز افشاء ہو چکا تھا' نہ جانے کیسے؟ میرے ماں باپ کو پتہ چل گیا تھا کہ سردار پولا بیس کا قتل میں نے اور سنتوش نے کیا ہے۔ تب میرے لیے ان کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میرا باپ تو مجھے جان سے مارنے کے درپے ہو گیا تھا۔ تب میں گھر سے فرار ہو گئی اور میں نے سپین میں فینیقیوں کے پاس جا کر پناہ لی۔ میں وہاں ایک مندر کی نرتکی بن گئی اور میں نے اپنا نام اشترہ رکھ لیا۔ مجھے فینیقیوں سے سنتوش کی خوشبو آتی تھی۔ اس لیے میں نے ان کے پاس پناہ لی اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے سپینی مندر کے فینیقی پجاری نے خود یہاں بھیجا ہے۔ میں تمہارے پیار کو تقسیم کرنے نہیں آئی۔"

شیتل نے شوزینہ کی مختصر داستان سنی تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ شوزی سے کہنے لگی۔

"شوزی! میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔ فینیقی دھرم میں ایک مرد دو شادیاں کر سکتا ہے۔ سنتوش پر جس قدر حق میرا ہے' اسی قدر تمہارا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ ہر قیمت پر دوسرا کوئی راستہ مجھے منظور نہیں۔"

شوزینہ مخمصے میں پھنس گئی۔ وہ بری طرح الجھ گئی۔ اس نے عاجز آ جانے والے لہجے میں شیتل سے کہا۔

"شیتل! اب میں ایک نرتکی ہوں اور تم جانتی ہو کہ ایک نرتکی......"

شیتل نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

"ہاں! میں جانتی ہوں اور مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ کل تک میں بھی ایک نرتکی تھی۔ لیکن اب ایک بچے کی ماں ہو۔ تم میرے ساتھ چلتی ہو یا میں مہا پجاری کو بلاؤں؟ جو میرے ساتھ ساتھ تمہارے بھی سسر ہیں۔"

شوزی نے چونک کر شیتل کی جانب دیکھا اور پھر نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان پھیل گئی۔ اس نے سر جھکا لیا اور دھیمی سی آواز میں شیتل سے کہا۔

"مبارک ہو!...... بچے کی بہت بہت مبارک ہو۔"

شیتل بالآخر شوزی کو لے کر اپنے گھر آ گئی۔ مندر کی نرتکیاں ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ شیتل نے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہی زور زور سے

سنتوش کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"سنتوش! سنتوش!...... تم ٹھیک کہتے تھے کہ تم اجنبی دیس کی حسین نرتکی سے بھی شادی کر لو گے دیکھو تو اجنبی دیس کی حسین نرتکی تم سے ملنے آئی ہے۔ ارے دیکھو تو تم سے کون ملنے آیا ہے۔"

سنتوش...... شیتل کی بات سن کر دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"یہ لڑکی پاگل ہے...... ہر بات بغیر سوچ سمجھے منہ سے نکال دیتی ہے۔ ایشور خیر کرے!۔ دیکھتا ہوں بھلا کسے پکڑ لائی ہے۔"

وہ یہی باتیں سوچتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو اس کے قدم برآمدے میں ہی جام ہو گئے۔ اس کے گھر پہاڑی حسینہ شوزی آئی تھی، جس کے ساتھ سنتوش نے اپنی زندگی کے سب سے حسین پل گزارے تھے۔ جو سنتوش کو آسمانوں سے آیا ہوا دیوتا سمجھتی تھی۔ جس نے سنتوش کے ساتھ مل کر سردار پولابھیس کا قتل کیا تھا۔ جس کے زخموں پر سنتوش نے اپنے ہاتھوں سے مرہم لگائی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی پتھر کی طرح ساکت و جامد ہو گئے۔ بس صرف آنسو تھے جو حرکت کر رہے تھے۔ باقی ہر چیز تھم چکی تھی۔

(ختم شد)